سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں

ماہنامہ سرگزشت کراچی

اکتوبر 2018

نگران اعلیٰ

معراج رسول

صفحات 290 قیمت 100 روپے

PakiBooks.Site

☆ مرگِ برگ: اردو کے اس قلمکار کی داستان جسے موت کھینچ لے گئی

☆ آل راؤنڈر: اس سپر اسٹار کی داستان جسے کوئی چانس دینے پر تیار نہ تھا

☆ داغِ ندامت: وہ اپنی محبوبہ کو سنگلاخ پہاڑوں میں چھوڑ آیا تھا، دلچسپ سچ بیانی

سرگزشت
07
قلمکار سیاست دان
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت و شنید
08
شہر خیال
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت
16
مرگ برگ
زویا اعجاز
اس شاعر کے اشعار خون رلایا کرتے تھے

مشعل راہ
41
عصائے موسیٰ
ڈاکٹر ساجد امجد
ایمان کی تازگی کے لیے ایمان افروز واقعہ

شکاریات
45
شکار و شکاری
سید احتشام
افریقا کے گھنے جنگل میں موت کا کھیل

سفر کہانی
53
شمشال سے ٹورنٹو
ندیم اقبال
جاپانی کا شہکار ایک الگ انداز کی داستان

یادیں
77
باعث افتخار
افتخار سجاد
یادیں سرمایہ سے کم نہیں ہوتی ہیں

فلم نگری
83
آل راؤنڈر
انور فرہاد
اس نے جہد مسلسل کی مثال قائم کی ہے

تذکرہ
107
موسیقار
چوہدری قمر جہاں علی پوری
والدین ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے جو اسے قبول نہ تھا

جعلسازی
111
تصویر
محمد سجاول خان
اس نے جعلسازی کا نادر طریقہ اپنایا تھا

تاریخ
117
آگ کا دریا
ضیا تسنیم بلگرامی
کشت و خون کا دریا بنانے والے کی کتھا

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی [illegible] ادارہ کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔
www.PakiBooks.Site

انکشاف
165
شوق پرواز
اصغر عباس
غلط فہمی میں ہم نے ہوائی جہاز کا موجد رائٹ برادرز کو سمجھ لیا ہے

معاشرت
168
ناسور
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ایک معصوم نوجوان کی خون رنگ لہو گرما دینے والی داستان

پہلی سچ بیانی
196
داغ ندامت
فضہ عادل
اس نے سنگلاخ پہاڑوں میں ایک حسینہ کو پسند کرلیا تھا

دوسری سچ بیانی
219
ٹوٹکا
رؤف اسلم آرائیں
کبھی کبھی آزمودہ ٹوٹکے بھی گلے میں اٹک جاتے ہیں

تیسری سچ بیانی
225
خلش
عاقب اشعر
جوئے میں اس نے بیوی کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا

چوتھی سچ بیانی
231
خالی ہاتھ
مجید اکرم
بساط بچھی مگر وہ خالی ہاتھ رہا

پانچویں سچ بیانی
243
بے وفا
جاوید الحسن
عشق میں پاگل لڑکی نے ماں باپ کی دنیا تاریک کردی

چھٹی سچ بیانی
251
حق
اعتزاز سلیم وصلی
ایک سیدھے سادھے بندے کو اپنا حق چاہیے تھا

ساتویں سچ بیانی
259
جوابی تھپڑ
زین مہدی
بے کاری میں اس نے موبائل چھیننے کا دھندا شروع کردیا تھا

آٹھویں سچ بیانی
269
خواب عذاب
نسرین اختر نینا
پھانسی کے ایک قیدی کو مقتولہ خودکشی پر آمادہ کررہی تھی

نویں سچ بیانی
277
سراب
ریحانہ قمر
وہ ساس صاحبہ کے ساتھ رہنا چاہتی تھی

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

www.PakiBooks.Site

جلد 28 ❖ شمارہ 09 ❖ اکتوبر 2018ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرِ اعلیٰ : عذرا رسول
مدیر : پرویز بلگرامی
نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◆◆◆

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

◆◆◆

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 100 روپے ❖ زرِ سالانہ 1200 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS
CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

ہر ملک وملت کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ صحیح ہو، معاشرہ صحیح ہوگا تو ترقی کی راہیں خود بخود کھلتی چلی جائیں گی لیکن ہمارا معاشرہ جس تیزی سے زوال کی جانب گامزن ہے، اس کا اندازہ بھی آپ سب کو ہوگا۔ اس کی وجہ کیا ہے، میں اکثر یہ سوال خود سے کرتا ہوں اور جواب ملتا ہے کہ ہم خود کو دھوکا دے رہے ہیں۔ مصلے پر کہتے ہیں کہ اھدِ نا الصراط المستقیم لیکن نماز تمام کرتے ہی اس راستے کی جانب چل دیتے ہیں جس کے بارے میں کہہ رہے تھے، غیرالمغضوب علیھم والاالضالین یہی وجہ ہے کہ معاشرہ بگڑ رہا ہے۔ کاش ہم صرف صراط المستقیم پر قائم رہیں تو ہمارا معاشرہ خود سدھر جائے گا۔ ہم دوسروں کو ہدایت دینے کی بجائے خود کو سنبھال لیں تو یہی معاشرہ قابل تعریف ہو جائے گا جس طرح قطرہ قطرہ سمندر بنتا ہے، اسی طرح انفرادی اکائیاں مل کر معاشرہ بناتی یا بگاڑتی ہیں۔

معراج رسول

قلمکار سیاست دان

میدناپور کا شمار بنگال کے ان علاقوں میں ہوتا تھا جسے بنگالی تہذیب کا مرکز قرار دیا جاتا تھا۔اس علاقے کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس علاقے میں علم وادب کو اہمیت حاصل رہی۔یہ علاقہ مسلمانوں کی آمد سے قبل بھی ایک بڑی حکومت کلکتا کا مرکز رہا تھا پھر علی وردی خان نے اس علاقے کو فتح کیا اور اپنی حکومت میں شامل کرلیا لیکن ان کے بعد میر جعفر کی غداری کی وجہ سے سراج الدولہ کے ہاتھ سے یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں چلا گیا پھر جب انگریزوں سے آزادی کی تحریک چلی تو اس علاقے کے کئی نام ابھر کر سامنے آئے جن میں کھودی رام جس نے انگریز جج کی کار پر بم مارا اور پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک چلانے والے ماتنگنی ہزارا،ہیم چندر وغیرہ بھی اسی علاقے کے تھے۔صرف ہندو ہی نہیں اہمیت کے حامل مسلمان بھی اس علاقے کے مشہور ہوئے جن میں حمید ملا، ناصر مونڈل کے علاوہ اور بھی کئی اہم نام شامل تھے جو تحریک آزادی میں پیش پیش تھے۔اس علاقے کا نام میدناپور اس وجہ سے پڑا کہ اس علاقے میں ایک مسجد تھی جو مسجد مدینہ کہلاتی تھی،مدینہ بگڑ کر میدنا ہو گیا لیکن ہندو تاریخ دانوں نے لکھا کہ میدنا ایک دیوی تھی اسی کے نام پر یہ علاقہ مشہور ہوا۔اس علاقے میں یوں تو کئی روسا تھے لیکن ایک خاندان سب سے زیادہ مشہور تھا اور یہ خاندان سہروردی کہلاتا تھا۔کہا یہ جاتا تھا کہ ان کے آباؤ اجداد اسلام کی تبلیغ کے لیے ہند آئے تھے: یہ صوفی مسلک تھے۔اسی خاندان کے حسن سہروردی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔انہیں 1945 میں کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کا پروفیسر نامزد کیا گیا۔اس طرح وہ کلکتہ یونیورسٹی کے پہلے مسلمان پروفیسر کے منصب پر فائز ہوئے۔کلکتہ یونیورسٹی کے ایک جلسے میں 6فروری 1932 کو بنگال کے گورنر سراسٹنلی جیکسن پر تحریک آزادی کے رکن بینا داس نے گولی چلائی تو انہوں نے جان پر کھیل کر اسے بچالیا جس پر حکومت برطانیہ نے انہیں نائٹ کا خطاب دیا۔فوج میں انہیں لیفٹیننٹ کرنل کا عہدہ ملا تھا۔ان کی شادی نواب عبداللطیف کی پوتی شاہ بانو بیگم سے ہوئی۔شاہ بانو سے دو بچے ہوئے ایک حسن مسعود سہروردی اور دوسری شائستہ سہروردی۔حسن کے بھائی حسین سہروردی بھی سیاست میں ایک بڑا مقام رکھتے تھے۔متحدہ بنگال کے چیف منسٹر بھی رہ چکے تھے۔انہیں کی دور حکومت میں برصغیر کا پہلا بڑا ہندو مسلم فساد ہوا تھا جس کی ابتدا نواکھالی سے ہوئی تھی۔نواکھالی کے مسلمان ہندو زمینداروں کے ظلم کے خلاف سینہ سپر ہوگئے تھے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تھا کیونکہ مسلم لیگ نے مسلمانوں میں جذبہ جگا دیا تھا۔اس جھگڑے کو گاندھی جی نے ہندو مسلم فساد قرار دے دیا اور انہیں اپنے ساتھ نواکھالی لے گئے تھے جس کی وجہ سے وہ جھگڑا زیادہ مشہور ہوا اور فساد بن کر بنگال سے پھیل کر صوبہ آسام،صوبہ اوڑیسہ،صوبہ بہار کو لپیٹ میں لے لیا تھا اور گاندھی کے ساتھ وہاں کا دورہ کرنے کو تاریخ دانوں نے حسین شہید سہروردی کی سب سے بڑی غلطی قرار دیا۔اسی حسین شہید سہروردی کے بھائی حسن شہید سہروردی کے گھر 22جولائی 1915 کو کلکتہ میں ایک بچی پیدا ہوئی۔اس نے ابتدائی تعلیم مقامی تعلیم گاہ لوریٹو ہائی اسکول سے حاصل کی جہاں انگریزوں کے بچے تعلیم پاتے تھے پھر اسی اسکول سے منسلک کالج سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔اس دور میں بہت کم مسلمان اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے تھے،وہ تو صنف نازک تھی پھر بھی اس نے اعلیٰ تعلیم کی جانب قدم بڑھادیا۔کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔اسی دوران ان کی شادی اکرام اللہ سے ہوگئی جو ریاست بھوپال کے خان بہادر حافظ ولی اللہ کے بیٹے تھے۔اکرام اللہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔انہوں نے 1936 میں انڈین سول سروس جوائن کیا تھا اور کئی اہم عہدوں پر رہ چکے تھے۔انہوں نے بیوی کی تعلیم میں دلچسپی دیکھی تو اس کے مزید پڑھنے کی خواہش کو رد نہ کرسکے۔ان کی حوصلہ افزائی سے اس لڑکی نے 1940 میں ”ڈولپ آف اردو ناول اینڈ شارٹ اسٹوریز“ کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا اور پہلی مسلم خاتون قرار پائی جسے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ان دنوں مسلمانوں میں پردے کا سخت رواج تھا۔والد بھی روشن خیال تھے اور شوہر بھی روشن خیال ملا اسی وجہ سے اس لڑکی نے پردے کی پابندی سے اجتناب کیا۔اکرام اللہ جب دہلی میں تھے اسی دوران ان کی ملاقات قائداعظم سے ہوئی۔وہ قائد کی شخصیت سے اتنا متاثر ہوئے کہ سول سروس میں رہتے ہوئے بھی وہ تحریک پاکستان میں حصہ لینے لگے۔ان کے ساتھ بیوی بھی پاکستان کے حصول کے لیے چلائی جاری تحریک میں حصہ دار ہوئیں اور خواتین کو تحریک میں عملی حصہ لینے کی ترغیب دینے کے لیے گھر گھر جانے لگی۔اس کی کوششوں سے مسلم لیگ کی خواتین ونگ کافی مضبوط ہوئی۔قیام پاکستان کے بعد 1947 میں قانون ساز اسمبلی کی رکن بنی۔اس نے ڈھاکا کو پاکستان کا دوسرا دارالحکومت قرار دینے کے لیے مشرقی پاکستان اسمبلی میں ایک پُرجوش تقریر کی۔اکرام اللہ بھوپال سے کراچی ہجرت کر آئے تھے۔اکتوبر 1947 میں انہیں قائداعظم نے سیکریٹری امور خارجہ نامزد کیا،بیوی بھی ڈھاکا تو کبھی کراچی میں رہتی۔پاکستان کی تعمیر نو میں لگی رہی۔اکرام اللہ کئی بار اقوام متحدہ میں پاکستانی مندوب رہے۔کینیڈا اور برطانیہ میں پاکستان کی طرف سے ہائی کمشنر بھی رہے۔اس درمیان انہیں بیوی نے ایک بیٹے انعام اکرام اللہ اور تین بیٹیاں ناز اکرام اللہ،سلمٰی اکرام اللہ اور ثروت اکرام اللہ کا تحفہ دیا۔بعد میں ثروت اکرام اللہ کی شادی اردن کے شہزادے سے ہوئی۔1963 میں جب اکرام اللہ کامن ویلتھ کے سیکریٹری تھے ان کا انتقال ہوگیا۔بیوہ ہونے کے بعد بھی وہ خدمت وطن میں لگی رہیں۔کئی ممالک میں پاکستان کی ہائی کمشنر بھی رہی۔تحریک پاکستان سے تعمیر پاکستان میں نمایاں خدمت انجام دینے والی شائستہ اکرام اللہ سہروردی 11دسمبر 2000 کو کراچی میں انتقال کر گئیں۔بعد از مرگ 2002ء میں انہیں حکومت پاکستان نے نشان امتیاز سے نوازا۔وہ کئی کتابوں کی مصنفہ تھیں لیکن ”فرام پردہ ٹو پارلیمنٹ“ زیادہ مشہور ہوئی۔

☆☆☆

PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

شہرِ خیال

مدیر اعلیٰ

☆ حکیم سید محمد رضا شاہ نے لورگہ ضلع میانوالی سے لکھا ہے۔ ''آپ نے مہنگائی کا رونا روتے ہوئے اپنی مشکلات کا ذکر کیا ہے میں اس وقت سے سسپنس و جاسوسی ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں جب ان کی قیمت صرف دو روپے تھی۔ مہنگائی نے تو سفید پوش طبقہ کو بھی دن میں تارے دکھا دیے ہیں۔ اس قیمت پر یقیناً آپ کے لیے ادارہ کے وسائل کا اجرا مشکل ہے اس لیے آپ ایک حد تک رسائل کی قیمتوں میں اضافہ کر سکتے ہیں کیونکہ عام رسائل بھی مارکیٹ میں 100 روپے ہی پر چل رہے ہیں۔ ''شہرِ خیال'' میں صدر محفل رضا احمد اعوان بھکر کا معلوماتی تبصرہ پڑھا۔ مبارک ہو اعوان صاحب اس کے علاوہ پروفیسر کیو اے قاسمی، قیصر خان بھکر، بشریٰ افضل، آفتاب احمد نصیر اشرفی، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، رانا محمد شاہد، سدرہ بانو ناگوری اور اویس شیخ کے تبصرے پڑھے۔ ان سب کو ہماری طرف سے شاباش اور نئے تبصرہ نگاروں کی کاوش بھی قابل ستائش ہے۔ سید امتیاز حسین بخاری چکڑالہ سادات کو خصوصی سلام۔ ان کے تبصرے جاندار اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب کو ان کے ماموں سید زوار حسین نقوی کی رحلت پر تعزیت۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت عطا فرمائے اور شاہ صاحب کو صبر جمیل۔ اس کے بعد ہمارے عزیز نزاہت افضال صاحب جو معلومات کا خزانہ رکھتے ہیں کا تبصرہ بھی لاجواب تھا۔ ان کو خصوصی مبارک۔ ندیم اقبال صاحب کا ''شمشال سے ٹورنٹو'' ایک دلچسپ معلوماتی سفرنامہ ہے۔ ویسے ندیم صاحب آپس کی بات ہے۔ مرو ایسے تو بدنام نہیں کیونکہ آپ بھی دیارِ غیر میں دل لگا بیٹھے۔ زین مہدی صاحب کی ''یہ پُراسرار بندے'' (اسفندیار بخاری) پر ایک قیمتی دستاویز۔ ان ہی بندوں کی شہادتوں سے ارضِ پاک دشمن کے مہلک واروں سے بچا ہوا ہے۔ ''لازوال نغمے'' زویا اعجاز صاحبہ کی عمدہ کاوش تھی کہ 1965ء کا دور یاد آگیا۔ جب ہم ساتویں کلاس میں تھے۔ ان نغموں نے فوج اور عوام میں دشمن کے خلاف ایک نئی روح پھونک دی۔ انور فرہاد کی فلم نگری میں اداکار اکمل خان جو اپنے وقت کے سپر اسٹار تھے، پڑھی۔ اکمل صاحب کی فلمیں زمانہ کالج میں دیکھی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ حزیں قادری کے بارے میں کافی معلومات مضمون میں میسر ہوئیں۔ پہلے زمانہ میں فلموں کا معیار اس لیے اچھا تھا کہ ہر شعبے میں محنت کی جاتی تھی۔ امجد رئیس کی آپ بیتی برفیلے سمندر میں پھنس جانے والوں کی خوفناک روداد ہے۔ ''ناسور'' طویل سلسلہ میں جناب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نعمان صاحب کو باہر لے گئے ہیں، جہاں نعمان صاحب کو کافی معرکے پیش ہیں۔ اب تو اس کے ساتھ کالیا بھی آملا ہے۔ یوں دونوں مل کر خوب ہنگامے کریں گے اور دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائیں گے۔ ''بیت بازی'' کے اشعار بہتر تھے۔ کترنیں بھی خوب تھیں۔ آپ بیتیوں میں ابھی صرف ''دیس پردیس'' پڑھی ہے۔ سچ ہے کہ دولت کے لالچ میں انسان درندہ بن جاتا ہے اور اپنی عاقبت برباد کر بیٹھتا ہے اور صفحہ اوّل میں شہیدِ تحریک جناب نواب بہادر یار جنگ جو تحریک پاکستان کے ہراول سپاہی تھے اور جوانی میں صرف 39 سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہوگئے کا تذکرہ بھی خوب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ باقی آپ بیتیاں پڑھنی ہیں اور آخر میں محمد عزیز مٹے، اعجاز حسین سخار، عمران جونانی، بابر عباس اور دیگر ساتھیوں کو سلام دعا۔ ادارہ کے ساتھیوں کو پیار اور خاص کر اعجاز احمد راحیل صاحب آپ بھی محفل کی جان تھے۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تجزیہ کراچی سے۔ ''خوب صورت سرورق کے ساتھ ستمبر کا سرگزشت دیدہ زیب بھی تھا اور تحریروں کی وجہ سے متاثر کن بھی۔ آپ کا کہنا بجا ہے کہ ہمیں خود احتسابی کی قدم قدم پر ضرورت ہے۔ خوش قسمتی سے ملک کا نیا سربراہ بلند ہمت ہے کہ احتساب کا عمل اس سے شروع کیا جائے جس کے لیے وہ اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ مزید یہ کہ اپنی ٹیم کا احتساب وہ خود کرے گا۔ سادگی اور بچت مہم شروع کردی گئی ہے۔ خدا انہیں توفیق دے کہ قوم کی بھلائی کے لیے اٹھائے گئے اقدام کو ہم سراہ سکیں اور کچھ نہیں تو کچھ

دیر صبر ہی کر لیں کہ بدنیتی اپنی ناکامی کے ساتھ ضرور ظہور پذیر ہوتی ہے۔ شہیدِ تحریک نواب بہادر یار جنگ کی پوری زندگی کا تحریری منظر نامہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ آپ نے دریا کو کوزے میں بند کردیا واہ۔ ''شہرِ خیال'' میں رضا احمد اعوان نے میدان مار لیا، شاندار تبصرہ ہے اور کیوں نہ ہو ان کا تعلق بھی قیصر خان، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری جیسے مشاق تجزیہ کاروں کے شہر سے ہے۔ قارئین سے التماس نامی خبر مایوس کن تھی جس میں آپ نے ہمارے سامنے تین آپشن رکھ کر رائے مانگی ہے تو ہم سمیت کئی ساتھی پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی ادبی خدمت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ہمارا آپ کا ساتھ برسوں کا ہے۔ ہم نے کبھی آپ کو ناگزیر اور غیر معمولی حالت کے علاوہ پرچوں کی قیمت میں اضافہ کرتے نہیں دیکھا اس لیے آپ جتنا چاہیں اضافہ کرلیں۔ اب رہ گئے دیگر ساتھی تو اکثریت ہماری ہم خیال ہوگی کہ ہم اپنے کسی دوسرے خرچے پر تو کنٹرول کر سکتے ہیں لیکن نہ تو صفحات میں کمی یعنی مزید کمی گوارہ نہیں کر سکتے ہیں اور نہ پرچوں کی جدائی برداشت کر سکتے ہیں۔ ہمارا بس چلے تو ہم ماہنامہ کی بجائے آپ سے گزارش کریں کہ سرگزشت کو پندرہ روزہ کردیا جائے لیکن چونکہ درمیان میں سسپنس اور جاسوسی مل جاتے ہیں تو ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ اب ہمارے وہ ساتھی جو قیمت نہ بڑھا کر صفحات کم کردینے پر راضی ہیں تو یہ تصویر ذہن میں ضرور رکھیں کہ کمزور اور لاغر سرگزشت کیسا لگے گا۔ اس صورت میں تو اور بھی سچ بیانیاں کم رہ جائیں گی۔ امریکی ڈالر کی بے وفائی اس کے ہر صدر کی طرح ازلی ہے جو ہمارا مقدر ہے تو پھر اس پر واویلہ کیسا! آپ نہ صرف پرچے کا لے آؤٹ بحال کریں، یعنی پہلے والے بتیس صفحات بحال کریں قیمت بھلے نوّے روپے یا سو روپے کردیں۔ سرگزشت کے ابتدائی سالوں میں پرچہ ایک ماہ شائع نہیں ہوا تھا تو ہماری حالت دیوانوں جیسی ہوگئی تھی۔ پرچہ بند ہو کر بہتر وقت کا انتظار تو ادھ مرا کردے گا۔ ''شہرِ خیال'' کے ساتھیوں کا تعارفی صفحہ ہماری تجویز ہے۔ ہماری ایک تجویز یہ بھی ہے کہ ''بیت بازی'' کا بھی موجودہ فارمیٹ تبدیل کیا جائے۔ اس کی بجائے کسی معروف شاعر کے کلام کا انتخاب شائع کیا جائے۔ مزید اگر اسے ہماری زبان درازی نہ سمجھا جائے تو معراج رسول صاحب آپ اپنی سوانح بھی لکھیں تاکہ پتا چل سکے کہ آپ کو موجودہ ادبی حیثیت کن کٹھنائیوں کے بعد ملی۔ آپ کے سفر میں آپ کے شریک بھائی جناب اعجاز رسول مرحوم کا تذکرہ خود آجائے گا۔ ''یہ پُراسرار بندے'' پر زین مہدی کو سلام اور کیپٹن اسفندیار کی شجاعت و جواں مردی کو سیلیوٹ۔''

☆ انیلا طالب کی خیال آرائی گوجرانوالہ سے۔ ''سرگزشت کے ساتھیوں کو تہِ دل سے سلام محبت قبول ہو سرگزشت میرا پسندیدہ رسالہ ہے اگرچہ کبھی اس میں کچھ لکھا نہیں لیکن اس کے شمارے اکثر نظروں سے گزرتے رہتے ہیں۔ آج پہلی بار تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ سرگزشت چھ تاریخ کو ملا سرورق پر لگی جلی حروف کی تحریروں نے ہی خبردار کردیا تھا کہ جب ''شہرِ خیال'' اتنا پُرکشش ہے تو اندر بھی یقیناً بہت کچھ ہوگا۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا اور انکل معراج رسول صاحب سے متفق ہونے کا اقرار کیا۔ کیا کمال کا اداریہ تھا واقعی آئینہ لگا، یک مُٹھی میں کرشن چندر کا تعارف خوب رہا۔ تعریفیں تو بہت سی تھیں ان کی، ہاں ان کے مسلمان ہونے کی خبر نے میری معلومات اور خوشی میں خاصا اضافہ کیا۔ ''شہرِ خیال'' میں بے انتہا ذہین و فطین لوگوں کو موجود پایا جن میں سے نزاہت افضال، رانا محمد شاہد، ندیم اقبال، اعجاز حسین، سید امتیاز حسین بخاری اور پیاری بہن سدرہ بانو ناگوری سرِفہرست ہیں، باقی سب بھی آفتاب کی طرح چمک رہے تھے۔ سب سے پہلے تو شاہ ولایت کو پڑھا، دلچسپ پایا۔ پیاری سسٹر زویا اعجاز نے بھی خوب لکھا۔ فلم نگری میں انور فرہاد صاحب نے معلومات میں خاصا اضافہ کیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' بالکل کہانی کے انداز میں لکھا گیا سفرنامہ ہے، بہت خوب ہے۔ ندیم اقبال کا شکریہ۔''

☆ محمد ایاز راہی کا شکوہ مانسہرہ سے۔ ''میں بھٹکا ہوا راہی۔ ایاز راہی ایک بار پھر ''شہرِ خیال'' کی طرف آن بھٹکا ہے کہ میرے تازہ مضمون ''گنگا جمنی تہذیب'' کو پڑھے بغیر ہی آنکھیں بند کرکے ہوا میں تبصروں کے تیر چلا دیے گئے۔ گویا بے پر کی اڑائی گئیں یعنی بنا کسی ٹھوس دلیل یا مثبت تنقید کے فیصلہ کردیا گیا کہ خشک بے جان اور روکھی پھیکی تحریر ہے۔ سرگزشت کے معیار و مزاج کی بھی پروا نہ کی گئی کہ یہ موقر جریدہ علمی اداروں کی بھی مستقل زینت بنتا ہے۔ اسے باقاعدہ حوالوں کے لیے محفوظ کرکے رکھا جاتا ہے اسی لیے اپنے مضمون کے آغاز میں ہی میں نے جون ایلیا مرحوم و مغفور کے نام اور قول کا حوالہ دیا۔ آگے چل کر علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، غلام بھیک نیرنگ، مرزا رسوا اور سیف الدین سیف جیسے شاعر و ادیب مشاہیر کا ذکر شامل کیا۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ ناقد قلم کار سے زیادہ علم رکھتا ہے پھر بھی یہ ضرور کہوں گا کہ اس تحریر کو خشک ہی ہونا چاہیے تھا ورنہ اس کی افادیت کم ہو جاتی، اُمید ہے میری باتیں گراں نہیں گزریں گی۔ سرگزشت یقیناً ایک ریڑھی والے سے لے کر ایک عالم و ادیب تک کا منظورِ نظر ہے۔ جس کا مقصد ہر کسی کے ذوقِ مطالعہ کو جلا بخشنا ہے۔ معاف فرمائیے گا میرے دوستو! اب میں ایسے مضمون یا تحریر لکھنے سے تو رہا جس کا آغاز کچھ اس طرح سے ہو۔ ''وہ اس قدر خوب صورت، طرح دار لڑکی تھی کہ اسے دیکھتے ہی میری چلتی گاڑی بری طرح لہرائی ڈگمگائی اور جام ہوگئی وغیرہ۔'' میں ایک حقیقت پسند اور مزدور آدمی ہوں۔ میری پانچ کتابیں اردو سے بچی لگن کی گواہ ہیں کوکہ مادری زبان میری پشتو ہے پھر بھی پانچوں اردو کتابوں پر لاہور سے ایم فل ہو چکا ہے۔ ہلکی پھلکی دلچسپ تحریر سے انکار نہیں مگر اچھا علمی ذوق بھی تو ہونا چاہیے اور یہی سرگزشت کی پہچان بھی ہے۔ خود میرے کئی مضامین

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

مستر دہوئے اور کسی اور جگہ لگ گئے کہ سرگزشت کا اپنا ایک معیار ہے۔ یہ بہرحال میں ''معبر خیال'' کے باسیوں سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے ذوق مطالعہ کو نہ صرف برقرار رکھیں بلکہ خوب سے خوب تر بنانے کے جتن کریں۔ ہم جیسے کتابی کیڑوں کی صحیح رہنمائی کریں تاکہ ہم اچھی سے اچھی تحریر پیش کرسکیں۔''

☆ گلاب خان سولنگی نے لاہور کینٹ سے لکھا ہے۔ ''ویسے تو کافی عرصے سے مختلف ڈائجسٹ میں لکھ رہا ہوں لیکن سرگزشت میں یہ میری پہلی کاوش ہے۔ سچ بیانی ہے میں آپ بیتی کا نام دوں گا۔ کچھ اور غلطی بنا ہے اس میں کچھ فرضی نام اور مقام شامل ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ اسے شائع کرکے حوصلہ افزائی ضرور کریں گے۔ واقعات پرانے ہیں مگر قلم بند ابھی کر رہا ہوں۔ بس یوں سمجھیں کہ سرگزشت کے لیے میری طرف سے یہ ادبی گفٹ ہے اسے قبول فرما کر شکریہ کا موقع ضرور عنایت فرمائیں گے (سچ بیانی موصول ہوئی، پرچے سے فارغ ہوکر پڑھ لوں گا)۔''

☆ اعجاز حسین سنجار کا اظہار، نور پور تھل سے۔ ''نیا شمارہ عید کی خوشیاں دوبالا کرتے ہوئے ملا لیکن ادارہ کی طرف سے خصوصی التماس نے دل کمزور کر دیا، ہم کسی حال میں ساتھ چھوڑنے والے نہیں سرگزشت کے جنم سے لے کر آج تک ساتھ نبھا رہے ہیں۔ میری رائے میں قیمت بڑھا دیں۔ میرے سے تبصرے کو رضا احمد اعوان، پروفیسر کیوائے قاسمی، بشریٰ افضل، آفتاب احمد نصیر اشرفی، کساز ہرا، دانش احمد انی، رانا محمد شاہد، نزاہت افضال اور لیس شیخ نے سراہا، دلی شکریہ۔ سید امتیاز حسین بخاری، میں بائی پاس سے گزرتے ہوئے چک 36 کو عقیدت سے دیکھتا ہوں، آپ کی محبتوں کا شکریہ۔ ''یہ پُراسرار بندے'' میں اسفندیار بخاری شہید کے ساتھ تمام جام شہادت پانے والے سپوتوں کے والدین اور لواحقین کے حوصلوں کو سلام پیش کرتا ہوں۔ ''لازوال نغمے'' میں ''ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے'' جب بھی ریڈیو یا ٹی وی پر نشر ہوتا ہے تو آنسو آنکھوں کا ساتھ چھوڑ کر بہنے لگتے ہیں، عجب کیفیت ہو جاتی ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں ندیم اقبال واقعات، جذبات سے بھرپور انداز میں رومانیت اور نازکیت کے ساتھ تسلسل اور روانی سے لکھ رہے ہیں جیسے پیدائشی مستند لکھاری ہوں۔ وہ بھولے بھٹکے مسافر اور غیر یقینی صورتِ حال کا شکار لگتے ہی نہیں ہیں۔ صلاحیت اور کامیابیاں نصیب میں رہیں میں دعاگو ہوں۔ ''ناسور'' میں حالات پُرتفتیش اور الجھتے جا رہے ہیں۔ نئے کردار، پُرخطر مناظر اور سازشوں کے جال بنے جا رہے ہیں۔ عرب ریاستوں میں اسلحہ کی فراوانی بھی حیرانی کی بات ہے اتنی مار دھاڑ، انسانی جانوں کا ضیاع اور حقوق غصب کرنے میں عرب بھی ہمارے قبائلی اور سرداروں کی مثل ہیں۔ سچ بیانیوں میں ''پکار'' نے میرے اور سب کے اندازے غلط ثابت کر دیے۔ ساجد کیسا بے پروا اور ذمہ داری سے بھاگنے والا جوان تھا لیکن صرف ایک لمحے نے کایا پلٹ دی، تمام مشکل مراحل خوش اسلوبی، محنت اور جذبے سے سرشار ہوکر پورے کیے، جسے زندگی کا مقصد سمجھ لیا تھا۔ ''درداں ماری'' میں رانی کی خوب صورتی نے اسے کتنے آزار دیے، آزمائشوں میں ڈالا اور ذہنی جسمانی اذیت سے دوچار کیا، دراصل طاقت ور طبقہ غریب، مجبور اور کمتر لوگوں کی بیٹیوں کو چھابڑی میں بکی سستی چیز سمجھ کر ہر حربہ آزما کر اپنی دسترس میں رکھنے کی تگ و دو کرتے ہیں پھر کھیل اور تماشا کرکے توڑ پھوڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ یہاں تو سرکا سائیں بھی شیطان کا چیلا اور زر کا پجاری نکلا۔ بدحرامی سے ساری قباحتیں اور برائیاں دماغ میں بٹھائے رہا۔ ''دیس پردیس'' میں کیسی خواہشیں اور خوشیاں دل میں چھپائے طویل سفر سے لوٹا لیکن دوست کے روپ میں زر کی ہوس میں باؤلے دشمن کے ہتھے چڑھ گیا، ہم ایسے کتنے واقعات روزانہ پڑھتے اور سنتے ہیں لیکن اعتبار کے ہاتھوں چھوٹے سے لے کر بڑا نقصان تک اٹھاتے ہیں، سبق نہیں سیکھتے، آپ کے پاس دنیاوی دولت ہے یا بہو، بیٹی اور بہن خوب صورت ہیں تو ہر مکتب فکر کا انسان دوستی کا دعویدار ہے۔ یہ اوصاف نہ ہوں تو سلام کا جواب تک نہ ملے گا۔ ''مجبوریاں'' واقعی اصول و قواعد سے ہٹا کر مرضی سے چلاتی ہیں۔ کتنا بھلا چنگا باشرع انسان بھی آنکھیں جھکا کر مصلحتوں کا شکار بن جاتا ہے البتہ جگ ہنسائی اور شرمندگی سے بچنے کے لیے پرانے ماحول اور شناسا لوگوں سے دور بھاگ کر خود کو سرخرو سمجھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ابا میاں مان گئے اور برائی پر مصلحت کا پردہ ڈال کر دنیا سنوار لی۔ میں سمجھتا ہوں ان کا فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق صحیح ہے ورنہ اولاد کی بغاوت سے الٹا حالات بگڑ جانے تھے۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کا سندیسہ کراچی سے۔ ''اس بار سرگزشت کا شمارہ عید کی چھٹیوں کی وجہ سے بہت جلدی مل گیا اور ہماری تو گویا عید سے پہلے ہی عید ہوگئی۔ دو دنوں میں سارا شمارہ پڑھ ڈالا۔ عید سے فراغت کے بعد اب پھر سے اپنے سرگزشت کو لیے بیٹھے ہیں۔ چھ ستمبر کی یادوں کو تازہ کرتا سرورق مصور انکل کی بہترین کاوش رہی۔ رضا احمد اعوان صدارت کی کرسی اور بہترین تبصرے پر مبارک باد کے ساتھ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میری تجویز کی تائید کرتے ہوئے روحی بانو کے حوالے سے کچھ معلومات ہم تک پہنچائیں اب دیکھنا یہ ہے کہ فرہاد انکل ہماری فرمائش کب پوری کرتے ہیں۔ نزاہت افشاں لکھتے اتنی روانی سے ہیں کہ تبصرے کا بھرپور حق ادا کر جاتے ہیں

www.PakiBooks.Site

ویسے نزاہت بھائی میں مایوس نہیں ہوئی تھی مگر مجھے شکوہ ضرور تھا جو کہ اب دور ہو چکا ہے۔ کساز ہرا آپ کا نام بہت یونیک سا ہے پلیز اگلے تبصرے میں اپنے نام کا مطلب ضرور بتائیے گا۔ (کسا چادر کو کہتے ہیں، کساز ہرا یعنی بی بی فاطمہؓ کی چادر)۔ رانا شاہد آپشن کی چوائس ہم خود کھو چکے ہیں۔ حکمرانوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں کچھ برائیاں ہم میں بھی ہیں۔ ''یہ پُراسرار بندے'' پڑھتے ہی زین مہدی کو داد دی، بلاشبہ زندہ قومیں اپنے شہیدوں کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کرتیں۔ ہمارا فخر ہمارا امان چین سکون انہی شہیدوں کی شہادتوں اور ہمارے وطن کی سرحدوں پر ڈٹے ہوئے ہماری فوج کے دم سے ہی تو ہے۔ اسفندیار نے ایک جملہ بہت خوب کہا کہ ''لوگ کہتے ہیں کہ فوج میں بڑی موج ہے میں کہتا ہوں کہ فوج کی وجہ سے ہی لوگوں کی موج ہے'' ہمت، حوصلوں، بہادری اور جرأت شجاعت کے یہ پیکر۔ انکل پلیز میری ایک الجھن دور کردیں اس روداد کی ابتداء میں جو مسجد والا واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کا کوئی تعلق اسفندیار سے نہیں تھا پھر وہ واقعہ بھی ادھورا ہے مجھے یہ بتائیے کہ اس ادھورے واقعے کو بیان کرنے کا مقصد کیا تھا (روداد بغور پڑھیں جس آپریشن میں اسفندیار شہید ہوئے اسی کا ابتدائی حصہ پہلے بیان کردیا گیا ہے پھر مصنف، شہید کی سرگزشت بیان کرتے کرتے اسی منظر پر لوٹ آیا۔) لازوال نغموں کا باکمال تجزیہ کرتی زویا اعجاز چھا گئیں، بہت خوب۔ زویا اعجاز جی، 14 اگست ہو یا 6 ستمبر ہمارا پورا دن انہی بے مثال نغموں کو سنتے ہوئے گزرتا ہے۔ الحمدللہ بچپن سے ہی سارے کے سارے نغمے ازبر ہیں۔ سفرنامہ ہمیشہ کی طرح ونڈرفل، امیزنگ اور لاجواب رہا۔ اداسیاں شوخیاں روٹھنا منانا ہنسنا ہنسانا اور بار بار آنکھوں کا بھیگ جانا نسرین کی یہی ادائیں ٹورنٹو کی فضائیں پُرلطف بنا رہی تھیں۔ بہت اچھے ندیم بھائی ویلڈن۔ ''ناسور'' کی یہ قسط گزشتہ اقساط کی نسبت کچھ بہتر اور پُرتجسس رہی۔ کالیا کی اچانک آمد سے جہاں اطمینان سا محسوس ہوا وہیں را کا کی بے وقت انٹری بہت سے بھیدوں سے پردہ فاش کرتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ ''پکار'' دلچسپ سچ بیانی ہے ایسے سیکڑوں اور لاکھوں گمنام ہیروز ہیں جو ستمبر کی جنگ میں وطن عزیز کا بھرپور دفاع کرتے ہوئے شہادتوں کے رتبے پر فائز ہوئے۔ ساجد کی طرح کچھ خوش قسمت تھے جنہیں پہچان مل گئی اور کتنے ہی تھے جو بے نشان رہ گئے۔ ''انجام'' فضول سی سچ بیانی ہے۔ 5 بہنوں کا بھائی پانے کا شرف پانے والوں کو اس طرح دھتکارا تو نہیں جاتا۔ ''مجبوریاں'' ایک باپ کی عزت کا بیٹی کی کمائی کے عوض سودا کرتی بہت سے ان کہے سوالات چھوڑ گئی۔ ''معبر خیال'' کے صفحے پر ادارے کی مالی مجبوری کا ذکر کیا گیا۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ معراج انکل اور ادارے کے دیگر صاحبان اس سلسلے میں پریشان ہو رہے ہوں گے اس کے لیے کچھ تجاویز حاضر خدمت ہیں۔ نمبر 1 لکھائی باریک کر دیجیے کالم کے اوپر اور نیچے جو خالی جگہ ہوتی ہے اسے استعمال میں لائیے تحریروں اور سچ بیانیوں کے صفحات پر بھی اوپر خالی جگہ ہوتی ہے اس پر بھی غور کیجیے نیز تحریروں کے شروع میں ادارے یا رائٹرز کی طرف سے تمہید لکھی جاتی ہے اسے بھی ختم کیجیے تصویری خاکے کم سے کم کردیں اور اشتہارات زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم جس رسالے کے ستر روپے ادا کرتے ہیں اس میں 23 روپے ہاکر اپنے پاس رکھتا ہے اور اس سے پہلے ڈسٹری بیوٹر اپنا رکھ چکا ہوتا ہے تو آپ کے پاس کیا پہنچتا ہے۔ 40 یا 42 روپے آپ ڈسٹری بیوٹر اور ہاکر سے بات کر کے ہاکر کا منافع دس روپے کردیں۔ یہ سیدھی سیدھی آپ کے پاس 13 روپے کی بچت ہوگی۔ ان روپے کی وجہ سے ہاکر غریب نہیں ہو جائے گا کیونکہ صرف آپ کا رسالہ ہی اس کا ذریعہ روزگار نہیں ہے وہ اخبار اور دیگر رسائل سے بھی پیسے کھینچ رہا ہے ان کو بتائیے کہ آپ کی بقاء میں ہی ان کی بقاء ہے تیسری اور آخری بات یہ کہ رسالے کی قیمت 100 روپے کردیں۔ (لکھائی اگر باریک کی گئی تو پڑھنے میں دشواری ہوگی۔ کالم کے اوپر نیچے جو جگہ ہوتی ہے وہ کٹنگ کے لیے ہوتی ہے اگر وہ جگہ سادہ نہ ہو تو کٹنگ میں دشواری ہوگی۔ کبھی بغور صفحہ کو دیکھیں، کچھ کٹنگ اوپر تو کچھ نیچے ملیں گی۔)''

☆ آرٹسٹ محمد عامر ساحل ڈیرہ اسماعیل خان سے رقمطراز ہیں۔ ''ادارہ اور تمام پڑھنے والوں کو میرا سلام، تمام دوستوں کے تبصرے پسند آئے۔ خاص کر کے قیصر خان بھرکا، جناب قیصر بھائی یاد کرنے کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ آج اتنے ماہ بعد خط لکھنے کی جسارت فقط اس لیے کہ سرگزشت شمارے کی اشاعت اور کاغذ کے بحران پر اپنی رائے دینا ضروری سمجھا۔ میں اور تمام قارئین کی یہی التجاء ہوگی کہ صفحات کی کمی مزید نہ کی جائے اور اگر ممکن ہو سکے تو پہلے کی طرح ہو جائے۔ اس کی قیمت جو مناسب ہو بڑھا دی جائے تاکہ سرگزشت کا معیار برقرار رہے جو اس کی پہچان ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں اس بار نسرین کا ذکر ابتداء سے لے کر انتہا تک ہے۔ سفرنامہ اب تو سفرنامے سے زیادہ ایک خاموش اور بے ضرر محبت کی داستان لگ رہی ہے۔ اس سے اور کوئی محظوظ ہو نہ ہو میں بہت زیادہ محظوظ ہو رہا ہوں۔ ندیم بھائی کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کو مزید عروج اور ترقی نصیب فرمائے (آمین)۔''

☆ محمد ہمایوں تنولی کا تبصرہ اسلام آباد سے۔ ''ماہ ستمبر کا شمارہ بہت خوب صورت ہے۔ سرورق نہایت شاندار ہے۔ ''معبر خیال'' میں رضا احمد اعوان کا خط بہت لمبا تھا لگتا ہے کہ موصوف خط لکھنے میں ماسٹر ہیں۔ ان کے بعد رانا محمد شاہد نے بھی لمبا ہی خط لکھا۔ بھائی خط مختصر لکھا کریں دوسروں کو بھی 'معبر خیال' میں داخل ہونے کی جگہ دیں۔ جس طرح ارم ناز نے چھوٹا خط لکھا۔ پڑھ کر مزہ آگیا۔ کہانیوں میں

www.PakiBooks.Site

حسبِ معمول ''ناسور'' پڑھی۔ شہزادہ عرب ممالک میں بھی یہاں کی طرح دشمنیاں پال رہا ہے۔ ''فردوس برزمین'' ابن عنقا کی بہت زبردست کہانی تھی۔ ہر بات تفصیل سے لکھی تھی۔ ''یہ پراسرار بندے'' بہت اچھی تھی۔ واقعی جب تک ہماری فوج جاگتی رہے گی ہم میٹھی اور پرسکون نیند لیتے رہیں گے۔ ''بے چین روح'' وسیم اشرف کی اچھی کہانی تھی۔ ''شمشال سے نورنو'' تو سرگزشت کی جان ہے۔ لگتا ہے کہانی کے کرداروں کے ساتھ ہم خود سفر کررہے ہیں۔ ''پکار'' احمد نے بہت محنت سے لکھی ہے۔ سیدھی دل میں اتر گئی۔ ''درداں ماری'' کی کہانی پڑھ کر اپنی والدہ یاد آگئیں۔ کہانی پڑھ کر لگا کہ کہانی میری ساس صاحبہ کے حالات جیسی ہے۔ باقی ''مجبوریاں'' پڑھ کر اپنی مجبوریاں یاد آگئیں۔ ''بے چاری'' بھی بہت اچھی تھی۔ ''خوش اخلاق'' اور ''انمول محبت'' اپنے انجام کو پہنچ گئیں۔ دعا کریں عمران خان واقعی پاکستان میں تبدیلی لائیں اور مگرمچھوں اور ڈاکوؤں کو اڈیالہ اور مچھ جیل بلوچستان کی سیر کرائیں۔''

☆ حنیف ادیب لاہور سے۔ ''اپنی تحریر ممتاز مزاحیہ شاعر سید ضمیر جعفری بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ ضرور شائع فرمائیں گے جس طرح آج کل آپ دیگر شعراء کے متعلق اقتباس شائع کررہے ہیں۔ یہ میری اپنی تحریر ہے۔ دو ماہ قبل ایک منظوم تحریر ''برہا کی ماری'' ارسال کی تھی۔ مایوسی ہوئی کہ نہیں چھپی۔ اُمید ہے آپ ضرور شائع فرمائیں گے۔ اچھی تحریر ہے اور اُمید ہے قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔ (سرگزشت میں منظوم کہانی یا روداد شائع نہیں ہوتیں ایک اہم بات، خط ذرا خوش خط لکھا کریں۔ الفاظ کی بناوٹ پڑھنے میں اپنا کردار رکھتی ہے) تبصرہ کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ سفرنامہ بدستور دلچسپیاں لیے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ وسیم بن اشرف کی تحریر ورجینا وولف کے متعلق پڑھی۔ وہ اب بیرونِ ملک کے مایہ ناز شعراء کی داستانیں پیش کررہے ہیں جو اپنے اندر معلومات کی ایک دنیا سمیٹے ہوئی ہیں۔ یہ ایک دلچسپ اور معلوماتی سلسلہ ہے۔ نیا شمارہ ابھی زیادہ نہیں پڑھ سکا۔ بیت بازی کے صفحے پر ممتاز اشعر کا شعر اچھا لگا۔ بعض دیگر اشعار بھی اچھے ہیں۔ بندہ نے ایک تجویز بھیجی تھی کہ علمی آزمائش ختم کی گئی ہے تو اب ایک شعر کا سلسلہ شروع کردیں اور شاعر کا نام پوچھیں۔ اُمید رکھتا ہوں اس پر آپ ضرور غور فرمائیں گے۔ (بہت عمدہ تجویز ہے، نوٹ کرلی)۔''

☆ عرفان فاروق لاہور سے لکھتے ہیں۔ ''میں اس سے قبل بھی مختلف پرچوں میں لکھتا رہا ہوں اور ان مدیران کی مہربانی ہے کہ وہ میری تحریروں کو اپنے صفحات پر جگہ دیتے رہے ہیں پھر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ میں بھی تحریروں کے لیے وقت نہ نکال سکا اور کالم نگاری کرنے لگا۔ آج کل مختلف ملکی اخبارات میں کالم لکھتا ہوں چونکہ یہ ایک ہی نشست میں مکمل ہوجاتا ہے اور خلقِ خدا کو کچھ فائدہ بھی مل جاتا ہے۔ جو آپ بیتی (سچ بیتی) آپ کو ارسال کررہا ہوں یہ ٹھنڈی راکھ میں وہ چنگاری ہے جو ہر وقت بے چین رکھتی ہے اور کسی کروٹ بجھ نہیں پاتی، اگر آپ کے معیار پر پورا اترے تو میرے موبائل پر اطلاع دے دیجئے گا اور یہی موبائل میرے رابطے کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر معیار پر پورا نہ اترے تب بھی مطلع فرمایئے گا۔''

☆ اعجاز حسین لدھیانہ کی تشریف آوری کچا کھوہ خانیوال سے۔ ''سرگزشت کیا ہے؟ مجھے سمجھ نہیں آتا کیا کہوں سرگزشت ہمارے لیے جسم میں دوڑتے ہوئے خون کی مانند ہے۔ ہر مہینے ڈھونڈ کے سطر سطر پڑھنا اور اپنی روح میں جذب کرنا بہت ہی اچھا لگتا ہے مگر غم روزگار کہیں بھی رکنے نہیں دیتا ہے۔ کبھی کوئی شمارہ دستیاب ہوا تو اس کو رکھا اور ورق ورق پڑھ کے اپنی تشنگی بجھانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ (آپ نے عرصہ بعد تبصرہ لکھا۔ حضور! پہلے کی طرح پابندی سے تبصرہ بھیجیں) جی چاہتا ہے سب سے پہلے ان ہزاروں، لاکھوں شہیدوں کی روحوں کو سلام عقیدت پیش کروں جن کی بدولت یہ پیارا وطن موجود ہے۔ ان میں وہ بھی لوگ شامل ہیں جن میں عام عوام سے لے کر ہمارے بہادر فوجی جوان، ہمارے وہ شہداء جنہوں نے ہر اس وقت اپنے لہو سے اس پاک سرزمین کی مانگ سجائی جب جب جہاں جہاں ضرورت پڑی۔ ہزاروں فوجی جوانوں کے ساتھ مجھے سب میرین غازی کے ترانوے شہداء بھی شدت سے یاد آرہے ہیں جنہوں نے یہاں سے ہزاروں میل دور انڈیا کی بندرگاہ وشاکاپٹنم کو مائنز کی مدد سے بند کرکے طیارہ بردار جہاز وکرانت کو محصور کرنے کے بعد واپسی کے سفر میں مائنز سے ٹکرانے کے نتیجے میں جامِ شہادت نوش کیا۔ اللہ پاک ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، (آمین)۔ اب آتے ہیں سرگزشت کے شمارے کی طرف جہاں سرورق پر اسفندیار بخاری شہید نظر آئے۔ ایسے شہداء دھرتی کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ معراج رسول صاحب کو سلام ان کی مختصر کہانی دل کو چھوگئی ہے۔ واقعی ہم اپنے قول وفعل کا محاسبہ کرنا شروع کردیں تو آدھے سے زیادہ مسائل تو ویسے ہی ختم ہوجائیں گے۔ یک صفحی سرگزشت میں نواب بہادر یار جنگ کے بارے میں پڑھا ایسی معتبر ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ''مہرِ خیال'' میں ہمارے پیارے رضا احمد اعوان چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے نظر آئے۔ گریٹ جناب مبارک باد قبول فرمائیں۔ پروفیسر اے کیو قاسمی، قیصر خان بشریٰ افضل، ایرج فاطمہ، سید امتیاز حسین بخاری، محمد ظفر اللہ ضیاء، آفتاب احمد نصیر اشرفی بھی اپنے جاندار تبصروں کے ساتھ موجود تھے اور پرانے دوست رانا شاہد، سدرہ بانو ناگوری، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، نزاہت افشال اور

www.PakiBooks.Site

اویس شیخ صاحب، سب دوست ہی جانِ محفل ہیں۔ اللہ پاک سب کو خوش وخرم اور آباد رکھے۔ اعجاز حسین سٹھار آپ کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ آپ نہ ہوں محفل میں تو محفل کا رنگ پھیکا پھیکا لگتا ہے۔ ''یہ پُراسرار بندے'' میں کیپٹن اسفندیار بخاری شہید کا تذکرہ اور احوال ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ وطن عزیز کی خاطر قربانیوں کے چراغ جلائے رکھنا ہے اور طاغوتی طاقتوں کو بتانا ہے کہ اس دھرتی کے بہادر سپاہی حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دینِ اسلام کے نام پر قائم اس عظیم ملک پاکستان کے لیے ہمیشہ کفن پہنے نظر آئیں گے اور قربانیوں کی عظیم داستانیں رقم کرتے رہیں گے۔ ''لازوال نغمے'' انتہائی عمدہ اور شاندار تحریر ہے۔ ''سپر پرفارمر'' میں ایسی ایسی نابغہ روزگار ہستیوں کے بارے میں پڑھ کے اچھا لگا۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جو کہ بغیر کسی سفارش اور مدد کے شہرت کے آسمان پر سورج بن کے چمکیں۔ ''بے چین روح'' اچھی تحریر تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اپنے عروج پر ہے۔ ندیم اقبال صاحب آپ کی تحریر میں اتنی روانی اور سلاست ہے کہ آپ کی تحریر کو پڑھتے ہوئے کم از کم مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ ساتھ ہوں۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔ خوش وخرم اور آباد رہیں، (آمین)۔ ''طمع چہرہ'' اچھی تحریر تھی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ قتل کبھی بھی نہیں چھپتا ہے اور کسی نہ کسی روز عیاں ہوجاتا ہے۔ ''فردوس بریں'' کے ساتھ ابن عنقا صاحب کافی دنوں بعد نظر آئے۔ ''ناسور'' بھی اچھی جارہی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب سے گزارش ہے کہ اس کی رفتار تھوڑی سی تیز کردیں۔ سرورق کہانی ''پکار'' وطن کی محبت اور قربانی سے لبریز ہے اور ہم سب کے لیے مشعلِ راہ ہے کہ جب کبھی وطن پر مشکل وقت آن پڑے تو کبھی بھی پیچھے مت ہٹیں کیونکہ یہ عظیم ملک ہے تو ہم ہیں۔ ''درداں ماری'' ہمارے معاشرے کے بھیانک روپ کی داستان ہے۔ جہاں غریب آدمی کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ غریب کے لیے ہر موڑ پر مختلف شکلوں میں بھیڑیے موجود ہیں۔ ''دیس پردیس'' لالچ میں اندھے ہونے والوں کی داستان ہے کہ کیسے غریب دوست کو جو کئی سال بعد واپس آیا اپنے دیس میں مگر لالچ سے بھرے دوست نے چند سکوں کی خاطر مار ڈالا۔ ''مجبوریاں'' ایک دل گداز داستان واقعی مجبوریاں انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔ ''بے چاری'' بھی ہمارے معاشرے کے ہی کردار ہیں۔ ''خوش اخلاق'' یا اللہ یہ کیا ایسے ایسے کریکٹر بھی ہوتے ہیں ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔ ''انمول'' بھی عمدہ تحریر ہے۔ ''انجام'' اچھی تحریر تھی۔ واقعی آدمی کبھی کبھی پس کے رہ جاتا ہے۔ ''شہ مات'' اس ماہ کی شاندار تحریر ہے۔ ادارہ کی طرف سے جو التماس کی گئی ہے ہم ادارہ کے ساتھ ہیں بس سرگزشت کی محفل سجی رہے، کوئی بات نہیں بے شک قیمت بڑھا دیں، جتنی مناسب سمجھیں۔''

☆ نصر اللہ خان داؤخیل ضلع میانوالی سے لکھتے ہیں۔ ''سرگزشت ستمبر 2018ء نظروں سے گزرا۔ آپ نے رسالے میں 3 آپشن دیئے ہیں تو میری رائے میں قیمت میں اضافہ کردیں۔ صفحات کم نہ کریں اور اشاعت کو سرے سے معطل کرنا ہمارے ساتھ زیادتی ہے۔ اُمید ہے قیمت بڑھا کر اشاعت جاری رکھیں گے۔ کسی بھی شمارے میں ذرہ حیدرآبادی کے متعلق کچھ لکھیں اگر شائع ہوچکا ہے تو مہینا اور سال بتادیں کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ لیں گے۔ (ذرہ حیدرآبادی کی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ ان پر کسی اور نے کبھی کچھ بھی نہیں لکھا) حزیں قادری اور اکمل کے بارے میں لکھ کر انور فرہاد صاحب نے لکھنے کا حق ادا کردیا۔ اگر کسی کے پاس سرگزشت کے پرانے شمارے مثلاً 1990ء سے 2000ء تک جتنے بھی ہوں میں لینے کے لیے تیار ہوں آپ بتادیں میں پتا اور رقم بھیج دوں گا یا بذریعہ ڈاک بھیج دیں میں وی پی لے لوں گا۔ آپ کی اور رسالے بھیجنے والے ادارہ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اچھی جارہی ہے۔ زویا اعجاز کی تمہر نغموں کے سلسلے میں اچھی تحریر تھی۔ سید احتشام کی تحریر ''جرم وسزا'' بھی اچھی ہے۔ آخر میں ایک بار پھر کہوں گا کہ قیمت بڑھا دیں اور صفحات یہی رکھیں آپ کی مہربانی ہوگی۔''

☆ سید امتیاز حسین بخاری کا کارنامہ سرگودھا سے۔ ''آداب تسلیمات کے بعد تحریر کرنے کا متمنی ہوں کہ عید کی چھٹیوں کے باوجود بھی ستمبر کا سرگزشت مقررہ تاریخ پر مل گیا تھا۔ شمارہ دیکھ کر بہت ہی بے پایاں مسرت ہوئی۔ دیدہ زیب دلکش سرورق دیکھ کر یقین ہوگیا تھا یعنی خوبرو ترین چہرہ دیکھ کر ہی میں جان گیا تھا کہ اب کی بار طویل ترین معلوماتی مواد پڑھنے کو ملے گا، مطالعہ کرتے ہوئے میری یہ بات درست نکلی۔ سب سے پہلے آپ کا اداریہ پڑھا جو اپنا احتساب فکر کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔ ''مہرِ خیال'' میں داخل ہوا تو دریا خان بھکر کے جنگ جو علوی اعوان قبیلہ کے چشم وچراغ ملک رضا احمد اعوان مسندِ صدارت پر جلوہ افروز نظر آئے اور اپنے بھرپور جامع تبصرے کی روشنی بکھیر رہے تھے۔ یاد آوری اور میری تحریریں پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ قیصر خان بھکر کا یاد کرنے کا شکریہ۔ ''سیاسی لوٹا'' سرگودھا کا اصلی باشندہ نہیں ہے باہر سے قیام پذیر ہوا۔ محترمہ کساں ہرانے مجھے سلام نوازا ہے اور مہرِ خیال کی رونق قرار دیا ہے شکر گزار ہوں۔ تمام دوستوں کے خطوط بھرپور تبصرے سے لبریز تھے۔ رانا محمد شاہد کا تبصرہ جامع ترین تھا۔ ''پراسرار بندے'' زین مہدی کا خوب صورت ترین معلوماتی شہ پارہ ہے جو بخاری قبیلہ کے قابلِ فخر ڈاکٹر سید فیاض حسین بخاری کے فرزندِ جلیل پیکرِ شجاعت وشہادت کیپٹن سید اسفندیار بخاری شہید ایئر بیس پشاور مڈھ بیر 18 اکتوبر 2015ء بروز جمعۃ المبارک کی معلوماتی داستان ہے مگر ان کے خاندانی پس منظر پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔ شمارہ ستمبر کا انمول تحفہ ''پکار'' ہے

www.PakiBooks.Site

جسے احمد فیصل آباد نے سپرد قلم کیا ہے۔ ایثار و قربانی محب الوطنی کا نادر مرقع ہے اور فرض کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے جان نثار کردی مگر وطن کی عظمت پر آنچ نہ آنے دی اور اپنے پیار کو ٹھکرا دیا۔ یہاں شجاع سپاہیوں کی قربانیوں کا ثمر ہے کہ آج پاکستان کا وجود باقی ہے، مستحکم و قائم ہے۔ ''بیت بازی'' میں نظر احمد کراچی اور غلام حسن کراچی ڈاکٹر سیدہ محسنہ نقوی روبینہ ناز قابل ذکر اور لائق مطالعہ ہیں۔ ''لازوال نغمے'' میں زویا اعجاز نے کمال تحریر سے آشنا کیا ہے اور میرے شہر سرگودھا کا ذکر ناصر کاظمی کے نغمے سے کیا ہے۔ زندہ دلوں کا گہوارہ ہے سرگودھا میرا شہر۔ پڑھ کر بہت ہی بے پایاں خوشی ہوئی۔ قلم نگری میں ''سپر پرفارمر'' اس بار محترم انور فرہاد لے کر حاضر ہوئے ہیں جو ان کی محنت شاقہ اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے اور معلومات کا بحر بیکراں ہے۔ سفر کہانی میں ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں اس بار ندیم اقبال منفرد اور عظیم انسان دوست کے روپ میں نظر آئے۔ ایسا رومانی ماحول تشکیل دیا کہ پڑھتے پڑھتے مجھ پر نیند غالب آگئی دوسری قسط تازہ دم ہو کر اور چائے پی کر پڑھی۔ بہت ہی زیادہ لطف اندوز ہوا۔ ''فردوس بریں'' ابن عنقا کی شمالی علاقہ جات کی جنت نظیر وادیوں کی لفظی تصویر اور شاندار خوب صورت عکاسی تھی یوں محسوس ہوا کہ میں بھی عالم تخیلات و تصورات میں سیر کر رہا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ سرگزشت کی قیمت میں اضافہ کر دیں صفحات کم نہ کریں تاکہ روشنی کا سفر جاری و ساری رہے اور اس میں تعطل نہ آئے۔ ہمیں سرگزشت ملتا رہے اور ہم مطالعہ کرتے رہیں۔ کاغذ کا بحران ختم ہوتے ہی سرگزشت روایتی انداز میں شائع کریں۔ اشاعت معطل ہرگز نہ کریں یہ میری مخلصانہ بے لوث رائے ہے۔''

☆ نزاہت افشاں گاؤں مہورہ تحصیل فتح جنگ سے لکھتی ہیں۔ ''اداریہ ہمیشہ کی طرح سبق آموز رہا۔ بیٹیوں کو بوجھ سمجھنے والوں کے لیے ان چند سطروں میں عبرت کی طویل داستان موجود ہے۔ ''شہید تحریک'' زبردست تعارف رہا۔ نواب بہادر یار جنگ بہت مخلص کارکن تھے۔ عوامی رائے اور ریاستی عناصر کو قیام پاکستان کی طرف مائل کرنا ان کا خاص کارنامہ تھا۔ ''یہ پراسرار بندے'' زبردست تحریر تھی۔ اسفندیار بخاری ہمارے وطن عزیز کا فخر تھا جس نے صرف 28 سال کی عمر میں اپنے آپ کو ملک و قوم کے لیے قربان کر دیا۔ ہمیں تو بہت فخر ہے اس بات پر کہ اسفندیار بخاری ہمارے ہی ضلع سے تعلق رکھتے تھے۔ ''لازوال نغمے'' میں پنجابی نغموں کے ترجمے بھی کیے ہماری قومی زبان کے کئی اہم نغمے شامل کیے جا سکتے تھے۔ ''بے چین روح'' وسیم بن اشرف عالمی ادب سے اچھی تحریر لائے۔ ''فردوس برزمیں'' اچھی تحریر تھی۔ ''ناسور'' میں کردار بڑھتے جا رہے ہیں اسی لیے کشش کھو رہی ہے۔ ''پکار'' پاک فوج کے شیر دل مجاہدوں کی ترجمانی کرتے میں خوب کامیاب رہی۔ ساجد نے احمد اور اپنے گھر والوں کے خدشات کے برعکس خود کو نئے سانچے میں ڈھالا اور آخر صرف چند لمحوں کی بات تھی جب ان نے اپنے وطن کی خاطر اپنے پیار کو چھوڑا اور خود کو ہمیشہ کے لیے امر کر گیا۔ ''دیس پردیس'' میں فاروق کی سنگدلی نے خیام کو خام کر ڈالا۔ فاروق جیسے لوگ دوستی کے مقدس رشتے پر دھبا ہیں۔ ''مجبوریاں'' میں محض پیسے کی خاطر اپنے آپ کو بازاری عورت بنا کر مدیحہ نے کیا کارنامہ سرانجام دیا؟ اسلام تو عورت کا سب سے بڑا محافظ ہے۔ ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ''بے چاری'' میں زرغونا کے ساتھ وہی ہوا جو کہ عموماً امیروں کا وتیرہ ہوتا ہے۔ زرغونا کے جذبہ ممتا کو سلام۔ ''خوش اخلاق'' میں انتخاب خوش اخلاق نہیں بلکہ ابلیس کا کارندہ تھا۔ ایسے لوگوں کو انسان کہنا بھی انسانیت کے نام پر دھبا ہے۔ ایسے لوگوں کا شمار ''طبقہ وحوش'' میں ہوتا ہے۔ ''انجام'' میں راشد کے گھر والوں کے سلوک ناروا نے اس کو نفسیاتی مریض بنا دیا اور یوں وہ بے چارا ایسے انجام سے دوچار ہوا۔ ''انمول'' سبق آموز تحریر تھی۔ خصوصاً اختتام دردناک تھا۔ ماں پھر بھی ماں ہوتی ہے اولاد چاہے کتنی بھی بری ہو اس کی ممتا اولاد کو پریشان دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ ''شہ مات'' میں گریز نے غلطی سے اپنی جوان بیوی کو موت کے منہ میں دھکیلا اور آخر اسی پچھتاوے نے اس کی جان لے لی کاش وہ تھوڑی سی تحقیق کر لیتا تو اپنی اولاد کو ماں سے محروم نہ کرتا۔ ''معبر خیال'' میں عمدہ تبصرے کے ساتھ رضا احمد اعوان سرفہرست تھے۔ قیصر خان، آفتاب نصیر اشرفی اور رانا محمد شاہد یاد کرنے کا بہت شکریہ۔ بشریٰ افضل میری پیاری سسٹر پورے ایک سال بعد حاضر ہوئیں۔ کسا زہرا یاد کرنے کا شکریہ۔ سدرہ بانو ناگوری، سیروں خون بڑھ گیا ارے واہ پھر کچھ خون عطیہ کر دو نا سسٹر۔ اویس شیخ، سید امتیاز حسین اور محمد اسماعیل اجاگر کے تبصرے بہترین تھے۔ روبینہ نفیس انصاری سسٹر دوست بسم اللہ جی آیا نوں۔ آخر میں ایک تصحیح کرتا چلوں کہ ہادیہ ایمان ماہا ایمان نے بیت بازی میں جو شعر لکھا، اس کا مصرع اول درست نہ تھا یہ شعر ہے استاد قمر جلالوی کا اور درست یوں ہے کہ ''اب نزع کا عالم ہے مجھ پر تم اپنی محبتیں واپس لو۔ جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اتارا کرتے ہیں۔ آخر میں ''شمشال سے ٹورنٹو'' کے متعلق اتنا کہوں گا کہ یہ تحریر ندیم اقبال کا نام ہمیشہ قائم رکھے گی۔''

☆ قیصر خان کا تبصرہ بھکر سے۔ ''اداریہ میں انکل نے کہانی کم سچ زیادہ بیان کیا ہے بلکہ مکمل سچ ہے۔ بہت باتیں کرنے والے ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتے ہیں۔ یک صفحی سرگزشت میں شہید تحریک نواب بہادر یار جنگ کے بارے میں پڑھنے کو ملا، اتنے عظیم لیڈر کو بالکل نہیں جانتا تھا اور وہ نواب ہو کر بھی دین دار تھے۔ ''معبر خیال'' صدارت ہمارے ضلع بھکر کے ادبی شخصیت کے حصے میں آئی، بہت مبارک باد۔ تبصرہ اچھا لگا اس کے ساتھ تمام تبصرے اچھے لگے۔ پرچے کے بارے میں اتنا ہی کہنا ہے صفحات کم کر کے قیمت بڑھا دیں۔ پرچے کی سیل کم ہو جائے گی کیونکہ لوگ کتابوں کا شوق کم رکھتے ہیں۔ پہلی کہانی ڈاکٹر ساجد کی جگہ پر زین مہدی تھے بہت باکمال خراج

www.PakiBooks.Site

عقیدت پیش کیا ہے واقعی اسفند شہید شہادت کے اعلیٰ مرتبے کے لیے جی رہا تھا۔ اس جیسے اور بہت سے ہیروز کی وجہ سے دشمن ہم کو بری نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ زویا اعجاز صاحبہ اس بار لازوال نغمے جیسا لازوال مضمون لائی ہیں۔ انکل انور فرہاد صاحب قلم نگری سے اچھوتے کردار والے لوگ لے کر آئے تھے، پڑھ کر مزہ آگیا بس ایک شکایت ہے کہ اداکارہ نیلی کے بارے میں کب لکھیں گے؟ ''شمشال سے ٹورنٹو'' بہت اعلیٰ پائے کی قسط تھی۔ بہت اعلیٰ انکل جی۔ ابن عنقا صاحب نے بھی بہت خوب صورت سفرنامہ لکھا ہے۔ پاکستان خوب صورت ملک ہے بس حکمران اچھے مل جائیں تو دنیا کا ہر بندہ آنا چاہے گا۔ ''ناسور'' اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ ''پکار'' سچ بیانی میں ساجد جیسے فوجیوں کی وجہ سے ہم ارض پاک میں سکون سے سوتے ہیں۔ ''درداں ماری'' میں مکافات عمل کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ''انمول'' یہ کہانی تو ہر گاؤں ہر شہر قصبہ میں آپ کو مل جائے گی لیکن سبق کوئی سیکھ رہا ہے؟ ''شہ مات'' اس دور میں ہر بندہ خود سے فیصلہ کر کے کہتا ہے وہ ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کو کوئی بھی نہیں مان رہا کہ وہ ذات جو فیصلہ کرنے پر قادر ہے وہ معاف کر رہا ہے اور انسان خود سے بڑا ابن جاتا ہے۔''

☆ رانا محمد شاہد کی تشریف آوری بورے والا سے۔ ''ستمبر کا سرگزشت عید سے ایک روز پہلے بہاولپور کے شاہی بازار سے خریدا۔ معراج رسول صاحب کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہمارے معاشرے کا حقیقی آئینہ بیان کرتی نظر آتی ہیں اس دفعہ بھی انہوں نے جہاں یہ بات بتائی کہ بیٹے کی نسبت بیٹی نے ماں سے محبت کا حقیقی بلکہ عملی اظہار کیا۔ وہیں یہ تلخ حقیقت بھی سامنے لائے کہ ہم نہ صرف اپنی اقدار و ذمہ داریوں سے دور ہو رہے ہیں بلکہ اپنے پیارے رشتوں سے محبتیں بھی محض دکھاوے کی رہ گئی ہیں۔ یک صفحی سرگزشت ہر دلعزیز شخصیت اور شعلہ بیاں مقرر بہادر یار جنگ کی تھی جنہوں نے پاکستان کی محبت میں نہ صرف اپنی جاگیر دی حتیٰ کہ اپنی جان بھی دے دی۔ وہ اپنی جاگیر و دولت کی بدولت نواب کہلاتے تھے مگر اپنے مقصد یعنی پاکستان کے حصول کے لیے انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ آج کے ہمارے حکمرانوں میں شہید تحریک جیسی تھوڑی سی خصوصیات بھی ہیں؟ کیا آج کے حکمران پاکستان کے لیے اپنی کوئی چیز قربان کرنے پر تیار رہتے ہیں یا کہ اس ملک کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ ''معبر خیال'' میں صدارت کے لیے رضا احمد اعوان کو بہت مبارک باد۔ آپ نے صحیح لکھا۔ والدین سے بچھڑنے کا دکھ کیا ہوتا ہے؟ یہ وہی بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے جو اس کرب سے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے والدین کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کو صبر عطا فرمائے (آمین)۔ ادارے نے آراء مانگی ہے تو عرض ہے کہ اگر بہت ناگزیر ہے تو قیمت میں اضافہ کر دیں کیونکہ صفحات میں کمی اور اشاعت کی عارضی معطلی سرگزشت کے چاہنے والوں کے لیے قابل قبول نہ ہو گی۔ بشریٰ افضل! بڑے عرصے بعد نظر آئیں۔ آپ نے صحیح لکھا۔ رمضان المبارک کی بابرکت ساعتوں میں ابو اللہ کے پاس چلے گئے۔ اللہ تمام پڑھنے والوں کے والدین جو اس دنیا سے جا چکے ہیں، اپنی جوار رحمت میں جگہ دے، (آمین)۔ سید امتیاز حسین بخاری! آپ کے ماموں کے لیے بھی دعا گو ہوں۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی! آپ نے ٹھیک لکھا۔ سدرہ بانو ناگوری! سیاست اپنے اپنے مفادات کے حصول کا نام بن چکا ہے اور جہاں سب کچھ اپنے اپنے مفادات ہوں وہاں بڑے دل کا مظاہرہ کون اور کیسے کرے؟ اگر ہارنے والا جیتنے والے کو تسلیم کر لے اور مبارک باد دے تو ہمارا سیاسی کلچر ہی تبدیل ہو جائے۔ نزاہت افشاں! ''معبر خیال'' کے ساتھیوں کے ساتھ خوب نوک جھوک کرتے نظر آتے ہیں۔ میں ''معبر خیال'' کے ان تمام ساتھیوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ابو کے لیے تعزیت کی۔ اتنی چھوٹی عمر میں ایسی بہادری! وطن عزیز کے بہادر سپوت اسفندیار بخاری کی جرأت و بہادری کو سلام۔ پاکستان کی تاریخ ان دلیر سپاہیوں کی ہی مرہون منت ہے۔ حال ہی میں خبر ملی ہے کہ 1965ء کی جنگ کے ہیرو سپاہی مقبول حسین انتقال کر گئے۔ جی ہاں وہی سپاہی مقبول حسین جنہوں نے 40 سال بھارتی قید میں گزارے (مکمل زندگی نامہ سپاہی مقبول حسین کا شمارہ مئی 18ء میں آچکا ہے)۔ ''لازوال نغمے'' 1965ء کی جنگ کے حوالے سے زویا اعجاز کی معلوماتی تحریر تھی۔ تاہم کچھ تشنگی محسوس ہوئی۔ انور فرہاد نے نامور گیت نگار پر دلچسپ تحریر لکھی۔ یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ حزیں قادری کے ٹاپ ٹین پنجابی گیت اپنے وقت کے ہی نہیں آج کے بھی مقبول گیت ہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ندیم اقبال کے سفر نامے میں تاریخ، جغرافیہ اور دیگر معلومات باہم موجود ہیں اسی لیے تو قارئین کی بھرپور دلچسپی لیے ہوئے ہے۔''

☆ وکیل الرحمٰن نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت کی قیمت میں اضافہ کر دیجیے۔ مہنگائی کی وجہ سے یہ مناسب ہو گا۔ یہ قدم اٹھانا ضروری ہے۔ اب آپ کا فیصلہ جو مزاج یار میں آئے۔ سرگزشت ایک معلوماتی، ادبی رسالہ ہے۔ مطالعہ بہت ضروری ہے کتاب بہترین رفیق ہے۔ ایک گزارش ہے کہ ڈاکٹر اقبال ہاشمانی کا تحریر کردہ مضمون کراچی پلازا کوارٹرز، جوبلی سینما میں اضافہ کر دیں پلیز۔ ہم بھی وہاں کے رہائشی تھے۔ بچپن، لڑکپن، جوانی وہاں گزاری ہے کہ ریوالی سینما سے کو نور کی طرف جاتے ہوئے فلم اسٹار رخسانہ (چیکو) کا گھر تھا۔ سعید منزل کے پاس کھیر ہاؤس کے قریب ڈاکٹر قدیر خان کی بھی رہائش تھی۔ جاوید شیخ، قباچہ بھی پلازا کوارٹرز میں نظر آتے تھے۔ کوتوال بلڈنگ 2 کے ہم بھی طالب علم تھے۔ غالباً ڈاکٹر قدیر خان نے بھی یہیں سے پڑھا ہے۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

غلام نبی، پشاور۔ ریحان احمد، ملتان۔ راشد علی خان، لاہور۔ محمد ارشد، بھکر۔ نصیر احمد، لیہ۔ زاہد خان، مانسہرہ۔ خالق داد، گجرات۔

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

مرگِ برگ

زویا اعجاز

الفاظ کے نگینوں سے مرصع خیالات کی حسین صورت گری کرنے والا، ہنستے بستے درد سے لذت کشید کرنے والا، بنجر آنکھوں میں شاداب مناظر کے خواب سجانے والا، چشم کشا انداز میں دردِ دل کی عکاسی کرنے والا، دل کو چھو لینے والے اشعار کا خالق اہل زبان بھی نہ تھا لیکن جب اشعار کہتا تو لوگ جھوم جھوم اٹھتے۔

پاکستان کے ایک بڑے شاعر کا زندگی نامہ

عمر اتنی تو عطا کر میرے فن کو خالق
میرا دشمن میرے مرنے کی خبر کو ترسے

اس مجوبۂ روزگار شاعر کی داستانِ حیات جس کی بے باک زندگی چھین کر موت بھی افسردہ ہوگئی۔

اس نیم تاریک اور چھوٹی سی گلی میں چاند کی پھیکی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دن بھر فکرِ معاش میں الجھے مرد اور امورِ خانہ داری کے ساتھ بچوں کی تربیت و پرورش میں اپنا وجود بھٹی کی طرح جھونک دینے والی خواتین تھکن سے بے حال تھیں۔ بحرِ زندگی میں ان کا سفر اگر پُرسکون انداز میں جاری ہوتا تو وہ سب یقینی طور پر ایک گہری، میٹھی اور سرشار

www.PakiBooks.Site

نیند سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے لیکن اب معاملات میں ایک بے یقینی کی سی کیفیت برپا ہو چکی تھی۔ ان کا مجموعی قومی دھارا اس نہج پر تھا کہ آرام و سکون اور بے فکری ایک عرصہ سے ناپید تھے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال اس گلی کے ایک نیم تاریک گھر میں بھی تھی جہاں ہر فرد کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔

وہ قدرے بوسیدہ لیکن صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ چہرے مہرے سے واضح طور پر ایک ہی بات جھلکتی تھی کہ انہوں نے زندگی کو نہیں بلکہ زندگی نے انہیں برت رکھا ہے۔ غربت اور سخت کوشی کی لکیریں چہرے کے ہر نقش سے عیاں ہونے کے باوجود وقار و دبدبہ سے مغلوب نظر آتی تھیں۔ وہ غریب تھے لیکن اس غربت کو انہوں نے اپنے خاندانی رکھ رکھاؤ اور اقدار پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ 'محلہ سادات' کے دیگر گھرانوں کی طرح وہ بھی ایک ناگزیر اضطراب میں مبتلا تھے۔ چار مئی کی اس رات میں نصف شب سے کئی گھنٹے پہلے اس نیم پختہ آنگن میں اپنے علاقہ 'ڈیرہ غازی خان' کی مجموعی کیفیت سے بحث و مباحثہ کا آغاز ہوا تھا جو ذمہ دار، باشعور اور دردمند شہریوں کی نفسیات کے موجب ملکی سیاسی حالات پر آن پہنچا تھا۔

سن سینتالیس اپنا سفر طے کرتا ہوا نصف پڑاؤ طے کرنے کے قریب تھا۔ سالہا سال سے جاری نسل اب کسی منطقی انجام تک پہنچنے والی تھی۔ گلی گلی، نگر نگر نئے ملک اور آزادی کا چرچا تھا۔ محلہ سادات کا وہ گھرانا بھی اسی موضوع میں الجھا اپنی ذہنی پختگی و شعور کے مطابق سیاسی صورتِ حال کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا۔ صحن میں بیٹھے ان افراد کی بحث اور دلائل اندرونی جانب موجود مستورات کی سماعت میں بھی پہنچ رہی تھی۔ وہ بھی انہی کی طرح آس و اُمید کے ہنڈولے میں جھولتی تھیں لیکن اس رات صورتِ حال قدرے مختلف تھیں۔ خاتون خانہ کے بشرے سے بے حد اضطراب اور ناقابل بیان اذیت جھلک رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کرب برداشت کی حدود سے تجاوز کرنے لگا ہے۔ اس درد میں بھی اس کے چہرے پر مقابل کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی مسکراہٹ تھی۔ اس لمحہ کی آمد کے لیے اس نے نو ماہ انتظار کیا تھا۔ اپنے وجود سے ایک نئی زندگی کو جنم دے کر بانہوں میں بھرنے، اس کی ننھی انگلیوں، پھول سے رخساروں کا لمس اپنے لبوں پر محسوس کرنے کا تصور ہی دل کو گدگدانے لگتا تھا۔ اس گھرانے کی تجربہ کار اور بزرگ خواتین پہلے ہی پیش گوئی کر چکی تھیں کہ 'سید چراغ حسین نقوی' کی دلہن بحکم الٰہی بیٹے کو جنم دے گی تاہم حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے ہمیشہ بیٹی یا بیٹے کی بجائے نیک، صحت مند اور طویل العمر اولاد کی دعا مانگی تھی۔

افق پر چاند اپنا سفر طے کرتے ہوئے مشرقی سمت کی جانب جھکنے لگا تو بحث و مباحثہ کے شرکاء بھی تھک ہار کر نیند کی وادی میں داخل ہو گئے۔ اب ہر سو صرف سناٹے کا راج تھا۔ ہر گذرتا لمحہ خاتون خانہ کی اذیت اور حوصلہ مند مسکراہٹ میں اضافہ کر رہا تھا۔ اپنی گھریلو غربت، ناکافی وسائل، کم خوراکی اور کام کاج کے بوجھ کا مقابلہ وہ بہت بہادری سے کرتی آئی تھی۔ کسی بھی قسم کا گلہ، شکوہ یا اظہار تکلیف اسے نسوانی وقار اور مامتا کی معراج کے منافی محسوس ہوتا تھا۔

رات کی تاریکی اب دم توڑتی نظر آ رہی تھی۔ جان لیوا مرحلہ بخیریت تمام ہوا اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی نوزائیدہ نے اپنی باریک آواز میں روتے ہوئے قفس دنیا میں آمد کا نقارہ بجا دیا۔

''ماشاء اللہ! پہلی کرن کے ساتھ ننھے شہزادے کی آمد بڑا ہی مبارک لمحہ ہے۔'' ایک بزرگ خاتون گویا ہوئیں۔

''ارے! اس کی چیخ و پکار پر تو غور کرو ذرا کیسے رو رہا ہے۔'' دوسری خاتون نے بچہ والدہ کی گود میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''ایسا محسوس نہیں ہو رہا ہے کہ یہ توازن کی ابجد سیکھ کر آیا ہے۔''

''الٰہی! اس منصب پر فائز ہونے کے لیے جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے۔ میرے بچے کے مقدر میں تاروں کی ضوفشانی اور اس روشن صبح کا اجالا بھر دینا!'' ماں نے پیشانی پر بوسہ ثبت کرتے ہوئے دعا کی۔

سید چراغ حسین بھی اس کشادہ پیشانی، سیاہ بالوں، خم دار خوبصورت پلکوں، سیاہ گہری آنکھوں اور جاذبِ نظر نقوش کے حامل بچے کو گود میں لیے ایک مقدس رشتہ کا حسن محسوس کرتے عجز بھری خوشی سے نہال ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر گھر میں مبارک، سلامت کا شور رہا اور پھر معمولات زندگی اپنی سابقہ ڈگر پر لوٹ آئے۔ غربت و مسائل زدہ وہ گھرانا تادیر خوشی منانے کے اہل ہی کہاں تھا؟ کسی بچے کی پیدائش پر کئی کئی روزہ جشن منانا تو امیرانہ اور شاہانہ چونچلے ہوا کرتے ہیں۔ کسی غریب گھرانے میں نومولود اپنے استقبال کے لیے خوشیوں کے ساتھ ڈھیروں

فکریں اور سوچیں بھی لے کر آیا کرتا ہے۔ اس سادات گھرانے میں بھی حسب مقدور خوشی منانے اور چند لمحوں کی مبارکباد کے بعد سب غم روزگار میں مگن ہو گئے۔

سید چراغ حسین کا یہ کنبہ باہمی محبت، خودداری، شخصی وقار اور رکھ رکھاؤ میں اپنی مثال آپ تھا۔

ان کے والد کا نام 'سید مہر حسین' جبکہ سسر 'سید غلام سرور شاہ' تھے۔ شجرہ نسب 'امام علی نقیؑ' سے جا ملتا تھا۔ جد امجد علی راجن کا مزار 'ضلع لیہ' میں تھا۔ بستی اور اسٹیشن بھی 'علی راجن' کے نام سے ہی مشہور تھے۔ سید مہر حسین پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل تھے۔ چراغ حسین کی سگی والدہ سے آٹھ بہن بھائی تھے۔ چار بیٹوں میں سب سے بڑے 'سید نور احمد شاہ' پولیس انسپکٹر تھے۔ 'سید در محمد شاہ' بارڈر ملٹری پولیس میں 'جمعدار' تھے۔ 'سید چراغ حسین' اور 'سید خادم حسین شاہ' بالترتیب تیسرے اور چوتھے نمبر پر فائز اور 'زین سازی' کی دکان پر رزق حلال کے حصول کے لیے کوشاں رہتے۔ ان کے ایک سوتیلے بھائی 'سید منظور حسین' ریلوے افسر اور 'سید رحم شاہ' گریجویٹ ہونے کے ساتھ ساتھ انگریز حکومت کے وظیفہ یافتہ تھے۔ بھرا پرا خاندان اپنے اپنے وسائل کے مطابق محبت و یگانگت سے باہمی میل جول قائم رکھے ہوئے تھا۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں یکساں جذبات لیے شریک ہوا کرتے۔ سید چراغ کی پہلی اولاد کے لیے ان کی شفقت ناقابل بیان تھی۔ نام رکھنے کا مرحلہ درپیش آیا تو اپنی مروجہ روایات کے مطابق 'جمادی الثانی' کی مناسبت سے 'عباس ابن علیؑ' سے اظہار عجز کے لیے 'غلام عباس' پر بھی متفق ہو گئے۔

اس بہترین انتخاب پر خاندان کے بزرگوں نے حسب روایت مبارکباد اور آئندہ زندگی کے لیے ڈھیروں دعائیں دیں اور کاروزندگی میں مشغول ہو گئے۔

☆.....☆

غلام عباس نے متحدہ و غلام ہندوستان میں آنکھ کھولی تھی۔

یہ اس کی خوش بختی تھی کہ غلامی کا یہ طوق زیادہ عرصہ تک اس کے وجود و شناخت سے نتھی نہ رہ سکا۔ ایک ماہ بعد آزادی ہند کا اعلان ہوا اور پھر اگلے اڑھائی ماہ میں تقسیم کا عمل وجود میں آ گیا۔ متحدہ ہندوستان اب پاکستان اور بھارت کے نام سے عالمی نقشے پر دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔ سید چراغ حسین کے لیے تقسیم کا یہ عمل غیر متوقع نہیں تھا،

سوانحی خاکہ

اصل نام..... سید غلام عباس نقوی
تخلص..... محسن نقوی
جائے پیدائش..... محلہ سادات، ڈیرہ غازی خان
تاریخ پیدائش..... پانچ مئی..... 1947
تاریخ وفات..... پندرہ جنوری..... 1996
جائے وفات..... مون مارکیٹ لاہور
پیشہ..... شاعری
صنف..... غزلیات
وجہ شہرت..... شاعرِ اہل بیت

☆☆☆

محسن نقوی کو قائداعظم کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے بہت متاثر کیا۔ بھٹو کی وفات کے بعد ان کی سیاسی وابستگی پیپلز پارٹی سے ہی وابستہ رہی۔ بے نظیر بھٹو کی علمی قابلیت اور انداز سیاست ان کے دل میں گھر کر گیا۔ انہوں نے بے نظیر کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک نظم لکھی جسے 1994 میں 'پرائیڈ آف پرفارمنس' ملا۔

اے عظیم کبریا
سن غریب کی دعا
سازشوں میں گھر گئی
بنتِ ارض ایشیا
لشکرِ یزید میں
اک کنیز کربلا
فیصلے کی منتظر
اک یتیم بے خطا
ٹال سب مصیبتیں
ہے دعا ترے حضور
واسطہ حسین کا
توڑ ظلم کا غرور
یا اللہ، یا رسول ﷺ
بے نظیر بے قصور

www.PakiBooks.Site

قابل قبول تھا۔ انہوں نے خوش دلی سے اس نعمت خداوندی کا استقبال کیا۔ ڈیرہ غازی خان انگریز و ہندو قوم کی مکاری سے محفوظ رہتے ہوئے پاکستان کا حصہ بنا تھا لہٰذا ہجرت کے دردناک مرحلہ سے بھی محفوظ رہے۔ نئے اور آزاد ملک کا رہائشی بننے کا خواب تو ان کی آنکھوں میں جانے کب سے بسا تھا۔ یہی خواب اپنے جلو میں حالات کی راتوں رات جادوئی تبدیلی کا خیال بھی سمالائے تھے لیکن اس گھرانے کی اجتماعی زندگی میں محض اتنی تبدیلی آسکی تھی کہ دونوں بھائیوں نے زین سازی کے دیرینہ کام کو خیرباد کہہ کر غلہ منڈی میں 'سادات آڑھت' کے نام سے محدود سے پیمانے پر کام کاج کا آغاز کردیا۔ ایمانداری اور خلوص زادراہ تھا لہٰذا نئے کاروبار کو جمانے کے لیے پُراعتماد بھی تھے۔

غلام عباس نے بھی پاؤں پاؤں چلنا شروع کردیا تھا۔ وہ ایک من موہنا بچہ تھا جس کی کشادہ جبیں اور سیاہ گہری آنکھیں دیکھ کر ہر کوئی شفقت و محبت سے مغلوب ہو جاتا۔ ہوش سنبھالنے پر والدین نے روایات کے عین مطابق 'قرآن ناظرہ' کی تعلیم دینے کا آغاز کردیا۔ اس مقصد کے لیے گھر میں بھرپور توجہ دینے کے علاوہ اسے مسجد بھی بھیجا جانے لگا۔ والدین اس کی تربیت میں اپنی اقدار کے سبھی رنگ بھرنے کے خواہاں تھے۔ اس لیے وقتاً فوقتاً محبت' شفقت اور سنجیدگی سے زندگی کے کئی اہم' بنیادی اور ناگزیر اسباق ذہن نشین کروانا فراموش نہ کرتے۔

''آج میں آپ کو ایک اہم ذمہ داری سونپنا چاہتا ہوں میرے بچے! آپ اسے مکمل کریں گے ناں؟'' وہ اس کے گھنگریالے بال پیار سے سمیٹ کر کہتے۔

''جی بابا جان! میں ضرور پوری کروں گا۔''

''آپ کی زندگی اب ایک ایسے مقام پر آن پہنچی ہے جہاں بیرونی دنیا سے تعارف حاصل ہوگا۔ کچھ انہیں اپنی تربیت کے رنگ دکھاؤ گے اور کچھ ان کی اقدار و روایات کے رنگ اپنے اندر جذب کرو گے۔ آپ سید گھرانے کے چشم و چراغ ہو۔ ایک عمومی معاشرتی رویے کے مطابق سادات کو بے حد عزت و احترام اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس اعتبار' عزت اور احترام کی لاج رکھنا آپ پر بھی فرض ہوگا۔''

''میں ایسا ہی کروں گا بابا جان!''

''شاباش میرے بچے! وعدہ کرو کہ اپنی عزت نفس' خودداری پر کبھی آنچ نہیں آنے دو گے۔ سچائی کا دامن کبھی نہیں چھوڑو گے۔ جھوٹ' منافقت' لالچ اور حسد سے اپنا کردار کبھی آلودہ نہیں ہونے دو گے۔''

''پکا وعدہ۔'' غلام عباس نے سرِتسلیم خم کردیا۔

☆......☆

ابتدائی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

اسکول داخل ہونے کے بعد جب حروف سے آشنائی میں اضافہ ہوا تو اس کے ہاتھ ایک اور نیا مشغلہ آگیا۔ گھر میں موجود مذہبی کتابیں جو قبل ازیں شرارت وغیر سنجیدگی کے باعث اس کی دست برد سے محفوظ رکھی جاتی تھیں' اب دسترس میں آئیں تو سوچ و فکر کشادہ ہونے لگی۔ شعور کی وادی اور خیالوں کی گھنی چھاؤں میں دھیرے دھیرے آگاہی کی دھوپ پھیلی تو احساس ہوا کہ ان کا طرز زندگی' وسائل اور معاشی مرتبہ کس قدر مختلف ہے۔ ان کی دنیا میں بہت سی محرومیاں تھیں' خاموشی کے قفل اور استحصال تھا۔ اس کے بزرگ اکل حلال کے حصول پر کاربند تھے جو یقینی طور پر ایک قابل فخر اور لائق تقلید امر تھا۔ اس نے بھی انہی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی اقدار کو زادِ راہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ہم عمر بچے کھلونوں سے کھیلتے' بہترین اور مہنگے لباس پہنے بھی نظر آتے لیکن غلام عباس کی زندگی کا محور صرف کتابیں اور پڑھائی تھی۔ اسے محلّہ کے ساتھ ہی ایک 'پرائمری اسکول نمبر 6' میں داخل کروا دیا گیا۔ وہ درسی کتب کے ساتھ میر انیس و مرزا دبیر کی شاعری میں بھی دلچسپی لیتا کیونکہ اس نے خود بھی دیکھا تھا کہ اسے محفل و مجالس میں اس کے ابا اور چچا وغیرہ جب پڑھتے ہیں تو ان کی خوب پذیرائی ہوتی ہے۔

پرائمری اسکول کی یہ پڑھائی اس کے لیے بے حد اہم ثابت ہوئی۔ بڑھتی ہوئی جماعت کے تناسب سے اخراجات میں بھی اسی شرح سے اضافہ ہو رہا تھا۔ گھریلو حالات اس سے ڈھکے چھپے تو بالکل بھی نہ تھے۔ ایسے میں والدین سے اصرار اور دباؤ ڈال کر اپنی بات منوانا اسے کم ظرفی محسوس ہوتی تھی۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے غلام عباس نے کسی بھی صورت کوئی درمیانی راہ تلاش کرنی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد ایک خیال دل کو بھایا جسے عملی جامہ پہنانے کے لیے اسکول سے فراغت ملتے ہی وہ مختلف علاقوں کا دورہ کرنے نکل کھڑا ہوتا۔ جلد ہی اسے اپنے مسئلہ کا بہترین حل مل گیا جو نہ صرف موجودہ مسائل کے خاتمہ کی کنجی تھی بلکہ مستقبل میں بھی اس کے وجود میں پوشیدہ ہنر و فن

www.PakiBooks.Site

کے خزانے کا قفل شکن بھی ثابت ہونا تھا۔

☆......☆

اس میلے کا سماں بالکل روایتی تھا۔ پُرشور' بارونق اور ہرسو گہما گہمی۔

ایک کونے میں اشیائے خورونوش کے اسٹال موجود تھے تو دوسری طرف رنگ برنگے کھلونے سجے دکھائی دے رہے تھے۔ جھولوں کی جانب بچوں کا ہجوم ہمیشہ ہی زیادہ ہوا کرتا تھا لیکن اس روز صورتِ حال قدرے مختلف تھی۔ ان اسٹالز کے پختہ کار اور قدرے عمر رسیدہ مالکان کے درمیان ایک دس سالہ لڑکا بھی 'لاٹری کے ٹکٹ' لیے موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں شریر سی چمک اور ہونٹوں پر کھلتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ دکاندار اسے دیکھتے ہوئے مختلف چہ مگوئیوں میں مصروف تھے۔

''یہ لڑکا کون چلا آیا ہے یہاں؟''

''میں نے بھی آج پہلی دفعہ ہی دیکھا ہے۔'' دوسرے شخص نے کندھے اچکائے۔

''کہیں کسی بڑے بھائی یا والد کی جگہ تو نہیں چلا آیا؟'' ایک اور رائے ابھری۔

''یہ تو ٹھیکیدار ہی جانے لیکن تم سب خیال کرنا بھائیو! آج کل کے لونڈے دیدہ ہوائی سے بڑوں کے بھی کان کترنے لگے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی جیب کترا نکل آئے۔''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے یارو! تم لوگ بھی نجانے پرکا کوا بنانے کی عادت کب چھوڑو گے؟'' ایک سنجیدہ طبع دکاندار نے ملامتی انداز میں کہا۔ ''یہ محلّہ سادات کا رہائشی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں اسے۔ سید چراغ حسین کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔''

''اوہ...... اللہ مجھے معاف کرے، میں نے انجانے میں سیدزادے کو کیا کیا نہ کہہ دیا۔'' دوسری جانب سے فوری شرمساری کا اظہار آیا۔ ان سب کی باتوں' نظروں اور تجزیوں سے بے نیاز غلام عباس اپنے ہم عمر بچوں کو لاٹری خریدنے کی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''سب سے بڑا نام خدا کا...... دیتا ہے وہ انعام وفا کا......'' وہ اپنی بساط کے مطابق قافیہ بندی کرنے کی کوشش کیا کرتا کیونکہ ابتائی ادب نے اسے ردیف قافیہ کی پہچان کرادی تھی۔

''ارے لڑکے! یہ تم کس زبان میں بات کرتے ہو؟'' دو ننھے بچوں نے اشتیاق سے اس کی جانب دیکھا۔

''تمہیں پسند نہیں آئی کیا؟'' وہ مسکرایا۔

''ارے نہیں! بہت مزہ آتا ہے، بہت اچھا بھی لگتا ہے۔''

''تم بھی تو بہت اچھے ہو، من کے کتنے سچے ہو۔'' غلام عباس نے ایک بار پھر قافیہ بندی کی۔ اس کی نیک نیتی اور لگن ہی کا نتیجہ تھا کہ بچے دیگر اشیاء کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکے آتے تھے۔ ایک کم عمر لڑکے کی زبان سے قافیہ بندی سننا انہیں بے حد بھاتا۔ اس ہنسی مذاق اور موج مستی میں ٹکٹ فروخت ہو جاتے۔ دکاندار بھی اس کی شرارتوں اور شوخ طبیعت سے متاثر ہو چلے تھے لیکن ایک امر ان کے لیے بھی بہت حیران کن تھا کہ غلام عباس ہمیشہ

محسن نقوی بلاشبہ ہر محفل کی جان ہوتے تھے۔ ان کے بے ساختہ جملوں سے محفل کشتِ زعفران بن جایا کرتی۔ ایک دفعہ پی ٹی وی کے برابر میں کوئی دعوت منعقد کی گئی تھی۔ محسن کے ساتھ سعداللہ شاہ براجمان تھے۔ ان کی نظر ایک خاتون پر پڑی جس کا رنگ ذرا پکا سانولا مائل سیاہی تھا۔ محسن نے اس کی بابت استفسار کیا تو سعد نے بتایا' شاید اس کا نام کشور ہے۔ محسن نے کہا: 'یار! اب میں اس مصرع کو کیونکر سچ مان پاؤں گا...... ''کشور حسین شاد باد۔''

☆☆☆

محسن نقوی کے قلم کی جولانی زندگی بھر رواں دواں رہی۔ ان کا مجموعہ کلام وفات کے بعد بھی کتابی شکل میں سامنے آیا۔ سچے موتیوں کو سمیٹتی تمام کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔

بند قبا، برگ صحرا، ریزہ حرف، عذاب دید، طلوع اشک، رخت شب، خیمہ جاں، موج ادراک، فراتِ فکر، حق ایلیا، ردائے خواب۔

☆☆☆

محسن کی شاعری زمانہ طالبعلمی میں 'رومانوی تحریک' سے متاثر تھی۔ ضیاء الحق کے دور میں انہیں اسلامی قصائد کے مجموعہ 'موج ادراک' پر 'صدارتی ایوارڈ' کے لیے نامزد کیا گیا لیکن آمریت کے خلاف ہونے کی بنا انہوں نے اسے وصول کرنے سے انکار کردیا۔

www.PakiBooks.Site

چند تکلیں کے بعد ہی واپسی کے لیے پر تولنے لگتا۔

''اتنی جلدی گھر کیوں چلے جاتے ہیں چھوٹے شاہ جی؟ ابھی تو کافی سودا باقی ہے ناں آپ کا۔'' ایک دکاندار نے دریافت کیا۔

''میں اتنی ہی ٹکٹیں فروخت کرتا ہوں چاچا جتنے پیسوں کی مجھے ضرورت ہو۔ زیادہ پیسے کے لالچ میں یہیں رکا رہا تو میرے حصے کی پڑھائی کون کرے گا بھلا؟'' وہ شریر انداز میں جواب دیتا اور گھر پہنچ کر اپنی ساری کمائی والدہ کے حوالے کر دیتا۔

''اسے اپنے پاس رکھ لیجیے ماں جی! آپ کے پاس رہنے سے اس میں برکت رہے گی۔ مجھے جب ضرورت ہوگی آپ سے لے لوں گا۔''

''غلام عباس! تُو میرا بڑا ہی تابعدار اور محنتی بچہ ہے۔ اللہ پاک تجھے اپنے سوا کسی کا بھی محتاج نہ کرے۔ اس مشقت سے تجھے تھکاوٹ تو نہیں ہو جاتی؟'' ممتا نے تڑپ کر دعا کی۔

''ارادے جن کے پختہ ہوں' نظریں جن کی خدا پر ہوں''

تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے۔'' اس نے حسبِ عادت شاعری میں جواب دیا۔

''اتنی سی عمر میں یہ قربانی اور جذبہ کہاں سے سیکھ لیا ہے تو نے؟''

''پتا نہیں ماں جی! مگر ایسا لگتا ہے کہ یہ سب میرے لہو میں ہی شامل ہے۔'' اس کے لبوں پر کھوئی کھوئی سی مسکراہٹ والدہ کو بے اختیار غلام عباس کا وقتِ پیدائش یاد دلا دیتی اور وہ اس کی پیشانی چومتے ہوئے اشکبار ہو کر اپنے سینے میں بھینچ لیتیں گویا اسے ہر سرد و گرم سے محفوظ کر لینا چاہتی ہوں۔

☆......☆

لڑکپن کا وہ دور اپنے تمام تر خوابوں سمیت بند مٹھی سے ریت کی مانند پھسلتا جا رہا تھا۔

غلام عباس کے وہ خواب بھی اسی کی طرح انوکھے تھے۔ تتلیوں کے رنگ چرا کر اپنی زندگی میں بھرنا اس کی اوّلین خواہش تھی۔ والدین کی فکروں کا خاتمہ کر کے زورِ بازو سے پھولوں کی نرماہٹ دے کر وہ خود ان کے لیے چھتنار درخت بننا چاہتا تھا۔ چاند تاروں کے سنگ آنکھ مچولی کھیلنا تو ہر ایک کو ہی پسند ہوتا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں تو یہ ارمان بسا تھا کہ چاند پر کوئی پینگ ڈالے اور اسے دھیرے دھیرے جھلاتا تاروں سے اٹھکیلیاں کرے۔ اب تک تو یہ لاتعداد ستارے ہی اپنی ٹمٹماتی آنکھوں کی چمک دمک اور شرارتوں سے اہلِ فرش کو لبھاتے آئے ہیں مگر اسے تو کچھ منفرد کرنا تھا۔ وہ عالمِ تصور میں کئی بار ان تاروں کو گدگدا کر آگے نکل جاتا۔ ستارے مچل کر اس نٹ کھٹ لڑکے کو پکڑنے کی کوشش کرتے تو وہ اپنے اس جھولے سے واپس پیچھے آتے ہوئے انہیں ایک بار پھر چٹکی بھر کے اس کھیل کو مزید دلچسپ بنا دیتا۔

بلند پروازی کی تمنا لاشعور میں سجائے غلام عباس نے جب عمر کے اس دور سے تجاوز کیا تو مزاج ایک نئے آزار میں گرفتار ہونے لگا۔ چاندنی رات اس کی طبیعت میں عجیب سرور اور کیف پیدا کرنے لگی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ روح و قلب میں کوئی ساز چھڑ گیا ہے۔ مدھم سی یہ صوتی لہریں لہو میں میٹھی میٹھی سی سرشاری پیدا کرنے لگتیں۔ دل کی دھڑکنیں کبھی مدھم ہوتیں تو کبھی یکدم کوئی نئی لے پکڑ لیتیں۔ سانسوں کی رفتار بے قابو ہو جاتی اور پردہ تصور پر الفاظ کا مبہم سا رقص شروع ہو جاتا۔ وہ اپنی اس نئی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش میں اضطراب سے کروٹیں بدلنے لگتا۔ چاندنی کسی دریا کی طرح بہتی گھر کی کہنہ سال' میلی دیواروں پر پھسل کر اس کی آنکھوں میں سمانے چلی آتی۔ وہ بے تابی سے دونوں ہاتھ آنکھوں کے دریچوں پر رکھ لیتا لیکن غضب تو یہ تھا کہ اس صورت میں بے بسی فزوں تر ہو جاتی۔ آنکھوں اور ہاتھوں کے اس عمل کے ردِعمل میں بے چینی حد سے سوا ہونے لگتی۔ ایسا محسوس ہوتا کہ یہ چاندنی اگر کچھ پل بھی اس کی بصارت سے اوجھل رہی تو اس کی ذات میں کوئی بہت بڑا خلا پیدا ہو جائے گا۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنے بستر سے اٹھتا اور جلے پیر کی بلی بنا صحن میں ٹہلنے لگتا۔ اس کیفیت کا خاتمہ پو پھٹنے کے بعد ہی ہوا کرتا تھا۔

گرما کی راتوں کے بعد یہ سلسلہ سرمائی شب میں بھی نہ رک پایا۔ ٹھٹھرے ہوئے جاڑوں کی چاندنی رات میں وہ چپکے سے کمرے کا کواڑ کھول کر برہنہ پا صحن میں چلا آتا۔ تلوؤں میں سرایت کرتی ٹھنڈک اور دھند آلود آسمان سے چھن کر آتی چاندنی کے غسل میں اسے اپنا وجود کامل محسوس ہوتا۔ وہ رات بھر وہیں بیٹھا سرما کی خوشبو' دھند کی نمی اور ٹھٹھری دودھیا روشنی کو جذب کرتا رہتا۔

www.PakiBooks.Site

اسی سرشاری میں ایک روز غلام عباس نے صحن میں پڑے بستے سے اپنی کاپی نکالی اور قلم سے چند لفظ گھسیٹ کر دوبارہ ٹرانس کے عالم میں قمر و نجم کی محفل برخاست ہونے تک ایک ہی آسن میں وہیں بیٹھا رہا۔ اس وقت اسے سردی سے شل ہوتے وجود کا احساس تھا' نہ ہی کچھ قلمبند کرنے کا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اب ایک بھرپور اور سرشار نیند اس پر مہربان ہو جائے گی۔

☆......☆

چاند کا شباب ڈھل چکا تھا۔

یہ وہی وقت ہوتا تھا جب غلام عباس کی طبیعت میں ٹھہراؤ اور بے چینی کو قرار آ جاتا۔ اس کی روزمرہ زندگی کے معمولات جوں کے توں برقرار تھے۔ وہ اب مڈل کلاس میں تھا۔ اخراجات پورے کرنے کے لیے محنت و مشقت بھی ہنوز جاری تھی۔ پڑھائی لکھائی میں اس نے یوں بھی کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ ایک رات پڑھائی کے دوران کاپی پر لکھے چند حروف نظر آئے۔ شعر کے قالب میں ڈھالے گئے وہ فقرات اس کی اپنی لکھائی میں ہی تھے۔

''ارے! یہ میں نے کب لکھے تھے بھلا؟ تو یہ...... کیسا بچکانہ شعر ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو خوامخواہ دماغی خلل میں مبتلا تصور کرنے لگے گا۔'' اس نے خودکلامی کرتے ہوئے کاپی بستے میں ڈال دی لیکن دل میں قلم تھام کر کاغذ در کاغذ سیاہ کرنے کی خواہش اب بھی مچل رہی تھی۔

''جاؤ میاں! یہ شعر و شاعری تمہارے بس کا روگ نہیں۔ خوامخواہ ایسے بے تکے' بچکانہ اور سطحی سے اشعار پہ جگ ہنسائی کروا بیٹھو گے۔ شعر تو چچا رحم شاہ کہتے تھے اور کیا خوب کہتے تھے۔ موت اور موت بھی جوانی کی...... دھوم ہے مرگ شادمانی کی...... ایسا تخیل پیدا کر سکو تو بات بھی ہے۔'' اس نے سختی سے خود کو باور کروایا۔ غلام عباس کو قوی اُمید تھی کہ اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر وہ جلد ہی اس عارضی کیفیت سے خود کو باہر نکال لے گا لیکن عالم یہ تھا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ چاندنی راتوں کے بعد الفاظ کا رقص بھی اسے بے بس کرنے لگا اور وہ بے اختیاری کے عالم میں اپنے خیالات کسی صفحہ پر منتقل کر دیتا۔ اس کے ذہن میں کئی بار اپنے ایک ماموں' سید علی شاہ مخدوم نقوی سے اصلاح لینے کا خیال بھی کلبلایا۔ وہ شاعری کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا تھے اور ہمہ وقت اپنے دماغ کی پٹاری سے کوئی نہ کوئی شعر نکال کر حاضرین کو محظوظ کیا کرتے۔

شاعرِ اہلِ بیت ہونے کی حیثیت سے محسن نقوی نے کئی لازوال شہ پارے تخلیق کیے۔ موجِ ادراک' فراتِ فکر اور حق ایلیا میں قاری کی ملاقات ایک انوکھے شخص سے ہوتی ہے جو جابجا اپنے قلم سے مذہب و سانحہ کربلا پر اشک بہاتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کتابوں میں شعب ابی طالب سے کربلا تک کے قدآور کرداروں کی شخصیت نگاری کا نامکمل اور ادھورا سا زائچہ نظر آتا ہے۔ نامکمل اور 'ادھورا' اس لیے کہ ان شخصیات کے کردار کی عظمت کا احاطہ تو کسی بنی نوع انسان کی فکر کی دسترس میں نہیں۔ محسن نقوی کو ایک حقیقت کا بخوبی احساس تھا کہ صرف وہی لفظ زندہ رہتے ہیں جو ذہنوں سے دل تک اترنے کی صلاحیت رکھتے ہوں لہٰذا ان قصائد میں ہیئت نمائی سے زیادہ شخصیت نگاری پر توجہ دی گئی۔ ان کا تحریر کردہ ہر لفظ آج بھی مقبولیت و پسندیدگی میں اپنی مثال آپ ہے۔ 'اے مرے کبریا'۔ 'المدد مصطفیٰ'۔ 'نہ پوچھ میرا حسین کیا ہے؟' 'کربلا' جیسی ان گنت نظمیں ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کا تحریر کردہ 'سلام' اہلِ بیت میں زبان زدِ عام ہے۔

عاشور کا ڈھل جانا' صغرا کا وہ مر جانا
اکبر ترے سینے میں' برچھی کا اتر جانا
اے خونِ علی اصغر میدانِ قیامت میں
شبیر کے چہرے پر کچھ اور نکھر جانا
سجاد یہ کہتے تھے معصوم سکینہ سے
عباس کے لاشے سے چپ چاپ گزر جانا
ننھے سے مجاہد کو ماں نے یہ نصیحت کی
تیروں کے مقابل بھی بے خوف و خطر جانا
محسن کو رلائے گا' تا حشر لہو اکثر
زہر اتری کلیوں کا صحرا میں بکھر جانا

''رہنے دو میاں! رہنے دو! اصلاح لینے کا مطلب تو یہ ہوا ناں کہ ابھی سے سہاروں کی تلاش میں ہو۔ وہ عرش کے ستارے ہیں۔ چمک ان کا مقدر ہے۔ اگر ہمت ہے تو اپنے دم پر کچھ کرو ناں۔'' وہ اپنے ہی خیالات کو رد کرتے ہوئے سوچتا۔

''ٹھیک ہے! ٹوٹی پھوٹی اور بچکانہ ہی سہی لیکن میری

www.PakiBooks.Site

شاعری خام حالت میں ہی رہے گی۔'' اس نے عزم کیا۔ انھی سوچوں میں غلطاں، خود سے الجھتے، لڑتے اور اپنے خوابوں کو سنبھالتے ایک روز اس کے ذہن میں چھجارحم شاہ کے تخلص 'خیال' سے متاثر ہو کر اپنے لیے بھی کوئی تخلص سوچنے کی تحریک پیدا ہوگئی۔ اسی پل ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

''محسن...... محسن نقوی...... بالکل ٹھیک...... یہی ہوگا میرا تخلص۔''

اس کا اضطراب اور کشمکش اب سکون و اطمینان میں تبدیل ہوگئے تھے۔ بارش کے پہلے قطرے کی مانند غلام عباس کے قلم اور خیال نے 'محسن نقوی' کی صورت میں ایک شجر کے لیے بیج بو دیا تھا جس کا کلام بہت جلد ایک ایسی بارش میں تبدیل ہو جانا تھا جس کی بوچھاڑ میں ہر اردو بولنے اور سمجھنے والا بھیگ کر الفاظ کی خوشبو میں خود کو معطر محسوس کرتا۔

اس روز درحقیقت ایک باغی نے جنم لیا تھا۔

☆......☆

الفاظ کے جنگل میں کھوئے، چاندنی راتوں کے آبلے بدن پر سجائے اور اپنی ضد و خودسری کو زادِ راہ بنائے غلام عباس خاموشی و مستقل مزاجی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔

زندگی میں تغیر صرف اتنا ہی آیا تھا کہ اب وہ 'ڈیرہ غازی خان گورنمنٹ ہائی اسکول 1' میں میٹرک کلاس تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ پڑھائی لکھائی میں سنجیدگی تا حال برقرار تھی۔ اپنی ذات سے وابستہ والدین کے خوابوں اور امنگوں سے آگاہی کی بدولت انہیں مایوس کرنے کا تصور بھی محال تھا۔ سید چراغ حسین کے گلشن میں غلام عباس کے بعد مزید ایک بیٹے اور چار بیٹیوں کا اضافہ ہوا تھا لیکن پہلوٹھی کی اولاد ہونے کے ناتے اس کی اہمیت اب بھی نا قابل گزیر تھی۔

والدین کی تمناؤں کو مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا قلمی سفر اب اس مقام پر آن پہنچا تھا کہ چھوٹے موٹے اشعار غزل میں تبدیل ہونے لگے۔ اپنی ان خفیہ کاوشوں پر کچھ روز یا کسی طویل وقفہ کے بعد اس کی دوبارہ نظر پڑتی تو وہ اپنی فنی خامیوں اور خیالات کی ناپختگی پر دل کھول کر ہنستا۔ اس قہقہہ کی گونج میں غلام عباس کے وجود میں سمٹا محسن نقوی بےتابی سے زبان و بیان میں یکتائی اور خیالات میں منفرد اسلوب قائم کرنے کے لیے عزم دہرانے لگتا۔

اسی دھوپ چھاؤں کی کیفیت میں اس نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ گھریلو حالات میں بھی اب قدرے بہتری آچکی تھی۔ کاٹن فیکٹری کے قیام نو سے برسوں سے جاری ایک جامد ماحول میں خوشگوار تبدیلی پیدا کر دی۔

میٹرک کا پڑاؤ عبور کرتے ہی غلام عباس نے 'گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خان' میں داخلہ لے لیا۔ یہاں آمد کے ساتھ ہی زندگی یکسر تبدیل ہو کر رہ گئی۔ اسکول میں ملنے والا لگا بندھا ماحول، اساتذہ سے برسوں کی شناسائی، بچپن سے گندھی شرارتوں میں لپٹی اور بلند پروازی کے خواب دیکھتی دوستیاں بھی ایک نئے روپ میں سامنے آنے لگیں۔ پروفیسرز سے طویل علمی و ادبی گفتگو کرتے ہوئے اسے اپنا وجود بےحد معتبر محسوس ہوتا۔ ذہنی افق وسیع تر ہونے لگا تو شاعری کا قدرتی ہنر بھی مہمیز ہوتا گیا۔ انھی دنوں کالج کے ایک دوست کے ہاتھ اس کا 'خفیہ' کلام لگ گیا۔

''اماں یار! تم تو چھپے رستم نکلے۔ میں تو سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تمہارے اس چلبلے اور شریر روپ کے پیچھے ایک اچھا خاصا شاعر چھپا بیٹھا ہے۔'' وہ حقیقتاً اس کی شاعری سے بہت متاثر ہوا تھا۔

''اب بناؤ مت مجھے! اس قدر بھگو بھگو کر مارنے سے بہتر ہے کہ سیدھے لفظوں میں مذاق اڑا لو...... میں بالکل برا نہیں مناؤں گا۔'' غلام عباس نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ مارا۔

''اتنی بدگمانی اچھی نہیں پیارے! میں تمہارا مسئلہ سمجھ گیا ہوں۔ تمہیں یقیناً اپنے کلام میں تشنگی اور غیر مطمئن سی کیفیت محسوس ہوتی ہوگی۔'' اس کی بات پر غلام عباس نے شد و مد سے اثبات میں سر ہلایا تو وہ سلسلہ کلام ایک بار پھر جوڑتے ہوئے گویا ہوا!

''اک ذرا آنچ کی کمی ہے بس لیکن وہ بھی کسی بہترین استاد کی شاگردی اختیار کر کے دور کی جا سکتی ہے۔''

''یہی میرا اصل المیہ ہے دوست! میں خود کو عالم فاضل ثابت نہیں کر رہا۔ محض اپنے دم پر نام بنانا چاہتا ہوں۔ کسی سے اصلاح لینے کا تصور ہی ایسا لگتا ہے کہ میرے کاسہ میں کوئی توجہ کی بھیک ڈال دے۔ کبھی محسوس ہوتا ہے کہ ایسا کیا تو کبھی دنیا کے سامنے یہ نہ کہہ سکوں گا کہ یہ خالصتاً میرا کلام ہے۔'' اس نے سادگی سے اپنی الجھن بیان کی۔

www.PakiBooks.Site

''تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔ اصلاح اور رہنمائی دو الگ معاملات ہیں۔ اب دیکھو! تم کالج آتے ہو، پروفیسرز سے ٹاپکس سمجھتے ہو، اپنی کمی و کوتاہی جانتے ہو۔ اس کے بعد امتحان میں تو تمہاری ہی محنت کے بل بوتے پر کامیابی ملے گی ناں! اب اگر اس سارے عمل میں سے تم استاد کا کردار خارج کر دو تو کامیابی کس طرح ممکن ہو سکے گی؟''

''تمہاری بات میں بالکل وزن ہے۔'' اس کی منطق غلام عباس کے دل میں گھر کر گئی۔

''تو بس پھر! بہترین اساتذہ سے رجوع کر کے ان کے تجربات و مشاہدات اپنے دامن میں بھر لو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری صورت میں ہمارے کالج میگزین کو ایک بہترین شاعر میسر آنے والا ہے۔'' دوست نے خلوص سے مشورہ دیا۔

غلام عباس نے اس کی یہ نصیحت گرہ سے باندھ لی اور تلاش بسیار کے بعد مولانا حسرت موہانی کے شاگرد 'شفقت کاظمی' کے پاس چلا گیا جو چار مجموعہ ہائے کلام کے خالق اور برصغیر کے 'سہل ممتنع' کے صف اول کے شاعر تھے۔

''جاؤ میاں! ہم کسی کو شاگرد نہیں بنایا کرتے۔ آج کل کے لونڈے لپاڑوں کو آتا جاتا کچھ بھی نہیں اور اپنے ٹاٹ سے بھی بدتر کلام میں مخمل کے پیوند لگوانے چلے آتے ہیں۔''

''میں تو بڑی اُمید لیے آپ کے پاس آیا تھا۔ اچھا! آپ مت بنیے ہمارے استاد...... منہ بولا شاگرد بنا لیجیے بس۔'' اس نے اپنی مخصوص بذلہ سنجی سے کہا اور کاظمی صاحب کی نیم رضامندی پا کر اپنا کچھ کلام ان کے سامنے رکھ دیا۔ ان کا چہرہ مختلف کیفیات کی آماجگاہ بننے لگا۔ سنجیدگی، مسکراہٹ، بےیقینی کا تاثر ستائش میں ڈھلنے لگا تو وہ سنبھل کر گویا ہوئے!

''تمہارے وجود پر چھائی شرارتوں اور لاابالی پن کو دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ شاعری کے لیے سنجیدہ ہو گے۔ یقیناً تم نے زندگی کو بہت قریب سے جانا اور پرکھا ہے اور میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ مستقبل میں تمہاری یہ شاعری روایتی الف لیلہ نہیں بلکہ ایک آئینہ ہوگی جس میں ہر کوئی اپنا عکس دیکھ کر پکار اٹھے گا کہ یہ تو میرے دل کی بات تھی۔ اس نے کیسے کھنگالی؟''

''آپ کے یہ الفاظ میرے لیے بہت بڑا ٹانک

مجھ سے روٹھے ہیں میرے اپنے قبیلے والے
میرے سینے میں ہر اک تیر ستم ٹوٹا ہے

☆......☆

میرے اعادہ کا غضب ابر کرم ہے مجھ کو
میرے احباب کی نفرت میرا سرمایہ ہے
مطمئن ہوں کہ مجھے یاد رکھے گی دنیا
جب بھی اس شہر کی تاریخ وفا لکھے گی

☆......☆

میرا ماتم اسی چپ چاپ فضا میں ہوگا
میرا نوحہ انہی گلیوں کی ہوا لکھے گی

ہیں۔'' غلام عباس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

''میرا یہی مشورہ ہے کہ ذاتی مطالعہ کبھی ترک نہ کرنا۔ عہد گذشتہ کے شاعر اگر ہمارا ذہنی افق وسیع تر کرتے ہیں تو عہد رفتہ کے شعراء اور ادیب حالات حاضرہ کا شعور ایک نئے زاویے اور نقطۂ نظر سے دیتے ہیں۔ تمہاری شاعری کا محور زندگی اور رویے ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ جوانی کی پہیلیوں اور خیالوں کی گھنی چھاؤں میں عمر کی دھوپ پھیلے گی تو قلم پر گرفت مضبوط تر ہو جائے گی۔ تمہیں عدم میکدے کی راہ سے ہو کر گذرتا اور فانی کے ہاتھ سے جام گر کر ٹوٹتا نظر آئے گا۔ جوش کو پڑھو گے تو وہ زندگی کو پھول والوں کی گلی اور چمپا کلی سمجھ کر برتتا دکھائی دے گا۔ فراق سوچ اور اداسی میں گھرا ہے۔ اقبال اسے رواں دواں اور پیہم قرار دیتا ہے۔ زندگی کا یہ سفر ابھی تمہیں بہت کچھ سکھائے گا۔ دھوپ چاٹنے کے بعد چاندنی اگلنا ہی تمہارا اصل کمال ہوگا۔'' وہ اسے انوکھے اور چشم کشا حقائق سے روشناس کراتے رہے۔

ان چند نصائح پر عمل کرنے کا آغاز کیا تو اسے خود بخود ہی اپنے کلام میں ایک واضح تبدیلی آتی محسوس ہونے لگی۔ عدم اطمینانی مکمل طور پر ختم تو نہ ہوئی تھی تاہم اس میں کسی قدر کمی ضرور واقع ہوئی تھی۔

اس نے اعتماد سے اپنی تخلیقات کالج کے مجلہ 'الغازی' میں دے دیں۔

☆......☆

''یہ محسن نقوی کون ہے بھئی ہمارے کالج میں؟'' الغازی میں کلام کی اشاعت کے بعد اکثریت کی نوک زباں پر یہی سوال تھا۔

''کوئی نیا لونڈا امائیگریٹ ہو کر آیا ہے کیا؟'' دوسرا

www.PakiBooks.Site

طالبعلم استفسار کرتا۔

''ارے نہیں بھئی، محسن نقوی اپنا غلام عباس ہے۔'' اس انکشاف پر مقابل ایک پل کے لیے ساکت رہ جاتا۔

''وہی غلام عباس جس کے بال گھنگریالے ہیں اور محفل میں بیٹھ کر قہقہہ لگائے تو ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے ساتھ بیٹھے شخص کی گود میں جا گرتا ہے۔'' بے یقینی کے اس مظاہرے کا جواب مثبت میں ملتا۔

''واللہ! اس قدر دلفریب اور اعلیٰ شاعری..... ذرا اٹھان تو دیکھو اس قطعہ کی۔

چاندنی کارگر نہیں ہوتی
آوارگی مختصر نہیں ہوتی
ان کی زلفیں اگر بکھر جائیں
احتراماً سحر نہیں ہوتی

''خوب ہے!'' مقابل نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''لیکن مجھے تو اس غزل کی گہرائی اور اسلوب نے گھائل کر دیا ہے۔ ہر ایک لفظ گویا نگینہ ہے۔

''قبول کر لے اے جہان کہنہ مزاج
میں دے رہا ہوں تجھے اک نئی غزل کا خراج
غریب شہر کی عصمت نہ بک رہی ہو کہیں
عجیب شور سنا ہے فصیلِ شہر پہ آج
تم اپنے ذہن کی تنہائیوں میں چھپ جاؤ
کہ ہو چلا ہے بہت عام خودکشی کا رواج
لبوں کو سی کے گنہگار گفتگو ٹھہرا
اسی کا نام ہے دنیا، اسی کا نام سماج
میں کس طرح کسی رستے میں سر اُٹھا کے چلوں
کہ میرے سر پر تو رکھا ہے خواہشات کا تاج
اتر گیا میرے وجدان کی تہوں میں مگر
وہ رکھ سکا نہ مرے ڈوبتے شعور کی لاج
مری غزل سے ہی پہچان لو مجھ کو محسن
مری غزل سے جھلکتا ہے میرے فن کا مزاج''

ہر گزرتے دن میں شاعری کی اشاعت اور مقبولیت میں اضافے کے ساتھ غلام عباس کا نام کہیں پس پشت جانے لگا۔ اب 'محسن نقوی' ہی اس کی شناخت بن گیا تھا۔ منہ زور تو اناجذبوں کی روانی سے گندھے اشعار ہر دل کی دھڑکن بنتے چلے گئے۔ نوجوان طالبعلم محسن نقوی کے تخیل کی دھوم زبان زد عام تھی لیکن خود غلام عباس کی دھڑکنیں کسی اور ہی لے پر محوِ رقص ہو چلی تھیں۔ اس کی زندگی میں ایک 'قاتل جذبہ' نے اس قدر خاموشی سے سیندھ لگائی تھی کہ وہ کوئی بھی مزاحمت ہی نہ کر سکا۔ محبت بہت طمطراق سے اس کا وجود اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔

یوں کسی مہ جبیں کے چہرے پر
کھیلتی ہے شباب کی لالی
جیسے ساون کی اودی چھاؤں میں
رقص کرتا ہے سندھ کا پانی

محبت ایک ایسا خودسر جذبہ ہے جس کی روانی میں مضبوط سے مضبوط انسان بھی خس و خاشاک کی طرح بہہ کر اپنی قوت ارادی اور سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔ اس مرض میں گرفتاری کے بعد خود فریبی کا روگ سب سے پہلے لاحق ہوتا ہے۔ مسائل اور مشکلات سے یکا یک 'انسیت' کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ اس بارش میں بھیگتا ہر بشر مور کی طرح رقصاں اپنی خوش قسمتی پر نازاں رہتا ہے۔ غلام عباس بھی پور پور گرفتارِ محبت تھا۔ اس کے قلم کی روانی پارے کی طرح مچلتی جذبات کی انوکھی مدوجزرانہ کیفیات کو بیان کرتیں تو پڑھنے والے پر بھی بے خودی طاری ہو جاتی۔ ان دنوں کامیابی کی دیوی بھی اس پر خوب مہربان تھی۔ اس کے کلام کی شہرت 'زبان و بیان پر گرفت نے کالج کی ادبی سوسائٹی کو بہت جلد متوجہ کر لیا اور پھر ایک روز پروفیسر نے اسے اپنے پاس طلب کر لیا۔

''میں نے تمہیں ایک خاص مقصد کے لیے بلوایا تھا ینگ مین! لیکن ابھی میری ایک الجھن دور کرو۔'' پروفیسر کی بات پر وہ سوالیہ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

''میں اکثر کنفیوژ ہو جاتا ہوں کہ تمہیں غلام عباس کہہ کر مخاطب کروں یا محسن نقوی؟ بحیثیت طالبعلم تو اصل نام سے ہی پکارے جانا تمہارا حق ہے لیکن کیا کروں؟ یہ شناخت تمہیں ایک شوخ و شنگ، شریر اور لاابالی سے لڑکے کا روپ دیتی ہے۔ بات بہ بات قہقہے بکھیرنے والا، یار باش آدمی جسے دنیا کا کوئی غم چھو کر بھی نہیں گذرا مگر تمہارے الفاظ کی انگلی تھامے جس شخص تک پہنچتا ہوں اسے سنجیدگی، بردباری میں بے مثال پاتا ہوں۔ میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوتی ہے جس کا بدن کہنہ سال اور روح زخموں سے چھلنی ہوتی ہے، بڑی مشکل ہے بھئی! بڑی ہی مشکل ہے.....'' ان کے انداز پر وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا۔

''آپ مجھے محسن ہی کہہ لیجیے سر! کالج میں اکثریت

www.PakiBooks.Site

تو میرا اصل نام بھول ہی چکی ہے۔''

''تمہارا کلام میری نظروں سے گذرتا رہتا ہے۔ چاندنی کارگر نہیں ہوتی..... آوارگی مختصر نہیں ہوتی..... ان کی زلفیں اگر بکھر جائیں..... احتراماً سحر نہیں ہوتی..... بھئی واہ! اس قطعہ کے بعد تو مانو چراغوں میں روشنی ہی نہ رہی۔ کسی بھی زاویے سے ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ تم اس میدان میں نووارد ہو۔''

''نووارد کہاں سر جی! پہلا شعر مڈل اور پہلی غزل میٹرک میں لکھی تھی۔ لکھنے کے بعد پہلے تو بہت خوشی سے انہیں سنبھال کر رکھتا کہ میں نے بہت بڑی توپ چلا دی ہے۔ کچھ عرصہ بعد اسے دوبارہ پڑھتا تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے۔ ان کاغذات کی کشتیاں اور جہاز بنا دیتا تھا۔'' اس کے شریر انداز نے پروفیسر کو بھی قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا۔

''مجھے تم سے ایسی ہی اُمید تھی۔ ایک سچے اور خالص ادیب کا یہی المیہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی اپنی تخلیق سے مطمئن نہیں ہو پاتا۔ جس روز اسے اپنا کلام یا تحریر کامل تصور ہونے لگے تو وہی لمحہ اس کی قلمی تنزلی اور گمنامی کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔'' وہ اسے بین السطور بہت کچھ سمجھا گئے۔ انہیں اسٹوڈنٹس یونین کے جنرل سیکرٹری، نائب صدر، مشاعروں اور مباحثوں میں حصہ لے کر فتح اور ٹرافیاں سمیٹ کر لانے والے اس نوجوان شاعر سے بہت سی توقعات تھیں اسی لیے مزید کسی تاخیر کے بغیر مدعا بیان کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

''الغازی کا مدیر بننے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

اس پیشکش پر وہ ساکت رہ گیا۔ ''یہ تو بہت بڑی ذمہ داری ہے سر!''

''تمہارے ہنر اور خلوص پر مجھے مکمل اعتماد ہے۔ مشکلات سے ہار ماننے والے نہیں ہو تم۔'' انہوں نے اسے قائل کر کے ہی دم لیا۔

☆.....☆

محلہ سادات کے ایک چھوٹے سے گھرانے کا سپوت غلام عباس 'محسن نقوی' کی ذات کے اسرار میں غائب ہونے لگا۔

اس کا کلام خوشبو کی طرح ہر کسی کے دل و دماغ کو معطر کر رہا تھا۔ زندگی کا یہ نیا روپ اسے حقیقتاً بے حد پسند آیا تھا۔ وہ حالیہ سرگرمیوں سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہوتا رہا۔ الفاظ تو گویا ہمہ وقت اس کے سامنے ہاتھ

سرائیکی وسیب سے تعلق رکھنے والے محسن نقوی نے مادری زبان میں بھی کئی غزلیں لکھیں جنہیں سرائیکی گلوکاروں نے موسیقی کے قالب میں ڈھال دیا۔ ریڈیو پاکستان ملتان کے مشاعروں سے لے کر ٹی وی پروگرام 'رت رتیلی' کی کمپیئرنگ بھی کی۔ شاعری اور مجالس کے سلسلہ میں وہ اپنوں کی سازشوں کا شکار بھی ہوئے۔ ایک انٹرویو میں محسن نقوی نے ڈھکے چھپے انداز میں عیاں کیا کہ انہیں دو مرتبہ زہر بھی دیا گیا تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ مگر سخت جانی اور قوتِ ارادی کی بدولت وہ زندگی کی طرف واپس پلٹ آئے۔ انہیں اقدام قتل سے لے کر نظر اندازی تو ہین و تذلیل کے کربناک مراحل سے بھی گذرنا پڑا۔

محسن نقوی نے اپنی زندگی خود ہی ایک شہرۂ آفاق نظم میں سمو کر رہتی دنیا کے لیے آئینہ بنا دی۔

میرا نوحہ انہی گلیوں کی ہوا لکھے گی!
میں کہ اس شہر کا سیماب صفت شاعر ہوں
میری تخلیق میرے فکر کی پہچان بھی ہے
میرے حرفوں، میرے لفظوں میں ہے چہرہ میرا
میرا فن اب میرا مذہب، میرا ایمان بھی ہے
میر و غالب نہ سہی، پھر بھی غنیمت جانو
میرے یاروں کے سرہانے میرا دیوان بھی ہے
مجھ سے پوچھو کہ شکست دل و جاں سے پہلے
میرے احساس پہ گزری ہے قیامت کیا کیا
سایہ دار و شب غم کی سخاوت سے الگ
میں نے سوچی قد و گیسو کی علامت کیا کیا
میرے ٹوٹے ہوئے خوابوں کے خرابوں سے پرے
میرے بکھرے ہوئے جذبے تھے سلامت کیا کیا
طنزِ اغیار سے احباب کے اخلاص تک
میں نے ہر نعمتِ عظمیٰ کا لبادہ پہنا
دستِ قاتل کی کشش آپ گواہی دے گی
میں نے ہر زخم قبا سے بھی زیادہ پہنا
میری آنکھوں میں خراشیں تھیں دھنک کی لیکن
میری تصویر نے ملبوس تو سادہ پہنا
ضربتِ سنگِ ملامت میرے سینے پہ سجی
تمغہ جرأت و اعزاز حکومت کی طرح
کھل کے برسی میری سوچوں پہ عداوت کی گھٹا
آسمان سے اترتی ہوئی دولت کی طرح
قریہ قریہ ہوئی رسوا میرے فن کی چاہت
کونے کونے میں بکھرتی ہوئی شہرت کی طرح
میرے آنگن میں حوادث کی سواری اتری
میرا دل وجہ عذاب در و دیوار ہوا

www.PakiBooks.Site

باندھے کھڑے رہتے اور وہ جنبشِ قلم سے انہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتا۔ 'الغازی' کی جانب سے سونپی جانے والی ذمہ داریاں بھرپور طریقہ سے سرانجام دینے سے اسے دوبارہ اس مجلہ کا مدیر مقرر کر دیا گیا۔ اسی دوران بحیثیت کالج یونین صدر اس نے محنت و لگن سے 'فکر جدید نمبر' شائع کیا تو ادبی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ پاکستان بھر کے ادبی حلقے محسن نقوی کے نام سے آشنا ہو گئے۔ کالج میں تو اس کے قد کاٹھ تک پہنچنا اب کسی کے لیے ممکن ہی نہ رہا تھا۔

انہی مصروفیات میں الجھتے ہوئے وہ بی۔ اے کے آخری سال تک آن پہنچا۔ محبت کی سوندھی خوشبو بر کھارت اور چاندنی سے اس کا ناتا ہر گزرتے دن کے ساتھ گہرا ہونے لگا تھا۔ اپنی بے تحاشا مصروفیات سے تھک کر آنکھیں موندتا تو محبت کی خوش رنگ تتلیاں اپنے دلفریب رنگ لیے اس کے ساتھ محو رقص ہو کر وجود کو بادلوں کی طرح ہلکا پھلکا کر دیتیں۔ وہ بے حد خوش تھا اور ازل سے ہی ایسی خوشی پا کر خوش فہمی میں مبتلا ہو جانے والے ابنِ آدم کی طرح وہ بھی ایک تلخ حقیقت بھول گیا تھا کہ یہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو ہمیشہ ہی سے تشنہ رہنا مقسوم قرار پایا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہوا کرتی ہے کہ بظاہر بے حد مضبوط گہرا اور اٹوٹ بندھن درحقیقت اتنا کمزور ہوتا ہے کہ سماج کے متعین کردہ اصول و ضوابط کے سامنے اپنی ایک بھی تاویل کو سند کامیابی عطا نہیں کروا پاتا۔ کہیں امارت و غربت اس کے آڑے آ جاتی ہے تو کہیں ذات برادری اور مسلک اس کی بلند پروازی کو نابود کر دیتے ہیں۔ غلام عباس کے اعتماد پر بھی تقدیر نے بہت اہم موقع پر نہایت کاری وار کیا تھا۔ محبت کے سریلے نغموں کی لے پر جھومتے اسے احساس ہی نہ ہوا کہ قسمت کس طرح ہجر اور جدائی کے پروانے پر دستخط کروانے چلی آئی ہے۔

''مجھے یقین نہیں ہوتا کہ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس کی آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں چبھنے لگی تھیں۔

''ہم نے محبت کی ہی کیوں تھی؟'' اس کے پہلو میں موجود 'سازِ ہستی' بھی سسک اٹھی۔

''غالباً ایک حسین ترین جذبہ کی لذت آشنائی کے لیے۔'' وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''یہ لذت دہرا معیار کیوں رکھتی ہے؟''

''ہاں! سچ ہی کہہ رہی ہو۔ ازل سے ہر دور کا شاعر، ادیب، فنکار حتیٰ کہ عام انسان بھی اسے حسین جذبہ گردانتا ہے لیکن میں آج سے اسے منافق گردانوں گا۔'' وہ تلخ ہونے لگا تھا۔

''ایسا مت کہو خدارا!''

''سچائی سے مزید کب تک منہ موڑے رکھوں؟ حقیقت تو یہی ہے کہ یہ لذت آغاز میں اس قدر شیرینی رکھتی ہے، سماعت میں ایسے رسیلے نغمے گھول دیتی ہے کہ اس کے جلو میں موجود زندگی کی تلخ اور ناگزیر حقیقتوں کی کڑواہٹ اور دو اجنبیوں کے درمیان باہمی رشتے پر دنیا و سماج کی لعن طعن سنائی یا دکھائی ہی نہیں دیتی۔'' وہ دکھ سے کہتا خاموش ہو گیا۔

دو طرفہ خاموشی کا یہ وقفہ طویل ہونے لگا۔ اس دبیز سناٹے تلے انہیں دھڑکنوں کا شور اور تقدیر کی منادی واضح سنائی دے رہی تھی کہ وقتِ جدائی آن پہنچا ہے۔ روح کی گہرائی میں مچلتی صدائیں اس لمحہ کائنات کی گردش تھم جانے کے لیے دعا گو تھیں لیکن زخمی پندار، شکستہ دل اور پارہ پارہ انا نے ان التجاؤں کو کچھ اور ہی روپ دے دیا۔

''ہم آج کے بعد اجنبی بن جائیں گے۔''

''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔'' وہ بھی بے نیازی سے بولا۔ ''نئی زندگیوں کی بنیاد رکھتے ہوئے پرانے رشتوں کا گارا اور مٹی تو نہیں لگائی جا سکتی ناں!''

قیامت خیز گھڑیاں جھیلنے کے بعد وہ بوجھل دل لیے جب رخصت ہوئے تو وہاں موجود ہر مظہرِ فطرت بھی ایک اور رشتہ کو بے موت مرتے دیکھ کر اداس تھا۔ اس افسردگی کے باوجود ان کی کہنہ سال آنکھیں جانتی تھیں کہ اجنبی بن کر سب کچھ فراموش کر دینے کے دعوے بھرم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جدائی کا زہر پی کر لوٹ جانے والے وہ بے خبر کہاں جانتے تھے کہ یہ تشنہ محبت ان کی زندگیوں میں خلش، کسک اور کبھی سہانی یاد بن کر سمائی رہے گی۔ وہ بلاشبہ زندگی کی نئی راہیں متعین کر کے الگ دنیا بسا لیں گے لیکن ان کی روح یہیں اسی مقام پر ٹھہری رہے گی۔ کسی ضدی بچے کی مانند مچلتی اپنا من پسند کھلونا نہ مل پانے پر اداس اور مضطرب رہے گی۔ ہزارہا نعمتوں کے ملنے پر بھی 'ناموجود' کی کسک تادمِ آخر ان کے وجود سے لپٹی رہے گی۔ وہ دونوں ایک بار پھر آمنے سامنے آئیں گے۔ کسی نئے عذر سے 'کسی ان کہی کا بوجھ ختم کرنے' 'کوئی نئی یاد لینے' وہ دوبارہ ملاقات ضرور کریں گے اور تب جان لیں گے کہ وہ ایک بار پھر جھوٹے بھرم میں جی رہے تھے۔

محبت تو اب بھی مکمل آب و تاب سے برقرار تھی۔

☆......☆

سالانہ امتحان کی آمد اور بحیثیت مدیر غلام عباس اور محسن نقوی نے مکمل خلوص اور لگن سے فرائض سرانجام دینے کا باہمی سمجھوتا کر لیا تو زندگی قدرے سہل محسوس ہونے لگی۔

اس نے اپنے چہرے پر خوشی، بے نیازی، شادمانی اور اطمینان کا ایک نقاب اوڑھ لیا تھا۔ وہ حتی الامکان یہی کوشش کرتا کہ اپنے وجود کی شکستگی کو بذلہ سنجی کے پیرہن میں پوشیدہ رکھے لیکن چاندنی راتوں میں برپا ہونے والے اضطراب کے سامنے وہ ہنوز بے بس تھا۔ بے چینی جب حد سے سوا ہو جاتی تو رقص کرتے الفاظ خود ہی سرنگوں ہو کر اپنی انگلیاں اسے تھما دیتے۔

''میں بھی اُڑوں گا ابر کے شانوں پہ آج سے
تنگ آ گیا ہوں تشنہ زمیں کے مزاج سے
میں نے سیاہ لفظ لکھے دل کی لوح پہ
چھٹکے گا درد اور بھی اس امتزاج سے
انسان کی عافیت کے مسائل نہ چھیڑیے
دنیا الجھ رہی ہے ابھی تخت و تاج سے
گنگا تو بہہ رہی ہے مگر ہاتھ خشک ہیں
بہتر ہے خودکشی کا چلن اس رواج سے
تم بھی مرے مزاج کی لے میں نہ ڈھل سکے
اکتا گیا ہوں میں بھی تمہارے سماج سے''

☆

''دل جلا کر بھی دلربا نکلے
میرے احباب کیا سے کیا نکلے
آپ کی جستجو میں دیوانے
چاند کی رہگذر پہ جا نکلے
سوزِ ہستی بھی جب نہیں باقی
سازِ ہستی سے کیا صدا نکلے
دیکھیے کارواں کی خوش بختی
چاند رہزن بھی رہنما نکلے
یوں تو پتھر ہزار تھے لیکن
چاند گوہر ہی بے بہا نکلے
دل بھی گستاخ ہو چلا تھا بہت
شکر ہے کہ آپ بے وفا نکلے
کس کی دہلیز پر جھکیں محسن
جتنے انسان تھے سب خدا نکلے''

☆......☆

امتحانات سے فراغت پاتے ہی فرصت کی یہ ان چاہی گھڑیاں اسے ایک آزار میں مبتلا کرنے لگیں۔ اہلِ خانہ سے بھی اس کی یہ کیفیت پوشیدہ نہ تھی۔

''غلام عباس! تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟'' والدین نے ایک روز اسے گھیر لیا۔

''میں کیا کر رہا ہوں بھلا؟'' وہ حیران ہوا۔

''پہلے تو صرف راتوں میں جاگ کر کسی بے چین روح کی طرح بھٹکتے رہتے تھے پھر شاعری شروع کر دی اور اب سگریٹ بھی پینے لگے ہو۔'' والدہ نہایت دکھی تھیں۔

''بخدا! ایسا کسی منفی صورتِ حال کی وجہ سے نہیں ہے۔ سگریٹ اور چاندنی کے بغیر تو میری شاعری سانس بھی نہیں لے پاتی۔''

''لیکن اس عشق معشوقی کے جذبات کو لکھتے ہی کیوں ہو؟'' سید چراغ حسین برہم ہوئے۔

''ارے میرے بھولے ابا! میں زندگی اور اس کی ناہمواریوں کو بیان کرتا ہوں۔ وہی میرا اصل میدان ہے۔ عشق معشوقی تو راہ میں آنے والا عارضی پڑاؤ تھا بس۔'' عادت کے مطابق اس نے مذاق کے انداز میں کہا۔

''مستقبل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ خیر سے چودہ جماعتیں پاس کر لی ہیں۔ اب کاروبار کی طرف بھی دھیان دیا کرو۔'' والدہ نے کہا۔

''میں ابھی مزید پڑھنا چاہتا ہوں، گورنمنٹ کالج ملتان سے 'اردو ادب' میں ایم اے کرنا میری پہلی ترجیح ہے۔''

''ٹھیک ہے! تو پھر میری بھی ایک شرط ہے۔ تمہیں وہاں جانے سے قبل شادی کرنی ہوگی۔'' والد کی بات پر اس کے ذہن میں ایک ہی پل میں کسی 'اجنبی' کے ساتھ کیے گئے قول و قرار، شادی اور خوشگوار زندگی کے خواب اجاگر ہو گئے۔

''کس سے شادی کروانا چاہتے ہیں آپ میری؟'' اسے علم تھا کہ والد نے پیشکش نہیں دی بلکہ اپنا فیصلہ سنایا ہے۔

''اپنی بھتیجی، سید خادم حسین شاہ کی نورِ چشم سے۔''

''ٹھیک ہے ابا! جیسے آپ کی مرضی۔ میں اس رشتہ کو مکمل صدقِ دل اور خلوص سے نبھاؤں گا۔'' پھر اس نے

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

وہی انداز اختیار کیا۔ والدین جانتے تھے کہ وہ ہر بات کو پُر مزاح انداز میں کہنے کا عادی ہے پھر بھی اس کے اقرار پر والدین کے تناؤ زدہ وجود اور مضطرب چہروں پر فصلِ بہار نے ڈیرے جمالیے۔

عقدِ نکاح میں بندھنے کے بعد وہ 1968 میں 'گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان' کا حصہ بن گیا۔ ملتان میں آمد کے ساتھ ہی نت نئی ہنگامہ خیزیاں اور تسخیر کے انوکھے آسمان اس کے منتظر تھے۔ اس کی شہرت اور خداداد صلاحیتوں کی دھوم آمد سے قبل ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔ 'گلگشت کالونی' کے ہاسٹل میں رہائش پذیر غلام عباس کا نام اب خال ہی کسی کی زبان پر آتا تھا۔ اکثریت کے لیے اب وہ صرف 'محسن نقوی' تھا۔

دورانِ ایم اے نہایت قلیل عرصہ میں وہ راتوں رات ہی شہرت کی بلندیاں چھونے لگا جس کی وجوہات بھی ہرگز معمولی نہ تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب انوار احمد' فخر بلوچ' صلاح الدین حیدر' اصغر ندیم سید اور خالد شیرازی جیسے باہنر افراد بھی بدترین معاشی حالات کا سامنا کررہے تھے۔ عالم یہ تھا کہ خالد شیرازی کو اپنی ایک آدھ غزل فروخت کرنی پڑتی یا کسی مقامی لیڈر کی فرمائش پر اخبارات میں نمایاں ہونے کے لیے 'بیان' لکھ کر دینے پر اونٹ کے منہ زیرے کے مترادف معاوضہ مل جاتا اور وہ سب دوست 'نواں شہر' کے بس اسٹینڈ میں بیٹھ کر گزر کرلیتے۔ ایسے حالات میں محسن نقوی کے پاس سلامی میں ملنے والے ویسپا اسکوٹر کی موجودگی ہرگز نظر انداز کیے جانے کے قابل نہ تھی۔ کالج میں دو اساتذہ کے علاوہ یہ سہولت کسی اور کو میسر بھی تو نہ تھی۔ محسن نقوی دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہوگیا کیونکہ وہ نہ صرف خود سگریٹ اور چائے پی سکتا تھا بلکہ اپنی کشادہ پیشانی کو پُرشکن کیے بغیر حلقہ احباب کو بھی ان 'آسائشات' سے مستفید کردیا کرتا۔ غزل گو شاعر ہونے کی بدولت صنفِ نازک ہمہ وقت اس کی توجہ کی طالب رہتیں۔ ساتھی لڑکوں کے لیے متاثر ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے پڑھنے کا انداز منفرد تھا۔ پڑھتے وقت اس کی مسکراہٹ مداحوں اور حریفوں کو یکساں طور پر گھائل کردیتی تھی۔ ملتان کے ادبی افق پر اسلم انصاری' ارشد ملتانی' عاصی کرنالی' حزیں صدیقی' حیدر گردیزی کے بعد محسن نقوی سب سے روشن ستارہ بن گیا۔ اسے مشاعرے میں سننا عوام کی اولین ترجیح بننے لگی۔

ملتان کی ادبی' ثقافتی اور سیاسی زندگی میں اس وقت بے حد ہلچل تھی اور یہ تمام تر کیفیت بڑی سرعت سے محسن میں بھی منتقل ہوگئی۔ ملک میں سیاسی گہما گہمی عروج پر تھی۔ سالہا سال سے جاری آمریت عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز کرچکی تھی۔ آمر کے اقتدار کو للکارنے اور اپنے بنیادی سیاسی حقوق کی بحالی کے لیے محسن نقوی بھی قلم کو شمشیر بنائے میدان میں اتر آیا اور جلد ہی 'صدر ایوب خان' کے خلاف مضامین اور نظم لکھنے کی پاداش میں اسے گرفتار کرلیا گیا۔

''اپنی جوانی پر ترس کھاؤ لڑکے! ابھی تو تمہارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔'' اس کا سادات گھرانے سے تعلق پولیس افسر کے دل میں نرم گوشہ بنا چکا تھا۔

''ارے صاحب! اشیائے خورونوش سے تو ایک عالم بھرا ہے۔ جب اتنا کچھ موجود ہو تو پھر ترس بھی بھلا کوئی کھانے کی چیز ہے؟'' اس کے لبوں پر مخصوص مسکراہٹ اور آنکھوں میں شریر چمک تھی۔

''لگتا ہے جوانی کا خمار کچھ زیادہ ہی سر چڑھ گیا ہے اس لیے شیر کی کچھار میں داخل ہونے کی حماقت کررہے ہو۔ ایک برادرانہ مشورہ دیتا ہوں۔ اپنی شاعری کو مشاعروں اور کالج کے میگزینز تک محدود رکھ کے لوگوں سے واہ واہ سمیٹتے رہو۔ سیاسی جرم کا ٹھپا ایک بار لگ گیا تو ناکردہ گناہوں میں بھی دھر لیے جانے کے امکان بنے رہیں گے۔''

''اب آپ اتنے پیار سے چھوٹا بھائی سمجھ کے مشورہ دے ہی رہے ہیں تو اتنا حق مجھے بھی ہونا چاہیے کہ بڑے بھائی کے سامنے دل کی بات کہہ سکوں۔ دیکھو بڑے بھائی! زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اس لیے میں اسے بھرپور طریقہ 'دلیری' بے باکی اور حق گوئی سے جینا چاہتا ہوں۔ مجھے آمر کا خوف ہے' نہ اس کی جانب سے کسی سزا کا اور یہ بھی جان لیجیے کہ آمر کے اقتدار کا سورج اب کسی بھی وقت غروب ہونے کے لیے تیار ہے...... کیا سمجھے؟''

''سمجھ گیا بیٹا! سب کچھ سمجھ گیا...... مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم نئی سیاسی پارٹی کے متاثرین میں سے ہو۔'' افسر مسکرایا۔

''تو کیا غلط ہوں؟'' وہ بے خوفی سے بولا۔ ''میں تو پارٹی کے قائد کا اسی روز مرید بن گیا تھا جب مجھے خبر ملی تھی کہ اس نے پاکستان کے خلاف نازیبا کلمات ادا کرنے پر 'ہمسایوں' کے وزیرِ خارجہ کو طمانچہ رسید کردیا تھا۔ اس روز میرے دل نے کہا تھا کہ یہ شخص تیرے ہی قبیلے کا ہے۔

اس کا رستہ پکڑلے۔'' پولیس افسر اس جوانی سے بھرپور شاعر کی آواز میں لاکھوں افراد کی صدائیں محسوس کرکے معنی خیز انداز میں سر ہلا کے رہ گیا۔

☆......☆

سیاسی سرگرمیوں اور کالج کے رسالہ 'نخلستان' کے ایڈیٹر کی کرسی سنبھالے محسن نقوی کا سفر کامیابی سے جاری تھا۔

کچھ عرصہ مزید گذرا تو حلقہ احباب نے اسے اپنا مجموعہ کلام کتابی شکل میں شائع کروانے کے لیے اصرار شروع کردیا۔ یہ وہ دور تھا جب تمام دوست سرِ شام ہی کسی نہ کسی کیفے میں محفل جما لیتے اور پھر رات گئے تک ادبی میدان میں عظیم کارنامے سرانجام دینے کی باتیں سوچتے' نت نئے منصوبے بنا کر ایک دوسرے کی خوب کھنچائی کرتے۔ ایسی ہی ایک محفل میں کسی دوست نے سنجیدگی سے کہا۔

''یارو! ہم کب تک یونہی شیخ چلی کے منصوبے بناتے رہیں گے؟ اب کچھ کر دکھانے کے لیے بھی تیار ہونا چاہیے کہ نہیں؟''

''بات تو سولہ آنے ٹھیک ہے لیکن کریں بھی تو کیا؟'' ایک اور ساتھی نے کہا۔

''ارے! یہ اپنا محسن نقوی آخر کس مرض کی دوا ہے؟ اس سے پوچھو ذرا کہ اپنا شعری خزانہ کالج کے میگزین میں اور عمرو عیار جیسی زنبیل میں کب تک چھپا کے رکھے گا؟ اسے قبر میں ساتھ لے جانے کا ارادہ ہے کیا؟ اپنا مجموعہ کلام کتابی شکل میں شائع کروانے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتا؟''

''ابھی تو کسی بینک میں ڈکیتی مارنے کے منصوبہ کو حتمی شکل دے رہا ہوں۔ اس میں کامیابی ملتے ہی پہلا کام کتاب کی اشاعت کا کروں گا۔'' اس کے بے ساختہ انداز پر وہ محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

''ہم یہ کام اپنی مدد آپ کے تحت بھی تو کرسکتے ہیں۔'' دوست اب بھی اپنے موقف پر قائم تھا۔

''فاقہ مستی اور تنگدستی کے اس دور میں ہم یہ کام کیسے کرپائیں گے بھلا؟'' محسن قدرے سنجیدہ ہوا۔

''آپس میں مل ملا کے چندہ جمع کرتے ہیں اور پہلے پہل ذرا کم تعداد میں کتاب منظرِ عام پر لے آتے ہیں۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ یہ کاوش ادبی فضاء میں ارتعاش پیدا کردے گی۔'' بات معقول تھی۔ محسن کے دل میں گھر کرگئی۔ انہوں نے حسبِ استطاعت چندہ جمع کیا اور 'بندِ قبا' بازار میں لے آئے۔

☆......☆

خوشبو کی سرد لہر سے جلنے لگے جو زخم
پھولوں کو اپنا بندِ قبا کھولنا پڑا

ایک ہزار کی تعداد میں شائع کیا گیا یہ شعری کلام توقعات کے برعکس ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔ ملک بھر کے ادبی جریدوں میں ہونے والے تبصروں نے ان بھی دوستوں کا خون کئی سیر بڑھادیا۔ محسن نقوی کی یہ کامیابی ان کے لیے بھی کسی تمغہ سے کم نہ تھی۔ نامور اور جغادری ادباء وشعراء انگشت بدنداں تھے کہ ایک کم عمر شاعر نے غزل کے 'طریقہ راسخہ' کو بالکل نظر انداز نہیں کیا بلکہ کلاسیکی غزل کی مشق کرتا ہوا جدید منزل تک آن پہنچا ہے۔ کلاسیکی غزل کی لفظیات کورد کیے بغیر اردگرد کے ماحول سے تشبیہات واستعارے مستعار لیتے ہوئے اس نے ایک عالم پر اپنے الفاظ کا سحر طاری کردیا۔ نقشِ قدم' فصلِ گل' فصلِ خزاں' زنجیر بہ پا' کفِ آئینہ' گُندرو فا' رنگِ حنا' نغمہ جاں' پیمانہ بکف' شامِ غریباں' حسنِ بتاں' اندازِ تغافل اور آبلہ پائی جیسی تراکیب کے ساتھ اس کی غزلوں میں عجمیت کے مقابلہ میں مانوس فضا کی موجودگی ہی اس سحر کی اصل وجہ تھی۔ جدیدیت کے شوق میں غزل کا روایتی توازن بگڑنے نہیں دیا گیا تھا۔ موضوعات روایتی عشق و عاشقی کے علاوہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے حقائق اور معصوم صداقتیں سماجی معنویت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھیں۔ زندگی اور زندگی آموز رجحانات پر مبنی اشعار نے عوامی حلقوں میں ارتعاش برپا کردیا۔

مزاجِ عظمتِ آدم کی بات ہے ورنہ
زمیں کا ظلم ترے آسماں سے کم تو نہ تھا

☆

اک طرف سیم وزر کے بستر پر
زندگی کروٹیں بدلتی ہے
اک طرف مفلسی کے دوزخ پر
آدمیت کی لاش جلتی ہے

محسن نقوی کا مخصوص لب ولہجہ ذہنی خلوص کا غماز بن کر قارئین کو گرویدہ بناتا چلا گیا۔

یہ اندھیرا یہ روشنی کیا ہے

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

آؤ سوچیں کہ زندگی کیا ہے
ہر قدم پرفریب دیتے ہو
بندہ پرور یہ دوستی کیا ہے
اپنے دامن تار تار کو دیکھ
مجھ سے مت پوچھ کہ آگہی کیا ہے
آ مجھے اپنے شہر میں لے چل
اے مری موت سوچتی کیا ہے
چاند پر جا کے ہم بھی سوچیں گے
یہ سہانی سی چاندنی کیا ہے
دل صداؤں میں کھو گیا محسن
میں نے پوچھا تھا خامشی کیا ہے

گورنمنٹ کالج ملتان کے اس شوخ و شریر طالبعلم کی حق گوئی اور بے باکی کا یہ عالم تھا کہ وہ برملا کہتا۔

مرے مزاج پر حیراں ہے زندگی کا شعور
میں اپنی موت کو اکثر گلے لگا کے ملا
میں زخم زخم بدن لے کے چل دیا محسن
وہ جب بھی اپنی قبا پر کنول سجا کے ملا

اس کی سچائی کی خوشبو الفاظ کی صورت میں ہرسو پھیلی تو نقاد بھی اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ:

''محسن نقوی منافقتوں کے بے آب وگیاہ صحراؤں کے درمیان ٹھنڈے میٹھے پانیوں والے نخلستانوں کا سفیر ہے۔ بند قبا میں اس کی شاعری کا نقش اول ہے یقین ہی نہیں آتا۔ وہ ابتداء سے ایسا پختہ کار کیسے تھا؟ حیرت ہے۔ بند قبا کی غزلوں میں وہ سب کچھ ہے جو اچھی اور سچی شاعری میں ہونا چاہیے۔ ان اوراق سے گذرنا ایک انوکھی سیاحت ہے۔''

☆......☆

شہرت، عزت اور ہردلعزیزی کا ایک نیا امرت نوش کر لینے کے باوجود محسن کی سیاست میں دلچسپی کم نہ ہو سکی۔

'پیپلز پارٹی' میں دلچسپی تو روز اول سے ہی تھی۔ 1969 میں ملتان میں 'پی ایس ایف' کی بنیاد رکھنے کا غلغلہ اٹھا تو وہ ہراول دستے میں شریک تھا۔ محسن نقوی نہ صرف دل وجان سے 'قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو' کی دبنگ شخصیت اور سیاسی بصیرت پر فدا تھا بلکہ برملا ایک ہی بات دہرایا کرتا تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح کے بعد اسے بھٹو کے علاوہ کوئی اور رہنما یا سیاسی شخصیت متاثر نہیں کر پائی۔

ذوالفقار علی بھٹو نے جب بھی ملتان کا دورہ کیا، وہ طلبہ کے دستوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلتا۔ انہی دنوں ملتان ڈویژن (بشمول ڈیرہ غازی خان) پارٹی کے جلسوں میں اپنی شعلہ بیاں نظموں سے محسن حاضرین کا دل گرما دیتا تھا۔ 'امروز' میں کالم نگاری کے علاوہ حنیف رامے صاحب کے پرچے 'نصرت' اور مولانا کوثر نیازی کے 'شہاب' میں بھی اس کی نظمیں و مضامین اسی دور میں تواتر سے شائع ہوتے رہے۔ حلقہ احباب اس کی یہ رفتار اور جنون دیکھ کر حیران ہونے لگے تھے۔

''محسن میاں! اتنا تیز مت بھاگو۔ منہ کے بل گر جاؤ گے۔'' اسے مشورہ دیا جاتا۔

''کیسے گروں گا بھئی؟ میری نظریں آسمان کی بجائے زمین پر ہوں گی تو گرنے کا کیا سوال؟'' وہ اطمینان سے کہتا۔

''بند قبا کی کامیابی ہی کیا کم تھی جو سیاست کے خارزار میں بھی نمایاں ہو چلے ہو۔ حاسدین سے بچ کے رہنا بس اب۔''

''جب اللہ میرے ساتھ ہے تو خوف کس بات کا؟ اگر اس ذات اقدس نے مجھے ایک خوبی سے نوازا ہے تو میں اس کا سچائی اور دیانت داری سے استعمال کرنا ترک نہیں کر سکتا۔ باقی رہے حاسدین! تو ان کے لیے میں جلد ہی ایک اور دھماکا کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ جلد ہی اس پر فیصلہ بھی کر گذروں گا۔''

''بہت خوب! پروردگار تمہیں ڈھیروں کامیابیاں نصیب فرمائے۔''

ایم اے کی پڑھائی اپنے اختتامی مراحل تک پہنچنے والی تھی۔ کالج انتظامیہ کی جانب سے اس کی شاعری کے اعزاز میں گولڈ میڈل نوازا جا چکا تھا۔ اپنی اس کامیابی پر خوشی سے جھومتے محسن نے ان دنوں ایک نیا معمول اختیار کر لیا تھا۔ اسے جہاں کہیں بھی شعراء اور ادباء کی محافل جمنے کی خبر ملتی، وہ اپنے ویسپا پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتا۔ اچھی شاعری سننے اور اپنے اندر جذب کرنے کی تشنگی اسے کسی پل بھی چین سے نہ رہنے دیتی۔

☆......☆

سن 1970 کا سفر جاری تھا۔

اہلخانہ کو توقع تھی کہ پڑھائی مکمل ہوتے ہی ان کا 'غلام عباس' اپنے آشیانے میں لوٹ آئے گا لیکن بہت جلد ان پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ غلام عباس تو جانے کب سے خاموشی کی ردا اوڑھے اسرار کے جنگل میں روپوش ہو چکا ہے۔ اب تو صرف 'محسن نقوی' ہی کا غلبہ نظر آتا تھا جو ہمہ وقت کسی تند بگولے کی زد میں رہتا۔ اسے ہر کام جلد از جلد نمٹا لینے کی جانے کیا عجلت درپیش رہتی تھی۔ خلوص، لگن اور سچائی کو ہمراہی بنائے وہ شاعری کے میدان کا راہی بن کر رہ گیا تھا۔ شہر کے ادبی مجادلوں اور مشاعروں میں اس کی شرکت ناگزیر ہوا کرتی تھی۔ وہ کسی بھی طور کاروبار سنبھالنے کی طرف آتا ہی نہیں تھا۔

''پڑھائی ختم ہو چکی، خواب مکمل ہو گیا، شہرت بھی خوب کمالی۔ اب کچھ کاروبار کی طرف بھی دھیان دے لو۔'' والد اور چچا نے ایک روز اسے گھیر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کی یہ برہمی جائز ہے اور جلد یا بدیر ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے بھی وہ ذہنی طور پر تیار تھا۔

''میں مجبور ہوں۔''

''کس بات کی مجبوری ہے، آخر ہم بھی تو جانیں۔ خدانخواستہ غبی ہو؟ معذور ہو؟ یا نکھٹو ہو؟'' والد نے برہم ناراضگی جتائی۔

''میں الفاظ کے جنگل میں گھر چکا ہوں۔ آنکھیں تو کیا بھی حواس اس جنگل کی تاریکی اور بھول بھلیوں کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ ڈرتا ہوں اس مدار سے باہر نکلا تو اپنا وجود، اعتماد اور شناخت سب کچھ کھو بیٹھوں گا۔''

''بہت خوب! یہ تو واقعی ہمارے لیے ایک خبر ہے کہ محسن نقوی کسی بات سے خائف بھی ہوتا ہے۔'' چچا نے کہا۔

''ہاں بھئی! ورنہ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ وہ بڑے بڑے سیاسی جلسوں میں بے باک شاعری کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔'' والد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

''آپ کے یہ سب گلے شکوے بجا! لیکن میں کاروبار کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر گھٹن زدہ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اللہ زندگی نصیب کرے! اظفر گریجویٹ ہو جائے... وہ مجھ سے کہیں زیادہ قابل اور بااعتماد ثابت ہو گا۔''

''مگر میرا سوال اب بھی برقرار ہے۔ تم کیوں نہیں؟'' ''ہاں'' کہا۔

''ہر انسان کو پروردگار نے کوئی نہ کوئی خوبی ودیعت کر کے اس دنیا میں بھیجا ہے۔ میرا ہنر الفاظ ہیں۔ میں انہی کے ساتھ زندگی بھر خوش رہ سکتا ہوں اور اب وقت آ گیا ہے کہ میں ذاکر و خطیب کی حیثیت سے ایک نئی زندگی کے آغاز کے فیصلہ کو عملی جامہ پہنا دوں۔'' اس کے انکشاف پر حاضرین خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوئے اور پھر بے طرح آبدیدہ ہو گئے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی مہار مذہبی شاعری کی طرف موڑتے ہوئے خود محسن نقوی کو بھی کہاں علم تھا کہ مستقبل قریب میں ہی اسے 'میر انیس' سے تشبیہ دی جانے لگے گی۔ اپنے قلم کو نئی جولانی ملتے ہی وہ مستقبل کی کسی بھی سوچ سے بے نیاز عقیدت و احترام کے موتی صفحہ قرطاس پر بکھیرنے لگا تو اس کا کلام مجلس عزا، ذاکرین اور علماء میں زبان زد عام ہو گیا۔

اے رب جہاں پنجتن پاک کا صدقہ
اس قوم کا دامن غم شبیر سے بھر دے
بچوں کو عطا کر علی اصغر کا تبسم
بوڑھوں کو حبیب ابن مظاہر کی نظر دے
کم سن کو ملے ولولہ عون و محمد
ہر ایک جواں کو علی اکبر کا جگر دے
ماؤں کو سکھا حضرت زینب کا سلیقہ
بہنوں کو سکینہ کی دعاؤں کا اثر دے
مولا تجھے زینب کی اسیری کی قسم ہے
بے جرم اسیروں کو رہائی کی خبر دے
جو چادر زینب کی عزادار ہیں مولا
محفوظ رہیں ایسی خواتین کے پردے
جو دین کے کام آئیں وہ اولاد عطا کر
جو حضرت شبیر کی خاطر ہو وہ گھر دے
مفلس پہ زور جواہر کی ہو بارش
مقروض کا ہر قرض ادا غیب سے کر دے
غم کوئی نہ دے ہم کو سوائے غم شبیر
شبیر کا غم بانٹ رہا ہے تو ادھر دے

اثائی شاعری کے علاوہ محسن نے حمد و نعت کی صنف پر قلم اٹھایا تو ایک سے بڑھ کر ایک لازوال شہ پارے تخلیق کر دیے۔

اے عالم نجوم و جواہر کے کردگار!
اے کار ساز دہر و خداوند بحر و بر
ادراک و آگہی کے لیے منزل مراد
بہر مسافران جنوں حاصل سفر!
یہ برگ وبار شاخ و شجر تیری آیتیں
تیری نشانیاں ہیں یہ گلزار و دشت و در
یہ چاندنی ہے تیرے تبسم کا آئینہ

www.PakiBooks.Site www.PakiBooks.Site

پر تو ترے جلال کا بے سایہ دوپہر!
موجیں سمندروں کی تری رہگور کے موڑ
صحرا کے پیچ و خم' ترا شیرازہ ہنر!
اجڑے دلوں میں تری خوشی کے زاویے
تابندہ تیرے حرف' سرِلوح چشم تر
موج صبا' خرام ترے لطفِ عام کا
ترے کرم کا نام' دعا در دعا' اثر
اے عالمِ نجوم و جواہر کے کردگار
پنہاں ہے کائنات کے ذوقِ نمو میں تو
تیرے وجود کی ہے گواہی چمن چمن!
ظاہر کہاں کہاں نہ ہوا رنگ و بو میں تو
مری صدا میں ہیں تری چاہت کے دائرے
آباد ہے سدا مرے سوزِ گلو میں تو
اکثر یہ سوچتا ہوں کہ موج نفس کے ساتھ
شہ رگ میں گونجتا ہے لہو' یا لہو میں تو؟
اے عالم نجوم و جواہر کے کردگار!
مجھ کو بھی گرہ شام و سحر کھولنا سکھا!
پلکوں پہ میں بھی چاند ستارے سجا سکوں
میزان تحس میں مجھ کو گہر تولنا سکھا
اب زہر ذائقے ہیں زبان حروف کے
ان ذائقوں میں 'خاک شفا' گھولنا سکھا
دل مبتلا ہے کب سے عذابِ سکوت میں
تو ربِ نطق قلب ہے' مجھے 'بولنا' سکھا

☆......☆

شاعری' سیاست' ذکر وخطابت میں کامیابی در کامیابی محسن کا مقدر بن رہی تھی۔

ان کامیابیوں کو سمیٹتے وہ المناک حادثوں سے بھی دوچار ہوا۔ سن اکہتر کے اختتام پر 'سقوط ڈھاکا' نے صرف اسے ہی نہیں' ہر حساس اور دردمند پاکستانی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ملک دولخت ہوگیا اور مغربی پاکستان کی عنان اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کو مل گئی۔

ملکی سالمیت بٹ جانے کا سانحہ ہی کم نہ تھا کہ آٹھ مارچ 1972 میں شفیق اور کسی چھتنار درخت سا وجود رکھنے والے والد نے بھی زندگی سے منہ موڑ لیا۔ یہ وقت اس کے لیے بے حد کٹھن تھا۔ والدہ کی محبت اور مخلص شریکِ حیات نے اس موڑ پر اسے منتشر ہونے سے بہت محفوظ رکھا لیکن کچھ درد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کوئی درماں نہیں ہوتا۔ زندگی کا کوئی بھی موڑ ہو' والد کا سایہ سر سے اٹھ جانا انسانی ترجیحات و معیار بہت سی تبدیلیاں پیدا کردیتا ہے۔ برس ہا برس کی عادات ترک کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ سید چراغ حسین شاہ نقوی کی وفات پر محسن کی ذہنی کیفیت بہت دگرگوں تھی۔ وہ اپنے معمولاتِ زندگی تبدیل کرنے کا خواہاں تھا لیکن مزاج کی سیلانیت پر بند باندھنے سے خود کو مکمل قاصر پا رہا تھا۔ اس کے وجود میں سمایا پارہ ہمہ وقت متحرک رہنے کے لیے بے تاب رہتا۔

وقت کے پلوں تلے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ محسن کی الجھنیں اور بے بسی تا حال لاینحل تھی۔ ایک روز وہ اپنے ماموں زاد بھائی 'سید علی شاہ نقوی' کے ساتھ لاہور روانگی کے لیے محوِ سفر تھا۔ اس کی کیفیت علی سے بالکل پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''کیا بات ہے یار؟ کوئی مسئلہ یا پریشانی ہے تو میرے ساتھ بانٹ لے۔''

''پریشانی تو کوئی بھی نہیں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

تو پھر اتنے مضطرب کیوں رہتے ہو؟''

''یہ بھی علم نہیں۔ بس دل چاہتا ہے کہ چاندنی ہمراہ لیے سفر گردی میں محو رہوں۔''

''اس روگ کا آخر کیا علاج ہے؟''

''میں کیا جانوں؟! اگر علم ہو جائے تو سب کچھ ٹھیک نہ کرلوں۔'' محسن نے ماچس کی چند تیلیاں تھام لیں۔ وہ لمحات بہت خاص تھے۔ ماچس کی ننھی تیلیوں کو ساز کی طرح بجاتے ہوئے اس نے کسی وجد کے عالم میں تخلیق کے ایک نئے کرب سے گذرتے ہوئے ایک شہ پارہ کو جنم دیا۔

یہ دل یہ پاگل دل مرا کیوں بجھ گیا آوارگی
اس دشت میں اک شہر تھا وہ کیا ہوا آوارگی
کل شب مجھے بے شکل کی آواز نے چونکا دیا
میں نے کہا تو کون ہے اس نے کہا آوارگی
لوگو بھلا اس شہر میں کیسے جئیں گے ہم جہاں
ہو جرم تنہا سوچنا لیکن سزا آوارگی
یہ درد کی تنہائیاں یہ دشت کا ویراں سفر
ہم لوگ تو اکتا گئے اپنی سنا آوارگی
اک اجنبی جھونکے نے جب پوچھا مرے غم کا سبب
صحرا کی بھیگی ریت پر میں نے لکھا آوارگی
اس سمت وحشی خواہشوں کی زد میں پیمان وفا
اس سمت لہروں کی دھمک کچا گھڑا آوارگی

www.PakiBooks.Site

کل رات تنہا چاند کو دیکھا تھا میں نے خواب میں
محسن مجھے راس آئے گی شاید سدا آوارگی

یہی تو اس کا المیہ تھا...... وہ کسی بنجارے کی مانند قریہ قریہ اور کسی بادل کی مانند ہوا کی رتھ پر سوار اپنی روح کی تسکین چاہتا تھا۔

☆......☆

محسن نقوی کی شاعری' سیاست اور خطابت کا توازن خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔

ملک میں انتخابی مرحلہ نزدیک تر تھا اور عوامی جوش و خروش سوا نیزے پر تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو اس کی سیاسی لگن کے بہت مداح تھے۔ انہوں نے ڈیرہ غازی خان میں قومی اتحاد کے قائد 'مفتی محمود' کے مقابلے میں اسے 'ایم این اے' کا ٹکٹ دے کر سبھی کو انگشت بدنداں کردیا۔ محسن کو بھی یقین تھا کہ وہ اپنی پارٹی کے استحکام اور ملکی بقاء و ترقی کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دے گا۔ عملی سیاست میں اس کی خطابت اور شعلہ بیانی عروج پر نظر آتی رہی۔ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر محسن نے ڈیرہ غازی خان کی سیٹ سے مولانا مفتی محمود کے مقابلے پر الیکشن لڑنا تھا جہاں سے اس پارٹی کو کبھی بھی جیت نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس وقت ایک بات نوشتہ دیوار تھی کہ مولانا کو عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ غلام عباس المعروف محسن نقوی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ہجوم کی نبض اپنے ہاتھ میں تھام لیا کرتا۔ شاعری' بذلہ سنجی' توانا لہجہ اور للکار سے حاضرین کے دل گرما جاتے۔ فتح بظاہر بہت قریب تھی لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شد! ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر انہیں پابند سلاسل کردیا گیا۔ ملک میں ایک دفعہ پھر آمریت نافذ ہو چکی تھی۔ محسن کے لیے وہ وقت بہت کربناک تھا اور ہوتا بھی کیوں نہ؟ اس کی تقدیر بھی جانے کیا کھیل کھیلنے پر بضد تھی۔ وہ جس سے بھی محبت کرتا' ناگہاں ہی کسی عفریت کی مانند اس رشتے کو نگلنے کے درپے ہو جاتا۔ قائد عوام کی قید تو ان سب کے لیے ایک اجتماعی سانحہ تھی۔ محسن نقوی سمیت ہزاروں پارٹی کارکنان صدائے احتجاج بلند کرتے' انجام سے بے نیاز اپنے قائد کے لیے ہر حد عبور کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس نے بھی دیگر افراد کی طرح الصیاں کھائیں' انڈر گراؤنڈ ہوا' تشدد برداشت کیا' کئی کئی ماہ پاکستان کی مختلف جیلوں میں گذارے لیکن اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا۔ ایک وعدہ تھا جو ایفا کرنا تھا' ایک امانت تھی کہ جس کا حق ادا کرنا تھا۔ محسن نے بھی سر پر کفن باندھ لیا تھا۔ اسے 1978 میں شائع ہونے والے شعری مجموعہ 'برگِ صحرا' کو ملنے والی پذیرائی بھی دلی خوشی نہ دے سکی۔ اس سمیت بھٹو کے ہر حامی کا مقصدِ حیات صرف اپنے قائد کی رہائی تھا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ لاکھوں دلوں کی تڑپ اور محبت بھی اپریل 1979 میں ہونے والی اس پھانسی کو نہ روک سکی۔

ذوالفقار علی بھٹو اپنی ابدی منزل پر روانہ ہوگئے اور پسماندگان میں خاندان کے علاوہ محسن جیسے ان گنت افراد کو ایک دائمی روگ میں مبتلا کر گئے۔ وہ سانحہ اس کے لیے برداشت کی حدود سے بہت بڑا تھا لیکن وقت کے سامنے کس کی چل سکی ہے؟ زخم کوئی بھی ہو اس کے لیے مندمل ہونا ہی مقسوم قرار پایا جاتا ہے۔ ہاں! مگر کرب و اذیت کی ٹیسیں ان الفاظ کی صورت میں اپنے دائمی نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔

علی کی ذوالفقار تھا' وطن کا افتخار تھا
وہ زندگی کے گلستاں میں بے خزاں بہار تھا
وہ راہنمائے مملکت وطن کا تاجدار تھا
سرعدو کے واسطے وہ تیغ بے نیام تھا
وہ قائد عوام تھا' وہ قائد عوام تھا
وہ ہنس پڑا تو کھل اٹھی کلی کلی کرن کرن
کہ اس کے دم سے بن گئی گلی گلی چمن چمن
بنا رہا تھا دیس کو ارم ارم عدن عدن
وہ شیر دل جوان تھا' وہ مرد نیک نام تھا
وہ قائد عوام تھا' وہ قائد عوام تھا
وہ دلوں کا تاجور' وہ حوصلوں کا ترجماں
وہ دشمنوں کے واسطے تھا اک برق بے اماں
وہ منزلوں کی جستجو میں ہر گھڑی رواں دواں
کہ اس کے فکر آہنی کی زد میں صبح و شام تھا
وہ قائد عوام تھا' وہ قائد عوام تھا
جگر میں درد قوم کا' نظر میں مسکراہٹیں
وہ سن رہا ہے روح زندگی کی سرسراہٹیں
وہ گن رہا ہے وقت کے ہر وقت کی آہٹیں
کہ اس کے دل میں قوم کا عجیب احترام تھا
وہ قائد عوام تھا' وہ قائد عوام تھا

☆......☆

ملک عزیز میں آمریت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگیا تھا۔

www.PakiBooks.Site

سیاسی افق پر بے یقینی اور مایوسی کے بادل چھائے رہتے تھے۔ اس دور میں عوام چار طبقات میں تقسیم ہو چکے تھے۔ اوّل وہ جو سابق وزیرِاعظم کی محبت میں ہر حد سے گزر جانے کے لیے تیار تھے۔ دوئم جمہوریت کے حامی تھے۔ سوئم جمہوریت کو اسلامی اقدار میں ڈھال کر نافذ کرنا چاہتے تھے اور آخری گروہ میں ایسے افراد شامل تھے جو اب تک پاکستان کا وجود تسلیم ہی نہیں کر پائے تھے۔ ان دگرگوں سیاسی حالات میں محسن نقوی سمیت کئی کارکنان حکومتی عتاب کا شکار رہے۔ انہیں کئی بار متوقع بغاوت کے ناکردہ جرم میں ملوث کر کے مقدمات میں الجھایا گیا۔ تشدد اور گرفتاری سے بچنے کے لیے انہیں بہت سے مواقع پر 'انڈر گراؤنڈ' ہونا پڑا۔ اس صورتِ حال میں محسن نقوی کے وجود میں تاحال سانس لیتا 'غلام عباس' سب سے زیادہ مضطرب اور کشمکش میں مبتلا تھا۔ سیاست اور جنون کی اہمیت اپنی جگہ مسلم لیکن وہ اپنے خاندان اور اہلخانہ کی خوشیوں' سلامتی اور استحکام کی جبلی سوچ سے بھی فرار حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ عہدِ گزشتہ اگر کچھ پہلوؤں سے اس کے لیے نامہربان ثابت ہوتا رہا تھا تو بہت سے حوالوں سے اسی قسمت نے اسے بے بہا نعمتوں سے بھی نوازا تھا۔ اسد عباس' عقیل عباس اور قرۃ العین جیسے انمول تحائف کی ناقدری بھی تو وہ کسی صورت نہ کر سکتا تھا۔ خاندان کے بہتر مستقبل کے لیے اس نے کاروبار میں سنجیدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ خاندانی کاروبار میں دخل اندازی کرنے یا اپنے لیے کسی قسم کا کوئی حصہ وتعاون طلب کرنے جیسی کم ظرفی کی تاب اس میں بالکل نہ تھی۔ سوچ بچار کے بعد اس نے 1980ء میں لاہور کے علاقہ 'نشتر بلاک' میں ایک خوبصورت گھر 'ریزہ نجف' تعمیر کروایا جو آناً فاناً ہی سیاسی' ادبی' فلمی اور علمی شخصیات کا مسکن بن گیا۔ شاعری' سیاست اور خطابت سے قطع نظر وہ اپنے اہلخانہ کو مستحکم معاش فراہم کرنا چاہتا تھا لہٰذا 'مون مارکیٹ' میں امپورٹ ایکسپورٹ کے لیے دفتر تیار کروالیا۔ اس کے دل و دماغ میں واہموں کے ناگ کنڈلی مارے ڈستے رہتے کہ کسی بھی ناگہانی آفت کی صورت میں اہلخانہ رتی بھر معاشی پریشانی کا شکار نہ ہو سکیں۔ اپنی محنت' خلوصِ نیت اور لگن سے جب وہ زندگی ہموار کرنے میں کامیاب ہوا تو اس کی سدا کی ستم ظریف تقدیر نے وقت کے ساتھ سازش کر کے کتابِ حیات کے کچھ اوراق اس طرح پلٹے کہ وہ ایک بار پھر اپنے ماضی کے روبرو جا کھڑا ہوا۔

☆......☆

اس روز وہ سند باد ہوٹل ملتان کی ایک ادبی محفل میں موجود تھا۔

یہ ایک بھرپور اور پُررونق تقریب تھی جس میں اس نے مشہور گلوکار غلام علی کے ساتھ کئی سازندے بھی ہوائی جہاز کے ٹکٹ دے کر بلوائے تھے۔ اسٹیج پر انتظامات کو حتمی شکل دی جا چکی تھی۔ گورنمنٹ کالج ملتان سے اس کے واقف کار 'انوار احمد' بھی یونیورسٹی سے اپنی دو جماعتوں کے ہمراہ وہاں موجود تھے۔ عرش صدیقی' خواجہ امتیاز علی' مبینہ طلعت' اے بی اشرف اور صفدر امام جیسے اساتذہ بھی تقریب کے 'دلہا' کا انتظار کر رہے تھے لیکن وہ زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہو کر اس وجود کے سامنے تھا جسے اپنے تئیں اس نے ماضی کی خاک میں دفن کر کے مستقبل کے کامیاب سفر کا آغاز کیا تھا۔

''تم...... یہاں...... کیسے؟'' اس نے بدقت تمام کہا۔

''حیران ہو گئے ناں مجھے دیکھ کر؟'' وہ گہری سانس لے کر گویا ہوئی۔ ''میں خود بھی حیران ہوں کہ آخر اتنے برس بعد یہاں اپنے آس پاس تمہاری موجودگی کا علم ہوا تو قدم اس طرف بڑھنے سے روک کیوں نہ سکی؟''

اس کے الجھن بھرے انداز پر وہ بے ساختہ مسکرا کر رہ گیا۔ جذبات واحساسات کے دشت میں برسوں سیاحت اور الفاظ سے شب و روز کھیلنے والے محسن نقوی کو اس روز علم ہوا کہ پہلی محبت ایک آسیب کی طرح ہوتی ہے۔ ایک ایسا آسیب جو انسانی قلب و روح اور دماغ کو اپنا مسکن بنا لے تو پھر تاعمر رہائی ممکن نہیں ہو پاتی۔ وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ آکٹوپس کی طرح یہ گرفت انسانی ذہنی و قلبی نظام کو اپنا عادی بنا لیتی ہے اور قوت ارادی وخود کو سمجھا لینے کی خوش فہمی میں مبتلا بشر یہ گمان کر لیتا ہے کہ وہ زندگی میں آگے بڑھ گیا ہے۔ یہی اس کی خود فریبی ثابت ہوتی ہے کیونکہ محبت اپنا مقام کبھی نہیں چھوڑتی۔

محسن کا دل چاہا کہ وہ اسے جھنجوڑتے ہوئے اس حقیقت سے آگاہ کر کے خوش فہمی کی دھند سے باہر نکال لائے لیکن وہ اتنا تو بخوبی جانتا تھا کہ بنتِ حوا بھی کسی موڑ پر اپنی انا کی شکست تسلیم نہیں کرتی۔

''میرا مقصد صرف اس قدر کامیابیوں پر مبارکباد دینا تھا۔'' محسن نے اسے کہتے سنا۔

www.PakiBooks.Site

''یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ شکریہ! تمہاری آمد میرے لیے حیران کن ہی نہیں بلکہ خوشگوار بھی رہی۔'' اس نے بھی مقابل کا بھرم توڑنا مناسب نہ سمجھا۔ ماضی کے خوشگوار لمحات اور سہانی یادیں دہراتے ہوئے وقت بیتنے کا احساس اس وقت ہوا جب کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور انوار احمد کی جھنجلائی ہوئی آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

''میں مہمانوں کے سامنے یہ سرکاری بیان بارہا دہرا کر تھک چکا ہوں کہ اچانک محسن نقوی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اور وہ ڈاکٹر سے معائنہ کروانے کے بعد آنے ہی والے ہیں۔''

''آ رہا ہوں لالہ! بس کچھ دیر اور۔'' وہ جبراً بولا۔ اس نے دل پر پتھر رکھ کر اسے رخصت کیا اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔

اس تقریب کے بھی اخراجات محسن نے ہی برداشت کیے تھے اور انوار کی رضامندی کے برعکس غلام علی و غلام عباس کو مدعو کیا تھا۔ اب ایسے موقع پر تقریب میں اس کی عدم موجودگی پیشہ وارانہ اخلاقیات کے بھی منافی تھی۔

اس کے وجود میں سخت کشمکش اور اعصاب میں انتشار برپا تھا۔ تقدیر کے اس نئے وار کو خندہ پیشانی سے سہتے ہوئے اب اسے اپنا بھرم برقرار رکھنے کا دشوار ترین مرحلہ بھی درپیش تھا۔ اعصاب پُرسکون کرتے ہوئے اس نے کڑھائی دار کرتہ پہنا' گھنگھریالے بالوں میں خوشبودار تیل اور آنکھوں میں سرمہ لگا کر پان چباتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور ہونٹوں پر ایک بھرپور مسکراہٹ لیے جھومتا ہوا اسٹیج پر آن پہنچا۔ انوار احمد خشمگیں اور خفا نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر خواجہ امتیاز کے بشرے سے جھلکنے والی حیرانی و عدم اطمینانی اس سے سوا تھی۔

''یہ کس زاویہ سے شاعر لگتا ہے؟ اس کی ایک بھی ادا شاعرانہ نہیں۔'' انہوں نے انوار کے کان میں سرگوشی کی۔

''اس کے ظاہر پر مت جائیے جناب! ابھی آپ خود دیکھیں گے کہ وہ اس مجمع کو دم سادھنے پر مجبور کر دے گا۔'' انوار احمد نے تیقن سے کہا۔ ان کی باتوں' نظروں اور سرگوشیوں سے بے نیاز محسن نقوی نے اسٹیج پر اپنی غزل کا آغاز کیا تو اس کے بعد جیسے چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

بھرے سوا سرِ مقتل مقام کس کا ہے
کہو کہ اب لبِ قاتل پہ نام کس کا ہے
یہ قبہ و تاج و قباب انہیں مبارک ہوں
مگر یہ نوکِ سناں احترام کس کا ہے
تمہاری بات نہیں تم تو چارہ گر تھے مگر
یہ جشنِ فتح' پسِ قتلِ عام کس کا ہے
ہماری لاش پہ نہ ڈھونڈو انگلیوں کے نشاں
ہمیں خبر ہے عزیزو یہ کام کس کا ہے
فنا کے ہانپتے کانپتے جھونکے ہوا سے پوچھتے ہیں
جبینِ وقت پہ نقشِ دوام کس کا ہے
تمہاری بات تو حرفِ غلط تھی مٹ بھی گئی
اتر گیا جو دلوں میں کلام کس کا ہے
وہ مطمئن تھے بہت قتل کر کے محسن کو
مگر یہ ذکرِ وفا صبح و شام کس کا ہے

اس غزل کا ہر ایک شعر بھرپور داد وصول کرتے ہوئے زبان زدِ عام ہو گیا۔ شور اور تالیوں کی گونج میں مسکراتا اور قہقہے بکھیرتا ہوا محسن اس بات پر مسرت سے نہال تھا کہ وہ اپنا بھرم برقرار رکھنے میں ایک بار پھر کامیاب ہو گیا ہے۔

☆......☆

شہرِ لاہور نے محسن نقوی کو بے پناہ محبتوں سے نوازا۔ احمد ندیم قاسمی' منیر نیازی' شہزاد احمد جیسے قدآور شعراء کی موجودگی میں بھی اس کا منفرد اسلوب' توانا لہجہ' پُراثر کلام' غمِ دوراں کے ساتھ غمِ جاناں اور اسلامی و کربلائی شاعری نے نوجوان نسل کو بہت جلد اپنا گرویدہ بنا لیا۔ زندگی کے صحرا میں اپنے پاؤں کے آبلوں سے پھوٹتے لہو کے گلاب کھلانے والے اس شاعر کا جادو سرچڑھ کر بولتا۔ وہ بگولوں کا ہم سفر اور ہواؤں کا ہم مزاج تھا۔ سچائی اور خلوص اس کا سب سے بڑا روگ تھے۔ گروہی تعصبات' مذہبی منافرت' منافقت اور طبقاتی کشمکش میں گھری انسانیت اس کی روح پر گہرے چرکے لگاتی۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ اس دور میں کئی ادیب اور شعراء نے بھی ذاتی تشہیر کے لیے اپنی ذات کو ان آلائشات میں مبتلا کر لیا تھا۔ محسن نقوی کے لیے یہ صورتِ حال کسی سمندر کے ازخود رود کوہی میں سمٹنے یا آسمان کے جزیروں میں تقسیم ہونے جیسی تھی۔ اسی دوران 1985ء میں 'ریزہ حرف' منظرِ عام پر آئی جسے اس نے 'ناتمام سچ کی دستاویز' قرار دے کر اپنی بے باکی سے لاکھوں دلوں میں گھر کر لیا۔ شاعری کی صورت میں بکھرے موتی ہر ایک کو اپنی صدائے دل محسوس ہوئی۔

یہ جینا کیا ہے رسمِ جاں کنی ہے

www.PakiBooks.Site

مری ہر سانس نیزے کی انی ہے
کبھی سورج سوا نیزے پر اترے
یہ کیسی برف کی چادر تنی ہے
ہوا ہے یا کوئی ننگی بھکارن؟
یہ بیٹی کس دکھی ماں نے جنی ہے؟
مرا سایہ مجھے چھاؤں نہ دے گا
مری اس سے پرانی دشمنی ہے

'ریزہ حرف' بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ فلمی دنیا نے محسن کے گرد اپنا گھیرا مزید تنگ کرلیا۔ وہ اس کی مقبولیت اور آفاقی ولازوال شاعری کو 'آوارگی' کی صورت میں بھی کیش کروا چکے تھے۔ فلمساز 'سردار بھٹی' نے بھرپور اصرار پر اپنی فلم 'بازارِ حسن' کے لیے ایک لازوال نغمہ 'لہروں کی طرح تجھے بکھرنے نہیں دیں گے' تخلیق کروایا جس پر محسن کو بعد ازاں 'نیشنل فلم ایوارڈ' بھی عطا کیا گیا۔

اس کامیابی کے بعد دیگر فلمسازوں نے بھی اس کی چوکھٹ پکڑلی۔ عین ممکن ہے کہ محسن نقوی کا فلمی نغمہ نگاری کا یہ سفر مزید طوالت اختیار کرتا لیکن فلم 'دھڑکن' کے فلمساز نے اس کی شاعری میں مین میخ نکالتے ہوئے جذبات کو برانگیختہ کرنے والے شوخ نغمے طلب کیے تو اس کی خودداری نے مزید کام کرنے سے انکار کردیا۔ یہ وہ دور تھا جب ملک میں جمہوریت ایک بار پھر بحال ہو چکی تھی۔ محسن ہنوز پیپلز پارٹی سے ہی وابستہ تھا۔ روزنامہ 'مساوات' میں سیاسی قطعات بھی خوب دھوم مچا رہے تھے۔ 'سیاست' اس کی زندگی کا جزولاینفک تھی۔ حالات حاضرہ پر سلگتے ہوئے قطعات نشتر زنی' بے باکی اور حق گوئی پر مبنی یہ قطعات فرعون وقت کو بلبلانے پر مجبور کردیا کرتے۔ انہی میں سے چند ایک بصارت کی نذر ہیں۔

(آزادیِ کشمیر)

بھارت کے ارادوں کو جلا دے گی کسی روز
جلتی ہوئی ہر آنکھ کے خواب کی تعبیر
کہتا ہے ابھرتی ہوئی ہر صبح کا سورج
کچھ اور بھی نزدیک ہے 'آزادیِ کشمیر'

(روشنی)

یارو! اس احتیاط سے اب زندگی کرو
جمہوریت کی رت میں نئی چاندنی کرو
دیکھو جہاں جہاں بھی مسلط ہو تیرگی
اپنے لہو سے آپ وہاں روشنی کرو

(سیاست دان)

لہو کے داغ کو جز و متاعِ جاں سمجھتے ہیں
خزانہ لوٹنے کو مقصدِ ایماں سمجھتے ہیں
حقیقت میں وہ سوداگر ہیں انسانی ضمیروں کے
مگر کچھ سادہ دل اُن کو سیاستداں سمجھتے ہیں

(بے خبر)

نوجواں لاشوں میں گھر کے رہ گئی ہے زندگی!
ظلم کی وہ شب ملی جس کی سحر کوئی نہ ہو
جل رہے ہیں بام و در اور مطمئن ہے 'پاسباں'
گھر کی بربادی سے اتنا بے خبر کوئی نہ ہو!

(یارب)

اغیار کی سازش سے دل و جاں کے علاوہ
خود میرے مؤرخ کا قلم کانپ رہا ہے
ظالم کے مظالم کا کوئی فیصلہ یا رب!
مظلوم کی چیخوں سے فلک کانپ رہا ہے

ملکی سیاست کی پارہ پارہ حالت کو اپنے قلم سے عیاں کرنے اور اس کی حالت زار سدھارنے کی بھرپور خواہش کے باوجود عملی سیاست کی پہلی صف اس سے روٹھ چکی تھی۔ غربت اور محرومی میں گذرا بچپن' جدوجہد کرتی جوانی بالآخر اسے ایک ایسے مقام پر لے آئی تھی کہ ان تھک محنت اور لگن کی بدولت وہ متمول ہوگیا تھا۔ شہرۂ آفاق شاعری' تمول اور دوستانہ وضع کھ طبیعت کے باعث اس کی ذات کئی تنازعات میں بھی الجھ گئی۔ ڈیرہ غازی خان میں شیوخ کے محلات جیسے قصر کی خریداری کا غلغلہ اٹھا تو کبھی کراچی میں تعمیراتی کمپنیوں کا مالک ٹھہرادیا گیا۔ خفیہ شادی' فلمی دنیا میں کسی گلوکارہ سے معاشقانہ تعلقات' مقدمات اور کسی نہ کسی قتل میں اس کا نام اچھالنا شہرت اور ہردلعزیزی کو داغدار کرنے کی بھدی کوشش کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ان تنازعات کا بے باکی سے سامنا کرتے ہوئے محسن نے 'عذابِ دید' کی کامیاب اشاعت کے ساتھ مقبولیت کا ایک اور سنگ میل عبور کرلیا۔ ملکی حکمرانوں کی بے حسی' اقتدار کی رسہ کشی میں عوامی بنیادی حقوق سے بے نیازی نے اس مجموعہ کلام کو قابل رشک پسندیدگی عطا کی۔

وہ اکثر دن میں بچوں کو سلا دیتی ہے اس ڈر سے
گلی میں پھر کھلونے بیچنے والا نہ آ جائے

☆.....☆

نوّے کی دہائی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ایک خونی سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔

تعصب' گروہ بندی' فرقہ واریت کی عفریت نے ملک میں عجیب انتشار برپا کر رکھا تھا۔ نفسانفسی' بے حسی اور بے حمیتی پسندیدہ ذاتی اوصاف قرار دیئے جانے لگے۔ سیاست میں بھی الزامات و بہتانات کا بازار گرم تھا۔ عزتیں سرعام نیلام ہونے لگیں' انصاف قابل فروخت تھا۔ منافقت' چور بازاری اور لوٹ مار نے فضا اس قدر زہریلی بنادی تھی کہ حساس اور باضمیر افراد کے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو چلا تھا۔ محسن نقوی کا شمار بھی اسی قبیلے سے تھا جو آدمیت کی اس تذلیل کو سرعام' برملا رگید دیتے۔ 'طلوع اشک' میں اس عہد کی بڑھتی نفرتوں کے خلاف نازک جذبوں اور دائمی رشتوں کا دھیما سا احتجاج نظر آیا کیونکہ وہ چیخ و پکار پر مبنی احتجاجی رویئے کو بے سود اور وقت کا ضیاع سمجھتا تھا۔ اس کتاب میں محسن کا قلم دکھ' درد اور کرب کی طویل ہوتی رات میں محبتوں کے دیپ جلا کر امن و آشتی کا درس دیتا نظر آیا۔ اس کی یہ مسافت 'رختِ شب' تک پہنچی تو دھیما احتجاج بالآخر نشتر زنی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی حساسیت و وطن پرستی اپنے عوام کو جھنجوڑتے ہوئے آئینہ دکھانا چاہتی تھی کہ خدارا تعصب اور گروہ بندی کے اس مدار سے باہر نکل آؤ۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ ملی حمیت اور باہمی اخوت کو دانستہ طور پر ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت کمزور بنایا جارہا ہے تاکہ فرقہ واریت اس ملک کی جڑوں کو دیمک کی طرح کھوکھلا کرکے دشمن کو اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب کرسکے۔ وہ قوم کو اپنے خوابوں سے آشنا کرتے درحقیقت ان کے خوابیدہ جذبات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا۔

میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی ایسا شہر بساؤں میں
جہاں سرسرائے نہ آدمی کی رگوں میں
کوئی ہراس تک!
جہاں وہم ہو نہ دلوں میں وہم کا سہم ہو
جہاں 'سچ' 'کوچ' سے ہو واسطہ
جہاں جگنوؤں کو ہوا دکھاتی ہو راستہ
جہاں داغ داغ سحر نہ ہو
جہاں کشتیاں ہوں رواں دواں
تو سمندر میں بھنور نہ ہو
جہاں برگ و بار سے اجنبی
کوئی شاخ کوئی شجر نہ ہو
جہاں چہچہاتے ہوئے پرندوں کو
بارشوں کے عذاب سے کوئی ڈر نہ ہو!
جہاں نوحہ غم زندگی
مری ہچکیوں سے عیاں نہ ہو
جہاں چاک ہو نہ کوئی پیرہن
نہ سخن وروں کی زبان کٹے
کوئی شہر ایسا بھی کہیں!
جہاں دھوپ چھاؤں گلے ملیں
جہاں بانجھ رت میں بھی پھول کھلیں
جہاں چاہتوں کے ہجوم میں
کبھی گیت امن کے گاؤں میں
جہاں زندگی کا رجز پڑھوں!
جہاں بے خلل گنگناؤں میں
مرے بس میں ہو کبھی کہیں
کوئی ایسا شہر بساؤں میں

وہ سچ لکھتا رہا، سچ سننے کی تمنا کرتا رہا اور وجدان خاموشی سے کچھ نادیدہ آہٹیں اپنی جانب بڑھتی محسوس کرتا رہا۔

☆.....☆

بڑی بے چین رہتی ہے طبیعت اب میری محسن
مجھے اب قتل ہونا ہے'
مگر قاتل نہیں ملتا

سن چھیانوے کا آغاز ہوگیا تھا۔ تعصب اور منافرت کی آگ شعلوں میں تبدیل ہو چکی تھی جو اپنی خونخوار زبان سے سینکڑوں وکیل' ڈاکٹر' صحافی' سرکاری ملازمین اور سائنسدانوں کو نگل چکی تھی۔ وہ پندرہ جنوری کی سرد شام تھی۔ بارش نے فضاء میں مزید یخ بستگی پیدا کردی تھی۔ سردرت اور اداسی تو ہمیشہ ہی لازم و ملزوم رہے ہیں لیکن اس روز یہ افسردگی معمول سے زیادہ دبیز تھی۔ لاہور کے اس مصروف بازار میں ہڈیوں میں گودا جمانے والی ہواؤں سے خود کو بچانے اور اپنی اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی عجلت میں ہر شو افراتفری کی سی کیفیت تھی۔ محسن بھی 'مون مارکیٹ دبئی چوک' میں اپنے دفتری کاموں سے فراغت پا چکا تھا۔ دفتر سے گھر جانے کے لیے نکلتے ہوئے اس کے ذہن میں بہت سے ادھورے کاموں کی فہرست کلبلا رہی تھی۔ سردرت کی شاعرانہ خوبصورتی محسوس کرتے وہ دو قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ دھماکوں کی گونج نے فضا کو مرتعش کردیا۔ اسی لمحہ اسے اپنے بدن میں بھی جلتے انگارے دھنستے

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

محسوس ہوئے۔ جسم کو ایک جھٹکا لگا اور وہ نادیدہ آہٹیں جو قبل ازیں ایک واہمہ محسوس ہوتی تھیں اب مجسم خود سے چند قدم دور آتشیں اسلحہ تھامے نظر آرہی تھیں۔

''تو کیا وہ سب واہمے حقیقت تھے، وہ موت کی دستک تھی جو مجھے اپنی آمد کے متعلق چونکاتی تھی۔ موت اس قدر دیدہ دلیری سے مجھے اپنے سنگ لے جانے چلی آئی ہے؟'' اس کے بدن میں چند مزید انگارے بھرے تو ایک خود کار سوچ نے سر اٹھایا ہوگا۔

''ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی تھا زندگی میں، ابھی تو اپنی ایک نسل کو جوان و کامیاب ترین ہوتے دیکھنے کی تمنا دل میں موجزن تھی، ابھی تو زیارت کعبہ کی تشنہ لبی باقی تھی، ابھی تو عزیز از جان بیٹی 'عقیلہ' کے ساتھ بہت سا وقت گزارنا تھا، ابھی تو بہت سے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنی تھی، تو کیا سب کچھ ادھورا ہی رہ جائے گا؟'' انگارے بلا تعطل 'تزتز تزتز' کی خوفناک آواز کے ساتھ جسم میں سرخ روزن بناتے جارہے تھے۔ ''کوئی تو ایسا کام ہوگا جو میں نے سچ میں مکمل کرلیا ہو...... سچ! ہاں سچ! اس نفرت سے لبریز معاشرے میں سچائی کا آئینہ دکھانے کا عمل حتی المقدور پورا کیا ہے۔''

محسن کا جھٹکے لیتا جسم کولتار کی سڑک پر گر کر خاک آلود ہوگیا تھا۔ دھندلاتی بصارت میں شور و غل مچا کر آدمیت کی ایسی توہین پر صدائے احتجاج بلند کرتے طیور اور اپنا اصل مقام و منصب فراموش کیے گولیوں کی اس بوچھاڑ سے ہراساں ہوکر بھاگتے انسانوں کے مناظر رقصاں تھے۔ عمر بھر اپنی مسکراہٹ اور ہنسی سے بھرم برقرار رکھنے والا 'غلام عباس' ایک بار پھر بھرپور انداز میں مسکرایا اور اکھڑتی سانسوں کے درمیان صرف یہی کہہ سکا۔

سفر تو خیر کٹ گیا
میں کرچیوں میں بٹ گیا

☆......☆

وہ کون لوگ تھے' ان کا پتا تو کرنا تھا
مرے لہو میں نہا کر جنہیں نکھرنا تھا
تم نے انگلیاں کیسے فگار کرلی ہیں
مجھے تو خیر لکیروں میں رنگ بھرنا تھا
خزاں کی دھوپ سے شکوہ فضول ہے محسن
میں یوں بھی پھول تھا' آخر مجھے بکھرنا تھا

اردو شاعری کا ایک مکمل عہد محسن نقوی کے لرزہ خیز قتل کے بعد ایک خونی باب رقم کرکے تمام ہوگیا۔ اس قتل کا مقدمہ 'علامہ اقبال پولیس اسٹیشن' میں درج ہوا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے قاتلوں کی گرفتاری کے لیے بے انتہا دوڑ دھوپ کی اور بالآخر 'تین ہزار روپے' کے عوض یہ کارنامہ سرانجام دینے والے کو گرفتار بھی کرلیا۔ اس کی نفرت و کرودھ کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوسکتا تھا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق محسن نقوی کے جسم میں 'سینتالیس' گولیاں پیوست تھیں۔

محسن کی نماز جنازہ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے سربراہ 'علامہ آغا سید حامد علی شاہ موسوی' نے ناصر باغ لاہور میں پڑھائی۔ میت کو ڈیرہ غازی خان کے اسی محلہ سادات میں بھیج دیا گیا جہاں سے سچائی کا روگ لیے وہ ایک پُرآشوب دور تک چلا آیا تھا۔ ہزاروں سوگواران نے اپنے محبوب شاعر کو 'کربلا شریف ڈیرہ غازی' میں سپرد خاک کرکے الوداع کہہ دیا۔

الوداع!
شام غم کی دھن' الوداع
موسم ہجر کی بے راہ چبھن
الوداع!
دل میں کھلتے ہوئے خواہشوں کے چمن
لب جلاتے ہوئے
ہجرتوں کے سخن
نفرتوں کی گھٹن
الوداع!
دل پہ چھائی ہوئی
دکھ کی سورج گرہن
الوداع!
الوداع......!
فکر گور و کفن
الوداع
دل نے مجھ سے کہا
ساعت فرق ہے
جان من الوداع!

ماخذات:

محسن نقوی انٹرویو......روزنامہ دستک
فیچرز......ڈان نیوز......جنگ نیوز......دنیا نیوز......
اردو محفل فورم بزم اردو لائبریری
''یادگار زمانہ ہیں جو لوگ'' از 'انوار احمد'

www.PakiBooks.Site

عصائے موسیٰؑ

ڈاکٹر ساجد امجد

جادو اور معجزہ میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ معجزہ دلائل صدق ہے اور جادو کبائر ہے، حرام ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے سامنے جب جادو گر آئے تو اللہ رب العزت نے انہیں کس طرح نمٹنے کی تعلیم کی؟

ایمان کی تازگی کے لیے ایک قرآنی قصہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اعزاز نبوت سے نوازا گیا تو اس وقت ساحران مصر کی گرم بازاری تھی۔ سحر (جادو) کو ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل تھی۔ مصری تمدن میں ساحرین کا رتبہ نہایت بلند تھا حتیٰ کہ ان کو شاہی دربار میں بھی بڑا رسوخ حاصل تھا۔ جنگ ہو یا صلح، پیدائش ہو یا وفات، فراعین مصران ساحروں ہی سے رجوع کرتے تھے۔ اس علم سحر پر عبور رکھنے والے اشخاص میں گروہ در گروہ موجود تھے اور اپنی شعبدہ گری سے عوام کو حیران کرتے رہتے تھے۔ ان کی حرکتیں اتنی پراسرار تھیں کہ آنکھوں کو دھوکا دیتی تھیں، دلوں کو قائل کرتی تھیں۔ مذہبی معاملات تک میں ان علوم کو جگہ دی جاتی تھی، چنانچہ مصر کے قدیم شاہی مقبروں میں حنوط شدہ لاشوں کے ساتھ جو جادو ٹونے برآمد ہوئے ہیں اور ان مجروں میں جو تصاویر و اقوال ملے ہیں ان سے بھی ان کی تصدیق ہوجاتی ہے۔ جادو مذہب کی حیثیت حاصل کرگیا تھا۔ اسی اعتقاد کے پیش نظر اہل مصر اس کو سیکھتے اور سکھاتے تھے۔ طرح طرح کی ایجادات و اختراعات کرتے رہتے تھے اس لیے چھوٹے بڑے جادوگروں کی بہتات تھی۔

فرعون اور اس کے اعیان و ارکان جب موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ و ہدایت روکنے سے عاجز ہوگئے اور مصری عوام موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ سے متاثر ہونے لگے تو فرعون نے اس جادو گری کو حیلہ بنایا۔ اس نے کہنا شروع کردیا کہ موسیٰ علیہ السلام بہت بڑے جادوگر ہیں اور اپنے جادو کی مہارت کو کام میں لاکر مصری حکومت پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔

آپ پر یہ بہتان باندھنے کا خیال اسے اس لیے آیا تھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے کئی معجزات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ عقل کا اندھا تھا اس لیے معجزے اور سحر میں فرق نہیں کرسکا

www.PakiBooks.Site

تھا اور اسے جادو سے تعبیر کررہا تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو ڈرانے دھمکانے کے لیے دربار میں طلب کیا۔ بہت دیر تک انہیں تلقین کرتا رہا کہ وہ راہِ راست پر آجائیں یعنی یہ کہنا چھوڑ دیں کہ وہ اللہ کے نبی ہیں لیکن جب آپ مرعوب ہونے کے بجائے خود اسے دعوت حق دینے لگے تو اس نے صاف لفظوں میں کہا۔ ''اگر تو نے میرے سوا اور کسی کو معبود قرار دیا تو میں تجھ کو قید میں ڈال دوں گا۔''

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ''اگرچہ میں تیرے پاس خدائے واحد کی جانب سے واضح نشانی لے کر آیا ہوں تب بھی تیرے غلط راستے کو اختیار کرلوں؟''

''اگر تو سچا ہے تو دکھا وہ نشانی جو تو لے کر آیا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور اپنا عصا (لاٹھی) فرعون کے قدموں میں ڈال دیا۔ اسی وقت اس لاٹھی نے اژدھے کی شکل اختیار کرلی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ فرعون گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ''تو کیسا خدا ہے کہ معمولی سے سانپ سے ڈر گیا۔ اب بھی مان لے کہ تو خدا نہیں بلکہ لوگوں پر اپنی حکومت رکھنے کے لیے خود کو خدا کہلواتا ہے۔ تیرے نفس نے تجھے دھوکا دیا ہے۔''

''میں کیسے مان لوں جب کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ صریحاً جادو ہے۔''

''یہ جادو نہیں خدا کا وہ نشان ہے جو تو نے مجھ سے طلب کیا تھا۔''

''یہ مظاہرہ تو میری مملکت کا کوئی بھی جادوگر کرسکتا ہے۔''

''اگر تیرے نزدیک یہ معجزہ نہیں تو پھر یہ دیکھ۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال کر نکالا تو دیکھنے والوں کے لیے چمکتا ہوا روشن تھا۔

فرعون اور اس کے درباریوں نے اسے بھی جادو قرار دیا۔ اس کے خوشامدی درباری چیخ اٹھے۔ ''بلاشبہہ یہ ماہر جادوگر ہے اس کا ارادہ ہے کہ یہ تمہیں مصر سے نکال دے۔''

فرعون نے کہا۔ ''اے میرے بندو، اے درباریوں اس کے لیے تمہارا کیا مشورہ ہے۔''

''اسے اور اس کے بھائی ہارون کو مہلت دو اور شہروں میں ایک جماعت کو بھیجو جو ماہر جادوگروں کو اکٹھا کرکے لائے۔ وہ بھی اسی طرح کرتب دکھائیں اور دونوں کے درمیان مقابلہ ہو، اس کا سب جادو دھرا رہ جائے گا۔''

حضرت موسیٰ نے یہ دعوت قبول کرلی۔ ''افسوس ہے کہ تم جادو اور معجزے کو یکساں سمجھتے ہو۔ بہرحال تم اپنے جادوگروں کو جمع کرلو میں اپنے خدا کی طاقت طلب کرتا ہوں لیکن ایک مرتبہ پھر نصیحت کرتا ہوں کہ جادو اور معجزے کو ایک مت سمجھو۔ جادو باطل اور معجزہ حق ہے۔''

یہ معاشرہ ہی ایسا تھا کہ اس میں معجزے اور سحر میں خط امتیاز کھینچنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ فرعون کے دل میں کھوٹ بھی تھی جس کی وجہ سے اس نے خدا کی نشانیوں کو جادو سے تعبیر کیا۔

لغت میں ''سحر'' کے معنی پوشیدہ چیز کے ہیں چنانچہ صبح کے اوّل وقت کو ''سحر'' اس لیے کہتے ہیں کہ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی یعنی دن قدرے تاریکی میں چھپا ہوا ہے۔

جمہور علماء کی یہ رائے ہے کہ سحر ایک حقیقت ہے اور مضر رساں اثرات رکھتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اس میں اسی طرح مضر اثرات رکھ دیئے ہیں جس طرح زہر میں یا دوسری نقصان رساں ادویہ میں۔

بعض علماء کا قول یہ ہے کہ سحر کی حقیقت شعبدہ نظر بندی اور فریب خیال کے سوا کچھ اور نہیں۔ بلاشبہہ وہ ایک باطل اور بے حقیقت شے ہے۔

مذہب کے نقطۂ نگاہ سے جن اعمال سحر میں شیاطین ارواح خبیثہ اور غیر اللہ سے استعانت کی جائے اور ان کو حاجت روا قرار دے کر منتروں کے ذریعے ان کی تسخیر سے کام لیا جائے تو وہ شرک ہے اور اس کا عامل کافر ہے۔

اور جن اعمال میں ان کے علاوہ دوسرے طریقے بھی استعمال کیے جائیں اور ان سے دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے ان کا مرتکب حرام اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔

اس کے برخلاف ''معجزہ'' وہ نشانات ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کو عطا کرتا ہے۔ یہ عطا ہے کسب نہیں۔

نبی اور رسول کا اصل معجزہ اس کی وہ تعلیم ہوتی ہے جو وہ راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

ان تعلیمات کی سچائی اور صداقت ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء و رسل کو تعلیم و پیام کے ساتھ ایک یا چند نشانات (معجزات) بھی عطا کرتا ہے اور جب وہ نبوت کے دعوے کے ساتھ بغیر اسباب کے ایسا نشان دکھاتا ہے جس کی

www.PakiBooks.Site

کوئی دنیاوی طاقت مقابلہ نہیں کرسکتی (اس میں جادو بھی شامل ہے) تو اس کا نام معجزہ ہوتا ہے۔

کسی نبی اور رسول کو جو معجزہ دیا جاتا ہے وہ اسی نوع میں سے ہوتا ہے جس میں اس کی قوم کو درجہ کمال حاصل ہوتا کہ اس کی قوم کو اس معجزے کو سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ یہ جان لے کہ پیغمبر کا یہ نشان انسانی اور بشری طاقت سے بالاتر قوت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

حضرت موسیٰ کو عصا اور ید بیضا کے معجزے اس لیے عطا کیے گئے کہ ان کے زمانے میں مصر سحر اور جادو کا مرکز تھا۔ مصریوں نے اس فن کو اوج کمال تک پہنچا دیا تھا۔

اللہ کی سنت کا تقاضا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے معجزات عطا کیے جائیں جو اسی نوع تعلق رکھتے ہوں تاکہ جب انکار پر اصرار حد سے بڑھ جائے تو آپ ان معجزات کے ذریعے انہیں باور کرادیں کہ میرے پاس جو طلب ہے وہ بشری دسترس سے باز رہے اور لوگوں کو ان کی صداقت کا یقین آجائے۔

معجزہ دراصل انسانی نہیں بلکہ براہ راست خدائے تعالیٰ کا فعل ہے جو تکمیل صداقت کے لیے وجود میں آتا ہے۔ وہ اصول و قوانین پر مبنی نہیں ہوتا کہ ایک فن کی طرح سیکھا جاسکے اور نبی ہر وقت اس کے کرد کھانے پر قادر ہوتا وقتیکہ مخالفین صداقت کے سامنے اس کو دکھانے کی ضرورت پیش نہ آجائے۔ نبی خدا سے رجوع کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کی جانب سے اس کو کر دکھانے کی قوت عطا ہوجاتی ہے۔

اس کے برخلاف جادو ایک فن ہے جس کے اصول و قواعد ہیں جنہیں ساحر ہر وقت کام میں لاسکتا ہے اس کے اسباب اگرچہ ناواقفوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن اس فن کے تمام واقف کار اس سے واقف ہوتے ہیں۔ ایک وقت میں کئی جادوگر وہی کرکے دکھا سکتے ہیں جو ایک جادوگر کررہا ہوتا ہے۔

☆.....☆

شاہی کارندے مصر کے شہروں میں گھومتے پھر رہے تھے اور اعلان کررہے تھے کہ ایک بڑا جادوگر آگیا ہے جو اقتدار پر قبضہ کرلینا چاہتا ہے جو اس سے مقابلہ کرنے کا خواہاں ہے اپنا نام درج کرادے۔ اگر تم نے مخالف جادوگر کو شکست دے دی تو فرعون کی جانب سے بیش قیمت انعام کے مستحق ہوجاؤ گے۔

بڑے بڑے ماہر جادوگروں نے اپنے نام قومی فریضہ سمجھ کر درج کرا دیئے کیونکہ فرعون اور اس کے حواریوں نے انہیں باور کرا دیا تھا کہ مصر کی آزادی خطرے میں ہے۔ بنی اسرائیل اس پر قبضہ کرنے والے ہیں اور وہ اپنے ساتھ ایک جادوگر کو لے آئے ہیں۔

بڑے بڑے جادوگروں کو دارالحکومت روانہ کردیا گیا۔

جب تمام جادوگر جمع ہوگئے اور انعامی رقم طے ہوگئی تو مقابلے کے ''زینت کا دن'' طے ہوا کیونکہ مصریوں میں تمام عیدوں میں سب سے بڑی عید کا دن یہی تھا۔

ایک بڑے میدان میں جہاں عید کا میلہ لگتا تھا اس مقابلے کا اہتمام کیا گیا۔ لوگ سمندر کی لہروں کی طرح اس میدان کی طرف امڈنے لگے۔ ایسا ہجوم جمع ہوا جو اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ فرعون اور اس کے درباری بھی ایک اونچی جگہ آکر بیٹھ گئے کہ اس مقابلے کو دیکھ سکیں۔

ان دیکھنے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے متاثر ہوئے تھے اور اب یہ دیکھنے آئے تھے کہ ان کا فیصلہ درست ہے یا غلط۔

جادوگر اس مقابلے میں انعام کے لالچ میں جمع ہوئے تھے چنانچہ انہوں نے ایک مرتبہ پھر فرعون سے وعدہ لیا کہ

سید آل رضا کے بزرگ ایران سے برصغیر آئے تھے۔ ان کا خاندان باوقار اور معزز تھا۔ علم و دانش کی وجہ سے اس خاندان کے تمام افراد احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مرزا غالب کی طرح آل رضا کے آباؤ اجداد کا پیشہ بھی پشتہا پشت سے سپہ گری تھا۔ سید آل رضا کا سلسلہ نسب حضرت امام علی رضاؑ سے ملتا ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ سید محمود رضوی نیشاپور سے ہجرت کرکے وارد ہندوستان ہوئے تھے۔ شیر شاہ سوری نے جب مغل بادشاہ ہمایوں کو قنوج کے مقام پر شکست دی تو اس موقع پر ہمایوں کے بھائی کامران نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ مارواڑ کے راجا مال دیو نے بھی مدد دینے سے انکار کردیا۔ چنانچہ ہمایوں نے ایران کی راہ لی۔ ایران جانے کی وجہ یہ تھی کہ مغلوں اور ایرانی حکمرانوں کے روابط ہمیشہ خوشگوار رہے تھے۔ اس زمانے میں شاہ طہماسپ وہاں کا بادشاہ تھا۔ ہمایوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے کے سلسلے میں اس سے فوجی مدد کی درخواست کی، چنانچہ طہماسپ نے دس ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر ہمایوں کے سپرد کردیا۔ انہی لوگوں میں سید آل رضا کے جد امجد سید محمود رضوی بھی تھے جو ہمایوں کے ساتھ نیشاپور سے ہندوستان آئے۔ سید محمود رضوی یہاں آنے کے بعد مختلف شہروں میں قیام پذیر رہنے کے بعد بالآخر ضلع اناؤ کے مردم خیز شہر موہان میں مستقلاً آباد ہوگئے۔

www.PakiBooks.Site

ہمارے لیے انعام ہے اگر ہم غالب رہیں؟

فرعون نے کہا۔ ’’ہاں اور اس صورت میں تم ہمارے مقربین میں سے ہوگے۔‘‘

جادوگروں نے جب اس طرف سے اطمینان کرلیا تو بڑی بڑی رسیاں اور لاٹھیاں لے کر میدان میں اتر آئے کہ یہی وہ سامان تھا جس کے ذریعے انہیں جادو دکھانا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنا عصا (لاٹھی) اٹھایا اور میدان میں تشریف لے آئے۔ آپ نبی تھے اور نبی کا قاعدہ ہی یہ ہوتا ہے کہ اتمام حجت کے لیے ہدایت ضرور کرتا ہے۔ آپ نے بھی ان جادوگروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ’’افسوس تم پر، دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی عذاب بھیج کر تمہاری جڑ اکھاڑ دے، جس کسی نے جھوٹ بات بنائی وہ ضرور نامراد ہوا۔‘‘

یہ بات سن کر لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

’’موسیٰ (علیہ السلام) باتوں میں الجھا کر مقابلے سے بھاگنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’یہ ضرور ہمارے جادوگروں سے ڈر گئے ہیں۔‘‘

’’ایسا نہ ہو مقابلہ ہی نہ ہو اور ہمیں واپس جانا پڑے۔‘‘

یہ حال دیکھ کر درباری بھی چیخ چیخ کر جادوگروں کو سمجھانے لگے۔ ’’یہ دونوں بھائی جادوگر ہیں۔ یہ چاہتے ہیں اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال دیں اور پھر تمہارے شرف اور تمہاری عظمت کے مالک ہو جائیں، بس اپنے سارے داؤ جمع کرو۔ پرا باندھ کر ڈٹ جاؤ جو آج بازی لے گیا وہی کامیاب ہوگا۔‘‘

درباریوں کو ڈر تھا کہ کہیں موسیٰ علیہ السلام کی باتوں میں آ کر جادوگر مقابلے سے دستبردار نہ ہو جائیں۔ اس طرح ان کا منصوبہ ہی خاک میں مل جاتا اسی لیے وہ چیخ چیخ کر جادوگروں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

جادوگر بھی نرے کافر تھے۔ انعام کا لالچ الگ تھا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ کی نصیحتوں کو نظر انداز کر دیا بلکہ انہیں خاموش رہنے کو کہا۔ ’’موسیٰ (علیہ السلام) اس قصے کو چھوڑو کہ کون ہمیں عذاب دے گا اور ہماری جڑیں اکھاڑ پھینکے گا، ہمارا خدا تو وہ بلند ٹیلے پر بیٹھا ہے، تو اپنے خدا سے پوچھ کر بتا کہ ابتدا ہماری جانب سے ہو یا تو کرے گا۔‘‘

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ’’افسوس! میری باتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ابتدا تم کرو اور جادو کے جتنے حربے ہیں استعمال کرلو۔ سحر اور معجزے کا فرق تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔‘‘

یہ سنتے ہی جادوگروں نے رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر ڈال دیں۔ جادو کے اثر سے یہ رسیاں اور لاٹھیاں سانپ اور اژدھے کی شکل میں دوڑتی نظر آنے لگیں۔ مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ تمام لوگ ساکت کھڑے تھے کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔ اب موسیٰ کیا جادو دکھاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو اپنے اردگرد سانپ اور اژدھے دوڑتے ہوئے دیکھے تو دل میں ہراس محسوس کیا کہ کہیں لوگ اس مظاہرے سے متاثر نہ ہو جائیں اور ساحر کے سحر کو حقیقت نہ سمجھ لیں اگر ایسا ہوا تو یہ تاثر اور رعب قبول حق کے لیے سدراہ نہ بن جائے۔

ممکن ہے انہیں یہ خیال بھی آیا ہو کہ اب وہ کیا کریں۔

اللہ اپنے نیک بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں ڈر غالب ہوا تو فوراً وحی نازل ہوئی۔ آپ کو مطلع کیا گیا۔ ’’اندیشہ نہ کر، تو ہی غالب رہے گا تیرے داہنے ہاتھ میں جو لاٹھی ہے فوراً پھینک دے۔ جادوگروں کی تمام بناوٹیں نگل جائے گی۔ انہوں نے جو کچھ کیا ہے محض جادوگروں کا فریب ہے اور جادوگر کسی راہ سے آئے بھی کامیابی نہیں پاسکتا۔‘‘

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وحی نازل ہوتے ہی اپنا عصا زمین پر ڈال دیا۔ یہ عصا عظیم الشان بے انتہا لمبے چوڑے جسم والا اژدھا بن گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر جادوگروں کو مخاطب کیا۔ ’’تم جو کچھ بنا کر لائے ہو یہ جادو ہے اور یقیناً اسے اللہ ملیامیٹ کر دے گا۔ اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ مفسدوں کا کام نہیں سنوارتا۔ وہ حق کو اپنے احکام کے مطابق ضرور ثابت کر دکھائے گا۔‘‘

پھر لوگوں نے عجب ماجرہ دیکھا، جادوگروں کی لاٹھیاں اور رسیاں جو سانپ بن کر ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھیں ان پر موسیٰ علیہ السلام کا عصا جس نے اژدھے کی شکل اختیار کرلی تھی وہ تیزی سے ان کی طرف لپکا اور ایک ایک کرکے انہیں نگلنے لگا۔ یہ دیکھ کر جادوگر چیخے۔ ’’موسیٰ ہم سے بھی بڑا جادوگر ہے۔ ہم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔‘‘

سچ ہے کہ جن کے دلوں پر قفل لگ جائے وہ کبھی بھی راہ راست پر نہیں آتے۔ اتنی کھلی نشانیاں دیکھ کر بھی فرعون اور اس کے درباری و جادوگر باز نہ آئے معجزے کو جادو کہتے رہے۔

www.PakiBooks.Site

شکار و شکاری

سید احتشام

گھنے جنگلوں میں شکار کا اپنا مزہ ہے، یہی وجہ تھی کہ راجا مہا راجا سال دو سال میں ایک بار شکار پر ضرور نکلتے تھے۔ شکار کا شوق پورا کرنے کے لیے افریقا تک پہنچ جاتے تھے۔ نواب افتخار بھی شکار کے شوقین تھے اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے افریقا کے گھنے جنگلوں میں گئے تھے، ساتھ میں حالی موالی بھی تھے مگر یہ شکاری دورہ انہیں مہنگا پڑا۔ آدم خور قبیلے نے ان کے ایک ساتھی کو پکڑلیا تھا۔

1960ء سے قبل تقریباً ایک صدی تک ٹانگانیکا، زنجبار اور کانگو یہ تینوں ممالک تاج برطانیہ کے زیر نگیں تھے۔ اب یہ ممالک آزاد ہیں۔ تاہم کانگو دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے جب کہ ٹانگانیکا اور زنجبار نے ایک وفاق قائم کرلیا ہے جسے تنزانیہ کہتے ہیں اور اس کا دارالحکومت دارالسلام ہے۔

قیام پاکستان سے قبل ہندوستان کے اکثر شکاری بالخصوص والیان ریاست اور جاگیردار شیر، چیتے، ہاتھی یا گینڈے کا شکار کرنے کے لیے افریقی ممالک بالخصوص ٹانگانیکا، زنجبار، کینیا، کانگو اور رہوڈیشیا (موجودہ زمبابوے) بھی جایا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں مجھے بھی ایک بار شیر پور

www.PakiBooks.Site

کے جاگیردار نے نواب مہرالٰہی خان کے ہمراہ مذکورہ بالا ممالک میں سے ایک میں جانے کا موقع ملا یعنی ٹانگانیکا۔

1942ء میں نکتے جاڑوں کے دن تھے اور دوسری جنگ عظیم اپنے انتہائی عروج پر تھی جس کی گرما گرمی نے پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، تاہم ٹانگانیکا اور زنجبار حیرت انگیز طور پر جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ تھے۔ میں ان دنوں رام پور سے دو ماہ کی رخصت لے کر شیر پور گیا ہوا تھا جہاں کے جاگیردار میرے کرم فرما تھے مگر صاحب میرا وہاں جانا غضب ہوگیا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا کہ نواب صاحب میرے ہی منتظر تھے۔ ''میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا۔'' میرے وہاں پہنچتے ہی نواب صاحب نے ٹانگانیکا جانے کا پروگرام بنالیا اور ٹھیک تین دن بعد شیر پور کی بیس رکنی شکاری پارٹی، افریقا کے اس ملک کے لیے روانہ ہوگئی۔

اگرچہ ان دنوں ہوائی جہاز کے ذریعے آمدورفت عام ہوچکی تھی۔ تاہم نواب صاحب طویل ہوائی سفر سے کچھ الرجک تھے اس لیے انہوں نے بحری سفر کو ترجیح دیتے ہوئے اوشین کوئن نامی بحری جہاز میں کشتیں بک کرائی تھیں۔ جنگ کی وجہ سے بحری سفر مخدوش سمجھا جاتا تھا لیکن نواب صاحب کو کون سمجھائے ان کے سر پر شکار کا بھوت سوار ہوچکا تھا اس لیے ہم ساتھ جانے پر مجبور ہوگئے۔

ممبئی کے ساحل سے جنوبی افریقا کی بندرگاہ ڈربن کے لیے ہمارا سفر شروع ہوا۔ بحری راستے میں ہماری پہلی منزل کراچی کی بندرگاہ تھی۔ کراچی میں جہاز نے ایک دن قیام کیا۔ ان دنوں کراچی ڈھائی لاکھ کی آبادی کا ایک چھوٹا سا شہر ہوا کرتا تھا۔ چوبیس گھنٹے کے بعد جہاز نے لنگر اٹھایا اور ہم دس دن کے طویل اور صبر آزما سفر کے بعد ڈربن پہنچ گئے۔ چونکہ نواب مہرالٰہی خان کو برطانیہ حکومت نے ریاست کا درجہ دے کر انہیں نواب کا خطاب عطا کیا تھا اس لیے ان کی آمد کی اطلاع ڈربن پہنچ چکی تھی اور بندرگاہ پر ڈربن کا انگریز پولیس کمشنر اینڈریو اور نائب کمشنر سوسٹ چند افسران کے ساتھ ان کے استقبال کو موجود تھے۔ ہم نے تین یوم تک ڈربن میں قیام کیا اور بعد ازاں ٹانگانیکا روانہ ہوگئے۔

چونکہ ڈربن سے ٹانگانیکا کے دارالحکومت زی لینڈ کا فاصلہ آٹھ نو سو میل سے زیادہ نہ تھا اس لیے نواب صاحب ہوائی سفر کے لیے راضی ہوگئے۔ جنگ کے بادل ابھی ادھر چھائے نہیں تھے اس لیے ہوائی سفر محفوظ سمجھا جارہا تھا۔

نواب صاحب نے بی او اے سی کا پورا جہاز چارٹر کرالیا۔ ٹانگانیکا کے جنگلات میں ہماری رہنمائی کے لیے مسٹر اینڈریو نے اپنے نوجوان افریقی ذاتی ملازم گالا کو ہمارے ہمراہ کردیا۔ گالا کا تعلق ٹانگانیکا ہی سے تھا اور وہ ایک نیم وحشی قبیلے کا فرد تھا جسے اینڈریو نے اس وقت اپنے سایۂ عاطفیت میں لے لیا تھا جب وہ ٹانگانیکا میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ گالا اپنی مقامی بولی بنتو کے علاوہ انگریزی، سواحلی اور عربی بھی بڑی روانی سے بولتا تھا۔ گالا کی عربی دانی سے مولوی سلامت اللہ بہت متاثر تھے۔

اب یہاں تھوڑا سا ذکر مولوی سلامت اللہ کا بھی ہو جائے۔ مولوی صاحب کہنے کو تو عالمِ دین اور نواب زادے افتخار خان کے اتالیق تھے۔ تاہم نہایت ہنس مکھ اور بزلہ سنج تھے۔ انہیں سیر و تفریح اور شکار کا بھی شوق تھا اور اسی شوق کی بدولت ساٹھ باسٹھ برس کی عمر میں بیوی بچوں سے دور نواب صاحب کے پاس پڑے ہوئے تھے۔ دورانِ سفر میں انہیں اکثر یہ کہہ کر چھیڑتا رہتا تھا کہ افریقا میں کسی آدم خور قبیلے کا لقمہ بن جاؤ گے۔ ان کا جواب یہ ہوتا کہ میں تو مولوی آدمی ہوں۔ آدم خوروں کے قبضے میں آنے کے بعد ان سے فرقہ واریت اور شرک و بدعت کے بارے میں بحث چھیڑ دوں گا تو وہ گھبرا کر خود ہی بھاگ جائیں گے۔

☆.....☆

ٹانگانیکا کے دارالحکومت زی لینڈ پہنچ کر ہم نے شہر کے واحد ہوٹل میں قیام کیا۔ ان دنوں اس شہر کی حیثیت ایک بڑے قبیلے سے زیادہ نہ تھی۔ آبادی کوئی پچیس تیس ہزار اور شہری سہولیات بھی واجبی سی تھیں۔ شہر کا وہ علاقہ جہاں انگریز شہری اور افسران مقیم تھے، خاصا سجا بنا تھا لیکن افریقی شہریوں کی بستیاں غربت و افلاس اور پسماندگی کی آئینہ دار تھیں۔ یہاں سے ہمارے سفر کا اہم ترین مرحلہ شروع ہوا۔ اب ہماری منزل دارالحکومت سے کوئی چار میل دور ایک گاؤں شگاٹا تھا جہاں سے جنگل کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ تاحد نگاہ کئی سو میل میں پھیلے ہوئے اس جنگل میں ہر قسم کے جنگلی جانور اور درندے بھرے پڑے تھے۔ ہمیں یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ گالا کا قبیلہ عین جنگل کے درمیان رہتا تھا اور قبیلے کے لوگ ان درندوں اور جنگلی جانوروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ گالا نے ہمیں اپنے قبیلے کے متعلق ایسی ایسی کہانیاں سنائیں جو قطعاً ناقابلِ یقین تھیں تاہم سب لوگ پڑھے لکھے تھے اس لیے ان باتوں کو دلچسپی کے ساتھ سنتے رہے۔

www.PakiBooks.Site

زی لینڈ سے ہمارا سفر جنگل کی طرف شروع ہوا۔ شگاٹا کا قصبہ کہنے کو تو زی لینڈ سے صرف چار میل دور تھا لیکن راستہ اتنا سنگلاخ اور دشوار گزار تھا کہ ہم بدقت تمام نصف گھنٹے میں وہاں تک پہنچ پائے۔ اوپر سے ستم یہ ہوا کہ ہماری منزل قصبہ کا آباد علاقہ نہ تھی بلکہ ہمیں جنگل کے اندر سے گزر کر اس کے تقریباً وسط میں واقع گالا کی بستی تک جانا تھا۔ ہم جس وقت جنگل پہنچے تو سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ آسمان پر سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا تاہم جیسے جیسے ہمارا کارواں جنگل کے اندر داخل ہوتا گیا، ہم سورج کی روشنی سے محروم ہوتے چلے گئے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا گویا ہر سمت تاریکی پھیل گئی ہو۔ یہ تاریکی ان گھنے جنگلات کے سبب تھی جو آپس میں بالکل گتھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان سے جیپ کو نکال لے جانا بلاشبہ ڈرائیونگ کے ایک کارنامہ سے کم نہ تھا۔ گالا کی رہنمائی کے سبب ہی ہم سفر جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ غالباً ان تاریک جنگلات ہی کی وجہ سے افریقا کو تاریک براعظم کا نام دیا گیا ہے۔

جنگل کے ایک تاریک حصہ میں ایک گھنٹا تک رینگ رینگ کر چلنے کے بعد جب ہمارا قافلہ ایک کھلے میدان میں پہنچا تو افریقا کی معروف چمکیلی دھوپ نے ہمارا استقبال کیا۔ مارچ کے ابتدائی دن تھے اور شام کے پانچ بجے کا عمل ہوگا مگر دھوپ میں اس قدر حدت تھی کہ مجھے جیکب آباد اور ملتان کی گرمی یاد آگئی۔ اب ہمیں دور کچھ فاصلے پر پھیلے ہوئے مخروطی جھونپڑے نظر آرہے تھے۔ یہی گالا کی آبائی بستی تھی جہاں زولو قبیلے کی ایک شاخ منکول سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد تھے۔ گالا بھی منکول قبیلے کا ایک فرد تھا۔ گالا کی نظر جیسے ہی ان مکانوں پر پڑی، اس کے منہ سے بے ساختہ خوشی اور مسرت سے لبریز ایک چیخ بلند ہوئی اور اس نے بچوں کی طرح قلقاریاں مارتے ہوئے کہا۔ ''وہ رہا میرا گاؤں۔'' بلاشبہ اپنا وطن اور جنم بھومی سب کو عزیز ہوتا ہے۔ وطن کی سرزمین پر پہنچتے ہی عام طور سے لوگ خوشی سے بے قابو ہو جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ جھونپڑے ہمارے قریب آتے گئے اور کچھ دیر بعد ہم گاؤں کی حفاظتی فصیل تک پہنچ گئے جو دراصل کانٹے دار جھاڑیوں اور مضبوط لکڑیوں سے بنی ہوئی پانچ چھ فٹ اونچی ایک دیوار تھی جس نے گاؤں کو چاروں طرف سے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

☆.....☆

ہیت کے اعتبار سے شاعری کی دو اصناف ہیں۔ غزل اور نظم، نظم کی کئی ہیتیں ہیں، جس میں مثنوی، ثلاثی قطعہ بند، مخمس، مسدس، مثمن، مستزاد، نظم معریٰ، آزاد نظم اور نثری نظم شامل ہیں۔ آزاد نظم کی کامیابی کے بعد نثری نظم کے امکانات روشن ہونے لگے۔ نثری نظم میں وزن، قافیہ، ردیف اور مصرعوں کے چھوٹا یا بڑا ہونے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ آزاد نظم میں ارکان کی کمی بیشی روا ہوتی ہے لیکن نثری نظم میں ارکان سرے سے معدوم ہوتے ہیں بلکہ سطور چھوٹی اور بڑی ہوتی ہیں، جس طرح غزل اور نظم میں ہیت کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے، اسی طرح ان اصناف کے فکری مزاج میں بھی مغائرت پائی جاتی ہے۔ نظم میں فکری اعتبار سے وسعت پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس میں زیادہ تصریح و توضیح کی گنجائش ہوتی ہے، جس کے باعث منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور محاکات نگاری بخوبی کی جاسکتی ہے۔ تسلسل نظم کا تلازمہ ہے۔ خیالات زنجیر کی کڑیوں کی صورت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ نثری نظم بطور خاص سلاست کا مظہر ہوتی ہے۔ نثری نظم میں فنی حوالے سے بہت گنجائش پائی جاتی ہے۔ تاہم فکری اعتبار سے کسی قسم کا سمجھوتا روا نہیں ہے۔

اقتباس: شاعرات ارض پاک
از شبیر ناقد

گاؤں کے لوگ بستی کے ایک گوشے میں بیٹھے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ ہماری گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ سن کر چونکے اور چیختے ہوئے ہماری طرف آنے لگے۔ ان میں مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے بھی شامل تھے۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں نیزے اور بھالے تھے جنہیں وہ لہراتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ ان لوگوں کو اس طرح دوڑتے ہوئے دیکھ کر گالا جیپ سے کود پڑا اور اپنی زبان میں چلا چلا کر کچھ کہنے لگا۔ گالا کو دیکھ کر قبیلے کے لوگ خوشی سے اچھلنے لگے۔ یہ لوگ لباس سے تقریباً عاری تھے۔ مردوں نے تو لنگوٹی نما ایک کپڑا اپنی کمر کے گرد لپیٹ رکھا تھا جب کہ عورتیں سینے سے لے کر گھٹنوں تک صرف ایک چادر میں ملبوس تھیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنا لباس بھی صرف بوڑھی یا ادھیڑ عمر کی عورتوں کے جسم پر تھا جب کہ نوجوان اور کم سن لڑکیاں اس

www.PakiBooks.Site

سے بھی محروم تھیں اور انہوں نے بھی مردوں کی طرح صرف لنگوٹی باندھ رکھی تھی۔

اچانک میں نے کسی کی آواز سنی جو بڑی قرأت کے ساتھ لاحول ولاقوۃ کی گردان کررہا تھا۔ پلٹ کر جو دیکھا تو مولوی سلامت اللہ کو ایک درخت کے ساتھ کمر لگائے اور آنکھیں بند کیے ہوئے کھڑا پایا جو بار بار لاحول پڑھ رہے تھے۔ میں نے انہیں جھنجوڑ کر پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ تو مولوی صاحب نے خاص رامپوری لہجے میں فرمایا۔

”یہ...... یہ عورتیں کتنی بے غیرت ہیں۔“

اب تمام معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔ دراصل مولوی صاحب ان صحت مند نوجوان منگول عورتوں کے جوبن کی تاب نہ لاسکے تھے اور پھر جوبن بھی ایک نہیں بہت سے۔ میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا کہ اگر وہ اس طرح شرماتے اور گھبراتے رہے تو یہ عورتیں بھوتنیوں کی طرح چمٹ جائیں گی۔ بس گالا کے اشارہ کرنے کی دیر ہے۔ تب مولوی صاحب کے ہوش ٹھکانے آئے اور وہ بھی چپ چاپ ہمارے ساتھ قبائلیوں کی سمت بڑھنے لگے۔

نواب صاحب کے میر شکار کرنل محمد علی خان اور چند دیگر افراد ہم سے پہلے قبیلے کی حدود میں پہنچ چکے تھے۔ قبیلے والوں کے درمیان ایک بہت قوی ہیکل اور بھیانک شکل والا شخص تقریباً پورا لباس پہنے کھڑا تھا۔ اس کے طور طریقوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہی قبیلے کا سردار ہے۔ گالا نے بڑے ادب کے ساتھ اس کے قریب پہنچ کر اپنی زبان میں کچھ کہا اور ساتھ ہی نواب صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ گالا کی بات سنتے ہی سردار مسکراتا بلکہ باچھیں چیرتا ہوا نواب صاحب کی طرف بڑھا اور اپنی ناک ان کی ناک سے رگڑنے لگا۔ نواب صاحب اس صورتِ حال سے گھبرا گئے اور پیچھے ہٹنے لگے۔ نواب صاحب کی گھبراہٹ سے قبیلے والے بہت محظوظ ہوئے اور قہقہے لگانے لگے۔ گالا نے نواب صاحب کو انگریزی میں سمجھایا کہ وہ پیچھے نہ ہٹیں کیونکہ اس قبیلے کے لوگ دوسروں کا استقبال اسی طرح کرتے ہیں۔ سردار کی دیکھا دیکھی قبیلے کے دیگر مرد ہماری طرف بڑھے اور اپنے مخصوص انداز میں ہمارا استقبال کرنے لگے۔ وہ تو شکر کریں کہ قبیلے کی عورتوں نے اس رسم کی پابندی نہیں کی ورنہ کم از کم مولوی صاحب کی حرکتِ قلب ضرور بند ہو جاتی۔

اس رات ہم نے گاؤں ہی میں قیام کیا۔ سردار نے ہماری رہائش کی خاطر چار عدد جھونپڑے خالی کرا دیے۔ ہم تھکے ماندے تھے، دل چاہتا تھا کہ سرِ شام ہی سو جائیں مگر قبیلے کی روایت کو کیا کہیے کہ سردار نے اس رات ہمارے لیے ایک جشن کا اہتمام کیا تھا جس میں مخصوص انداز کے رقص و موسیقی کا پروگرام بھی شامل تھا۔ ایک تو رقاص، گلوکار اور موسیقار تھے ہی آبنوسی رنگت والے، طرفہ یہ کہ انہوں نے اپنے جسم اور چہروں کو لال اور نیلی پیلی کھریا مٹی کی لکیروں اور دائرے بنا کر کچھ زیادہ... ہی بھیانک کرلیا تھا۔ ہم شیر اور چیتوں کے شکاری تھے لیکن خوفناک چہروں والے مرد اور عورتوں کو رقص کرتے دیکھ کر ہمیں کچھ خوف محسوس ہو رہا تھا۔ یہ لوگ بھڑکی ہوئی آگ کے گرد رقصاں تھے۔ آگ کی سرخ روشنی جب ان کے جسموں پر پڑتی تو ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے آتشیں عفریت رقص کر رہی ہوں۔ اسی پر موقوف نہیں، کچھ رقاص مستی میں آکر شعلوں پر بے ساختہ قدم رکھ دیتے۔ یہ لوگ ایک دوسرے پر انگارے بھی اچھال رہے تھے۔ میں نے چپکے سے گالا سے پوچھا کہ کیا یہ لوگ جادوگر ہیں جن پر آگ کا اثر نہیں ہوتا تو گالا نے مجھے بتایا کہ یہ کوئی عجوبہ نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اپنے پورے بدن پر گینڈے کی چربی کا لیپ کر رکھا ہے اور اس چربی پر آگ مطلق اثر نہیں کرتی۔

وہ رات جوں توں کر کے کٹی اور اگلے ہی روز تیسرے پہر ہم شکار کے لیے روانہ ہو گئے۔ شکار کے لیے ہماری منزل کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ گالا نے ہمیں بتایا تھا کہ گاؤں سے کوئی دو تین میل دور، جنگل کا انتہائی گھنا حصہ ہے جہاں شیر، چیتے اور دیگر خونخوار درندے دندناتے پھرتے ہیں۔ ان میں ایک شیر تو اتنا جیالا تھا کہ دن دہاڑے گاؤں میں گھس کر ایک گائے کو لے اڑا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس جنگل کا سب سے زیادہ خطرناک درندہ ایک بلی کی قسم کا جانور ہے جس سے شیر اور چیتے بھی خوف کھاتے ہیں۔ بلی کے نام پر جب مجھے ہنسی آئی تو تولا نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ بتایا کہ یہ بلی قد و قامت اور جسامت میں چھوٹے سائز کے کتے کے برابر ہوتی ہے جس کے دانت اور پنجے نہایت تیز اور نوکیلے ہوتے ہیں۔ لمحہ بھر میں یہ بلی اپنے شکار کو چیر پھاڑ کے رکھ دیتی ہے۔ اکثر درندے تو انسانوں کا ہجوم دیکھ کر راہِ فرار اختیار کر لیتے ہیں مگر جنگلی بلی اس وقت بھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اور حملہ آور ہو جاتی ہے۔ تاہم اس درندے کی تعداد دوسرے جانوروں کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن اس سے چوکنا اور باخبر رہنے کی اشد ضرورت ہے۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ افریقا اور ہندوستان کے جنگلات میں شیر یا چیتے کے شکار میں بڑا نمایاں فرق تھا۔ اب بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ سندر بن، نینی تال اور مالا گیری کے جنگلات کے سوا ہندوستان کے جنگلات میں خونخوار درندے بہت کم پائے جاتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہ انسانوں کے خوف سے دن کے وقت بہت کم اپنی کمین گاہوں سے باہر نکلتے ہیں۔ ان کی واردات عام طور سے رات کے وقت ہوا کرتی ہے۔ تاہم آج سے کوئی ستر اسی سال پہلے افریقا میں جنگل کے جنگل ان آدم خوروں سے بھرے ہوئے تھے لہٰذا ان کا شکار دن میں کسی بھی وقت کیا جاسکتا تھا۔ خاص طور سے یوگنڈا، انگولا، ٹانگانیکا، کانگو، سوڈان، رہوڈیشیا اور سیرالیون کے جنگلات میں شکار کے لیے دن کا وقت ہی مناسب تصور کیا جاتا تھا۔ غالباً یہی سبب تھا کہ نواب صاحب اس بات پر زور دے رہے تھے کہ شکار ابھی اور اسی وقت کیا جائے۔

اب یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ خود سردار مگرنڈا ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔ اس نے کسی ناگہانی آفت سے نمٹنے کے لیے قبیلے کے کچھ نوجوانوں کو بھی اپنے ہمراہ لیا جو اپنے نیزے اور بھالے لے کر ہمارے ساتھ ہی جیپوں پر سوار ہو گئے۔ ان کی کل تعداد پانچ تھی۔ دورانِ سفر سب سے آگے والی جیپ میں سردار مگرنڈا، مہر الٰہی خان، گالا اور کرنل محمد علی خان بیٹھے تھے۔ یہ جیپ جسے میں چلا رہا تھا، چاروں طرف سے بند تھی دیگر جیپیں کھلی ہوئی تھیں۔ میرے پیچھے آنے والی جیپ میں مولوی سلامت اللہ، نواب صاحب کے ڈرائیور محسن خان، ان کے ایک دوست سردار علی صاحب اور خاص ڈرائیور بشیر خان تھے۔ بعد میں دو عدد گاڑیاں اور بھی تھیں جن میں سے ایک میں قبیلے کے نوجوان اور دوسری میں ہمارے ساتھ آنے والے لوگ سوار تھے۔

☆......☆

اب صورتِ حال یہ تھی کہ ہمارے پاس جیپیں تو کل پانچ تھیں جب کہ قبیلے کے لوگوں سمیت ہم سب کی کل تعداد کافی ہو گئی تھی۔ بہرحال ہم کسی طرح گھس گھسا کر جیپوں میں سوار ہو ہی گئے اور ہمارے سفر کا آغاز ہوا۔ مقامِ مقررہ سے کچھ فاصلے پر جہاں سے جنگل کے گھنے حصے کا آغاز ہونے والا تھا، سردار مگرنڈا نے گاڑیاں روک دینے کے لیے کہا۔ اس کا کہنا تھا کہ گاڑیوں کے شور سے جنگلی درندے چوکنا ہو کر بھاگ جائیں گے۔ لہٰذا باقی ماندہ سفر اب پیدل طے کیا جائے۔ اس جگہ ایک اونچا ٹیلا تھا۔ نواب صاحب نے مجھ سے اور کرنل محمد علی خان سے کہا کہ ذرا اس ٹیلے پر چڑھ کر جنگل کے اندرونی حصے کا جائزہ تو لو۔

ہم دونوں دوربینیں لے کر ٹیلے پر چڑھ گئے۔ یقین کریں جنگل پر طائرانہ نظر ڈالتے ہی میرا دل خوشی سے سرشار ہو گیا، کہاں ہندوستان کے جنگلات میں شیر کی تلاش میں کئی کئی دن مارے پھرتے رہو اور کہاں ٹانگانیکا کا یہ جنگل جہاں پہلی ہی نظر میں کوئی نصف کلومیٹر کی دوری پر شیر کا ایک جوڑا نظر آیا جو ایک جوہڑ کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور سامنے ان کے دو عدد ننھے ننھے بچے کھیل رہے تھے۔ کچھ زیادہ فاصلے پر بارہ سنگھوں اور ہرنوں کی ایک ڈار دکھائی دی، جن کے درمیان دو تین زرافے بھی دوڑ رہے تھے۔ ہم نے مگرنڈا سے دریافت کیا کہ ہم لوگ یہاں شیر کا شکار کرنے کے لیے کیا ترکیب اختیار کریں۔ یہ سوال اس لیے کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے جنگلات میں تو مچان باندھ کر یا جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان کوئی محفوظ مقام منتخب کر کے شیروں کا شکار کرنے کے لیے مچان بنا دیا جاتا ہے جب کہ یہاں تو مچان باندھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ شیروں کا جوڑا سامنے ہی بڑے بے تکلفانہ انداز میں راز و نیاز میں مصروف تھا۔ مگرنڈا نے کہا کہ خاموشی کے ساتھ دبے پاؤں ٹیلوں کے اوپر چلتے رہو جن کا سلسلہ نصف دائرے کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ٹیلوں کی اترائی شروع ہوتی ہے جو عین وہاں پر ختم ہو گی جہاں شیر بیٹھے

صحافت کا درخشاں ستارہ نہ رہا

1951 میں حیدرآباد میں جنم لینے والے سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کرنے والے الیاس شاکر 1977 میں کراچی آ گئے۔ کئی اخبارات و جرائد میں خدمت انجام دینے کے بعد 1988 میں انہوں نے ”قومی اخبار“ کی بنیاد رکھی اور شہری سطح کی صحافت کا آغاز کیا۔ کراچی کے مسائل کو سامنے لانے لگے۔ اس طرز صحافت کو خوب پزیرائی حاصل ہوئی اور قومی اخبار شہر کا کامیاب ترین شام کا اخبار کہلانے لگا۔ اپنے انداز کی صحافت نے ہی انہیں کراچی کے مختلف صحافیوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ کسے معلوم تھا کہ 8 ستمبر 2018 کو ہم کراچی کے اس نایاب ہیرے کو کھو دیں گے۔ ادارہ ان کے گھر والوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

ہوئے تھے۔ وہاں پہنچ کر شیروں کو گھیر لیا جائے گا۔

مگرمنڈا کا قیاس یہ بھی تھا کہ شیروں کا بھٹ بھی یہاں کہیں قریب ہی واقع ہے۔ مگرمنڈا اتنے اطمینان کے ساتھ یہ سب بتا رہا تھا کہ جیسے یہ مہم شیر کے شکار کے بجائے خرگوش یا ہرن پکڑنے کی ہو۔ مگرمنڈا کے اشارے پر نیزہ بدست نوجوان اور ہمارے ساتھی ٹیلوں کے اوپر پہنچ گئے اور ہم سب مگرمنڈا کی قیادت میں دبے پاؤں اس طرف کو چلنے لگے۔

کوئی بیس فٹ بعد ہماری پارٹی ٹیلوں کے آخری سرے تک پہنچ گئی اور اب اترائی کا آغاز ہوا۔ مجھے یہ ڈر ہوا کہ کہیں اترتے ہوئے ہم عین شیروں کے سامنے نہ پہنچ جائیں لیکن اترائی پر پہنچتے ہی مگرمنڈا نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور قبیلے کے نوجوانوں کو اپنے قریب بلا کر سرگوشی میں کچھ کہنے لگا۔ گالا کے توسط سے اس نے ہمیں یہ پیغام دیا کہ ہم کہیں چھپ جائیں۔ ہم لوگ ٹیلے کے اردگرد پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں روپوش ہو گئے جب کہ اس کے ساتھی نوجوانوں نے اپنی گردنیں خم کرتے ہوئے، آہستہ آہستہ دائرے کی شکل میں پھیلنا شروع کر دیا۔ دولڑ کے درختوں میں سے ہوتے ہوئے، شیروں کے عقب میں چلے گئے۔ دو نوجوانوں نے دائیں جانب ڈیرا جمایا اور گالا سمیت دو نوجوانوں نے شمالی حصے کا رخ کیا۔ ہم جس جگہ کھڑے تھے وہاں سے شیروں کا فاصلہ سو گز سے زیادہ نہ تھا جب کہ نیزہ تھامے ہوئے نوجوان تو شیروں کے اور بھی زیادہ قریب تھے لیکن شیروں کو ان کی آمد کی کوئی خبر نہ تھی۔ شیر اپنے حال میں مست تھے۔ ان کے بچے بدستور اپنے کھیل میں مصروف تھے۔ اچانک سردار مگرمنڈا ہمارے قریب آیا اور سرگوشی میں نواب صاحب سے کچھ کہا۔ نواب صاحب تو اس کی بات نہ سمجھ سکے البتہ اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ وہ ہم سے آگے بڑھنے کو کہہ رہا تھا۔ ہم لوگ دبے پاؤں اس سمت کا رخ کرنے لگے جہاں قبائلی نوجوان ایستادہ تھے۔ اچانک گالا سامنے آ کھڑا ہوا اور اس نے ہم سے ہتھیار سنبھالنے کو کہا۔ گالا نے کہا۔ ”اور اب سردار ایک نعرہ لگائے گا۔ ہم لوگوں کو چاہیے کہ اس کا نعرہ بلند ہوتے ہی ہم فائر کھول دیں۔“

کوئی لمحہ بھر بعد سردار مگرمنڈا کے حلق سے بھیڑیے جیسی فلک شگاف آواز بلند ہوئی۔ جیسے ہی سردار، مگرمنڈا نے یہ چیخ بلند کی۔ شیروں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے سامنے کی سمت دوڑنے لگے۔ وہ بالکل ہمارے قریب آ رہے تھے۔ ہم لوگ توشت باندھے ہوئے تیار ہی تھے۔ میں نے نواب صاحب اور کرنل محمد علی خان نے ایک ساتھ فائر کیا۔ ہم تینوں کی گولیاں نشانے پر بیٹھیں اور شیروں کا جوڑا اپنے ہی خون میں نہا گیا۔ شیروں کے گرتے ہی قبائلی نوجوانوں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جھپٹ کر شیروں کے ان دونوں بچوں کو پکڑ لیا جو اپنے ماں باپ کا حشر دیکھ کر بھاگ رہے تھے۔ ان نوجوانوں نے خشک گھاس سے بنی ہوئی رسیاں بچوں کے گلے میں ڈال دی تھیں، مزے کی بات یہ ہے کہ یہ رسیاں بھی انہوں نے اس جگہ بڑی مختصر سی مدت میں تیار کر لی تھیں۔

بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس شکار میں کچھ زیادہ مزہ نہیں آیا۔ کہاں ہندوستان کے جنگلات جہاں بعض اوقات ہفتوں تک شیروں کی تلاش میں سرگرداں رہنا پڑتا تھا، کہاں یہ شکار جو میرے نزدیک خرگوش اور ہرن کے شکار سے بھی زیادہ آسان تھا۔ قبائلی نوجوان تو شیروں کے قسائی معلوم ہو رہے تھے جنہوں نے نصف گھنٹے سے بھی کم وقت میں بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ شیروں کی کھال اتار کر رکھ دی۔ کرنل محمد علی خاں اس منظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کیمرا نکالا اور شیروں کی کھال کھینچے جانے کے منظر کو عکس بند کرنے لگے۔

☆.....☆

محمد علی خان فوٹو گرافی کے بہت شوقین تھے۔ اب چونکہ ان کا کیمرا نکل چکا تھا، لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ مکمل اندھیرا پھیلنے سے پہلے اردگرد کے بہت سے مناظر کی تصویر کشی کر لیں۔ ہماری پوری مہم صرف دو گھنٹے میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ ابھی کوئی سات بجے کا عمل تھا اور سورج غروب ہونے میں نصف گھنٹا باقی تھا۔ بس مجھے تو اتنا یاد ہے کہ محمد علی خان شیر کی کھال اتارنے والی تصویر کھینچ کر کسی دوسری طرف چلے گئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اِدھر اُدھر کی عکس بندی کر کے واپس آ جائیں گے۔ تاہم کوئی ایک گھنٹا بیت گیا اور محمد علی خان نہیں لوٹے تو ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے انہیں زور زور سے آوازیں دیں مگر کوئی ہوتا تو سنتا اور جواب دیتا۔ کسی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ہم سب لوگ پریشان ہو گئے۔ اس وقت تک گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ سب سے زیادہ فکر یہ تھی کہ محمد علی خان کے پاس صرف ایک ریوالور تھا۔ اگر اس دوران کسی درندے سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی تو وہ بے چارے تو بے موت مارے جائیں گے۔

نواب صاحب نے مجھے، گالا اور بخن خان کو حکم دیا کہ محمد علی خان کو تلاش کر کے لایا جائے۔ ہم لوگ رائفلیں اور

سرچ لائٹ لے کر دور دور تک انہیں تلاش کرتے رہے لیکن ان کا کوئی پتا نہ چلا۔ لہٰذا ہم لوگ منہ لٹکائے ہوئے، بے نیل و مرام واپس آ گئے۔ سردار مگرمنڈا بھی ہماری پریشانی کو بھانپ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ اچانک اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں گالا سے کچھ کہا۔ میں نے جب گالا سے دریافت کیا کہ سردار نے کیا کہا ہے تو اس نے بتایا کہ سردار کہہ رہا ہے کہ اس جنگل کے آخری سرے پر واقع پہاڑوں کے دامن میں ایک آدم خور قبیلہ رہتا ہے جس کے باسی جنگلی درندوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں، ممکن ہے، محمد علی خان اس قبیلے کی طرف جا نکلے ہوں یا دوران راہ قبیلے کے لوگ ان سے ٹکرا گئے ہوں اور خان صاحب کو قبیلے والوں نے پکڑ لیا ہو۔ یہ سن کر تو ہمارے ہوش اڑ گئے۔ ہمیں کیا علم تھا کہ جن آدم خوروں کے بارے میں ہم نے صرف کتابوں میں پڑھا یا ایم بی ایم کی فلموں میں دیکھا تھا، ان سے کبھی یوں مڈبھیڑ بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ وقت سوچنے سمجھنے یا بحث مباحثہ کا نہ تھا۔ ہم پر ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی بن کر گزر رہا تھا۔ لہٰذا جیپوں کے اندر ہم نے اپنا سامان سمیٹا، اسے جیپوں میں پھینکا اور گاڑیاں اسٹارٹ کر کے برق رفتاری کے ساتھ مگرمنڈا کے بتائے ہوئے مقام تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔

لیکن وہ جنگل تھا، کوئی رامپور کی ٹھنڈی سڑک نہ تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہمارے کارواں میں شریک کوئی نہ کوئی جیپ کسی گڑھے یا کھائی میں پھنس جاتی یا گھنی جھاڑیاں یا زمین تک لٹکی ہوئی شاخیں ہمارا راستہ روک لیتیں، جنہیں کاٹ چھانٹ کر ہمیں راستہ بنانا پڑتا۔ جہاں ہمیں چند منٹ رکنا پڑتا، وہیں ہمارا دم گھٹ کر رہ جاتا، جیپوں کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور سرچ لائٹس نے بھی جنگل کو بقعہ نور بنا رکھا تھا۔ تاہم پھر بھی کہیں نہ کہیں راستے میں رکاوٹ کھڑی ہو جاتی۔

خدا خدا کر کے جنگل کی یہ بھول بھلیاں... ختم ہوئیں اور ہم نسبتاً ایک کھلی جگہ پر نکل آئے۔ سردار مگرمنڈا نے گالا کے توسط سے ہمیں یہ بتایا کہ اب وحشیوں کا قبیلہ قریب ہے۔ اب ہم نے گاڑیوں کو پوری رفتار پر چھوڑ دیا لیکن ایک اور آفت ہماری منتظر تھی۔ ہم نے صرف یہ دیکھا کہ ایک گھنے درخت کے اوپر سے کسی جانور نے اس جیپ پر چھلانگ لگائی جس پر مولوی سلامت اللہ اور بخن خان سوار تھے۔ ہم نے تو صرف یہ دیکھا کہ اس سیماب صفت برق رفتار جانور نے بخن خان کا نوالہ بنایا اور وہ درندہ اور بخن صاحب چلتی

ایک چراغ اور بجھا.....!!

ابھی ہم شاہد حسین، محی الدین نواب، کاشف زبیر، سلیم فاروقی، ایم اے راحت اور مختار آزاد کے غم سے ابھر بھی نہیں پائے تھے کہ ایک اور غم ناک خبر آ گئی۔ 31 اگست کو صبح ہی صبح لاہور سے کال آئی کہ ذاکر حسین آرٹسٹ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ ذاکر حسین عرصہ سے صاحبِ فراش تھے۔ اس دوران بھی ان سے اکثر باتیں ہوتی رہتی تھیں لیکن یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ ان کے بنائے ہوئے لاجواب سرورق قارئین کو متوجہ کرتے تھے۔ ان کی یہی خوبی تھی جس کی وجہ سے وہ ادارہ کے لیے ایک ضرورت بن گئے تھے۔ وہ انتہائی سادہ مزاج، نرم طبیعت تھے۔ ان کی یہی خوبی ہم سب کو آبدیدہ کر رہی ہے۔ تمام قارئین سے التماس ہے کہ وہ ایک سورۃ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص ضرور پڑھ دیں۔

☆☆☆

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

جیپ سے نیچے جا پڑے۔ یہ درندہ قد و قامت میں کسی کتے کے برابر تھا۔ ہم نے فوراً گاڑیوں کے فل بریک لگائے اور اس کے ساتھ ہی درندے نے ایک زقند لگائی اور یہ جا وہ جا۔ ہمیں تو ہتھیار سنبھالنے کا موقع بھی نہ ملا۔ ہم نے تو بس یہ دیکھا کہ بنن صاحب کا حلقوم ادھڑا ہوا تھا جس سے خون کا فوارہ بہہ رہا تھا اور وہ بری طرح تڑپ رہے تھے۔ آنِ واحد میں وہ ہماری آنکھوں کے سامنے دم توڑ گئے۔

سردار مگرنڈا نے ان کے زخموں کا جائزہ لے کر بتایا کہ انہیں اسی ظالم جنگلی بلی نے ہلاک کیا ہے جس کا ذکر سردار نے ہم سے کیا تھا۔ صرف ایک منٹ کے اندر اندر وہ ان کا کام تمام کر کے بھاگ گئی اور وہ بھی تین افراد کے سامنے۔ ہمارے لیے بڑے سخت افسوس اور حیرت کا مقام تھا۔ نواب صاحب، بنن صاحب کو بہت چاہتے تھے اس لیے بہت ضبط کے باوجود ان کے آنسو چھلک پڑے اور ہم لوگ بھی آبدیدہ ہو گئے مگر جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ ہمارے پیش نظر ایک مرحلہ اور بھی تھا۔ ہمیں تو محمد علی خان کی جان بھی بچانی تھی لیکن ہم بنن صاحب کی لاش کو بھی جنگلی درندوں کی خوراک بننے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے تھے اس لیے ہم نے مگرنڈا کے قبیلے کے دونو جوانوں اور اپنے دو ساتھیوں کو ایک جیپ سمیت وہاں چھوڑ دیا اور کہا کہ ہم انشاء اللہ بہت جلد واپس آجائیں گے یہ کہہ کر خود تین جیپوں میں سوار ہو کر اندھا دھند وحشی قبیلے کی طرف چل دیے۔

☆......☆

سردار مگرنڈا نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔ واقعی پہاڑوں کے دامن میں ایک وحشی قبیلہ آباد تھا۔ کچھ دیر تک سفر کرنے کے بعد ہمیں ایک جگہ سے آگ کے شعلے اٹھتے ہوئے دکھائی دیے۔ جیسے جیسے ہم اس کے قریب ہوتے گئے ڈھول پیٹے جانے اور شور و غل کی آوازیں بھی ہمارے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر سردار مگرنڈا نے گھبرا کر گالا سے کچھ کہا اور گالا نے ہمیں بتایا کہ سردار کہہ رہا ہے کہ یا تو قبیلے والے کسی انسان کو بھون کر کھا چکے ہیں یا اس کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ یہ سنتے ہی ہم لوگوں کے جسم میں تو جیسے بجلی بھر گئی اور ہم نے اللہ کے آسرے پر گاڑیوں کو پوری رفتار کے ساتھ چھوڑ دیا۔ اس وقت نہ تو ہمیں گاڑیوں کے الٹنے کا خطرہ تھا نہ جان جانے کا خوف۔ جیسے جیسے ہم وادی کے قریب ہوتے گئے ویسے ویسے منظر صاف ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے آتا چلا گیا۔ ہم نے دیکھا کہ بہت سارے برہنہ وحشی انسان ایک جگہ جمع ہیں۔ درمیان میں آگ جل رہی ہے جس کے گرد کالے کالے بھوت جیسے لوگ ناچ رہے ہیں۔ دور کوئی آدمی ایک درخت سے بندھا ہوا ہے۔ میں نے جب دوربین کے ذریعے اس شخص کو بغور دیکھا تو پھر شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ وہ شخص محمد علی خان ہی تھا جسے انسان نما وحشی درندوں نے برہنہ کر کے ایک درخت سے باندھ رکھا تھا۔

پھر کیا تھا، ہم چشم زدن میں ان کے قریب پہنچ گئے۔ سرچ لائٹس لہرائیں اور ان درندوں پر فائر کھول دیا۔ وہ لوگ جو انسانی گوشت کھانے کی لالچ میں جمع تھے، اس خوشی میں اتنے مست تھے کہ انہوں نے اپنے شور اور ہنگامے میں گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ کی آواز بھی نہیں سنی تھی، ایک ایک کر کے ڈھیر ہوتے چلے گئے۔ بیس پچیس تو وہیں گر گئے اور باقی ماندہ لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ہم لوگ چند لمحوں میں محمد علی خان کے قریب پہنچ گئے اور انہیں رسیوں کی بندشوں سے آزاد کرایا۔ محمد علی خان کی ستر پوشی کے بعد ہم نے انہیں جیپ میں ڈالا اور واپس اس مقام تک آئے جہاں بنن خان کی بے گور و کفن لاش پڑی تھی۔ ایک زندہ لاش اور ایک مردہ جسد خاکی کو لیے ہم لوگ منکولوں کی بستی میں پہنچے۔ بستی پہنچ کر بھی محمد علی خان بے ہوش تھے۔ انہیں کئی گھنٹے بعد ہوش آیا تو اندازہ ہوا کہ ان کے ہوش و حواس درست نہیں تھے کیونکہ خان صاحب ہمارے قریب کھڑے ہوئے منکولوں کو دیکھ کر چیخیں مارتے ہوئے دوبارہ بے ہوش ہو گئے۔ غالباً انہوں نے منکولوں کو بھی آدم خور تصور کیا تھا۔ بڑی مشکل سے ان کے حواس درست ہوئے تو انہوں نے بتایا کہ وہ جنگل کے قدرتی مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے کچھ دور تک نکل گئے تھے۔ اچانک کسی درخت کے اوپر سے رسی کا ایک پھندا ان کے گلے میں آ پڑا اور پھر انہیں کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اس تمام عرصے میں مسلسل بے ہوش رہے ورنہ تو خوف کے مارے ان کا دم ہی نکل جاتا۔

بنن خان کی موت اور محمد علی خان کے حادثے کے بعد وہاں رہنا اور شکار کرنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا اس لیے ہم نے آہوں اور سسکیوں کے ساتھ بنن خان کو اسی قبیلے کی حدود میں آخری آرام گاہ تک پہنچایا اور خود ہندوستان لوٹ آئے۔ ہاں صاحب! کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ شکاری خود شکار بن جاتا ہے۔

تیسواں حصہ

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

یہ اعزاز صرف سرگزشت کو حاصل ہے کہ اس نے سفرناموں کے انداز کو بالکل بدل دیا۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ سفرنامہ نگاری میں ایک نئے عہد کا اضافہ کیا اور ان خرافات کو یکسر نظر انداز کردیا جو [illegible] تھی۔ سفر نامہ پر کہانی کا گمان ہو اس جانب مکمل توجہ رکھی۔ سفر نامے میں تاریخ و جغرافیہ اور دیگر معلومات بھی ہوں۔ اس کا بھی خیال رکھا۔ ندیم اقبال کے سفر نامے میں بھی ایسا سب کچھ نظر آتا ہے۔

ذوق مطالعہ کی خاطر بالکل الگ انداز کا سفر نامہ

میں نہایت تیزی سے بھاگتا ہوا اسعد کے قریب پہنچا اور اس کے ہاتھ سے چپس کے پیکٹ چھین کر بطخوں کی جانب اچھال دیا، پھر میں نے ڈانٹنے کے انداز میں سرجی کو کہا۔ ''ایک بار دیکھ چکے تھے کہ یہ بطخیں کھانے کی چیز پر جھپٹتی ہیں تو پھر کیوں ایسی بے وقوفی کی؟''

سرجی نے شرمندہ شرمندہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو لطف لینے کے لیے چپس کے پیکٹ ان کی طرف پھینکے تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اتنی بڑی تعداد میں حملہ آور ہو جائیں گی۔''

اسعد کو گود میں اٹھا کر میں واپس نسرین کے پاس آگیا

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

اور بیٹھتے ہی اسی جگہ سے باتوں کے سلسلے کو جوڑا جہاں سے چھوڑا تھا۔ ''اپنا بیڈ میرے لیے چھوڑ کر خود صوفے پر سوتی ہو۔ میرے سب لمحوں کا حساب رکھتی ہو کہ مجھے چائے کب چاہیے، کھانا کس قسم کا اور کب کھاؤں گا۔ میں سویا ہوتا ہوں تو رات کو بار بار اٹھ کر دیکھتی ہو کہ کہیں بے آرام تو نہیں ہو رہا، سردی سے سکڑا پڑا ہوں تو کمبل ڈال دیتی ہو۔ پیار کا اتنا بڑا خزانہ ہاتھ لگے تو کون اسے چھوڑتا ہے؟ مگر یہ سب صرف اس لیے تم سے کرواؤں کہ مجھے اچھا لگتا ہے؟ میں کیوں نہ تمہارا بوجھ کم کروں اور کیوں اسے بڑھاتا جاؤں؟''

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر بولا۔ ''یقین کرو، اب سخت لہجے میں بات نہیں کروں گا۔''

اس کی میری جانب پیٹھ تھی۔ گھوم کر بولی۔

''تمہارے ڈانٹنے سے تو خفا نہیں ہوں۔''

''تو پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''اُمید ٹوٹنے سے دکھی ہوئی تھی۔ میں صبح اٹھ کر تازہ کھانے تمہارے لیے بناتی رہی۔ گو تم نے منع کیا تھا مگر مجھے تو وہی کرنا تھا جو ٹھیک ہے۔ لہٰذا میں نے تم کو خوش کرنے کے لیے یہ سب کھانے بنائے۔ سوچا کہ جب تمہیں بھوک لگے گی تو میں انہیں نکال کر تمہیں دوں گی۔ تم خوش ہو کر مجھ سے کچھ نہ کچھ اچھا کہو گے مگر تم نے بیگ کا بوجھ دیکھا اور مجھے ڈانٹ کر میری امیدیں ختم کر دیں۔ اگر تم بیگ میں میرے پیار کا وزن محسوس کر لیتے تو میرے حصے میں بھی کچھ آ جاتا۔''

میں کچھ دیر خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔ ''چلو ذرا واک کر لیتے ہیں۔''

وہ اٹھ کر بولی۔ ''مگر یہاں سامان جو پڑا ہے؟''

''کہیں نہیں جائے گا۔ سرجی اور سعد تو ہیں ناں۔'' میں بولا۔

پھر ہم نرم گھاس پر درختوں تلے لوگوں سے پرے چلنے لگے۔ اس دن گھاس پر بے شمار مرغابیاں تھیں جو ہم سے ذرا بھی نہ ڈر رہی تھیں۔ لوگ آہستہ آہستہ آرہے تھے۔ ہر ایک نے درختوں تلے اور کچھ نے ذرا ہٹ کر اپنے مسکن آباد کر رکھے تھے۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ موم کی طرح پگھل گئی۔ میں بولا۔ ''پیار ایک ہی ہوتا ہے مگر انداز مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کے لیے بوجھ اٹھاتا ہے اور کوئی کسی کا بوجھ کم کرنا چاہتا ہے، تم یہ سب کچھ اتنی فراوانی سے کرتی ہو کہ میں ندامت سے جھک جاتا ہوں۔''

''جس کو تم بوجھ کہہ رہے ہو وہ بوجھ نہیں بلکہ ایک خوب صورت احساس ہے۔ احساس کا بوجھ نہیں ہوتا۔ اگر اس کا کوئی بوجھ ہوتا بھی ہے تو کوئی اس سے نہیں جھکتا کیونکہ اسے اٹھائے جس راستے پر ہم چل رہے ہوتے ہیں وہ راستہ پیار کا ہوتا ہے۔ فرق صرف راستے کا ہے، اگر راستہ نفرت کا ہو تو پیار بھی بوجھ محسوس ہوتا ہے اور اگر راستہ پیار اور خیال کا ہو تو بوجھ بھی پیار محسوس ہونے لگتا ہے۔''

چلتے چلتے وہ چیڑ کے ایک درخت تلے سہارا لے کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ ''اللہ نے دنیا میں جتنی بھی مخلوق بنائی ہے وہ پیار سے بنائی ہے اور صرف پیار ہی کرنے کے لیے بنائی ہے۔ ہم پیار کو مرد اور عورت کے بیچ کوئی تعلق یا ناتا سمجھتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان کیا تعلق ہے؟ انسانی رشتے جتنے بھی دیکھ لیں وہ تب جا کر مضبوط ہوتے ہیں جب تک ان میں ایثار اور پیار کی مضبوط ڈور نہ بندھی ہو۔''

میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''اپنے اور میرے رشتے کو بھی دیکھ لو اگر اس میں ہوس ہوتی یا میری کوئی غرض شامل ہوتی تو تم کبھی اس طرح سے مجھے نہ دیکھ رہے ہوتے جن نظروں سے اب دیکھ رہے ہو، یہی تو پیار ہے۔ اگر اس کو درمیان سے نکال لو تو باقی کھوکھلے الفاظ ہی بچتے ہیں۔ اس پیار کو سینچنے کے لیے اپنے آپ کو فنا کرنا پڑتا ہے مگر میں تو کچھ بھی نہیں کر پا رہی۔ میری آرزو یہ نہیں کہ تمہیں پالوں بلکہ یہ ہے کہ تمہیں کبھی بھول نہ سکوں۔''

وہ باتیں ایسے کر رہی تھی جیسے پھول اور پتیاں پھینک رہی ہو۔

میں حیرت سے کھڑا یہ سوچتا تھا کہ جسے زندگی میں کبھی پیار ملا ہی نہ ہو اور اس کے اندر اتنا زیادہ پیار بھرا ہو۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پیار پانے سے بڑھتا ہے یا کہ پالنے سے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''جو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ تم مجھ سے پیار کرنے لگی ہو۔ پیار میں تو خوشی ملتی ہے اور یہی اس کا انجام ہے مگر تم کو کون سی خوشی ملے گی؟''

اس کے خوب صورت چہرے پر کوئی خوابیدہ کیفیت ابھر آئی۔ ہلکا سا مسکرا کر بولی۔ ''خوشی کوئی منزل تو نہیں ہوتی۔ خوشی کوئی اسٹیشن تو نہیں جہاں آپ اتر جاتے ہیں۔ پیار کے سفر میں خوشی اور مسرت کا کوئی اسٹیشن نہیں

پڑتا۔ یہ سفر بذات خود مسرتوں اور خوشیوں سے بھرا ہوتا ہے۔ آپ کو کہیں اترنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں تو خود یہ چاہتی ہوں کہ اس سفر کی کوئی منزل نہ ہو۔ بس یہ سفر جاری رہے۔''

یہ سن کر بے اختیاری.... اسے میں نے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ اس کی لمبی پلکیں میری گردن پر کھلتی اور بند ہو رہی تھیں۔ میں اس سے بولا۔ ''جس راستے پر تم چل پڑی ہو۔ بڑی مشکلیں آسکتی ہیں، خاص کر تم کو۔ اپنے آپ کو اتنے بڑے امتحان میں کیوں ڈال رہی ہو؟''

مجھ سے علیحدہ ہوئی ہم پھر سے نرم گھاس پر چل رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''جنون کے ہر راستے میں مشکلات ہوتی ہیں۔ جس راستے میں مشکلات نہیں، وہ راستہ کہیں نہیں جاتا۔ بس گھومتا پھرتا اپنے آپ کو آغاز کے قریب رکھتا ہے۔ انسانی راستے میں کوئی سختی نہیں ہوتی۔ وہ ایک طرح کی بھول بھلیاں ہوتی ہیں جو آپ کو بہلا پھسلا کر وہیں لے آتی ہیں جہاں سے آپ چلے تھے۔'' پھر میرے کندھے پر چپت مارتے ہوئے بولی۔ ''میری زندگی پہلے کون سی آسان تھی جو تم اب ڈرا رہے ہو۔ اب تو بہت آسان اور خوب صورت لگنے لگی ہے اور تم کہتے ہو کہ اس سے بھی باز آ جاؤں؟''

''اسی طرح کی باتیں کرتے کرتے ہم وہاں واپس آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ منزل تو کوئی نہ تھی مگر جتنی دیر یہ سفر رہا مسرتوں سے بھرپور تھا۔ خاص کر نسرین کے لیے اور میرے لیے بھی مگر وہ تو پہلی بار ایسے تجربوں سے روشناس ہو رہی تھی۔ زندگی کے گزرے پچھلے دس سال تو اس کے لیے کسی کریہہ اور بھیانک خواب کی طرح تھے۔ سرجی اور سعد دور جنوبی سمت جھیل کے ریتیلے کنارے پر کھیلتے نظر آ رہے تھے۔ میں نے نسرین سے کہا کہ اب یہاں سے چلنا ہے۔ زندگی کی مسرتوں کا کھوج لگانے کے علاوہ اس شہر کو بھی ذرا دیکھ لیں۔''

کہنے لگی۔ ''میں جا کر ان کو لے آتی ہوں۔'' پھر ہنس کر کہتی ہوئی انہیں بلانے چل پڑی۔ ''تمہیں تو میرا یہ بھاری بیگ بھی اٹھانا ہے۔ ذرا آرام کر لو میں انہیں لے آتی ہوں۔''

میں مسکرا کر نرم گھاس پر بچھی چادر پر پشت کے بل لیٹ گیا اور درختوں کی ٹہنیوں سے جھانکتے نیلے اور چمکتے آسمان کو دیکھنے لگا۔

نسرین، سرجی اور سعد کو واپس لے آئی۔ سعد دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے لپٹ کر بولا۔ ''سرجی انکل تو بہت اچھے ہیں۔ ہم بہت دیر تک کھیلتے رہے۔ آپ کی تو بہت تعریف کر رہے تھے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ یہ انکل تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔ مجھے تو معلوم ہے کہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔''

میں اس کے گھنے سیاہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ''سرجی انکل سمجھتے ہیں کہ سعد کو یہ معلوم نہیں ہے۔''

وہ سانس درست کرتے ہوئے۔ ''نہیں وہ کہہ رہے تھے کہ شاید تمہاری امی کو معلوم نہ ہو۔ انہیں ضرور بتانا کہ ندیم انکل مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔''

میں نے سرجی کی جانب دیکھا تو وہ نسرین کو کہہ رہے تھے۔ ''ہوا تیز چل رہی ہے۔ دوپٹا کس کر باندھ لو۔ کہیں گر نہ جائے۔''

ہم ایک بڑے فوارے کی جانب جا رہے تھے۔ جدھر بہت سے سیاح بچوں کو لیے رواں دواں تھے۔

ایک بہت بڑا فوارہ جس کے گرد سیاحوں کا رش تھا۔ فوارے کے اردگرد کی بہت ساری زمین کو پختہ اینٹوں سے ڈھانپ کر اسے زیادہ دیدہ زیب بنا دیا گیا تھا۔ ایک بہت بڑا احاطہ ان پختہ اینٹوں سے ڈھکا تھا۔ عورتیں، مرد اور بچے فوارے کے گرد کھڑے اُس کے پانیوں کو کئی فٹ بلند ہوتا دیکھ رہے تھے۔

سرجی اور سعد اکٹھے گھوم پھر رہے تھے۔ معلوم نہیں سعد نے سرجی کا ہاتھ تھام رکھا تھا یا سرجی نے سعد کا۔ میں دور رکھے ایک بینچ پر جا بیٹھا۔ فوارے اور احاطے کے باہر ہر جانب سرسبز درخت لہلہا رہے تھے۔ احاطے میں درجنوں پرندے آزادانہ پھرتے دانہ چگتے تھے۔ ذرا دور تین فوارے ایک ہی تالاب میں بلندی سے پانی پھینک رہے تھے۔ اوپر نیلا آسمان تھا جہاں بادل کہیں کہیں سے آکر اپنی جگہ بنا رہے تھے۔ ہلکورے لیتی ہوا مجھے تازہ دم لگتی تھی۔ لوگوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔

میرے پیچھے جھیل کے پار ٹورنٹو ڈاؤن ٹاؤن تھا۔ اس کی عمارتوں کا اجتماع پورے افق پر ہوا چھایا تھا۔ پرندے اس سے نیچی پرواز بھرتے نظر آرہے تھے۔

فوارے کے قریب نسرین، سعد اور سرجی سے علیحدہ ہوئی اور میری جانب بڑھتی چلی آئی۔ دھوپ کے چشمے کو اتار

www.PakiBooks.Site www.PakiBooks.Site

کر مجھ سے بولی۔ ''تم یہاں اکیلے کیوں خاموش خاموش بیٹھے ہو؟''

میں اٹھا اور اس سے سوال کیا۔ ''سعد، سرجی کے ساتھ خوش تو ہے ناں۔''

وہ ہنس کر بولی۔ ''ہاں، وہ جو بھی بات کرتا ہے تو سر جی اس کے مطابق کوئی کہانی آگے بڑھا دیتے ہیں۔ وہ دونوں بور نہیں ہو رہے۔''

''اور تم بور ہو رہی ہو؟''

''بور تو نہیں ہو رہی مگر کبھی کبھی تمہارے ہوتے بھی تنہا ہو جاتی ہوں۔ معلوم نہیں تم اپنی کن یادوں میں کھو جاتے ہو۔ اب بتاؤ کیا سوچ رہے تھے؟''

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر ہم دو سو سال پہلے پیدا ہوتے اور ہماری رہائش اس جزیرے پر ہوتی تو تم کو کیسا لگتا؟ اور ہم دونوں میاں بیوی بھی ہوتے۔''

وہ بولی۔ ''مگر یہاں تو کوئی مکان وغیرہ نہیں ہے۔''

''بائیں جانب والے جزیرے وارڈز آئی لینڈ پر بہت مکانات ہیں۔ یہ لوگ نسلوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔ وہاں اسٹور اور ریسٹورنٹ بھی ہیں۔ سڑکیں ہیں، گلیاں ہیں مگر کوئی گاؤں نہیں ہے۔''

''اوہ! تو تمہارا مطلب ہے کہ ہم دونوں اس جزیرے پر رہ رہے ہوتے؟''

''یہی سمجھو، اب بتاؤ تم کیا کرتی رہتی اور میں کیا محسوس کرتا۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ کسی جزیرے پر رہنا اور مستقل رہنا میرا ایک خواب ہے۔''

وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''کچھ خواب تمہارے ہوتے، کچھ میرے، ایک دوسرے کے خوابوں میں زندہ رہتے۔ ہمارا ایک چھوٹا سا گھر ہوتا۔''

میں نے پوچھا۔ ''چھوٹا سا کیوں؟''

ہنس کر بولی۔ ''چلو! چھوٹے گھر سے ذرا سا بڑا کر لو تو چھوٹے گھر سے ذرا بڑا گھر ہوتا۔ سارا لکڑی کا بنا ہوتا۔ مین دروازہ مغربی سمت ہوتا تاکہ سورج سے سارا دن روشن رہے۔ اوپر کمرے ہوتے، کچن اور لیونگ روم نیچے ہوتا۔ لکڑی کی سیڑھیاں اوپر کی منزل تک جاتیں۔ بیڈ روم کی کھڑکی شمال کی جانب کھلتی جہاں سے جھیل کی بیکراں وسعت نظر آتی اور ساحل سے چلتی ہوا ذرا ہی دیر میں کمرے کو بھر دیتی۔''

میں نے پوچھا۔ ''سردیوں میں تو ہوا کا درجہ منفی تیس ہوتا ہے، پھر کیا کرتیں؟''

''ہم وہی جلاتے جو ریڈ ایڈینز کمرے میں جلاتے تھے۔''

مسکرا کر میں نے پوچھا۔ ''وہ کیا جلاتے تھے؟''

''لوہے کا ایک بڑا سا چوکور ڈبہ جس میں سے ایک پائپ نکل کر چھت سے باہر جاتا ہے۔ اس میں لکڑیاں جلائی جاتی ہیں اور کمرا گرم رہتا ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یورپ اور امریکا میں کمرا گرم رکھنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ ان کے پرانے محلات میں ابھی تک یہ نظام کو زیر استعمال نہیں مگر اس کی باقیات کمروں میں اسی طرح سے لگی ہیں جیسے پہلے ہوا کرتی تھیں۔ حیرت یہ بھی ہے کہ ہمارے شمالی علاقہ جات میں اور خاص طور پر دور دراز کی وادیوں میں جہاں آبادی ہے، وہاں ابھی تک اس سے ملتا جلتا نظام کارآمد ہے۔

میں نے نسرین سے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ کہ تم پورا دن کیا کرتیں؟''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ سوچتے سوچتے سرجی کو دور سے دیکھتا پایا تو اپنا اسکارف سر پر درست کیا اور بولی۔ ''میں مرغیاں اور بکریاں پالتی، مرغیوں کے انڈے کچھ بیچ دیتی اور باقی تم کو کھلاتی۔''

''مجھے کیوں؟''

''اس لیے کہ یہ جو تمہارا وزن نہیں بڑھ رہا، وہ ذرا سا بڑھ جائے۔''

میں نے اپنا سر..... پکڑ لیا۔ بولا۔ ''یہ تم میرے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ ہر بات گھما پھرا کر مجھ پر لے آتی ہو۔'' میں نے بات آگے بڑھائی اور بولا۔ ''بکری کے دودھ سے کافی بناتی اور کیا پنیر بھی؟''

وہ بولی۔ ''ہاں اور گرمیوں میں گھر کے باہر زمین میں سبزیاں اگاتی۔ ہر ہفتے تم اپنی کشتی پر ٹورنٹو ڈاؤن ٹاؤن سے سبزی اور مچھلی بیچنے لے جاتے جہاں فارمر مارکیٹ لگا کرتی۔''

میں اسے پہلے بھی فارمر مارکیٹ اور لارنس مارکیٹ کے بارے میں معلومات دے چکا تھا جہاں ہر ہفتے پارک سٹی اور ٹورنٹو کے گرد و نواح سے کسان اپنا سامان بیچنے لاتے تھے۔

میں نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''اور کیا کرتی؟''

بولی۔ ''اور کچھ بھی نہیں، تم بتاؤ تم پورا دن کیا کرتے۔''

''میں صبح کافی کا تھرماس اور چند ڈبل روٹیاں ساتھ لے کر اپنی کشتی پر مچھلیاں پکڑنے چلا جاتا۔''

میں نے جھیل میں دور متحرک مگر ساکت نظر آتے ایک بحری جہاز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سے بھی پرے اپنی کشتی روک کر مچھلی کا شکار کرتا۔ کافی پیتا رہتا، فر کی جیکٹ اور ٹوپی اوڑھے لیٹا رہتا۔ شام سے پہلے بہت ساری مچھلیاں پکڑ کر لاتا۔ میری کشتی کو دور سے آتے دیکھ کر تم ساحل کی جانب دوڑی چلی آتی۔ ہم ڈھیروں مچھلیاں گھر کے باہر رکھ دیتے۔ گرمیوں میں تم کچھ مچھلیاں صاف کر کے سکھا لیا کرتیں تاکہ سردیوں میں ہمارے پاس خوراک وافر موجود ہو۔ باقی کچھ اپنے لیے تم رکھ لیتیں اور باقی میں مارکیٹ جا کر بیچ دیتا۔''

وہ بولی۔ ''اور کیا کرتے۔''

''یہ کیا کم ہے کہ سارا دن جھیل کے گہرے پانیوں میں جا کر فشنگ کروں اور تمہارے ساتھ مچھلیوں کی صفائی بھی کروں۔ درختوں سے لکڑیاں بھی کاٹ کر لاؤں تاکہ سردیوں کے لیے ذخیرہ کر سکوں اور آج کے جلانے کے لیے بھی کام آ سکے۔''

وہ بولی۔ ''یہ تو اتنا زیادہ کام نہیں ہے۔''

''تو ایسا کرو، اپنی مرغیاں اور بکریاں میرے حوالے کرو اور کشتی لے کر مچھلیاں پکڑو۔''

''نہیں نہیں، میری مرغیوں پر اپنی نظر مت رکھو۔ مجھ سے اب یہ پوچھو کہ تمہارے لیے کھانا کون سا بناتی؟''

''تم بتاؤ تم کو کیا پسند ہے؟'' میں بولا۔

''میں مچھلی اور سبزیوں کا سوپ تیار کرتی۔ پنیر اور بریڈ کا رول تمہارے لیے رکھتی۔ تمہارے آنے کا انتظار کرتی، مل کر لالٹین جلا کر کھانا کھاتے، رات کو تمہیں سونے سے پہلے دودھ گرم کر کے گلاس بھر کر دیتی۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ کبھی کبھی کام پر جانے کو دل نہیں کرتا۔ اس دن کیا کرتیں؟''

''سردیوں میں؟'' وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ''سردیوں میں تو مجھے ریچھ کے شکار پر نکل جانا ہوتا تاکہ اس کی کھال مہنگے داموں بیچ کر زیادہ سے زیادہ رقم اکٹھی کر سکتا۔ اگلی گرمیوں میں نئی کشتی بھی تو خریدنی ہوتی۔''

''ریچھ کی کھال اتنی مہنگی کیوں بکتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیونکہ ان دنوں فر کے کوٹ وغیرہ کا رواج ہو چلا ہے۔ امراء عورتیں اور مرد فر کے مہنگے کوٹ خریدتے ہیں۔ بے کمپنی (Bay) یہ کاروبار کرتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اب جب چھٹی کرنا تو جھیل کے پار مجھے کشتی پر شہر لے جانا۔ کل سڑک پر چلتے ہوئے مجھے پڑوسی عورت بتا رہی تھی کہ آج کل مارکیٹ میں گرم کوٹ آئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے سوپ بنانے کے لیے کیتلی بھی چاہیے اور بھی کچھ ضروری سامان کی شاپنگ کرتی ہے۔''

ہم اسی طرح کی باتیں کرتے اور ہنستے ہوئے بڑھتے جا رہے تھے۔ معلوم نہیں دو سو سال پہلے یہاں کے لوگوں کا کیا رہن سہن ہوگا اور یہ کہ ان میں کیا کیا باتیں ہوتی ہوں گی مگر ہم نے جو کچھ پڑھا اور سن رکھا تھا، اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اپنا دو سو سال پرانا ماحول بنا رہے تھے۔ میں اور نسرین، ہم دونوں بیٹھے یہی باتیں کر رہے تھے کہ وہ لوگ اتنی شدید سردی میں معمول کی زندگی بغیر بجلی اور گیس کے کیسے گزارتے ہوں گے۔ ان کے کیا مشاغل اور مصروفیات ہوں گی۔ ان کی کیا تفریح ہوگی اور بیماری کے علاوہ کون سے دکھ ہوں گے۔ وہ دنیا کے دوسرے ممالک کے بارے میں کتنا جانتے ہوں گے؟''

میں نے نسرین سے کہا۔ ''تم گھر میں پورا دن بیکار بیٹھی رہتی ہو۔ درختوں سے لکڑیاں ہی کاٹ لایا کرو۔''

وہ کہہ رہی تھی۔ ''تم تو پورا دن کشتی میں شکار کے بہانے سوئے رہتے ہو۔ گھر کا سارا کام میرے حوالے کر دیا ہے۔ خود ہی واپس آ کر ہاتھ پاؤں چلایا کرو۔''

یہ بات اس نے ختم کی ہی تھی کہ دیکھا کہ سرجی سعد کو ساتھ لیے پاس ہی کھڑے ہیں۔ حیرت سے آنکھیں اور منہ دونوں کھلے ہیں۔ سعد ان کے چہرے کے بدلے تاثرات دیکھ کر سرجی کو اور زیادہ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ''میں بھی دیکھوں کہ دونوں کس بات پر ہنس رہے ہیں۔ ندیم بھائی کب کشتی پر مچھلی کا شکار کرنے گئے تھے؟'' پھر نسرین کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔ ''درختوں سے لکڑیاں کاٹ کر آپ کو لانے کی کیا ضرورت تھی؟''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''سرجی! ہم اپنے پچھلے جنم کی بات کر رہے ہیں۔ ہم دو سو سال پہلے ساتھ والے

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

جزیرے میں رہتے تھے۔ اس وقت یہ سارا کام مجھ سے کروائی تھی۔ اس وقت تو کچھ نہیں کہا تھا مگر شکایت آج کر رہا ہوں۔''

پھر بڑی مشکل سے نسرین نے سرجی کو سمجھایا کہ ہم پرانا ماحول بنائے بیٹھے تھے۔ تب جا کر وہ نارمل ہوئے ہم پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ذرا ہی دور بچوں کے لیے ایک پارک بنایا گیا تھا۔ سوچا کہ سعد وہ پارک دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔

دیدہ زیب راستوں کے گرد مخملی گھاس کے چھوٹے چھوٹے قطعے اور ان میں لگے چھوٹے چھوٹے فوارے، کئی رنگوں کے پھولوں سے بھرے پودے، عمدہ تراشیدہ سرسبز باڑیں اور درخت جن کے پتے سورج کی کرنوں سے منور ہو جاتے تھے۔ آسمان پر بادل ذرا اونچے ہو کر کسی اور زمین پر برسنے کے لیے دوڑے چلے جا رہے تھے۔ ہنستے مسکراتے سیاح بچوں سمیت چل رہے تھے۔ ایک دوسرے پر نظر پڑتی تو مسکرا کر سر ذرا سا جھکا دیتے۔ کوئی جزیرہ ہو اور پرندے نہ ہوں، یہ ناممکن ہے۔ یہاں بھی جھنڈ کے جھنڈ پرندوں کے نچلی پرواز کرتے اڑ رہے تھے۔ ایسی زمین جہاں پرندے، پھول، درخت، بادل اور آسمان کے علاوہ صرف آپ ہوں اور ہواؤں کی سرگوشیاں ہوں، وہ زمین جنت کا کوئی قطعہ نہیں تو جنت نظیر ضرور ہوتی ہے۔ مجھے ایسی زمین پر رہنے کا تجربہ ہوا ہے جو پہاڑیوں سے گھری تھی۔ اس میں شفاف پانی کی ندیاں بل کھاتی گزرتی تھیں۔ سردیوں کی برف باری ہوتی تو ندیاں سفید اجلی برفوں سے ڈھک جاتیں۔ جب سورج کی کرنیں ان پر پڑتیں تو کہیں کہیں سے برف چٹخ جاتی اور برف پانیوں کا امتزاج مجھے تا دیر اپنی جانب دیکھنے پر کھینچے رکھتا۔ مرغابیاں بطخیں پانیوں میں تیرتی ہوئی میرے پاس سے گزر رہی تھیں۔

برف باری کا موسم اپنے آخری ہفتوں میں آتا ہے تو یہ پرندے ... انڈے دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اتنے زیادہ انڈے کہ ندی کنارے برفوں پر ڈھیر لگ جائے۔ پھر چند دنوں میں انڈوں کا پردہ پھٹتا اور ننھے منے بچے باہر نکلنے لگتے ہیں۔ چند ہی دنوں میں ماں اپنے بچوں کو لے کر خوراک کی تلاش میں گھاس کے میدانوں اور پہاڑیوں کی گھاٹیوں میں سرگرداں نظر آتی۔ میں مہینوں ان پرندوں کے ہمراہ رہا۔ میرا بہترین مشغلہ تھا کہ ان کے جھرمٹ میں جا بیٹھوں۔ انہیں دیکھتا رہوں۔ وہ سب پہلے مجھ سے بدکتے مگر پھر بے ضرر جان کر دوست بن جاتے۔ میں کسی تنہا بینچ پر اکیلا بیٹھا ہوتا تو وہ میری جانب چلے آتے۔ میرے ہاتھوں سے ڈبل روٹی اور بسکٹ کھاتے۔ میں چلتا تو وہ میرے ساتھ چل پڑتے۔ وہ اڑتے تو میں ان کے ہمراہ اڑنے لگتا۔ میں سورج غروب ہونے کا منظر دیکھنے کسی پہاڑی کی بلندی پر جا بیٹھتا تو درجنوں پرندے مجھے ڈھونڈتے ہوئے اڑتے ہوئے میرے گرد اتر آتے۔ ہم ساتھ ساتھ بیٹھے ہوتے۔ میں کچھ نہ بولتا مگر وہ اپنی زبان میں اپنی باتیں مجھے سناتے۔ سورج ڈوبتا تو میں اٹھ کھڑا ہوتا اور پرندے غول سمیت اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ میں اس طرح مہینوں شاندار قسم کے تجربات سے روشناس ہوتا۔

ہم بچوں کے پارک میں پہنچے تو وہاں منظر کچھ اور تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ بچوں کا پارک ہے تو جھولے ہوں گے، سلائیڈز ہوں گی اور دھما چوکڑی ہوگی مگر یہ چھوٹا سا پارک تعلیمی نقطۂ نظر سے بنایا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کیاریاں جن میں لگے کاسنی، نیلے اور پیلے پھول جو بے تحاشا مسکرا رہے تھے ایسے کہ جیسے گڑیوں کا باغ ہو۔ پھولوں اور دوسرے پودوں کی متعدد اقسام جن میں بچوں کو بتایا گیا تھا کہ ان کو پلانٹ کرنے کے لیے کیسی زمین اور کیسا آسمان چاہیے۔ انہیں پانی کب دینا ہے اور کب انہیں خوراک دینی ہے۔ ان کو کھلنے کے لیے کیسا ماحول چاہیے اور کیسی آب و ہوا۔ یہ ننھے پودے تب مرتے ہیں جب ان کا خیال نہ رکھا جائے۔

سعد تو خوشی سے چھلانگیں لگا رہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر ماں سے سوالات کر رہا تھا۔ ماں کچھ سوالوں کا جواب خود دیتی اور کچھ کا جواب پانے کے لیے میری جانب دیکھتی۔ سرجی اس کینوپی تلے جا کھڑے ہوئے جو بچوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ بہت سے بچے پھولوں میں گھل مل گئے تھے۔ پھولوں اور بچوں میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔ اس باغ کے اور گرد بلند و بالا درخت ہوا سے جھومتے کھڑے تھے۔ میں سعد کو اپنے سے لپٹائے اسے سمجھاتا تھا اور بہت کچھ اس سے سمجھتا تھا۔ بچے اکثر ایسی باتیں کرتے ہیں جیسی سعد مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

''گرمیوں میں تو پھول آ جاتے ہیں مگر سردیوں میں کہاں چلے جاتے ہیں۔'' سعد نے پوچھا۔

''سردیوں میں یہ اللہ کے پاس چلے جاتے ہیں کیونکہ انہیں سنبھالنا ہمارے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ اللہ انہیں اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ گرمیوں میں وہ زمین کو خوب طرح

[illegible] تیار کر کے ہمارے سپرد کر دیتا ہے کہ تم تھوڑی سی محنت کرو، زمین بناؤ، ننھے پودے لگاؤ، پانی دو تو پھول دوبارہ [illegible] میں تمہیں دے دوں گا۔ پھر ہم وہی کرتے ہیں جو وہ کہتا ہے اور آخر ایک دن صبح اٹھتے ہیں تو شاخوں پر پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔''

سعد کی سمجھ میں کچھ آیا اور کچھ نہ آیا۔

نسرین پھولوں کے درمیان بیٹھی انہیں بغور دیکھ رہی تھی۔ مجھے ایسے لگا کہ پھول اسے حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ پھولوں نے کچھ رنگ اس کے چہرے سے لیے، کچھ آنکھوں سے اور باقی ان موتیوں سے جو اس نیکلس میں جڑے تھے جیسے ہی ہوا چلی تو اس کا اسکارف ڈھلکا اور پھولوں نے کچھ رنگ اس کے بالوں سے بھی چرا لیے۔ کچھ دیر اس چھوٹے سے باغیچے میں گھومتے رہے اور پھر ہم اس پھول سی سفاری ٹرین کی جانب چل دیے جو دیکھنے والوں کو درختوں کے کنج میں لے جا رہی تھی۔

وہاں بہت رش تھا۔ کافی لوگ جمع تھے۔ چھوٹی سی سفاری ٹرین جن کے ڈبوں میں دو دو بندے آمنے سامنے [illegible] تھے۔ بچوں اور خواتین کا رش تھا۔ آگے ٹرین پر کپڑا کا جھنڈا لگا تھا۔ باوردی ڈرائیور پُرمسرت چہرے سے لوگوں کو سیٹوں پر بیٹھا رہا تھا۔ سرجی الٹی کیپ پہنے، دھوپ کا چشمہ لگائے ہاتھوں میں ٹکٹ تھامے کھڑے تھے۔ میں [illegible] سے کہا کہ وہ اور سعد سیر کر لیں کیونکہ یہ بچوں اور خواتین کا [illegible] ہے میں اور سرجی جا کر کیا کریں گے۔

سرجی طیش میں آ گئے اور بولے۔ ''آپ کو تو صرف خواتین ہی نظر آتی ہیں۔ وہ مرد نظر نہیں آ رہے جن سے خواتین [illegible] گھیر ہیں۔''

بات تو ان کی ٹھیک تھی۔ نسرین کو بھی میرے رکنے پر [illegible] تھا، بولی۔ ''ساتھ آئے ہیں تو ساتھ چلیں گے۔ آپ [illegible] کیوں رہ جانا چاہتے ہیں۔''

''[illegible] تمہاری واپسی کا انتظار کروں۔'' میں بولا۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ میری یہ بات آگے جا کر میرے [illegible] والا ہے۔

[illegible] سے کیے گئے وعدے زندگی بھر [illegible] اور بھی نادانستگی میں کی گئی باتیں دل و [illegible] کر رہ جاتی ہیں۔

وہ [illegible] اور میں مان گیا۔ میں اور سرجی ایک ساتھ [illegible] اور سعد بیٹھ گئے۔

لوگ ٹرین میں بیٹھ چکے تھے جو رہ گئے انہوں نے کوئی دھکم پیل کی اور نہ کسی کو کوسا، خاموشی سے پیچھے ہٹ کر ٹرین کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

ٹرین نے وسل دی اور بچوں بڑوں کا مسکراتا ہوا یہ چھوٹا سا کارواں چل پڑا۔

درختوں کے جھنڈوں کے بیچ میں جزیرے پر بنی جھیل کے پاس سے اور کبھی ٹورنٹو ڈاؤن ٹاؤن کا نظارہ دور سے کراتی چلی جا رہی تھی۔ آس پاس سبزہ ایسا کہ آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ پانی ایسا شفاف کہ شیشہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ ہواؤں میں ایسی تازگی جیسے جنت کے دروازے ابھی کھلے ہوں۔ بچوں کے چہروں پر ایسی حیرتیں کہ اپنی فیری ٹیل کہانیوں کے کردار چلتے پھرتے دیکھ لیے ہوں۔ کسی بھی دیدہ زیب مناظر کا حسن ان مناظر سے زیادہ پرکھنے والے کے تاثرات اور آنکھوں میں آتی چمک سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ٹرین ایک پل پر سے گزری جہاں ایک پختہ مینار تھا جس کے گرد لوگ جمع تھے۔ تصویر کشی ہو رہی تھی۔

پھر وہ ایک جنگل میں سے گزری تو جیسے ٹرین کا شور دب گیا اور پورا جنگل اپنے سکوت سمیت ہمارے اندر سما گیا۔

سعد مناظر میں منہمک تھا۔ سرجی معلوم نہیں کیوں ڈرے ڈرے بیٹھے تھے۔ نسرین ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے نہ جانے کہاں گم تھی۔ اپنے خیالوں میں یا جنگل کی تنہائیوں میں۔

میں نے سرجی سے پوچھا۔ ''کتنے ڈرے ڈرے کیوں بیٹھے ہیں؟''

بولے۔ ''سوچتا ہوں کہ درختوں سے لٹکتا سانپ کہیں ہم پر نہ آ گرے۔''

''آپ سائے سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں گھر مچھ نہ نکل آئے۔ ہواؤں سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں گھر کا کوٹھا نہ گر پڑے۔ پہاڑوں سے اس لیے خوف زدہ رہتے ہیں کہ کہیں قیامت نہ آ جائے اور یہ دھنی ہوئی روئی کی طرح اڑتے پھریں اور اب درختوں سے بھی؟''

خوف سے کانپنے کی اداکاری کرتے ہوئے فرمایا۔

''ڈیرہ میں ایک بار گرمیوں میں صحن میں سب سوئے تھے۔ ماشاء اللہ میری اور آپ کی بھابی کی چارپائیاں قدرے ہٹ کے درخت کے قریب تھیں۔ آدھی رات کے وقت

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

مجھ پر سوتے ہوئے کوئی چیز گری اور مجھ پر ہی رینگنے لگی۔ دہشت سے آنکھ کھول کر دیکھا تو گز بھر کا سانپ تھا۔ میں نے گھٹی گھٹی چیخ ماری تو آپ کی بھابی نے اپنا جوتا اتار کر سانپ کو اُدھر ہی دھن دیا۔ چوٹیں مجھے بھی بہت لگیں کیونکہ سانپ کے نیچے میں تھا مگر ماشاء اللہ آپ کی بھابی نے کمال ہمت سے سانپ کا سر کچل کر رکھ دیا۔''

نسرین بولی۔ ''شکر ہے، اللہ نے آپ کو بچالیا۔''

وہ بولے۔ ''اس کا بے حد شکر ہے کہ میں اگر بھاگتا نہیں تو اس نے میرا سر کچل دینا تھا۔''

''کس نے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

ہلکا سا مسکرا کر بولے۔ ''آپ کی بھابی نے، اس دن وہ بے حد غصے میں تھیں کہہ رہی تھیں آج سانپ کے ساتھ ساتھ تم سے بھی نمٹ لوں۔ نہ دن کا سکھ اور نہ رات کا چین۔''

نسرین نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ اپنی بیوی سے اتنا ڈرتے ہیں؟''

وہ بولے۔ ''میں تو عزت کرتا ہوں، اگر آپ اسے ڈرنا سمجھتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' سرجی نے پھر الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔ ''کیا آپ کا شوہر بھی اسی طرح آپ کی عزت کرتا تھا؟''

نسرین کے چہرے پر ہلکا سا سیاہ بادل لہرایا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اسے کوئی گہری چوٹ لگی ہو۔ سرجی کو اس کے شوہر کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ وہ تشدد کرتا تھا۔ میں نے بات بدل کر کہا۔

''سرجی! ہر شوہر آپ کی طرح بلند مرتبہ نہیں ہوتا جو بیوی کی اس طرح سے بے پناہ عزت کرے۔''

اسی دوران ٹرین جزیرے کے سرسبز میدانوں سے چھک چھک کرتی گزر رہی تھی۔ جزیرے پر واقع ایک شفاف پانیوں کی جھیل میں آسمان کے بادلوں کے عکس تھے۔ کئی سفید بطخیں اس میں تیر رہی تھیں۔ جھیل کنارے بینچ پڑے تھے اور وہاں درختوں کے جھنڈ تھے۔ وہ میرے بیٹھنے کے لیے پسندیدہ مقام تھا۔ میں نے اسے اپنے ذہن میں اسپاٹ کرلیا۔ ٹرین واپس آ کر رکی۔ ہم اترے اور انتظار کرنے والے لائن بنا کر سوار ہونے لگے۔

ہمارے سامنے ایک بڑے دائرے میں پھیلا جمپنگ پیڈ تھا۔ وہ زمین سے تقریباً چھ فٹ کناروں سے رسیاں کھینچ کر بلند کیا گیا تھا۔ اگر کوئی ٹھیک توازن کے ساتھ اس پر

جمپ لگانا شروع کرتا تو تقریباً دس بارہ فٹ ہوا میں بلند ہو
دوبارہ اس پیڈ سے ٹکراتا اور پھر ہوا میں بلند ہو جاتا۔ بلند
پر جا کر توازن قائم رکھنے کے لیے جمپر کو بلندی سے
آتے رسوں سے اس طرح باندھ دیا جاتا کہ ہاتھ پاؤ
آزاد ہوتے اور بقایا جسم ایک چوڑی بیلٹ سے بندھا ہوتا
اس طرح جمپر بلندی سے واپس آ کر عمودی حالت میں
سے ٹکراتا اور اپنی قوت کے بل بوتے پر جتنا مرضی جا
دوبارہ بلندی سے بلند ہو جاتا۔ بس ایک ہی خیال رکھا جاتا
اس کی ٹانگیں پیڈ سے ٹکرائیں۔ اگر بلند ہوتے وقت
قلابازی کھا لیتا تو اس صورت میں سر کے بل الٹا ہو کر
سے ٹکراتا تو سب کی ہنسی مذاق کا نشانہ بنتا۔

پیڈ کے گرد لوگ جمع تھے اور اپنا توازن قائم ر
جمپر کو داد مل رہی تھی اور جو قلابازی کھا جاتا تو مضحکہ خ
حالت میں پیڈ سے خوف زدہ ہو کر ٹکراتا اور بہت سے لوگو
کے جملوں کا شکار ہوتا مگر اس اچھل کود میں فن بھی بہت تھا
آپ ہوا میں پیڈ سے ٹکرا کر اڑتے ہوئے بلندی کی طرف
جاتے ہیں اور دوبارہ ٹکراتے وقت ٹانگوں کے زور
دوبارہ بلند ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ پانچ دس منٹ جاری ر
ہے۔

ہمارے سامنے نیکر پہنے ایک گوری لڑکی تھی جو فضا م
بلند ہوتی اور کچے پھل کی طرح گرتی ہوئی واپس آتی۔
نوجوانوں کے تاثرات ایسے تھے کہ جھولی پھیلا کر اس نعمت
گود میں بھر لیں۔ وہ لڑکی اب کرتب دکھانے لگی تھی۔
اوپر جا کر الٹی ہو جاتی، کبھی ٹانگیں پھیلا لیتی اور کبھی بازو کھول
دیتی۔ اب دیکھنے والے اس کے ورزشی جسم کے خدوخال
سے زیادہ لطف اندوز ہو کر داد پر داد دے رہے تھے۔

نسرین نے سعد کو سرجی کے حوالے کیا اور خود میر
پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں لڑکی کی جمناسٹک دیکھنے میں
تھا۔ وہ بولی۔ ''یہ اتنا بغور کیا دیکھ رہے ہیں؟''

میں مسکرا کر بولا۔ ''دیکھنے میں سب دکھ رہا ہے تو بغو
دیکھنے کا کیا فائدہ؟''

''تم بھی جا کر جمپ لگاؤ۔ اس فن کے تم بھی مز
لے لو۔''

''نہیں اپنی ایک گریس ہے، کیوں اسے خراب کر
ہو۔''

وہ بولی۔ ''تو میں جمپ لگاؤں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''تمہاری بھی تو ایک گریس

ہے۔ میں اسے کیوں خراب ہوتا دیکھوں۔'' میں نے بات جاری رکھی اور بولا۔ ''سعد بچہ ہے۔ اسے سب اچھا لگے گا۔''

سعد سے پوچھا تو وہ فوراً تیار ہو گیا پھر معلوم ہوا کہ سرجی نے بھی کمر کسی ہوئی ہے۔ میں نے ان سے کہا۔ ''سر آپ سوچ لیں۔''

وہ بولے۔ ''میں نے کون سا کسی ٹاور سے چھلانگ لگانی ہے۔ کسی جمپنگ پیڈ پر اچھلنے کا شوق تو مجھے بچپن سے ہے۔''

میں ہنس کر بولا۔ ''ایک تو ہر چیز کا شوق آپ کو بچپن سے ہے۔ کبھی یہ بھی کہہ دیا کریں کہ یہ شوق مجھے لڑکپن سے تھا۔''

وہ جمپ لگاتی لڑکی پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولے۔ ''لڑکپن کے شوق سرعام بتائے نہیں جاتے۔ سب چھپ کر صرف پورا کیا جاتا ہے۔''

ایک لڑکا دس ڈالر کیش لے کر ٹوکن دے رہا تھا۔ میں نے دو ٹوکن لیے ایک سعد کے لیے اور دوسرا سرجی کے لیے۔

سعد پُرجوش ہونے کے علاوہ کچھ گھبرایا ہوا بھی تھا۔ نسرین مجھ سے کہہ رہی تھی کہ سعد کو رہنے دو، ڈر رہا ہے۔

میں نے اس سے کہا۔ ''آج اس کا خوف اتر گیا تو بہت سے خطروں میں کود پڑے گا۔ ڈر کر رہنے والوں کے لیے دنیا میں بہت کم جگہ ہوتی ہے۔''

وہ سن کر خاموش ہو گئی۔ سعد کو پچھلی جانب سے لکڑی کے تختوں پر چڑھا کر پیڈ تک پہنچایا گیا۔ اسے حفاظتی ملبوس پہنا دیا گیا۔ کئی لٹکتے رسوں کی ہکس اس بیلٹ سے باندھ دی گئیں۔ ایک دوسرا بندہ اسے تھام کر کھڑا تھا اور دوسرا رسوں کو کھینچ کر اس کی مضبوطی جانچ رہا تھا۔ سعد وہاں کھڑا اوپر پیڈ سے مجھے اور کبھی ماں کو دیکھتا اور ماں اسے ہاتھ ہلا کے دکھاتی تھی۔

دونوں بندے جمپنگ پیڈ سے نیچے اتر گئے اور وہیں رسوں کو ایک ساتھ کھینچا تو سعد اوپر اٹھتا ہوا میں معلق ہو گیا۔ اسے میں نے انگوٹھے سے ڈٹے رہنے کا اشارہ کیا اور انہوں نے رسے چھوڑ دیا اور پھر سعد تیزی سے نیچے آیا اور پیڈ سے اس کی دونوں ٹانگیں قوت سے ٹکرائیں تو وہ دو فٹ اچھلا اور دوبارہ اوپر اٹھتا گیا پھر واپس آیا اور پہلے

سے زیادہ زور لگایا تو زیادہ بلند ہوا۔ اسے لطف آیا تو اگلی بار زیادہ زور سے پاؤں پیڈ پر سے اس نے ٹکرائے اور پھر زیادہ بلند ہوتا گیا۔ ادھر نسرین کی انگلیوں کے ناخن خوف سے میرے بازو میں کھبے جاتے تھے مگر ادھر سعد شیر بن گیا اور اچھل کر دس فٹ سے زیادہ بلند ہو کر واپس آ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور وہ ہم پر رعب ڈالنے کے لیے زیادہ سے زیادہ اوپر جا رہا تھا۔ اردگرد کھڑے لوگ تالیاں پیٹ رہے تھے اور نسرین کی گرفت میرے بازو پر کمزور پڑ رہی تھی۔

آٹھ دس منٹ یہ کرتب جاری رہا۔ وہ نیچے اترا اور بھاگتا ہوا میرے گلے لگ گیا۔ میں نے اسے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''معلوم ہے بہادر اور بزدل میں کیا فرق ہوتا ہے؟''

بڑی معصومیت سے بولا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

میں نے کہا۔ ''تو سنو، بہادر وہ ہوتا ہے جو خوف پر قابو پالیتا ہے اور بزدل پر خوف غالب آجاتا ہے۔''

وہ شاید نہ سمجھا اور ماں سے بولا۔ ''ایک بار پھر جمپ لگاؤں؟''

مگر اسی دوران سرجی پیڈ پر کھڑے رسوں، زنجیروں سے باندھے جارہے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران تھا کہ ڈر اور خوف سے ان کا چہرہ فق ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جمپنگ پیڈ پر نہیں بلکہ کسی لانچنگ پیڈ پر کھڑے ہیں جہاں سے اڑے تو فضا میں کسی راکٹ کی طرح غائب ہو جائیں گے۔

سرجی کو انہوں نے جکڑ کر باندھا تھا۔ ان کے رسے کھینچے تو فضا میں ایسے معلق کھڑے تھے جیسے سولی چڑھ گئے ہوں۔ ٹانگیں ان کی کھلی تھیں اور بازو لٹکے تھے۔ نیچے کھڑے لوگوں کو ہنستا دیکھ کر اب باقاعدہ حواس باختہ دکھائی دے رہے تھے۔ پھر نہ جانے کیا سوچ رہے تھے کہ ان کے رسے ڈھیلے کر دیے گئے اور وہ کچے پھل کی طرح نیچے گرے اور ٹکرا کر واپس فضا میں لٹک گئے۔ لٹک اس لیے گئے کیونکہ رسیاں دوبارہ سے کس گئی تھیں۔ اب ان سے پوچھا جارہا تھا پھر ''Are you Ready'' ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیں مگر نیچے کھڑے ایک شرارتی بوڑھے نے باآواز بلند کہا ''Yes'' اور پھر ان کی رسی دراز ہوئی تو انہیں ہوش تب آیا جب دوبارہ اپنے آپ کو فضا میں پایا۔ اب انہوں نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی۔ پیڈ سے ٹکراتے وقت قوت کم لگا رہے تھے تاکہ زیادہ بلند نہ ہوں مگر

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

گوروں کی تکنیک ان کی چالاکی سے بہر طور زیادہ موثر تھی۔ انہوں نے چاروں رسوں کے ساتھ اسپرنگ لگا رکھے تھے۔ سعد تو اپنے طور پر اچھل کود کر واپس آچکا تھا مگر ان کے لیے انہوں نے اسپرنگ سسٹم چالو کر دیا۔ اب یہ اپنی ٹانگوں کا زور پیڈ پر لگائیں نہ لگائیں، اسپرنگ نے تقریباً بیس فٹ فضا میں بلند کرنا ہی کرنا تھا۔ ان کی خوف زدہ اور بے بس حالت دیکھ کر ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ ہنس رہے تھے اور اتنے میں معلوم نہیں انہوں نے کسی ہک کو چھیڑ دیا یا اپنی ٹانگیں الٹی سیدھی چلائیں کہ ہوا میں ایسے پڑے تھے جیسے کوئی پانی میں تیراکی کرتا ہے اور تو اور ہاتھ پاؤں بھی تیراکی والے مار رہے تھے۔ میرا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ نسرین مجھے جھنجوڑ رہی تھی کہ سرجی کو تو کسی طرح سے نیچے اترواؤں۔ لانچنگ پیڈ کے دونوں نگراں ایک ہاتھ اپنی کمر پر دوسرا منہ پر رکھے ششدر کھڑے تھے۔

پھر انہیں لیٹی حالت میں پیڈ پر ڈالا گیا۔ دونوں نے مل کر اس کے رسے اور بیلٹ وغیرہ اس طرح سے کھولیں جیسے سرجی کے کپڑے بدل رہے ہوں۔ انہیں آزاد کر کے کھڑا کیا گیا تو وہ چکرا کر گرنے لگے۔ انہیں پھر دونوں نے تھاما اور بحفاظت نیچے اتارا۔ وہ بدحواسی میں ہماری جانب آنے کی بجائے دوسری جانب نکل گئے۔ کسی نے ان کی سمت درست کی اور ہمارے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ نسرین تو اپنی مسکراہٹ چھپانے میں کامیاب رہی مگر میں اور سعد اپنی ہنسی دبائے انہیں زیادہ ہراساں کر رہے تھے۔

ہم نے عافیت یہ جانی کہ وہاں سے کھسک جائیں۔ پھر سرگوشی میں ان سے پوچھا۔ ''کیا وہاں زیادہ خطرہ تھا؟ میں بھی اسی لیے اس جمناسٹک سے باز رہا۔''

خفا ہو کر آسمان میں کہیں گھورتے ہوئے بولے۔ ''مجھے بھی روک لیتے جب بھانپ گئے تھے۔ میں کئی بار آپ کے کام آیا ہوں میرے لیے یہ بھی نہ ہو سکا کہ نسرین باجی کے آگے مجھے شرمندگی سے بچا لیتے؟''

میں نے کہا۔ ''جو ہو گیا سو ہو گیا۔ تم خود شرمندہ نہ ہو تو وہ بھی بھول جائے گی۔ جیسے بطخوں سے لڑائی وہ بھول گئی ہے۔''

انہیں بطخوں سے جنگ یاد آگئی، بولے۔ ''شہباز اور خان قیصر بلکہ کسی کو بھی کچھ نہ بتانا۔''

میں نے ہنس کر ان کے سامنے ہامی بھری، ان کی پیٹھ تھپکی اور پکڑ کر نسرین کے سامنے انہیں لا کھڑا کیا اور نسرین سے کہا۔ ''سرجی ذرا دیر میں غافل کیا ہوئے سر سے تمہارا اسکارف پھر کھسک گیا؟''

وہ بولی۔ ''سرجی کو ہوا میں معلق بہت دیر دیکھا تو کھسک گیا ہوگا۔'' اس نے اپنا اسکارف درست کیا اور سرجی مجھے لاچار نظروں سے دیکھنے لگے۔

ہم آئی لینڈ پر سینٹرول تھیم پارک میں گھوم رہے تھے ایک میلہ سجا تھا جس میں ٹورسٹ جیسے بھٹک کر اپنے نشان ڈھونڈتے تھے۔ جان بوجھ کر بھٹک جانے میں بھی ایک لطف ہے۔ خود ہی بھٹک جائیں اور خود ہی اپنے آپ ڈھونڈیں۔

خود ہی بے سمت ہوا اور سرگرداں ہوں میں
اپنی ہی تلاش میں بھٹک رہا ہوں میں

اپنے ہی شہر میں اجنبی بن جاؤں اپنے ہی لوگ مجھے ناآشنا ہو کر دیکھیں۔ نہ کوئی مجھ سے سوال کرے اور نہ میں کسی سے جواب چاہوں۔ ایسے راستوں پر چلوں جہاں نہ بھوک لگے اور نہ پیاس ستائے۔ نہ کوئی تھکاوٹ ہو اور نہ نیند کا غلبہ ہو۔ ایک راستہ ہو جہاں پھول ہی پھول ہوں۔ درختوں سے ڈھکے پہاڑیوں اور بل کھاتی ندیاں ہوں۔ میں ہوں اور رقص میں سارا جنگل ہو۔ میرا سفر شروع ہو اور چلتا رہے۔ رکوں بھی تو اپنی مرضی سے چلوں بھی تو اپنی رضا سے۔ نہ کوئی مجھے یاد کرے اور نہ کوئی مجھے یاد آئے۔ ماضی بھول جائے اور مستقبل کا کوئی کھٹکا نہ ہو۔ مجھے معلوم ہے ایسا ہونا ناممکن ہے مگر ایسا سوچنا تو ناممکن نہیں۔ یہی تو سپنے ہوتے ہیں جو امید دل کے چراغ جلائے رکھتے ہیں۔

پچھلے دنوں کسی نے مجھ سے کہا کہ ایک صفحہ لکھ کر اسے دوں جس میں یہ بتا سکوں کہ سپنے کس طرح سے کسی زندگی کو تبدیل کرتے ہیں یا کس طرح سے کسی زندگی پر مثبت طریقے سے اثرانداز ہوتے ہیں۔''

پڑھا لکھا گورا تھا جو مجھ سے کہہ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''ہم تو سپنوں کو دھوکا سمجھتے ہیں۔ انہیں ناکارہ لوگوں کی ذہنی اختراع سمجھتے ہیں۔ ہم تو کہتے ہیں کہ سپنوں سے نکل کر عملی زندگی میں آؤ اگر ایسی بات ہے تو یہ کس طرح سے ہماری زندگی پر مثبت اثر چھوڑتے ہیں بلکہ زندگی کو کس طرح سے اچھی سمت موڑ سکتے ہیں؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''جو تم ہر وقت نظاروں میں کھوئے رہتے ہو۔ اپنے کمرے میں آتے ہو تو باہر کھلتی کھڑکی

www.PakiBooks.Site

[illegible] جاتے ہو کہ سورج ڈوبنے کے رنگ دیکھنے سے [illegible] ندیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہو۔ پہاڑوں کے اوپر جنگلوں میں اوپر نکل جاتے ہو۔ تمہاری یہ کھوج بھی تو ایک سپنا ہے۔ قدرت کے یہ حسین مناظر دیکھ کر تم کچھ تو سوچتے ہو گے؟ کچھ تو پاتے ہو گے؟ کئی پیچیدہ سوالوں کے جواب پاتے ہو گے۔ تم بس مجھے وہی جوابات لکھ دو اور [illegible] ان کاموں کے مثبت اثرات میں جو تمہاری بھٹکی زندگی کو [illegible]''

اپنے قارئین کو ایک بات بتاتا چلوں کہ ان دنوں پچھلی کئی ماہ سے زندگی کے بہت انوکھے سفر میں ہوں۔ کسی کی تلاش میں ہوں۔ کسی کی کھوج میں ہوں۔ چند لوگ میرے ہمسفر ہیں۔ زادِ سفر میں کاغذ اور قلم ہیں۔ آنکھیں، کان اور ناک ہے۔ آنکھوں سے دیکھتا ہوں کانوں سے پرندوں کو [illegible] سنتا ہوں۔ ناک سے خوشبوئیں چرا کر سونگھتا ہوں۔ زندگی کے بڑے اور خوب صورت تجربوں سے گزر رہا ہوں۔ وہ کچھ کر رہا ہوں جو دیکھنا چاہتا تھا وہ سوچتا ہوں جس [illegible] کا آرزومند تھا۔ اللہ اور اس کی کائنات کے رازوں میں ڈوب جاتا ہوں۔ ایسی چیزوں کا مشاہدہ ہوا جس کو عقل ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔ جنگلوں، بیابانوں میں گھوم رہا ہوں۔ قدرت اپنے اسرار کھول رہی [illegible] اپنے گیان اور دھیان میں منہمک ہوں۔ اس حالت میں اپنی کہانی کو ہر ماہ لکھ کر بھیج رہا ہوں کیونکہ میرے [illegible] دل سے بندھے ہیں۔

ہم تھیم پارک کے میلے میں چل رہے تھے۔ ہمارے اردگرد خواتین، بچے، بڑے اور بوڑھے بھی تھے۔ ہر ایک خوش نظر آ رہا تھا۔ جگہ جگہ رکتے رکتے چل رہے تھے۔ آگے ایک بہت بڑا اسٹال لگا تھا۔ کاؤنٹر اور پیچھے دیوار کے ساتھ اوپر نیچے قطار در قطار Stuffed Animal رکھے تھے۔ چھوٹے بڑے سائز کے کپڑوں میں بھوسا [illegible] بہت بڑی تعداد میں تھے۔ ہمارے بچپن میں [illegible] لڑکیاں کپڑے میں روئی وغیرہ بھر کر گڑیا [illegible] کاری کر کے گڑیوں کی آنکھیں، ناک اور [illegible] مگر یہاں ہاتھوں سے نہیں بلکہ مشینوں سے بنی [illegible] اس سے کچھ بڑے جانور، پرندے اور [illegible]

یہاں بچوں کے لیے سب سے زیادہ پسندیدہ جانور [illegible] نرم و ملائم مصنوعی فر میں Stuff کیا گیا ریچھ بچوں کا دوست ہوتا ہے۔ ایک فٹ سے تین فٹ کے اس کھلونے سے بچے کھیلتے ہیں، باتیں کرتے ہیں اور رات کو تکیے کے طور پر بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ دن میں مائیں انہیں سنبھالتی پھرتی ہیں اور شام میں بچے اسے اپنے سے دور نہیں ہونے دیتے۔ یہاں پارک کے ایک اسٹال میں ایسے بہت سے کھلونے جانور قطار در قطار اوپر نیچے رکھے تھے۔ کاؤنٹر پر بچوں کو ایک رنگ دیا جاتا ہے۔ بچے وہ لوہے کا رنگ پیچھے دیوار کے ساتھ رکھے کھلونے کی جانب اچھالتے ہیں۔ اگر رنگ کسی کھلونے جانور کے گلے میں پڑ گیا تو وہ کھلونا بچے کو دے دیا جاتا ہے۔ ایک دو ڈالر کے بدلے ٹف ریچھ ملنا کوئی گھاٹے کا سودا نہ تھا۔ بچے جوش و جذبے سے وہ رنگ اپنے پسندیدہ کھلونوں کی جانب اچھالتے اور اگر جانور کے گلے میں طوق پڑ گیا تو بچے خوش، ورنہ منہ لٹکا کر ماں باپ کی جانب سوالیہ نظروں سے ایک ڈالر اور مانگ رہے ہوتے ہیں۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ سعد دو تین بار رنگ پھینک کر ناکام ہو کے منہ پھلائے کھڑا تھا۔ رنگ آس پاس گر جاتے مگر گردن میں نہ پڑتے تھے۔ سب بچے تاک کر رنگ سامنے سے پھینک رہے تھے۔ اگر وہ سامنے کی بجائے رنگ کو بائیں سے دائیں لائن میں رکھے کھلونوں پر پھینکتے تو کسی نہ کسی کے گلے میں فٹ ہو جاتا۔ یہ تماشا جاری تھا۔ نسرین سعد کو پچکار رہی تھی کہ تمہیں خرید کر یہ دے دوں گی۔ یہاں ڈالر ضائع نہ کرو مگر انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز جیت کر یا چھین کر پائے اس میں اسے لطف آتا ہے۔ بچپن میں بیری ایک آنے میں جھولی بھر کر ملا کرتی تھی مگر جو مزہ بیری کے درخت پر چڑھ کر خطروں سے کھیل کر بیری توڑنے سے آتا تھا، وہ خریدنے میں تو کبھی ملتا ہی نہ تھا۔

میں نے نسرین سے کہا۔ ''اسے ٹرائی کرنے دو۔ جیت گیا تو ہمیشہ یاد رکھے گا۔''

وہ بولی۔ ''آپ بھی اسے بگاڑتے جا رہے ہیں آپ ساتھ ہوں تو یہ ضد کرنے لگتا ہے۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''وہ تو بچہ ہے جو ضد کرتا ہے۔ میں ساتھ ہوں تم بھی تو ڈگمگانے لگتی ہو۔''

آنکھیں دکھا کر کہنے لگی۔ ''زیادہ اتراؤ نہیں۔ ڈگمگائی نہیں بلکہ ڈگمگاتے ڈگمگاتے سنبھل جاتی ہوں۔''

پھر میرے ہاتھ کو اپنی نازک انگلیوں سے مسلتے ہوئے بولی۔ ''یہ آج کل تم اپنے آپ کو زیادہ اہمیت نہیں دینے

www.PakiBooks.Site

لگے؟''

میں بولا۔ ''تم نے ایک عام بندے کو خاص کر دیا ہے۔ دھیمے بہتے پانیوں میں طوفان برپا کر دیا ہے تو مجھے بھی کچھ سرشاری میں رہنے دو اور خاص کر جب تم ساتھ ہو۔''

وہ آہستگی سے بولی۔ ''آہستہ بات کریں۔ سرجی نے سن لیا تو پھر سے بھائی بن کر سمجھانے لگیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''فکر نہ کرو۔ وہ دور کھڑے ہم سے نظریں بچا کر کئی رنگ پھینک چکے ہیں کہ اور کوئی نہیں تو ریچھ ہی پھنس جائے۔''

میرے اشارے پر نسرین نے مڑ کر سرجی کو دیکھا جو گومگو کی حالت میں کھڑے یہ سوچتے نظر آئے کہ اگلا پھندا کس کی جانب پھینکوں۔ سرجی نے تاک کر رنگ پھینکا تو پھر سے کھلونا ریچھ انہیں مات کر گیا۔ میں نے سرجی کو آواز دے کر اپنی جانب بلایا۔ آتے ہی بولے۔ ''سوچ رہا تھا کہ رنگ پھینکوں یا نہیں؟''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''جو ابھی پھینکا تھا وہ......؟''

کہنے لگے۔ ''پوری بات تو سنیں۔ سوچنے کے بعد ہی تو ابھی پھینکا تھا۔''

میں نے سعد سے کہا۔ ''ابھی تمہاری ماں ٹرائی کرے گی۔ یہاں سے سیکھو کہ کسی کی گردن میں پھندا کیسے ڈالا جاتا ہے۔''

میں نے کاؤنٹر سے رنگ لیا۔ اپنی جانب گھورتی نسرین کو نظر انداز کر کے اسے لوہے کا کڑا دیا اور کہا کہ سامنے سے نہیں بلکہ 45 درجے کے زاویے سے دوسری لائن میں بائیں سے دائیں پھینک کر ٹرائی کرو پھر اسے سمجھا کر بتایا اور اس نے رنگ پھینک کر ایک کھلونا ریچھ کے گلے میں ڈال دیا۔ سعد فرطِ مسرت سے تالیاں پیٹنے لگا اور سرجی کی مونچھیں تک مسکرانے لگیں۔ انہوں نے ڈیڑھ فٹ کا کھلونا ریچھ نسرین کو تھما دیا پھر ہم سب نے اسی زاویے سے متعدد بار ٹرائی کی مگر ناکام رہے۔ نسرین اس ریچھ کو گود لیے کھڑی تھی۔ میں نے اس کے کان میں کہا۔

''تم تو ایسے تھامے کھڑی ہو جیسے واقعی گود لے لیا ہے۔''

وہ بولی۔ ''ہاں! تمہاری نشانی کو گود تو لینا پڑے گا۔ اسے دیکھ کر تمہاری یاد آتی رہے گی۔''

میں نے شرمندگی سے سر کھجاتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر دیا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اسے وہ میرا بچہ سمجھ رہی ہے۔ ہم میلے میں آہستہ آہستہ آگے کھسک رہے تھے۔

سعد نے کندھے پر کھلونا ریچھ یعنی پانڈا اٹھایا ہوا تھا۔ ایک بار میں نے اسے بازوؤں میں لیا تو اتنا ملائم اور نرم کہ بھینچنے کو جی کرتا تھا۔ سرجی اسے اپنے بازوؤں میں جکڑتے ہوئے بولے۔ ''تھکا ہوا بندہ اسے دو جپھیاں ڈال لے تو تھکاوٹ اتر جاتی ہوگی۔''

وہیں کھانے پینے کے اسٹال لگے تھے۔ ایک پر برف کے گولے بک رہے تھے۔ آئس کو کرش کر کے اس کا گولا بنا جاتا اور پھر گلاس میں ڈال کر اس کے اوپر رنگ برنگے میٹھے شربت انڈیلے جاتے اور پلاسٹک کے چمچے سے پیش کیا جاتا۔ سرجی کہنے لگے۔ ''مدتیں بیت گئیں اور برف کے گولے نہیں چوسے۔''

نسرین نے کہا کہ ہم بچپن میں کھایا کرتے تھے۔ سعد حیرت سے رنگین گلاسوں کو دیکھتا تھا۔

لڑکیاں برف کے گولے بیچ رہی تھیں۔ جن رنگوں کے شربت وہ ڈال رہی تھیں انہی رنگوں کے کپڑے انہوں نے پہن رکھے تھے۔ ہم نے چار گلاس لیے تو سعد گلاس کے اندر جھانک رہا تھا۔ ہم بچپن میں ایک تیلی پر چڑھے گولے کا رس چوسا کرتے تھے۔ ڈیرہ کی سخت گرمی میں برف کے گولے چوسنا ایک شاندار تجربہ ہوتا تھا۔ یہاں کی میٹھی برف اور کا ذائقہ مجھے ماضی میں لے گیا۔ میں نسرین کو مزے لے لے کر برف کے گولوں سے جڑے بچپن کے واقعات سنانے لگا۔ سرجی دور سعد کے ساتھ کھڑے کن اکھیوں سے ہمیں ہنستا دیکھ رہے تھے اور جزیرے پر چلتی بھیگی ہوا ہمیں چھو کر گزر رہی تھی۔

سرجی اور سعد ہم سے آگے لوگوں سے بچ بچا کر اور کبھی ہلکا سا ٹکرا کر چل رہے تھے۔ سعد بھاگا ہوا ہمارے پاس آ کر کہنے لگا۔ ''مجھے کپ والی رائیڈ لینی ہے۔''

جا کر دیکھا تو ایک بڑے قطر کا گول تختہ اپنے محور پر گھوم رہا ہے اور سیٹوں کی جگہ بڑے بڑے چائے کے کپ اس پلیٹ فارم پر رکھے ہیں جو اپنے اپنے محور میں تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ ان پلاسٹک کے کپس میں سیٹیں ہیں جن پر لوگ آمنے سامنے بیٹھ کر تیزی سے گھومتے ہوئے خوش ہوتے ہیں۔ بچوں کے لیے تو اچھی تفریح ہے مگر بڑے بھی بچے بن کر اپنے آپ کو خوش کر رہے تھے۔

اس پر تو بیٹھنے کو سرجی بھی تیار نہ تھے۔ وجہ یہ بتا رہے تھے کہ چکروں سے گھومتے ہوئے مجھے نظر کچھ نہیں آتا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ گھوم کر دیکھنا کیا چاہتے [illegible]؟''

وہ بولے۔ ''گھوم کر دیکھنے ہی تو آئے ہیں۔''

میں نے زچ ہو کر کہا۔ ''وہ چل پھر کر گھومنے کو کہتے [illegible]''

وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ''ٹھیک ہے دیکھ تو نہیں سکتا مگر [illegible] میں ساتھ بیٹھی لڑکیوں کی چیخ و پکار تو سننے کو مل جائے گی۔''

وہ ٹکٹ میں نے لیے اور سرجی اب سعد کو لے کر ایک پیالی میں بیٹھ گئے۔ سامنے کی دو سیٹیں خالی تھیں یعنی پیالی ابھی خالی تھی۔ اتنے میں دو گوری لڑکیاں نیم لباس زیب تن کیے سرجی کے سامنے آ بیٹھیں یعنی پیالی بھر گئی۔

سرجی نے جیب سے فوراً کالا چشمہ نکالا اور آنکھوں پر [illegible] بیٹھ گئے۔ پیالی گھومی تو سرجی لڑکھڑا گئے اور [illegible] اختیاری میں سامنے بیٹھی لڑکی کے گھٹنے [illegible] لڑکی چیخی تو انہوں نے ہاتھ ہٹا لیے اور معذرت [illegible]

اب گول [illegible] فارم اپنی رفتار سے گھوم رہا تھا۔ [illegible] کبھی آہستہ اور کبھی تیز گھومنا شروع [illegible] معلوم نہ پڑتا تھا کہ پیالیوں میں بھری مخلوق [illegible] رہی ہے۔ کبھی کوئی سفید پلاسٹک [illegible] کناروں پر آ جاتی اور پھر دیکھتے ہی [illegible] درمیان میں پہنچ جاتی۔ نسرین اپنے [illegible] گرتے پڑتے سعد کو دیکھ کر اضطراب [illegible] سرجی نے پہلے تو ٹک کر بیٹھنے کے لیے سعد کا سہارا [illegible] اپنے کندھے سے ان کے ہاتھ [illegible] کرنے لگے۔ سرجی کی دہشت [illegible]

[illegible] کچھ دیر جاری رہا اور پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ [illegible] اور سرجی سعد کو لیے ہمارے درمیان [illegible] میں نے پوچھا۔

''[illegible] کیوں [illegible] ہوا تھا؟ سب لوگ آپ کی [illegible]''

وہ بولے۔ ''آزاد ملک ہے اور اسی آزادی سے لطف [illegible] آزاد خیال ہیں، آزاد ہیں تو [illegible]''

نسرین میرے کان کے قریب منہ لا کر بولی۔

''سامنے رولر کوسٹر دیکھ رہے ہو؟''

''ہاں! سب کو صاف نظر آ رہی ہے۔'' میں بولا۔

وہ بولی۔ ''نظر تو سب کو آ رہی ہے مگر کہنا یہ چاہتی ہوں کہ ایسا ہو سکتا ہے میں اور آپ ایک ساتھ وہ رائیڈ لیں؟''

میں بولا۔ ''کیوں نہیں ہو سکتا لیکن اس کے لیے ہم دونوں کا ایک ساتھ راضی ہونا ضروری ہے۔''

''میں شادی کی نہیں صرف رائیڈ لینے کی بات کر رہی ہوں۔'' چشمہ اتار کر آنکھیں دکھلاتی ہوئی بولی۔

ایئر کوسٹر کی جانب آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میں نے کہا۔

''میں نے کئی فلمیں دیکھی ہیں۔ خطرناک مقامات پر لڑکا ہمیشہ لڑکی کی جان بچاتا ہے۔ اس کا خوف دور کرتا ہے تو ہیروئن تشکر بھرے جذبات سے اس کے گلے لگ جاتی ہے اور پھر چند گانوں کے بعد انجام شادی ہوتا ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تو تم ایسا کرنا کہ نہ میری جان بچانا اور نہ میرا خوف دور کرنا۔ بس رائیڈ کے بعد شریف آدمی کی طرح نیچے اتر جانا پھر نہ میں تمہاری احسان مند ہوں گی اور نہ تمہیں مجھ سے شادی کرنا پڑے گی۔''

وہ مسکرا رہی تھی اور میں اسے پہلی بار اس خدشے سے دیکھ رہا تھا کہ کہیں یہ مجھ سے کھو نہ جائے۔ کہیں گم نہ ہو جائے۔ میں انجانے وسوسوں میں گھرا کھڑا اسے پیار سے دیکھ رہا تھا۔ میری نظروں میں چھپے کئی سوالات اور دھڑکے اسے چونکا گئے تھے۔ وہ حیرت سے میری جانب بغیر پلکیں جھپکائے تکتی رہی۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میرے اندر کیا چل رہا ہے؟ کیا واقعی میں دل سے اس کی جانب مائل ہو رہا ہوں۔ کیا میں اسے چاہنے لگا ہوں۔ قربت کا لمس بڑا زوردار ہوتا ہے۔ چاہت کی آہٹیں گو چپکے سے آتی ہیں مگر دل کی زمین کو روندتی چلی جاتی ہیں۔ روح پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ مرد کتنا ہی اپنے آپ کو مضبوط سمجھے مگر پیار کی مسلسل برستی بارش کے سامنے اپنے آپ کو بھیگنے سے نہیں روک سکتا۔ میں اپنے اردگرد بڑی مضبوط دیواریں کھڑی کرتا چلا آ رہا تھا اور اس کے پیار کا بارود بھاں بھاں کر کے ان دیواروں کو تہس نہس کرنے لگا تھا۔

وہ بولی۔ ''تمہارے اندر کوئی خاص تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔ اقرار کر لو گے تو بہت اچھا لگے گا۔''

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

میں نے اس کے سر کے اوپر نیلے آسمان پر چھائے اجلے اجلے بادلوں کی جانب دیکھا جہاں انہوں نے کئی دلکش تصاویر بنائی تھیں۔ ایک تصویر میں جیسے کوئی لڑکی بیٹھی بانسری بجا رہی ہے۔ لڑکی کے سر پر جیسے پرندے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ ایک مرد بیٹھا بانسری کی دھن کو سن رہا ہے۔ میرے تخیلات کے پرندے بادلوں تک جا پہنچے۔ نسرین سے بولا۔ ''اقرار تو پہلے بھی کیا تھا۔''

وہ کہنے لگی۔ ''میں جانتی ہوں وہ میرا دل رکھنے کے لیے تھا۔ پر آج کچھ اور محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے میرے اندر کی بے چینی کو قرار آرہا ہو۔ میرے وہم دم توڑ رہے ہوں، ایسا لگ رہا ہے کہ میں تمہارے آگے ہار کر اب جیت رہی ہوں۔ مجھے بتاؤ آج دوسری نظروں سے مجھے کیوں دیکھا؟''

''محبت کسی نیکی کی طرح دھیرے دھیرے قریب آتی ہے۔ مذہبی کتاب کی طرح اپنے ورق پلٹتی ہے۔ آج کی محبت گزرے دنوں کا عکس ہوتی ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ دن گزر جاتے ہیں مگر ان کی یاد اچانک محبت میں ڈھل جاتی ہے۔ کئی بار سوچا کہ یہ پیار ہوتا کیا ہے۔ یہ ایک احساس تو ہے ہی مگر اسے الفاظوں کا پیرہن کیسے دیں؟ مجھے جواب ہمیشہ یہی ملا کہ کسی ہستی کے چھن جانے کا خیال بھی آپ کو جھنجوڑ دے، آپ کو دہلا دے تو سمجھیں آپ اسے چاہنے لگے ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ خدانخواستہ اگر تم کہیں مجھ سے دور ہو گئیں تو تمہاری یاد میرے اندر پیار بن کر مجھے خاکستر کر دے گی۔ تو پھر کیوں نہ تمہاری یاد کو پیار میں بدلنے سے پہلے یہ اقرار کرلوں کہ میرے لیے تم کو اپنے سے دور کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا میرے بس میں نہیں۔''

وہ نم ہوتیں چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوابیدہ کیفیت اتری تھی۔ چہرہ ایسا کہ سارا جہاں روشن ہو گیا ہو۔ حیرتیں ایسی کہ چکور نے چاند دیکھ لیا ہو۔

سرجی اور سعد دور کھڑے رولر کوسٹر کی پٹڑیوں کو اوپر نیچے بل کھاتے اور بلندی سے واپس ڈراپ ہوتے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے نسرین کو اپنے بائیں بازو میں لے کر اس کا سر اپنے کندھے پر لگا دیا۔ وہ کسی پرزور لہر کی طرح اپنے کنارے سے لگ کر دھیمی پڑ گئی اور صرف یہ بولی۔ ''تم نے کہا تو آج مگر میں اس سے زیادہ محسوس کئی بار کر چکی ہوں۔ جب بھی تم میرے لیے فکر مند ہوتے ہو، سمجھاتے ہو، غصہ ہوتے ہو اور جب جب میری جان[illegible] دیکھتے ہو۔ میں ہر بار تمہاری محبت کو شدت سے محسوس کر[illegible] ہوں۔''

''چلتے ہیں، سرجی کیا سوچتے ہوں گے کہ اچانک رک کر کیا باتیں ہو رہی ہیں۔''

میرے کندھے پر اپنا سر ٹکا کر بولی۔ ''اس وقت[illegible] یہ نہیں سوچنا چاہتی کہ کون کیا سوچ رہا ہے اور ہم کسی[illegible] سوچنے پر اپنی سوچ کیوں بدلیں۔ میں یہ کیوں نہ سوچوں[illegible] اب میں تمہارے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ تم کیوں مجھے یہ سوچ کر دیکھو کہ نسرین ہر بار، ہر لمحہ میرے بارے م[illegible] سوچتی ہے۔ سوچیں بھی عجیب چیز ہوتی ہیں۔ کوئی دور بھی[illegible] تو سوچوں میں کتنا قریب آجاتا ہے۔''

میں خوشی سے بولا۔ ''آج تو تم نے میری سوچوں[illegible] بھی نئی سوچ دے دی ہے۔ مجھے کوئی کھٹکا نہیں کہ تمہار[illegible] ہوتے میری فیملی مجھ سے دور ہو جائے گی۔ مجھے اس بات[illegible] بھی گھمنڈ ہے کہ اگر ایسا ہونے بھی لگا تو تم انہیں مجھ سے دو[illegible] نہیں ہونے دو گی۔''

وہ بولی۔ ''کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے یہ اچھ[illegible] طرح معلوم ہے کہ اگر ان کے نہ رہ سکے تو میرے بھی[illegible] نہیں بن پاؤ گے۔ اتنا تو میں بھی تم کو جاننے لگی ہوں۔''

وفادار ہونا ایک خوش خبری ہے۔ وہ مجھے خوش خبری[illegible] رہی تھی اور میں غرور سے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

پھر ہم بڑھتے ہوئے سرجی اور سعد کے قریب پہنچ گئے۔ رولر کوسٹر ریل کی پٹڑیوں پر سبک رفتاری سے کبھی او[illegible] اٹھتی اور کبھی بلندی سے ڈراپ ہو کر لڑھکتی نیچے گرنے[illegible] آجاتی۔ کبھی تیز رفتاری سے بالکل سیدھی دوڑنے لگتی جس[illegible] طرح کوئی کار سڑک پر آگے پیچھے کے دو پہیوں پر چلتی ہوں[illegible] کوئی بھی زاویہ وہ بناتی تو اس پر سوار لوگوں کی چیخ و پکا[illegible] مسلسل نیچے آرہی تھی۔ وہ تو معلوم نہیں کیا لطف اندو[illegible] ہو رہے ہوں گے مگر نیچے کھڑے لوگ ان کی خوف زدہ چیخیں سن کر زیادہ لطف لے رہے تھے۔

رولر کوسٹر بھی عجیب قسم کی رائیڈ ہے۔ اس دن تو م[illegible] پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ زمین سے پچاسوں فٹ بلندی[illegible] بل کھاتی پٹڑیاں اوپر نیچے اور دائیں بائیں گھومتی چلی آرہی تھیں۔ بلندی پر انہوں نے کئی زگ زیگ بنائے ہوئے تھے۔ دو سیٹوں کے آگے پیچھے لگے ڈبے جن کے نیچے رو[illegible]

[illegible] وہ ان پٹڑیوں پر نہایت تیز رفتاری سے بھاگتے [illegible]۔ ان کی رفتار ساٹھ ستر کلو میٹر فی گھنٹا ہو گی۔ ان [illegible] کا اوپر جانا بھی تھرل تھا اور اوپر سے نیچے اترنا بھی تھرل تھا۔

رولر کوسٹر امریکا میں پہلی بار 1880ء میں آئی پھر [illegible] دنیا کے ہر تفریحی پارک کا لازمی جزو بن گئی۔ [illegible] امریکا اور کینیڈا کے کئی بڑے تفریحی پارکس میں [illegible] کا اتفاق ہوا۔ ٹورنٹو کا ونڈر لینڈ ہو یا اورلینڈو کا [illegible] اسٹوڈیو، اوہایو کا سیڈر پوائنٹ یا شکاگو کا سکس [illegible] پنسلوینیا کا ہرشی پارک۔ ان سب میں رولر کوسٹر [illegible] کر لوگ چھوٹے نظر آئیں۔ رفتار 175 کلو [illegible] گھنٹا کر زمین آسمان کی جگہ نظر آئے اور آسمان نیچے [illegible] کوسٹر کی سیٹیں اوپر جا کر بالکل الٹی ہو جاتیں کہ [illegible] لوگوں کو لگے کہ ابھی بلندیوں سے لوگ ان [illegible] دانوں کی طرح نیچے گرنے والے ہیں۔ رفتار [illegible] اس میں بیٹھے ہوئے یہ محسوس ہو کہ میں آندھی اور [illegible] اڑا جا رہا ہوں۔ منہ سے لگاتار نکلتی [illegible] کرنے لگیں۔ میں نے فلوریڈا میں [illegible] رولر کوسٹر کی رائیڈ لی تھی اور پھر ہمیشہ کے لیے توبہ [illegible] رائیڈ نہیں بلکہ ایک ٹارچر ہے۔ اس پر [illegible] ہے کہ بندہ خود کشی کر لے مگر جتنا اس [illegible] تو اتنی ہی اس پر لمبی لائن سوار [illegible] اگر آپ کے پاس فاسٹ پاس [illegible] گھنٹے آپ لائن میں لگے انتظار کر رہے [illegible] رولر کوسٹر دیکھیں تو سینٹر پارک کی رولر [illegible] معلوم ہوتی ہے مگر اس دن وہ بھی میرے لیے [illegible] رائیڈ تھی اور میں خوف زدہ ہو کر [illegible] کوسٹر سیٹوں کو دھڑکتے دل سے دیکھ رہا [illegible]

[illegible] میں نے پوچھا۔ ''کیا ارادے ہیں؟ رائیڈ [illegible]

وہ بولے۔ ''میں حیران ہوں کہ یہ گرتی کیوں [illegible]'' ''معلوم نہیں [illegible] ہو کہ یہ بالکل ترچھی ہو [illegible] چلی جا رہی ہیں۔''

[illegible] بولی۔ ''سرجی آپ تو انجینئر ہیں۔ آپ ہی [illegible] کس طرح سے کوسٹر کو گرنے سے روکتی ہیں۔''

وہ بولے۔ ''میں نے آج تک ایسی کوئی دیوار کھڑی نہیں کی جو ترچھی بھی ہو اور کھڑی بھی رہ سکے۔'' پھر نسرین کو سمجھاتے ہوئے بولے۔ ''یہ پٹڑیاں کسی فزکس کے اصول کے تحت اوپر نیچے گھمائی گئی ہیں۔ اس میں سول انجینئرنگ کا عمل دخل نہیں ہے۔''

میں نے سرجی سے پوچھا۔ ''پھر جو فرعونوں نے اہراموں کی بلند دیواریں ترچھی کر دیں تو وہاں بھی فزکس کا عمل دخل ہو گا؟''

سوالات میں پھنسے تو زچ ہو کر بولے۔ ''کیا معلوم کوئی فرعون ٹیکسلا سے انجینئرنگ کی ڈگری لے گیا ہو کیونکہ گوتم بدھ نے وہاں بھی تو یونیورسٹی بنا رکھی تھی۔''

میں نے ہنستے ہوئے بحث سمیٹی اور سرجی کو کہا۔ ''آپ رائیڈ کا سوچیں اور یہ بھی یاد رکھیں کہ فرعون گوتم بدھ سے بھی تین ہزار سال پہلے مر کھپ گئے تھے۔''

سرجی چار ٹکٹ لے آئے۔ لائن لمبی تھی اور ہماری باری آدھے گھنٹے بعد آئی۔ اپنا سامان ہم نے ایک دیسی انڈین فیملی کے پاس چھوڑا تھا۔ پہلے ایک کوسٹر آئی تو اس میں سرجی اپنے ساتھ سعد کو لے کر بیٹھ گئے۔ اس نے پچھلی سیٹ پر میں نے اور نسرین نے اپنے آپ کو پھنسا لیا۔ ہمیں بیلٹ باندھی گئیں۔ دوسرے نے آکر وہی بیلٹ ایک بار پھر چیک کیں۔ ہم سے پچھلی سیٹیں بھی دیکھتے ہی دیکھتے بھر گئیں۔

ہم اس طرح سے خوف زدہ بیٹھے تھے کہ چاند پر جا رہے ہوں۔ ہم میں جوش سے زیادہ سنسنی تھی۔

کوسٹر آہستہ آہستہ روانہ ہوئی۔ کچھ آگے بڑھی اور پھر تھم گئی۔ آگے پٹڑی منہ کے بل گرتی چلی جا رہی تھی۔ اگر آگے سڑک خراب ہو تو اصولاً گاڑیاں رک جاتی ہیں اور پیچھے لمبی لائن بنتی جاتی ہے۔ یہاں تو پٹڑی ایک دم گر گئی تھی اور ان لوگوں نے شاید کوئی رسک لیا اور ہماری کوسٹر پٹڑی پر گرتی چلی گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ کون چیخا اور کون نہیں چیخا مگر آگے سے سرجی اور ادھر میں ہم دونوں مل کر دہاڑے، نسرین جو آسرا لیے میرا بازو تھامے بیٹھی تھی وہ گھبرا گئی اور میرا بازو چھوڑ کر اپنی فکر کرنے لگی پھر مجھے معلوم نہیں پڑا کہ کوسٹر کہاں جا رہی ہے اور کدھر سے آرہی ہیں۔ میری گرفت سامنے لگے ڈنڈے پر کمزور پڑی اور میں نے بڑھ کر نسرین کا بازو تھام لیا۔ اتنی تیزی سے ہم گزر رہے تھے کہ زمین پر

www.PakiBooks.Site www.PakiBooks.Site

کھڑے لوگ ایسا لگتا تھا کہ ہمارے ساتھ ساتھ اڑ رہے ہوں۔ حیرت ناک طور پر سعد اور نسرین اپنے ہوش وحواس میں تھے اور ادھر میں خلا میں ٹانک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرا جسم اوپر کہیں رہ گیا ہے اور روح کہیں گہرائیوں میں گرتی چلی جارہی ہے۔ مجھے میرا نانگا پربت کی جانب جیپ کا سفر یاد آرہا تھا جب وہاں کھائی کا خوف کسی جن کی طرح مجھ سے لپٹ گیا تھا مگر اس وقت وہاں ہم سڑک پر تو تھے اور یہاں تو جیسے جیپ بھی کھائی میں گرتی جارہی تھی۔ نسرین نے ایک دو بار اپنے بازو کو میری گرفت سے نکالنے کی کوشش کی مگر میری آہنی گرفت کے آگے وہ دھان پان سی لڑکی کہاں ٹھہر سکتی تھی جبھی تو اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ کبھی ہم اوپر جاتے اور پھر ہولنا کیوں کی گہرائی میں روشنی کی رفتار سے جیسے گرتے چلے جاتے تھے۔ یہ ایک عذاب مسلسل تھا جو پانچ منٹ سے بھی کم چھایا رہا مگر میرے اندر کا سارا انتظام اس نے الٹ پلٹ کر دیا۔

پھر یہ طوفان تھما۔ یہ آندھی رکی اور میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ بمشکل اپنے ٹکڑے دوبارہ سے کسی نہ کسی طرح فٹ کیے اور گرتا پڑتا سیٹ سے پلیٹ فارم تک آیا۔ نسرین حیرت واستعجاب سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ ہرگز توقع نہ تھی کہ میں رولر کوسٹر کے آگے بلی بن جاؤں گا۔ میرا سر چکرا رہا تھا، قے کی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ نسرین مجھے سنبھال کر سیڑھیوں سے نیچے لائی۔ میں نے کوئی بہانہ بنایا کہ میں کتنا بزدل ہوں۔ کوئی عذر نہ تراشا کہ مجھے ہائٹ فوبیا ہے اور ہاتھ باندھ کر نسرین سے بولا۔ ”محبت میں بھلے میری جان لے لو مگر کبھی رولر کوسٹر پر نہ بٹھانا۔“

سرجی اور سعد کی حالت مجھ سے کہیں بہتر تھی۔ نسرین کے چہرے پر پریشانی کے آثار اس وجہ سے تھے کہ میں نزع کے عالم میں تھا۔ سرجی نے میری پیٹھ ملی، سعد نے میرا ہاتھ پکڑا، نسرین نے میرے بال سہلائے مگر قسم لے لو کہ مجھے افاقہ ہوا ہو۔

مجھے پکڑ کر سامان کی طرف لایا گیا جہاں انڈین فیملی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر کوئی ان کا مرد بولا۔ ”آپ سے تو بہادر آپ کی بیوی ہے۔ کس طرح سے اس نے آپ کو سنبھال رکھا ہے۔“

وہ اردو میں بولا تھا۔ سرجی معلوم نہیں شرما کر مسکرانے لگے۔ میں نے ان سے کہا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں مہاراج! لگتی نہیں مگر دلیر بہت ہے۔ مجھے تو ترس کر رکھا ہوا ہے۔ اپنے سے دور تو جانے ہی نہیں دیتی۔“

وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور [illegible] اٹھانے لگا مگر نسرین نے میری بگڑی حالت بھانپ کر [illegible] خود اٹھالیا۔

نسرین نے چلتے چلتے اچانک مجھے کندھے سے [illegible] روکا اور پوچھا۔ ”رولر کوسٹر پر آخر تم کو ہو کیا گیا تھا۔ میں تو [illegible] گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تم کو کچھ ہو نہ جائے۔“ [illegible] چہرے کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”تمہارا [illegible] رنگ بھی زرد پڑ گیا تھا۔ بلکہ ابھی بھی زرد ہے۔“

سرجی پلٹ کر ہماری جانب چلے آئے، بولے۔ ”سامنے تازہ آئس کریم مل رہی ہے۔ وہ کھالیں تو جو [illegible] رنگ تھا واپس آجائے گا۔“

نسرین کا قہقہہ گونج گیا، بولی۔ ”کون سا سرخ [illegible] ان کا تھا؟“

”کہتے تو ہیں کہ بچپن میں ہوا کرتا تھا۔“ سرجی [illegible] ٹانگ کھینچنے کے موڈ میں تھے۔

وہ لگاتار ہنسنے لگی پھر میرا چہرہ اپنی جانب کر [illegible] شرارت سے بولی۔ ”اب بھی کہیں کہیں سے سرخ نظر [illegible] ہے۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ دراصل شرم کے مار [illegible] سرخ ہو جایا کرتا تھا۔ جیسے ابھی تمہارے ہاتھ نے گال [illegible] چھوا ہے تو کہیں کہیں سرخی آگئی ہوگی۔“

اس سے پہلے سرجی کچھ اور کہتے میں نے ان [illegible] کہا۔ ”میرے لیے آئس کریم کی بجائے کوک کی سلش [illegible] آؤ۔ باقی تم لوگ جو منگوانا چاہو منگوالو۔“

ہر ڈرنک کی سلش میں نے صرف کینیڈا اور ام[illegible] میں دیکھی ہے۔ کوک کو برف کے باریک ذرات میں تبد[illegible] کر دیا جاتا ہے اور اسے پینے کا اپنا لطف ہوتا ہے۔ پاکستا[illegible] میں اکثر سردیوں میں پیپسی وغیرہ اس لیے پیتا تھا ک[illegible] فریزر میں سلش بنی ہوتی تھی۔

ایک درخت تلے کچھ بینچ پڑے تھے۔ اکثر پر لوگو[illegible] قبضہ تھا مگر ہمیں پھر بھی جگہ مل گئی۔ بچے ہوں یا بڑے [illegible] آئس کریم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بے فکر مسکرا[illegible] چہرے چلتی ٹھنڈی ہوا میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصرو[illegible] تھے۔ اکثر سیاح تھے جو باہر کے ملکوں سے آئے ہو[illegible] تھے۔

میرے ہاتھوں ایک لیٹر کا گتے کا گلاس تھا جس [illegible] [illegible] بھری تھی۔ میرے لیے اسے ختم کرنا بہت مشکل تھا۔ [illegible] کے بعد میری طبیعت سنبھل گئی تھی۔

نسرین نے سرجی سے پوچھا۔ ”وہ آپ کی منگی اور [illegible] کیا ماجرا تھا؟“

سرجی کی شکایتی نظریں نسرین کے سوال پر میری جانب آ گئیں۔ اردو میں مجھ سے شکوہ انداز میں بولے۔ ”میرے راز کو سینے میں دفن کرنے کی بجائے طشت [illegible] کر دیا؟“

میں نے یاد دہانی کرائی۔ ”وہ راز جو شہباز اور خان [illegible] کو معلوم ہو وہ کیا راز رہ سکے گا؟“ پھر مسکرا کر چوٹ [illegible] ہوئے بولے۔ ”بس بچپن کی غلطی تھی پھر کسی کو دیکھا [illegible] آگئی۔ پھر دوستوں نے اس کی ایک کہانی بنا ڈالی اور اس [illegible] کہانی کی تکمیل ڈاؤن ٹاؤن میں مکمل ہوتے ہوتے رہ [illegible]“

نسرین سنجیدگی سے بولی۔ ”سنا ہے وہ آپ کو اسکاٹ [illegible] بھی ٹائم نکال کر اس سے مل آئیں۔“

سرجی ہلکا سا مسکرا کر بولے۔ ”ندیم بھائی اکثر کہا [illegible] کے راستے پر پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھو۔ [illegible] دوستوں کو پاؤں کی زنجیر مت بناؤ۔ کیا معلوم ملنے والا [illegible] دن گزارنا چاہتا ہو اور آپ دوستوں کی [illegible] جائیں۔ جتنا وقت ساتھ رہو، اسی میں ہنس [illegible] اس طرح ملو کہ سالوں یہ ملاقات یاد [illegible] شاید اگلے موڑ پر کوئی دوسرا آپ کا انتظار [illegible]“

نسرین سن کر خاموش ہوگئی۔ دیکھا تو اس کی سیاہ [illegible] آنکھوں میں اداسی کی لہریں تھیں۔ شاید سرجی سے کہی [illegible] باتوں کا اس نے کوئی غلط مطلب لے لیا ہو۔ شاید [illegible] ہو کہ میں اس کے بارے میں بھی یہی خیالات [illegible] جتنا وقت ساتھ ہیں ہنس کر گزار لیں پھر راستے [illegible] میں اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس [illegible] پر ہنسی آ رہی تھی۔ اس کے چاند چہرے پر [illegible] معدوم ہوگیا۔

سرجی نے اس کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ وہ اب محتاط [illegible] کمان سے نکل چکا تھا۔

[illegible] سرجی نے پوچھا۔ ”اچانک آپ چپ کیوں [illegible]“

[illegible] کے بعد بھرائی آواز میں بولی۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ سفری دوستیاں واقعی وقتی ہوتی ہیں۔ ان مختصر لمحوں میں کون کس کو باندھ سکتا ہے۔ باندھنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے کیا معلوم دوسرے کو جلدی ہو۔“

وہ خاموش ہوگئی۔ سعد میرے قریب بیٹھا تھا۔ اس کے گلے میں اپنا بازو ڈالتے ہوئے میں بولا۔ ”دوست! بتاؤ ہماری دوستی کتنی مضبوط ہے؟“

آئس کریم کا چمچ منہ میں ڈالتے بولا۔ ”اتنی مضبوط کہ آپ بھی اسے نہیں توڑ سکتے۔“

میں اس کے سر کو چومتے ہوئے بولا۔ ”بچے تو بچے ہوتے ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتے اور کیا خوب صورت بات کی ہے دوست، تم میرے ساتھ اپنے تعلق کو پہچان گئے لیکن ہم بڑے کیوں نہیں جان سکتے؟ اس لیے کہ ہم نالائق ہیں؟“ میں اتنا کہہ کر کے نسرین کو دیکھنے لگا۔ وہ گیلی پلکیں کیے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

سرجی نسرین سے بولے۔ ”ندیم نے جو کہا تھا وہ ان کے بارے میں تھا جن کو ہم ٹھیک سے جانتے بھی نہیں۔ ایسے ہی کہ راستے میں جیسے کوئی ٹکرا جائے۔ اگر آپ اپنا سمجھ رہی ہیں تو ایک بات بتاتا چلوں۔ جتنا مخلص میں نے ان کو آپ کے لیے دیکھا ہے شاید ہی کسی کو دیکھا ہوگا۔ وہ تو ایک بار کسی سے مل لیں اس کے لیے بھی اچھا سوچتے ہیں اور میری مثال آپ کے سامنے ہے۔ ایک بار ملا تھا۔ جب مشکل میں پڑا تو انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے کوئی خاص معلوم نہیں کہ آپ دونوں کے درمیان کتنا مضبوط تعلق ہے مگر یہ جانتا ہوں کہ جب بھی آپ کا ذکر آیا تو انہوں نے انتہائی احترام اور احتیاط سے کیا۔ جب بھی اپنی فیملی کی بات کی تو آپ لوگوں کا تذکرہ بھی ساتھ بڑے صاف دل سے کیا۔ میں تو اکثر حیران ہو جاتا ہوں کہ ان کے دل میں آپ کے لیے اتنی زیادہ فکر...... اتنا زیادہ خیال......؟“

میں بولا۔ ”رک جاؤ سرجی، یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میرے لیے ان کی کتنی اہمیت ہے۔ اکثر عورت کا ردعمل فطری ہوتا ہے۔ بہت سی چیزوں پر اس کا بس نہیں چلتا کہ انہیں ظاہر ہونے سے روکے۔ یہ میرے لیے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتی اگر ہو بھی گئی تو پھر بھی اسے بٹھا کر سمجھا لوں گا۔ اسے تو میں ناراض کر بھی نہیں سکتا۔“

میں نے سعد کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”عورت کے دل میں پیار ہوتا ہے اور دھڑکے بھی ہوتے ہیں۔ وسوسے ہوتے ہیں۔ یہ خدشے اس کے پیار کا

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

دوسرا روپ ہیں۔ وہ عورت ہے تو ہر قدم پر ڈرے گی مگر مرد کو ہر بار یہی کہنا ہوتا ہے۔ فکر نہ کرو، میں ہوں ناں، تم کسی خوف میں ہو تو میرا ہاتھ تھام لو۔ عورت مرد سے زیادہ عقل مند ہے مگر مرد کے لیے وہ عقل مند نہیں رہتی۔ اسے ہر قدم بڑھانے کے لیے مرد کا بازو تھامنا ہوتا ہے اور جب بھی یہ ذرا سا ڈری تو اپنا یقین دلانے کے لیے اس کے ساتھ رہوں گا۔''

وہ دونوں ہاتھ گود میں تھامے اپنے نصیب کے بارے میں سوچ رہی تھی یا پھر کچھ اور۔ میں جتنا بھی اسے ہمارے رشتے کی مضبوطی کا یقین دلاتا مگر وہ اس تعلق کو کیا نام دیتی۔ اس کی نظر میں یہ رشتہ چند وعدوں کا محتاج تھا۔ وعدوں کی زندگی کبھی دائمی ہوتی ہے؟ ایک ٹھوکر لگنے سے یادداشت گئی تو وعدے بھی بکھر گئے۔ دنیا کا کون سا قانون وعدوں کو تحفظ دیتا ہے مگر عہد اور اس کی پاسداری کے قانون کو وہ بھی نہیں جانتی تھی۔ قسم مجبوری میں کھائی گئی ہو یا اپنی خوشی اور رضا سے۔ کردار رکھنے والے کے لیے یہ ایک جلتا دیا ہے جس کو وہ کبھی بجھنے نہیں دیتا۔

سامنے ڈاجنگ کار چل رہی تھیں۔ میں نے سرجی کو اشارہ کیا کہ وہ سعد کو ان کی سیر کروالائے۔ وہ اٹھے اور سعد کو کچھ سمجھاتے بجھاتے اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ میں اٹھا اور نسرین کے ساتھ بینچ پر جا بیٹھا۔

اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

''ڈر کیوں جاتی ہو۔ کس چیز کا خوف ہے؟''

جواب نہ دیا۔ اس کی پلکیں گیلی ہوتی رہیں۔ نظریں اپنے ہاتھوں پر تھیں جو میرے ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑے تھے۔

میں نے دوسرا سوال پوچھا۔ ''چلو یہ بتاؤ تمہارے اور میرے تعلق کی بنیاد کیا ہے؟''

گیلی آواز میں بولی۔ ''میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ تمہاری عزت کرتی ہوں اور تم پر اعتماد کرتی ہوں کیونکہ تم نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور اپنا کردار بھی دکھایا ہے۔''

''اور......؟'' میں نے پوچھا۔

تو نظریں اٹھا کر اس نے جواب دیا۔ ''اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم صرف مجھ پر نہیں بلکہ سب پر اعتماد کرتے ہو۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''تم نے دوستی، پیار اور کسی بھی رشتے کی ساری شرائط بتا دیں۔ سب بنیادیں اور اصول دیے ہیں۔ اب ایک سوال اپنے آپ سے پوچھو اور جواب بھی خود کو دو کہ ان سب چیزوں میں کون سی ایسی چیز ہے میں نہیں کرتا؟ کیا تمہاری عزت یا تم پر اعتماد نہیں کرتا؟ ان سب سوالوں کا جواب ہاں میں ہے تو اپنے خوف کو مار دو اپنے اندیشے اس گہری جھیل میں ڈبو دو اور اپنے آپ اطمینان میں لے آؤ۔ اگر پھر بھی بے چینی رہے تو پھر شادی کرلیتے ہیں۔''

ایک جھٹکے سے اس نے نظریں اٹھا کر میری آنکھوں میں حیرت سے دیکھا۔ بے یقینی سے شاید سچائی ڈھونڈ رہی تھی۔ میری نظروں میں اعتماد دیکھ کر حیران تھی۔ میرے [illegible] کی مضبوطی کے سامنے وہ چور چور ہو گئی۔ بکھر کر میرے [illegible] سے آ لگی۔

مجھے خدشہ تھا کہ اپنی عادت کے باعث کہیں رونے لگ جائے۔ گلے لگنا کسی لڑکی کا مسئلہ نہ تھا مگر لگ کر رونا [illegible] سب کو ہماری جانب متوجہ کر دیتا۔ سسکیاں تو نہ ابھریں مگر آنسو بہاتی رہی۔

ٹورنٹو کی جانب میرا بے یقینی کا سفر مجھے کن [illegible] راستوں پر لیے چلتا تھا۔ پچھلے سال ان ہی دنوں [illegible] شمشال وادی کی سنگلاخ پتھریلی چٹانوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ ان چٹانوں میں دبدبہ تھا، رعب اور دہشت تھی۔ کوئی ملائمت اور نہ کوئی نازکی۔ موت کا خوف اور نہ تنہائی [illegible] ڈر تھا پھر ایک سال بعد منظر بدل گیا۔ موتیے کی خوشبو [illegible] احساسات میں گھرا تھا۔ خنک اور ملائم ہواؤں ایسے جذبات سے بھرا تھا۔ زندگی کوئی سیدھا راستہ نہیں بلکہ کئی موڑ ہیں ایک کے بعد ایک نیا موڑ، ہر موڑ کے بعد نئے خواب اور موڑ سے پہلے اس کی تعبیریں اور اس کے بعد نیا راستہ نئے مناظر پھر ایسے کئی موڑ مڑتے مڑتے اچانک آ[illegible] راستہ موت کی کھائی کے کنارے ختم ہو جاتا ہے مگر شرط [illegible] ہے کہ رکنا نہیں اور سامنے کھائی ہے۔ اندھیری اور [illegible] دینے والی کھائی جہاں گھپ اندھیرا ہے اور ٹھنڈک [illegible] ہوئی ہے پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اگلا قدم کھائی کے اندر [illegible] اس کے بعد غیب ہی غیب، راز ہی راز۔

نسرین کندھے پر سر رکھے خاموش تھی۔ میری بات[illegible] جواب نہ دیتی تھی بلکہ مجھ سے سوال کرنے لگی۔ ''[illegible] شادی کرو گے مجھ سے؟''

میں بولا۔ ''ہاں۔''

www.PakiBooks.Site

[illegible] آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کب تک کر سکو گے؟''

''جب تم کہو۔''

''سوچ لو۔''

''جب ہاں کردی تو پھر کیا سوچنا۔'' اسے کیا بتاتا کہ [illegible] کے بعد سوچنا زبان رکھنے والوں کا شیوہ نہیں۔

[illegible] میرے چہرے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''مجھے سوچنے کی اجازت دو گے؟''

میں ہنس کر بولا۔ ''سوچ لو بار بار سوچ لو لیکن ایک بات کا یقین کر لو کہ اگر شادی مجھ سے نہیں کرنی تو کسی اور سے بھی نہیں کرنی۔ تمہیں کسی اور کے سپرد کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔''

[illegible] ہوئے بولی۔ ''سعد کو دیکھتے ہیں بہت دیر سے کیا ڈاجنگ کار چلا رہا ہے؟''

ہم اس احاطے میں گئے جہاں چھوٹی چھوٹی گاڑیوں [illegible] ان کو دوسری چلتی گاڑیوں سے ٹکرا کر بے انتہا [illegible] تھے۔ دیکھا کہ سرجی ڈرائیونگ سیٹ پر ہیں اور [illegible] کر انہیں ہدایات دے رہا ہے۔ نسرین اور میں [illegible] رہے تھے۔

[illegible] کر کے انہیں وہاں سے نکالا۔ سعد گلا پھاڑ [illegible] والے انکل گاڑی چلانا نہیں جانتے۔ [illegible] رہا تھا اور یہ خود کسی گاڑی کی بجائے [illegible] سے ٹکرا رہے تھے۔

اب ہمارے سامنے ایک بہت بڑا وہیل نما جھولا تھا۔ [illegible] ہی نظر آ رہا تھا مگر جب اس کے نیچے جا [illegible] تو وہ اندازے سے کہیں زیادہ بلند دکھائی [illegible]

[illegible] نے مجھے جب جھولے کی بلندی کو تاپتے دیکھا [illegible]۔ ''تم نے تو نہیں بیٹھنا اس پر۔ تم کو ہائٹ [illegible] اپنی حالت دیکھی تھی؟'' پھر وہ بولی۔ ''[illegible] اترے تو ایسے لڑکھڑا رہے تھے جیسے نشے [illegible]''

میں نے ہنس کر آہستگی سے کہا۔ ''کہیں یہ تو نہیں سمجھ [illegible] اس میں نہیں دی۔''

[illegible] بولی۔ ''تمہارے ان فقروں کے سحر میں ابھی تک [illegible] ہوں۔ کم از کم میرا یہ بھرم مت توڑو۔''

[illegible] بعد میں نیچے کھڑا تھا اور وہ تینوں وہیل سے جڑے ایک جھولے میں بیٹھے آہستگی سے اوپر جا رہے تھے۔

میں اس وہیل کے جنگلے سے پیچھے ہٹتا ہوا ذرا دور ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ آتے جاتے چہرے دیکھ رہا تھا۔ بہت سارے چہرے مسکرا رہے تھے اور جو نہیں مسکراتے تھے وہ تھکے لگ رہے تھے۔ پیچھے بہت اونچے وہیل کے کسی جھولے میں وہ اپنے بیٹے اور سرجی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ان کے اوپر نیلا شفاف آسمان جہاں کہیں کہیں بادل کسی سمت میں رواں دواں تھے۔ نسرین کو آخرکار میں نے شادی کا کہہ دیا تھا۔ بہت بڑا قدم تھا جو میں نے اٹھانے کا ارادہ کرلیا تھا جس سے میں دور رہنا چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھتا چلا آیا تھا۔ اس نے اپنے سارے دکھ سکھ مجھے سونپ دیے تھے تو ایک طرح سے اس نے تعلق بنا لیا تھا۔ یہ تعلق ایک پسندیدگی میں ڈھل گیا۔ اس کا ساتھ اچھا لگنے لگا۔ اس سے ملنا مجھے اطمینان دیتا تھا۔ اس کا میرے لیے انتظار کرنا مجھے بھانے لگا تھا۔ اس کا بننا سنورنا مجھے اس کی جانب کھینچنے لگا تھا۔ اگر چاہتا بھی تو آس چھوڑ نہ سکتا تھا کیونکہ عہد دے کر عہد شکن نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔ یہ سب اتنا مضبوط رشتہ بن گیا تھا تو اسے کوئی نام کیوں نہ دے دیتا؟ اسی سوچ نے اچانک مجھے بغیر سوچے یہ سب کہلوا دیا تھا۔

میں سوچوں میں کھویا تھا اور وہ واپس آ کر میرے پاس کھڑے تھے۔ جب سعد نے میرا ہاتھ چھوا تو میں جیسے کسی خواب سے باہر آ گیا۔ وہ سامنے کھڑی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی اور میرے دیے ہار کے موتی اس کی گردن پر چمک رہے تھے۔

ہم اس میلے میں گھومتے رہے۔

کہیں رکے اور کہیں رک کر چل پڑے۔ درختوں کی چھاؤں میں یہ میلہ سجا تھا۔ پہلی بار اتنی بھیڑ بھاڑ میں گھس آیا تھا۔ گو میں شور شرابوں سے دور رہتا آیا ہوں مگر وہ جگہیں جہاں بچوں کی متجسس نگاہیں ہوں اور حیرت زدہ چہرے ہوں۔ یہ مقامات اکثر مجھے اچھے لگنے لگتے ہیں۔

بچے مجھے اس لیے بھی اچھے لگتے ہیں کیونکہ ان میں اپنا آپ تلاش کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اکثر میں اپنے آپ کو ان بچوں میں ڈھونڈ لیتا ہوں۔ میلوں ٹھیلوں میں گھومتے بچے تو بہت ہی بھلے محسوس ہوتے ہیں۔ میں بھی ان کی مثل اپنے چھوٹے سے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کے عید میلے میں اسی طرح گھومتا تھا۔

اللہ کا شکر ہے کہ میرے پاس یادوں کا بہت بڑا خزانہ

www.PakiBooks.Site

ہے۔کل کی بات بھول جاتا ہوں مگر بچپن کی ہر یاد کو سینچ سینچ کر رکھا ہوا ہے۔

ہمیں سال میں دو یا تین خوشیاں ہی نصیب ہوتی تھیں۔ایک جب گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں اور پھر جب عید کا چاند نظر آتا۔پہلی خوشی گرمیوں کی اور دوسری سردیوں کی ہوتی تھی۔عید میلہ تو پانوالا گیٹ پر موجودہ حق نواز پارک میں لگتا تھا۔عید سے دو دن پہلے کسی بڑے سے ضد کر کے وہاں جاتا جہاں جھولوں والوں کے قافلے اترتے، لکڑی کے چوبی تختے، گھوڑے، ٹینٹ وغیرہ زمین پر پڑے ہوتے جنہیں دو دن بعد جھولوں وغیرہ میں تبدیل ہونا ہوتا۔موت کا کنواں ہوتا جہاں موٹر سائیکل کو دوڑنا ہوتا۔وہ اپنے ہمراہ چڑیا گھر بھی لایا کرتے جس میں شیر کے علاوہ دوسرے متعدد جانور پنجروں میں بند ہوتے۔شیر بے چارہ اتنا مریل ہوتا کہ ہم بچے بھی اسے آنکھیں دکھاتے تھے۔

میلہ لگتا تو عید کا پہلا پڑاؤ ہمارا وہیں ہوتا۔فضا میں ڈھول کے علاوہ بے انتہا شور شرابہ ہوتا جس میں سرکس اور چڑیا گھر کے لاؤڈ اسپیکروں سے آتی آوازیں بھی شامل ہوتیں۔اس شور میں جھولوں کا شور، بچوں کی جھولا جھولتے ہوئے نکلتی چیخیں، ٹھیلوں سے اٹھتے ہوئے اور ضد کرتے بچوں کی آوازیں ہوتیں۔سرکس میں لکڑی پر چلتی بکری کو دیکھنا مجھے حیرت میں ڈال دیتا۔چڑیا گھر میں خرگوش، پانچ ٹانگوں والی بکری، لومڑی، بھوک سے نڈھال شیر، سویا ہوا گیدڑ، پنجرے میں بے چینی سے ٹہلتا چیتا اور دوسرے کئی جانور دیکھ کر ہم بہت خوش ہوتے۔

آج بھی سینٹر آئی لینڈ کے میلے میں بچے وہی چہرہ لے کر گھوم رہے تھے جو میرا تھا۔میں میلے کو بچوں کی آنکھوں سے دیکھتا اور ان کے ننھے سے دل میں بیٹھ کر محسوس کرتا تھا۔قلانچیں بھرتا سعد مجھے اس لیے اچھا لگ رہا تھا کیونکہ وہ میں تھا۔انسان کی زندگی سے نرم و گداز یادیں نکال دی جائیں تو باقی سنگلاخ دیواریں رہ جاتی ہیں جن سے سر ٹکراتے عمر بیت جاتی ہے۔

ہمارے سامنے ایک سلائیڈ ہے جس پر پانی لیٹا ہوا سامنے ایک بڑے تالاب میں گر رہا ہے۔لوگ تالاب کے گرد اکٹھے ہیں۔کچھ دیر بعد سلائیڈ سے ایک بوٹ سیاحوں کو لیے آہستہ آہستہ نیچے آرہی ہے۔ پھر تیز ہو جاتی تو پانی کی پھواریں کشتی پر بیٹھے لوگوں پر آتی ہیں۔وہ بھیگتے ہیں، شور کرتے ہیں، پھر کشتی رفتار پکڑتی ہے لوگوں کی چیخوں اور شور کو ساتھ لیے تالاب میں ایک رفتار سے آ گرتی ہے۔تالا[ب] کا پانی بھی کشتی کے مسافروں کو بھگو دیتا ہے پھر تماشا[ئ]ی والوں کو بھی اور کشتی کے مسافر مل کر ہنستے اور قہقہے لگا[تے] ہوتے ہیں۔

نسرین نے مجھ سے کہا۔"یہ زیادہ خطرناک نہیں لگ[illegible] تم بیٹھ سکتے ہو۔"

"اور اپنے بارے میں کیا کہتی ہو؟" میں نے پوچھا

"اکٹھے چلتے ہیں۔" میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔

میں بولا۔"بھیگ جاؤ گی۔"

"کوئی بات نہیں، ہوا چل رہی ہے، کپڑے سو[کھ] جائیں گے۔" وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگی۔

سرجی نے کہا۔"میں سامان کے ساتھ رہتا ہوں۔[illegible] لوگ کشتی کی سیر کرو۔"

پھر ہم نے ٹکٹ لیے اور لائن میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد کشتی میں آ بیٹھے۔سعد کو میں نے درمیان میں بٹھایا مگر اسے پانی کے چھینٹوں میں بھیگنے کا شوق تھا۔اس [illegible] مجھے درمیان میں بٹھا کر خود کنارے سے لگ کر بیٹھ گیا۔

کشتی آہستہ آہستہ پانی کی دھار پر رینگتی ہوئی او[پر] پہنچی اور وہاں فوارے چل رہے تھے پھر پانی پر چلتی ہو[ئی] سلائیڈ کی بلندی پر آ کھڑی ہوئی۔اب نسرین نے مجھے او[ر] میں نے سعد کو پکڑا ہوا تھا۔کشتی پانی کی سلائیڈ پر اتری او[ر] کچھ چھینٹے پانی کے پڑے تو اچھے لگے اور پھر ایکدم کشتی نے نچلی جانب رفتار پکڑی اور اڑتی ہوئی پانی کے تالاب سے [illegible] ٹکرائی۔میں نے خوف سے سعد کو اپنے سے لپٹا لیا۔

پانی چھپاکے سے بلند ہوا اور ہم سب کو بھگو گیا۔ٹھنڈ[ا] پانی اوپر پڑا تو ہوش ٹھکانے آگئے میں نے سعد پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور بڑے قرینے سے نسرین کے بازو کو اپنی کمر سے کھولا۔

ہم سب بھیگ چکے تھے۔نسرین کی حدت اور پانی کی ٹھنڈک نے ایک عجیب سی کیفیت میں مجھے جکڑ لیا تھا جیسے ٹھنڈے پانی اپنی تاثیر بدل کر مجھے گرم بوسے دیتے ہوں۔نسرین مجھے مسکرا کر دیکھ رہی تھی اور میں چوروں کی طرح سر جھکائے ایسے کھڑا تھا جس کی چوری رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔

کشتی سے اتر کر زمین پر آیا تو جیسے ہواؤں نے مجھے بادلوں کی سیر کرا کے زمین پر لا کھڑا کیا ہو۔پہلے سوچا کہ سر جھٹک کر اس کیفیت کو علیحدہ کر دوں مگر پھر اسے کسی ثواب کی طرح دل و دماغ میں ہمیشہ کے لیے رکھ لیا۔مسکرا کر سرشاری [illegible] کی جانب دیکھا اور اب وہ شرم کے مارے سر [illegible] کھڑی تھی۔

ہم آگے بڑھے تو سامنے ایک اور ایڈونچر ہمارا منتظر تھا۔[illegible] ہارر انٹرٹیمنٹ تھی۔مجھے پہلے کسی ہارر ہاؤس میں [illegible] کا اتفاق نہ ہوا تھا۔مجھے کوئی تجربہ نہ تھا کہ ساؤنڈ اور [illegible] اثرات سے انسان کیسے دہلتا ہے۔

نسرین سے پوچھا۔"ڈرنے کے لیے تیار ہو؟"

بولی۔"ہاں مگر ایک شرط پر اگر سہارا دینے کے لیے [illegible] ساتھ ہو تو۔"

سرجی بھی سعد کو ساتھ لیے تیار کھڑے تھے۔سعد سے پوچھا تو بولا۔"انکل میں واقعی بڑا ہو گیا ہوں، مجھے ڈر نہیں [illegible] ڈرپوک ہیں۔"

اندر آگے پیچھے چھوٹی چھوٹی گاڑیاں چل رہی تھیں۔[illegible] ایک ساتھ بیٹھے تھے۔آگے والی گاڑی میں سر[illegible] بیٹھے ہوئے تھے۔ایک بہت بڑا ہال تھا [illegible] کی گلیاں تھیں۔موڑ تھے اور اندھیرا چھایا [illegible] کبھی کبھار سرخ زرد لائٹیں جل کر بجھ جاتیں، جن سے ایک خوفناک ماحول پیدا کیا گیا تھا۔ان کوچوں میں ہر جانب لکڑی کے کیبن بنے تھے۔کئی موڑ تھے اور کئی مرحلے [illegible] گاڑیاں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں۔جو [illegible] اور پھر جھٹکے سے آگے بڑھنے لگتیں۔[illegible] پاور فل اسپیکر تھے جن سے بھی ڈراونی آوازیں اور بھی چیخیں بلند ہوتی تھیں۔ہم پہلا موڑ مڑے [illegible] اندازہ نہ تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔موڑ [illegible] دائیں جانب ایک کیبن میں جہاں اندھیرا تھا، [illegible] اور وحشت ناک قسم کا ماسک پہنے کوئی چمکتا [illegible] جانب لپکا اور خوفناک چیخ مار کر اپنا خنجر والا [illegible] حملہ آور ہوا۔سرجی اور سعد کی گاڑی کو [illegible] نکل لیا تھا مگر میں زد میں آگیا تھا۔ادھر [illegible] اٹھا اور ادھر میری آواز خوف سے بند ہو گئی [illegible] گم ہو گئی۔نسرین ایک فلک شگاف چیخ مار کر مجھ سے [illegible] اندر حلول کرنے کی کوشش کر رہی ہو [illegible] وہ شیطان صفت آدمی اسی کیبن میں غائب [illegible] لاؤڈ اسپیکروں سے شور، ڈراونی آوازیں اور تیز [illegible] مکمل سکوت چھا گیا۔چھت پر کہیں کہیں لال [illegible] دیواروں پر خون کے چھینٹے تھے اور ہماری گاڑی دھکے کھا رہی تھی۔میں گاڑی میں بیٹھا اپنی قوت لگا رہا تھا کہ میرے زور سے وہ تیز چلے مگر وہ تھم تھم کر چلتی تھی پھر کوئی دوسرا موڑ آیا تو کسی اندھیرے کونے سے کوئی شخص نکلا جس کے ہاتھ میں ایک کٹا سر تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا۔اس نے قریب آکر ہمارے آگے وہ سر کر دیا جس کی آنکھیں خوف سے پھٹی تھیں۔میں نے آنکھیں بند کر لیں مگر کان بند کرنا بھول گیا اور ایک کریہہ چیخ میرے کان میں آ کر اس قاتل نے ایسے ماری کہ میرا دل بند ہونے لگا۔آنکھیں کھولیں تو وہ قاتل واپس کسی اور اندھیرے میں گم ہو چکا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں ہنس رہا ہوں کہ رو رہا ہوں۔مجھے نسرین کے ساتھ سعد کی فکر تھی کہ اس کا کیا حال ہوگا۔اپنے بائیں بازو سے میں نے نسرین کو جکڑا ہوا تھا اور وہ سسک رہی تھی۔

پھر کئی کیبن آئے کہیں سر کاٹے جا رہے تھے اور کہیں جسموں میں کیلیں ٹھونکی جا رہی تھیں، شور اتنا تھا کہ معلوم نہ پڑتا کہ کہاں سے آرہا ہے۔میں نے نسرین سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی آنکھیں بند کرے۔ہم ایک اندھیری ٹنل سے گزر رہے تھے اور مختلف ایفیکٹس ہمیں ڈرانے میں کامیاب ہو چکے تھے پھر ایک جگہ پر جیسے ہمارے اوپر چھت گر رہی ہو اور اچانک ایک لاش ہماری جانب گرتی آئی اور پھر اس میں سے دھواں نکلا اور پھر اچانک اسی چھت میں غائب ہو گئی۔ایسے مناظر بھگتتے بھگتتے یہ سفر ختم ہوا اور ہم روشنی میں آئے تو دیکھا کہ سب کے چہرے دہشت سے زرد ہیں اور کئی ایک کے آنسو نکل رہے ہیں۔آگے سعد نے سرجی کی گود میں سر چھپایا ہوا ہے اور نسرین کپکپا رہی ہے۔

سعد کو میں نے اپنے سینے سے لگا لیا۔وہ بالکل خاموش ہو چکا تھا۔یہاں ہم بڑے سہم گئے تھے تو چھوٹے بچوں کا کیا قصور تھا۔اسے بہت دیر سمجھاتا رہا کہ یہ سب مصنوعی تھا اور صرف ہماری بہادری کو ٹیسٹ کرنے کے لیے انہوں نے ڈراما رچایا تھا۔سنتے مجھے وہ بولا۔"میں تو بالکل نہیں ڈرا۔" پھر سرجی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔"انکل نے پہلے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔جب میں نے ان کا ہاتھ ہٹایا تو میرا سر اپنی گود میں چھپا لیا۔"

میرے بھرپور قہقہے نے باقی کے رہے سہے ڈر کو بھی کہیں اڑا دیا۔

گرمیوں کے دن بڑے ہوتے ہیں۔یہاں نو بجے سورج غروب ہوتا ہے۔ہمارے پاس ابھی بہت سارا وقت

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

تھا۔ گو سورج زوال کی جانب جھک چکا تھا مگر دن کا بہت سارا حصہ باقی تھا۔ ابھی تو شام کے رنگ نکھرنے تھے اور میں انہی ساعتوں کے انتظار میں تھا۔

ہم تھک چکے تھے۔ سوچا ذرا دیر کے لیے کہیں ستانے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔

اونٹاریو لیک کنارے درختوں کے جھنڈ تھے اور ان تلے مخمل کی طرح گھاس بچھی تھی۔ ہم نے وہیں ایک مناسب جگہ تلاش کی جہاں سے جھیل کے پانی اور پیچھے ڈاؤن ٹاؤن کی بلند عمارتیں عین نظروں کے سامنے تھیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ نسرین نے فوراً بیگ سے نیچے بچھانے کے لیے شیٹ نکالی اور گھاس پر پھیلا دی۔ تھکے جسم کو نرم دبیز گھاس پر درختوں کی چھاؤں میں اور چلتی خنک ہواؤں میں لیٹنے کا موقع ملے اور وہ اس کا بھرپور فائدہ نہ اٹھائے تو اس سے بڑا احمق اور گناہ گار کوئی نہ ہوگا۔ میں نے اپنے جوتے اتارے اور دراز ہوگیا۔ نسرین اپنا بیگ کھول کر اس کے اندر جھانک رہی تھی۔ سرجی شاید نہیں تھکے ہوں گے یا پھر شرم کے مارے نسرین کے سامنے لیٹنے سے کترا رہے تھے اور سعد ماں کا کندھا متواتر ہلائے چلا جا رہا تھا کہ اسے سائیکل چلانی ہے۔

درختوں کی ٹہنیوں کے پار نیلے اور کھلے آسمان کو دیکھنا میری آنکھوں کی تھکاوٹ کو دور کرتا تھا۔ میں نے سر تلے اپنا بیک پیک رکھا تھا اور پھر چند ہی لمحوں میں نیند کی نیلی جھیل میں ڈوبتا چلا گیا۔

ذرا سی آنکھ لگی تھی کہ کسی ملائم لمس نے جیسے سپنوں میں آ کر چھوا ہو۔ آنکھ کھولی تو ہلکورے لیتی ہواؤں نے تھپکیاں دے کر پھر سے سلا دیا لیکن وہ لمس کسی احساس سے خوب صورت حقیقت میں بدلا اور بازو پر نرم گرفت نے مجھے دوبارہ سے نیلی جھیل کے روبرو بٹھا دیا۔

میں اٹھ بیٹھا اور منرل واٹر سے اپنے چہرے پر چھینٹے ڈالے اور گہری سانس لے کر نسرین سے بولا۔ ”تم بھی ذرا سو جاتیں، تھک گئی ہوں گی۔“

آنکھیں نکال کر بولی۔ ”کیا سب کے سامنے اِدھر ہی لیٹ جاتی؟“ پھر بیزاری سے بولی۔ ”سرجی بھی سعد کو لے کر بائیک رینٹ کرنے چلے گئے اور شاید وہ دونوں سائیکلنگ کر رہے ہوں گے اور میں تمہیں بے خبر سوتے ہوئے کتنی ہی دیر دیکھتی رہی؟“

اس نے چائے کپ میں بھر کر دی جو ابھی تک گرم تھی۔ ساتھ میں کباب اور روٹیوں نے میری بھوک [illegible] دی تھی۔

وہ بولی۔ ”سرجی اور سعد کھانا کھا کر گئے ہیں۔ [illegible] نے ان سے کہا ہے کہ واپسی پر ہمیں یہیں پر ملیں۔“ میں [illegible] کھاتے ہوئے اسے سنتا رہا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تم نے آ[illegible] بھی کر لیا ہے۔ ہم سامنے پیئر پر چلیں؟“

سامنے بائیں جانب جھیل کے اندر دور تک جاتی [illegible] پر متعدد لوگ ریلنگ سے لگے کشتیوں اور ڈاؤن ٹاؤن عمارتوں کا نظارہ کر رہے تھے اور میں پیئر سے ذرا دور بائیں جانب لائٹ ہاؤس کو دیکھ رہا تھا۔

وہ پختہ اینٹوں سے بنا کیسا بلند مینار تھا جس کی چوٹی اینٹوں کی نہیں بلکہ شیشے کی دیوار تھی۔ جبرالٹر پوائنٹ جبرالٹر لائٹ ہاؤس 1808ء میں تعمیر ہوا تھا۔ [illegible]reat Lakes یعنی عظیم جھیلیں جو ہزاروں میل کے فاصلے [illegible] پھیلی ہوئی ہیں اور جہاں بے شمار لائٹ ہاؤس ہیں جبرالٹران میں سب سے پرانا ہے۔ کینیڈا کا یہ دوسرا [illegible] سے قدیم لائٹ ہاؤس ہے۔ بڑے سمندری جہاز ان [illegible] بڑی جھیلوں میں چلتے ہیں۔ لہٰذا کئی لائٹ ہاؤس ان کو را[illegible] بتانے کے لیے ان کے کناروں پر بنے ہوئے ہیں۔ جھیلیں کینیڈا سے لے کر امریکا کی ریاس[illegible] Wiscomsh تک پھیلی ہیں۔ صدیوں پہلے یور[illegible] سے مسافر بردار جہاز اور تجارتی جہاز بحراوقیانوس [illegible] دریائے لارنس اور پھر لیک اونٹاریو میں داخل ہوتے تھے۔ لیک اونٹاریو کینیڈا میں ہے اور لیک ایری، لیک ہورن، لیک سپیرائر اور لیک مشی گن امریکا میں ہیں۔ یہ دنیا کا میٹھے پا[illegible] کا سب سے بڑا ذخیرہ ہیں۔ ان جھیلوں کا دوسرا کنارہ [illegible] سمندر کی طرح انسانی آنکھ کو نظر نہیں آتا۔ سردیوں کی برفو[illegible] کا پانی گرمیوں میں پگھل کر ان کو بھرتا رہتا ہے۔ کہیں کہیں [illegible] چھ چھ سو فٹ تک گہری ہیں۔ سمندر کی طرح اس میں بلن[illegible] لہریں جنم لیتی ہیں جن پر surfing ہوتی ہے۔ مچھلی ا[illegible] زیادہ کہ پوری دنیا کو کھلاتے رہیں۔ سیاحت کے ایسے خوب صورت مقامات کہ آنکھیں دیکھتے تھک جائیں مگر دل نہ بھرے۔ ان جھیلوں کو میں نے الگ الگ کئی مقامات سے دیکھا ہے مگر شاید دو فیصد بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ ان بڑی جھیلوں کے آس پاس ہزاروں چھوٹی بڑی جھیلیں اور کئی در[illegible] بہتے ہیں۔ پڑھنے والے جانچ سکتے ہیں کہ یہ علاقہ دیکھنے میں کتنا خوب صورت اور دلکش ہوگا۔

www.PakiBooks.Site

[illegible] کھلے آسمان کو [illegible] اور کوئی شہر آباد [illegible] کوئی شہری روشنی [illegible] آسمان پر چمکتے [illegible] محسوس ہوتے ہیں۔ [illegible] ایک بارعب نگہبان کی [illegible] لائٹ ہاؤس اس لیے [illegible] نظر پر چھائے ہوتے ہیں، [illegible] خاموش مگر دبدبے سے کھڑے [illegible]

[illegible] لائٹ ہاؤس میں منہمک دیکھ کر نسرین بول [illegible] ”اب اس لائٹ ہاؤس میں آپ کو کیا نظر آ رہا ہے جو [illegible] بھول گئے۔“

”[illegible] کہ اگر تمہیں اس جزیرے پر رات [illegible] تو نہیں؟“ میں نے اس سے [illegible]

[illegible] تم ساتھ کیوں نہیں؟“ پھر [illegible] پہلے ہی تو کہہ رہے تھے [illegible] ہم دونوں اس جزیرے پر لکڑی کے بنے [illegible]

[illegible] پوچھا۔ ”ٹھیک ہے اگر میں ہمراہ [illegible]

[illegible] کر میرے ساتھ آ بیٹھی اور [illegible] پورے چاند کی ایسی کوئی رات ہو۔ میں [illegible] تنہا ہوں۔ کوئی اور نہ ہو۔ ایسے لمحے مل [illegible] کچھ اور مانگوں بھی نہیں۔“

”اور اگر کوئی بھوت آ جائے تب بھی نہیں؟“

”[illegible] اور تم بھوت کو بیچ میں [illegible]

”اس لیے کہ اس جزیرے پر ایک بھوت بھی رہتا [illegible] چاند کی رات کو تم اپنی آخری دعا کا صلہ سمجھ [illegible] چاند کی رات ہی کو نکلتا ہے۔“ یہ [illegible] چاند جیسا چہرہ دیکھنے لگا۔

[illegible] بولی۔ ”تم مذاق کر رہے ہو؟“

[illegible] ایک شخص اس لائٹ ہاؤس میں [illegible] طریقے سے لارنس مارکیٹ [illegible] پھر اس کی لاش کو جھیل میں

پھینک دیا۔ تب سے ہر چودھویں کی رات کو اس کا بھوت لائٹ ہاؤس کے اردگرد آہ و بکا کرتا ہے۔ یہاں رہنے والے لوگ اکثر اس کی فریاد سنتے ہیں۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا، بس انصاف مانگتا ہے۔“

وہ خوف سے گنگ ہو کر بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے ہنستے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور بولا۔ ”اب اس لائٹ ہاؤس کو اس نظر سے دیکھ کر سوچو، دو سو سال پہلے یہاں ایک شخص تھا جو جھیل کے پار ڈاؤن ٹاؤن کے علاقے میں قتل ہو گیا اور اب اس کا بھوت یہاں پھرتا ہے۔ اس نظر سے دیکھو گی تو یہ کتنا پُراسرار نظر آئے گا؟“

وہ بولی۔ ”کوئی اور بات کرو، واقعی خوف آ رہا ہے۔“

اتنے میں آسمان پر ایک چھوٹا طیارہ جزیرے کے مغربی جانب نچلی پرواز کرتے ہوئے لینڈ کرنے لگا۔ اردگرد کے لوگوں کی نظریں آسمان کی جانب اٹھ کر طیارے کو دیکھنے لگیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین پر اتر گیا۔ لوگ دوبارہ آپس میں مگن ہو گئے۔

میں نسرین سے بولا۔ ”جہاں طیارے نے لینڈ کیا ہے وہاں ایک بہت خوب صورت بیچ ہے۔“

مچل کر بولی۔ ”وہاں چلیں؟“

میں خفا ہو کر بولا۔ ”مجھے کبھی کہنا بھی نہیں وہاں چلنے کا، میں ایسے کردار کا بندہ نہیں۔“

حیرت سے بولی۔ ”وہاں کیوں نہیں جا سکتے؟“

”اس لیے کہ وہ نیوڈ بیچ ہے۔ کوئی بندہ کپڑے پہن کر نہیں جا سکتا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

میری شرٹ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ ”سیدھی طرح سے پہلے نہیں بتا سکتے تھے۔ ہر بات ڈراما کر کے کیوں بتاتے ہو؟“

میں ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”چلو پیئر پر چلتے ہیں۔“

پیئر ایک لمبا اور چوڑا پلیٹ فارم تھا جو اونٹاریو لیک کے اندر تک بنایا گیا تھا۔ فرش اس کا پختہ اینٹوں کا بنا تھا اور اردگرد لوہے کی ریلنگ لگی تھی۔ ریلنگ کے ساتھ ساتھ متعدد دوربینیں لگی تھیں تاکہ لوگ ان سے پچیس سینٹ کے دو سکے ڈال کر ڈاؤن ٹاؤن کی عمارتوں کو قریب سے بغور دیکھ سکیں۔ ان عمارتوں نے تو جھیل کا شمالی افق گھیرا تھا اور یوں محسوس

www.PakiBooks.Site

ہوتا تھا وہ ہم سے اتنی قریب ہیں کہ ذرا سا آگے بڑھ کر انہیں چھو لیں گے۔

گو ہمارے اور ڈاؤن ٹاؤن کی عمارتوں کے بیچ جھیل کے نیلے پانیوں کی وسیع چادر بچھی تھی مگر یہ فاصلے بڑھاتی نہ تھی بلکہ کم کرتی محسوس ہوتی تھی۔ ہمارے اور ان بلند عمارتوں کے بیچ جھلمل کرتے پانی تھے جس پر ڈھلتے سورج کی کرنیں منعکس ہو کر ہمیں سیاہ چشمے پہننے پر مجبور کرتی تھیں۔ پانی کی سطح پر بوٹس اور بجرے حرکت میں تھے یا ساکن۔ جس حالت میں بھی تھے وہ منظر میں ٹھہر سے گئے تھے۔ آسمان نیلا شفاف اور چمکدار جس کے نیچے ''سی گل'' غوطہ زن تھے۔ ہمارے دائیں جانب نیچے بچھی جہاں کی خشک اور گیلی ریت پر انسانوں کے ہمراہ پرندے بھی ترنگ میں بیٹھے نظر آتے تھے۔

عمارتوں سے پرے دائیں جانب دور کہیں اشارہ کرتے ہوئے نسرین بولی۔ ''وہ مقام ادھر ہی تھا جب پہلی بار ہم اکیلے وہاں بیٹھے تھے۔ تم ذرا بے زار سے تھے اور مجھ سے زیادہ پرندوں کو دیکھتے تھے۔''

وہ بیچ زیادہ دور نہ تھی جہاں سردیوں کے بعد ہم چائنا ٹاؤن گھومنے کے بعد آبیٹھے تھے۔ یہ ٹھیک نہ تھا کہ میں اسے نظر انداز کر رہا تھا بلکہ شفاف آسمان تلے اڑتے پرندوں نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

ہم ریلنگ سے ٹیک لگائے اپنے سامنے پھیلے وسیع منظر کو دیکھ رہے تھے۔ اردگرد کا ماحول وہی تھا جو ہم نے اپنے اندر بسایا ہوا تھا۔ یعنی خواتین و مرد اس شاندار منظر میں کھو کر آپس میں باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔

بلندیوں سے زمین کو دیکھنے پر اس کی مسافت کا پتا چلتا ہے اور زمین پر قدم جما کر اسے دیکھنے سے اس پر بسنے والی مخلوق اور اسباب کے بارے میں آگاہی ملتی ہے۔ زمین پر رہنے والے جانداروں اور غیر جانداروں کا قریبی مشاہدہ کریں تو بھید کھلتا ہے کہ سب کس کس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ ربط میں ہیں۔ آپس میں ربط رکھنے کے بعد یہ تمام کس طرح سے ایک نادیدہ قوت کے زیر اثر ہیں۔ وہ قوت نکال دی جائے تو سب ربط بے ربط ہو جائے۔ اسی طرح ایک انسان ہر دوسرے انسان سے ایک ان دیکھی ڈور سے بندھا نظر آتا ہے۔ کسی کے دل و دماغ میں غصہ ہو یا محبت، دونوں کو دوسرا انسان با آسانی محسوس کر جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسرے کو محسوس کرانے کے لیے کوئی زبانی کلمات ادا کرے۔ انسانی حس کسی دوسرے کے اندر اٹھتے ہیجان یا طوفان کا ادراک کر لیتی ہے۔

مجھے نسرین بھی کسی طوفانی لہروں پر ڈولتی نظر آرہی تھی۔ نظریں اس کی جھیل کے نیلے پانیوں پر تھیں اور میری نظریں اس کی جھیل جیسی آنکھوں پر۔ جھیل پر بجتی لہروں کا شور اس کے اندر اٹھتے کسی شور سے مدھم محسوس ہوتا تھا۔ وہ سر کا اسکارف سنبھالتے شاید تھک گئی تھی، اسی لیے وہ اب کندھے پر ڈھلکا ہوا تھا۔ پانیوں کی سطح پر سے اٹھتی تیز ہواؤں نے اس کے لمبے سیاہ بالوں کو اپنی زد پر رکھا تو وہ ہواؤں کی سمت بتانے لگے۔ اس نے بالوں کو کئی بل دے کر باندھ دیا اور اسکارف تلے ڈھانپ کر ٹھوڑی تلے گانٹھ لگا دی۔ میں اسے متواتر دیکھے جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ اس نے تھام لیے اور فرط جذبات سے پوچھنے لگی۔ ''واقعی مجھ سے شادی کرو گے؟''

''میرے کہنے کا یقین نہیں تم کو؟''

''اسی یقین نے تو مجھے دہلا دیا ہے۔'' پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ''اپنی بیوی سے تو تم بہت پیار کرتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''بہت زیادہ تم کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔''

''ہم دونوں میں سے کس کو زیادہ چاہتے ہو۔'' اس نے اپنی جانب سے بڑا مشکل سوال مجھ سے پوچھا۔

''اپنی بیوی سے۔'' بغیر ہچکچاہٹ کے میں نے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی میرے سینے سے آ لگی۔ ''اتنا بڑا سچ آسانی سے کیسے بول لیتے ہو؟'' کراہ کر بولی۔

میں اس کا سر سہلاتے ہوئے بولا۔ ''بڑا سچ تو ہمیشہ بڑی آسانی سے بولا جا سکتا ہے۔''

مجھ سے علیحدہ ہو کر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں راضی ہوں، مجھے اپنا لو۔''

میں ہنس پڑا۔ اس سے بولا۔ ''جب تم کہو جس دن کہو اسی دن اپنا لوں گا۔''

''میرا ایک کہنا پہلے مانو، بیوی بچوں کو امریکا نہیں بلکہ سیدھا اپنے ہاں بلاؤ۔ وہ آجائیں تو ایک دو ماہ میں ہم شادی کر لیں گے۔''

میں واقعی حیران ہوگیا۔ پوچھا۔ ''یہ شرط کیوں رکھی؟''

(جاری ہے)

www.PakiBooks.Site

باعث افتخار

افتخار مجاز

ہر ایک کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات ضرور ہوتے ہیں جو کبھی محو نہیں ہوتے۔ ذہن و دل پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ انہیں بھلانے کی لاکھ کوشش کی جائے پھر بھی یاد آجاتے ہیں۔ اگر وہ واقعہ اعزاز نما ہو تو پھر وہ یاد آکر گویا احسان کر جاتے ہیں۔ جنگ ستمبر میں افواج پاکستان کے دوش بدوش ریڈیو پاکستان نے بھی جنگ لڑی تھی۔ قوم کو بیدار رکھنے میں اس نے جو کارنامے انجام دیئے انہیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ زیر نظر یہ مختصر سی تحریر اپنے اندر بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے۔

...دار کی زبانی جنگ ستمبر کی کہانی

9/11 کو امریکا میں Twin Towers کی تباہی اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ صورت حال کے باعث ماہ ستمبر کو ستم گر، یا پھر ستم گر ستمبر کہا جاتا ہے لیکن ہماری قومی زندگی میں ستمبر کے دو اور حوالے بھی بے حد اہم اور یادگار ہیں، جن میں سے ایک بانی پاکستان بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی رحلت ہے اور دوسرے جنگ ستمبر 1965ء کے وہ سترہ دن ہیں جب 6 ستمبر کو شروع ہونے والی پاک بھارت جنگ جو دراصل بھارت کی مذموم جارحیت تھی ہمیں ایک گروہ اور ہجوم سے ایک قوم بنا گئی، مگر المیہ یہ ہے کہ جنگ ستمبر کے 17 دنوں میں اہل پاکستان میں جو یک جہتی، ہم آہنگی، رواداری اور محبت و ایثار کے ساتھ ساتھ جب الوطنی اجاگر ہوئی وہ ان سترہ دنوں کے بعد آج تک ہمارے ہاں دوبارہ نظر نہیں آسکی۔ جنگ ستمبر، 1965ء کے دنوں میں راقم چھٹی جماعت کا طالب علم اور لاہور میں دریائے راوی کے اس پار شاہدرہ ٹاؤن کی تاریخی بستی کا مکین تھا۔ یقیناً راقم السطور کی عمر اس وقت 11/12 برس تھی، میڈیا کا بھی آج کی طرح اتنا

www.PakiBooks.Site

Exposure نہیں تھا مگر اس کے باوجود میری یادوں میں جنگ ستمبر کے بے شمار واقعات محفوظ ہیں، ضمناً میں یہ تذکرہ بھی کرتا چلوں کہ شاہدرہ کی بستی جنگی اور دفاعی اعتبار سے بھی بے حد اہم ہے اور تھی، کیونکہ شاہدرہ اور لاہور شہر کے درمیان دو پل (تب ایک ریلوے اور دوسرا روڈ کا پل تھا بہت بڑا پاور

اسٹیشن، لاتعداد صنعتی ادارے اور اہم تنصیبات تھیں، چنانچہ ان کی حفاظت کے لیے علاقہ میں مختلف مقامات پر فوج کی طرف سے بے شمار اینٹی ایئر کرافٹ گنز اور توپیں وغیرہ نصب کی گئی تھیں کہ پلوں، پاور اسٹیشن اور دیگر اہم تنصیبات کو نشانہ بنانے اور تباہ کرنے کے لیے انڈین ایئر فورس یہاں بار بار اٹیک کرتی تھی، پھر شاہدرہ سے 20/22 میل دور ہی تو واہگہ کا بارڈر تھا۔ جہاں جنگ کا میدان لگا ہوا تھا، ہم علاقہ میں تعینات فوجی جوانوں کی خدمت کے لیے صبح شام ان کے پاس جاتے انہیں گھر سے لایا ہوا کھانا Serve کرتے، علاقہ کے بازار سے سگریٹ اور دوسری چیزیں لا کر دیتے، کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ہماری وہاں موجودگی کے دوران فضائی حملہ ہو گیا۔ فوجی جوان ہمیں بھاگ کر مورچوں میں پناہ لینے کا کہتے اور خود اپنی اینٹی ایئر کرافٹ گنز سے بھارتی فضائیہ کو بھاگنے پر مجبور کر دیتے۔ جہاں ان گنز کی تڑتڑ سے فضاء میں ایک عجیب ارتعاش پیدا ہوتا وہاں اس دوران فوجی جوانوں کے نعرۂ تکبیر سے فضا گونج اٹھتی۔ بھارتی فضائیہ کے بھگوڑوں کی واپسی یا تباہی کے بعد جب حالات نارمل ہو جاتے، خطرہ ٹل جاتا، تو فوجی بھائی ہمیں گھومنے والی اینٹی کرافٹ گنز میں بٹھا کر باقاعدہ جھولے دیتے۔ جنگ ستمبر کی دلچسپ یادگار باتوں اور واقعات کا ایک بڑا خزینہ میرے حافظے میں موجود ہے جو یقیناً کسی آئندہ نشست میں شیئر کروں گا۔ یہاں میں

صرف جنگ ستمبر کے حوالے سے ہر سال منائے جانے والے یوم دفاع کے موقع پر اپنے عرصہ ملازمت پاکستان ٹیلی وژن کے دوران کیے گئے خصوصی پروگرامز کی کچھ ناقابل فراموش باتیں آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر کروں گا۔

جب 1980ء میں، میں نے پی ٹی وی جوائن کیا اس

وقت پاکستان میں صرف ایک ہی ٹی وی چینل تھا جو اپنی روزانہ 5/6 گھنٹے کی نشریات میں نیوز، کرنٹ افیئرز، ڈراما، میوزک اور عمومی دلچسپی کے پروگرام پیش کرتا تھا۔ اس عرصہ میں ہماری خصوصی دلچسپی رہی کہ اہم قومی دنوں کے بارے میں خصوصی

رپورٹس اور پروگرامز بھی پیش کیا جائے، پاکستان میں پرائیویٹ نجی ٹی وی چینلز آنے کے بعد جب پاکستان ٹیلی وژن میں نیوز چینل کا اجرا کر کے شعبہ حالات حاضرہ کے پروڈیوسرز کو اس کے لیے مخصوص اور مختص کر دیا گیا تو لاہور سینٹر سے یوم دفاع پاکستان کے زیادہ تر پروگرامز میرے ہی کریڈٹ پر آتے رہے۔ مجھے جو پہلا پی ٹی وی ایوارڈ ملا وہ یوم دفاع کے حوالے سے میرے ایک خصوصی پروگرام کی پروڈکشن پر ہی تھا۔ متذکرہ ایوارڈ کے حوالے سے منعقدہ خصوصی تقریب کا احوال بھی بہت دلچسپ اور یادگار ہے۔ میرے متذکرہ پروگرام جس کی بناء پر مجھے ایوارڈ کا حق دار قرار دیا گیا کے شرکاء میں معرکہ لاہور کے ہیرو کرنل شفقت بلوچ، گروپ کیپٹن سیسل چوہدری، شاعر منیر نیازی، دانشور

اعزاز احمد آذر اور معروف وقائع نگار و صحافی عنایت اللہ مرحوم اور ریاض بٹالوی مرحوم تھے۔ بہرحال جب میں ایوارڈ (تب ایوارڈ جیتنے والے کا اعلان تقریب تقسیم ایوارڈ سے پہلے ہی کر دیا جاتا تھا) وصول کرنے کے لیے ہال میں پہنچا اور ایک نظر مہمانوں پر ڈالی پھر کہا کہ مجھے کسی ایسے ویسے شخص سے ایوارڈ میرے ہاتھوں دلوانے کی بجائے کسی پڑھے لکھے شخص کے ہاتھوں دلوایا جائے اور اگر ایسا نہ کیا تو میں ہال میں موجود ہونے اور نام پکارے جانے کے باوجود اسٹیج پر ایوارڈ وصول کرنے نہیں آؤں گا۔ چنانچہ میری دھمکی کام کر گئی اور مجھے ایوارڈ دینے کے لیے مجھ سے پہلے جنگ ستمبر کے ہیرو گروپ کیپٹن (ر) سیسل چوہدری کو دعوت دی گئی جو ایک ممتاز ماہر تعلیم اور بڑے تعلیمی ادارے کے پرنسپل بھی تھے، یوں میں نام پکارے جانے پر اسٹیج پر پہنچا، سیسل چوہدری نے حسب روایت مسکرا کر پُرتپاک مصافحہ کیا جب وہ میرے ہاتھوں میں ایوارڈ تھما رہے تھے تو میں نے ان سے پوچھا کیا آپ کو معلوم ہے کہ مجھے یہ ایوارڈ کس پروگرام کی پروڈکشن پر دیا جا رہا ہے؟

سیسل نے نفی میں جواب دیا تو میں نے بتایا کہ یہ جنگ ستمبر کے حوالے سے وہ پروگرام تھا جس میں آپ بھی شریک تھے تو انہوں نے جذباتی ہو کر مجھے گلے لگا لیا اور پھر میرا ماتھا چوم کر روسٹرم پر آ کر حاضرین سے کہنے لگے۔ عموماً ایوارڈ لینے والے کا اعزاز ہوتا ہے کہ وہ کس کے ہاتھوں ایوارڈ

وصول کر رہا ہے مگر مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ دفاع وطن کے ایک سپاہی کو یہ اعزاز ملا ہے کہ اس نے ہر برس

[illegible]

[illegible] نشان حیدر میں ڈراما [illegible] عزیز بھٹی صاحب کا کردار ادا کرنے والے ناصر شیرازی [illegible] سے واقف تھے۔ میری ان سے دوستی کا آغاز 1973ء میں جناب اثر چوہان اور عاشق جعفری کے [illegible] سیاست میں کام کے [illegible] ایک [illegible] میں منیجر کے طور پر کام کرتے تھے۔ 1983ء میں، میں نے ان کا باقاعدہ آڈیشن [illegible] کے پروگرامز میں بطور میزبان [illegible] متعارف کرایا۔ ناصر شیرازی کی اٹھان، چہرہ مہرہ، [illegible] Up to the mark تھی [illegible] پروگرام چل نکلے۔ پی ٹی [illegible] اور خالد محمود ربانی مرحوم [illegible] مجھے مجبور کیا کہ میں [illegible] علی الترتیب انہیں [illegible] مگر پی ٹی وی کی روایات اور [illegible] کے مطابق جنرل منیجر جناب محمد نثار حسین نے مجھے [illegible] Handing over سے منع کیا اور کہا کہ شیرازی [illegible] اس لیے جب تک وہ تمہارے [illegible] حاضرہ کے پروگرامز میں بطور میزبان Appear [illegible] تم اس کی مطلق اجازت نہ دو، خواہ ناصر کی Demand کرنے والے تمہارے کتنے ہی سینئر اور قابل احترام کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ جناب یاور حیات اور جناب خالد محمود ربانی کے بار بار اصرار کے باوجود میں نے جی ایم صاحب کی [illegible] کو ہر مرتبہ انکار کر دیا۔ اس واقع کے [illegible] پی ٹی وی سے نشان حیدر ڈراما سیریز شروع ہوئی [illegible] کو تفویض کیا گیا، اصغر ندیم سید [illegible] جاندار اسکرپٹ لکھا ڈراما کی [illegible] شعیب منصور صاحب کو دی گئی، جوان [illegible] ہو کر لاہور آئے تھے مگر وہ کراچی [illegible] کوششوں میں تھے اس لیے [illegible] نشان حیدر، عزیز بھٹی شہید کی پروڈکشن کی [illegible] انکار کر دیا۔ چنانچہ یہ ڈراما پروڈیوس کرنے [illegible] اقبال قریشی دوست، شاعر اور دفتر میں [illegible] سلیم طاہر کے کندھوں پر ڈال دی گئی۔ ابتداء

میں سلیم طاہر بھی یہ بھاری پتھر اٹھانے پر آمادہ نہ تھے مگر جنرل منیجر محمد نثار حسین جو کہ خود ڈراما پروڈکشن کا بڑا حوالہ تھے نے سلیم طاہر کی ایک نہ سنی اور سلیم طاہر کو یہ ڈراما نشان حیدر عزیز بھٹی شہید پروڈیوس کرنے پر قائل کر ہی لیا۔ پروڈیوسر کے انتخاب کے بعد اگلا بڑا مرحلہ عزیز بھٹی شہید کا کردار ادا کرنے کے لیے آرٹسٹ کا چناؤ تھا۔ ضرورت یہ تھی کہ جس آرٹسٹ کا انتخاب اس کردار کے لیے ہو وہ چہرہ مہرہ سے بھٹی صاحب شہید سے مماثلت بھی رکھتا ہو اور فوجی MANNERS، ادب، رکھ رکھاؤ، چال ڈھال سے بھی متعارف ہو۔ بھٹی صاحب کے کردار کی ادائیگی کے لیے آرٹسٹ کی تلاش جاری تھی کہ ایک روز جناب محمد نثار حسین جنرل منیجر لاہور سینٹر نے مجھے بلوایا، میں ان کے دفتر میں حاضر ہوا تو خلاف معمول کافی پلوائی اور دوران گفتگو ان مشکلات کا تذکرہ کیا جو انہیں عزیز بھٹی شہید کے حوالے سے ڈراما کے لیے آرٹسٹ کی تلاش کے ضمن میں درپیش رہیں۔ پھر کہنے لگے تمہیں بے حد خوشی ہوگی کہ بھٹی صاحب کا کردار ادا کرنے کے لیے میں نے تمہارے کمپیئر ناصر شیرازی کو منتخب کر لیا ہے کہ اس کی شکل وصورت اور Cuts عزیز بھٹی سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ بات وہی نثار صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے جنہوں نے جناب یاور حیات اور جناب محمود ربانی کے بار بار Request کرنے کے باوجود مجھے اپنی Discovery انہیں Hand Over کرنے سے واضح طور پر منع کیا تھا۔

میں جنرل منیجر اور وہ بھی محمد نثار حسین جیسے سخت ایڈمنسٹریٹر کو وہ قصہ نہ یاد دلا سکا جب مختلف مواقع پر انہوں نے کن لفظوں اور کس لہجے میں اپنی Discovery اور Product دوسروں کو دے کر خود تہی دامن ہو جانے سے منع کیا تھا تاہم جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ ناصر شیرازی کی فیملی بیک گراؤنڈ ہی فوجی نہیں وہ خود بھی فوج میں رہ چکا ہے تو انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں فوری طور پر ناصر شیرازی کو ان سے ملواؤں۔ بہرحال یہ ڈراما سیریز نشان حیدر کے عزیز بھٹی شہید کے کردار کے لیے ناصر شیرازی کے انتخاب کی کہانی تھی۔ سلیم طاہر اس ڈراما کی پروڈکشن کے آغاز میں کچھ ڈرے ہوئے اور اتنی بڑی اسائنمنٹ ملنے پر ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے انہوں نے شبانہ روز محنت سے اس ڈراما کی پروڈکشن کو ایک شہکار بنا دیا اور پھر اسی ڈراما کی کامیاب پروڈکشن پر وہ پی ٹی وی کے صف اوّل کے صاحب طرز ڈراما پروڈیوسر بنے اور

www.PakiBooks.Site

بعدازاں ڈراما سیریز نشان حیدر کا یہ ڈراما عزیز بھٹی پروڈیوس کرنے پر انہیں جو اعتماد، نام اور وقار حاصل ہوا اس کی بناء پر انہوں نے پی ٹی وی سے کئی یادگار سیریز اور سیریل پیش کیے مگر اب ان کی پہچان کا حوالہ ان کا مقبول پروگرام میں اور آپ اور یہ ڈراما نشان حیدر عزیز بھٹی شہید ہی ہے اور رہی بات ناصر شیرازی کی تو اتنے برس گزر جانے کے باوجود ناصر جہاں کہیں بھی جاتے ہیں لوگ انہیں پہچان لیتے ہیں مگر کوئی ان کے اصلی نام سے واقف نہیں ہوتا، انہیں ہمیشہ عزیز بھٹی ہی کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ جو بجا طور پر ناصر شیرازی کا اعزاز تو ہے ہی مگر ناصر اسے اپنی اعلیٰ ظرفی کی بنا پر ہمیشہ میرے کھاتے میں ڈالتے ہوئے اکثر کہتے ہیں کہ اگر افتخار مجاز مجھے کرنٹ افیئرز کے پروگرامز کے لیے بطور کمپیئر متعارف نہ کراتے تو آج مجھے عزیز بھٹی شہید کا کردار ادا کرنے کا اعزاز حاصل نہ ہوتا۔

نشان حیدر ڈراما سیریز کے حوالے سے عزیز بھٹی شہید پر بنائے گئے کھیل کا تذکرہ کرتے ہوئے عزیز بھٹی شہید پر بنائی جانے والی دستاویزی (ڈاکومنٹری) فلم کی یاد بھی آ گئی ہے، اس دستاویزی فلم کا اسکرپٹ آج کے معروف کالم نگار اور سابق وزیراعظم نواز شریف کے معاون خصوصی عرفان صدیقی نے لکھا تھا۔ عرفان صاحب غالباً ان دنوں کھاریاں کے کسی کالج میں پڑھاتے تھے اور انہوں نے آئی ایس پی آر کی معاونت، راہنمائی اور مشاورت سے یہ اسکرپٹ مکمل کیا تھا۔ یہ اسکرپٹ واقعتاً ہر اعتبار سے ایک Well Netted اور Comprehensive اسکرپٹ تھا۔ جسے ٹیلی ویژن کی تکنیک کو ملحوظ رکھ کر لکھا گیا تھا۔ دلچسپ اور یادگار بات یہ ہے کہ Vetting کے نقطہ نظر سے بار بار پڑھے جانے کے باوجود اس میں قطع و برید، ایڈیٹنگ کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس دستاویزی فلم کی پروڈکشن کی ذمہ داری شعبہ حالات حاضرہ کے سینئر پروڈیوسر ضیاء الرحمٰن امجد (مرحوم) کو دی گئی۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اس دستاویزی فلم کی تیاری اور پروڈکشن کے دنوں میں ضیاء الرحمٰن اور میں روم میٹ تھے اور اس سے پیشتر لاتعداد پروگرامز اور اسائنمنٹس مشترکہ طور پر مکمل کر کے آن ایئر کر چکے تھے۔

چنانچہ ضیاء الرحمٰن کی یہ دلی خواہش تھی کہ انہیں دی جانے والی اس دستاویزی فلم کی پروڈکشن میں کو، یا ساتھی پروڈیوسر کے طور پر کام کروں کیونکہ پروگرامز پروڈکشن کے حوالے سے ہم دونوں میں بے حد ہم آہنگی اور ذہنی مطابقت تھی۔ ویسے بھی

جوائنٹ پروڈکشن میں Work Load تقسیم اور شیئر ہو جاتا ہے اور وہ جو کہتے ہیں ناں کہ ایک ایک اور دو گیارہ تو اس کے مصداق Cross Check اور کوالٹی Inhance کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ مگر تب ہمارے شعبہ کے سربراہ ضیاء الرحمٰن امجد کی بار بار گزارشات کے باوجود مجھے پروڈکشن ٹیم میں شامل کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ جس سے ضیاء الرحمٰن کو کمیشن اور ڈیپریشن بھی ہوا مگر صدر شعبہ نہ جانے کیوں اپنے فیصلے پر ٹکے رہے شاید وہ (مرحوم) ضیاء الرحمٰن کو لٹ نائم دے کر کسی گزشتہ گستاخی کا بدلہ لینا چاہ رہے تھے۔ اس صورت حال اور صدر شعبہ کے فیصلے نے ڈیپارٹمنٹ کے ماحول کو کافی کشیدہ کر دیا تھا۔ تاہم میں نے ضیاء الرحمٰن کو یقین دلایا کہ وہ اس اہم اسائنمنٹ کی پروڈکشن میں خود کو اکیلا نہ سمجھیں میں ہمہ وقت Un-officially ان کے ساتھ ہوں گا اور جہاں جہاں میری بحیثیت پروڈیوسر، ڈائریکٹر مشاورت کی ضرورت ہوگی صرف وہیں نہیں بلکہ دوران شوٹنگ، ایڈیٹنگ اور Mixing ان کے شانہ بشانہ ہوں گا۔ چنانچہ پھر ایسا ہی ہوا میں نے اس دستاویزی فلم کے لیے Vider Research اور Search کا کام سنبھال لیا۔ جو کہ ظاہر ہے کہ پی ٹی وی کی بلڈنگ کے اندر ہی سے ہونا تھا۔ مگر یہ ایک مشکل اور پریشان کر دینے والا عمل تھا کہ 1965ء کی جنگ سے متعلقہ اور ضروری شاٹس کی Selection مختلف مواقعوں پر ہونے والی معمولی جنگی مشقوں اور پروڈیوسر سلیم طاہر کے ڈراما میجر عزیز بھٹی شہید کے لیے فلمائے گئے خصوصی مناظر سے منتخب اور ضروری Frame کا ایک لوپ تیار کرنا تھا جو فلم کی فائنل ایڈیٹنگ کے دوران ریڈی میڈ Shape میں دستیاب رہتا۔

دو ایک مرتبہ اس دستاویزی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے میں نے جناب ضیاء الرحمٰن کو آفر بھی دی کہ میں ان کے ہمراہ معاونت کے لیے جانا چاہتا ہوں مگر وہ اس امر پر آمادہ نہ ہوئے، انہیں خدشہ تھا کہ اگر اس فلم کی پروڈکشن میں "باس" کو ہماری مشترکہ کاوشوں کا علم ہو گیا تو وہ کوئی اور مسئلہ نہ کھڑا کر دیں اس لیے مجھے کہا گیا کہ میں خود کو Indoor کاموں کے لیے ہی مختص رکھوں کہ کہیں "باس" کی ناراضی انہیں میری اس معاونت سے بھی محروم نہ کر دے۔ تاہم جب یہ ڈاکومنٹری فلم مکمل ہو کر Boss کے روبرو Previewing یا سنسر کے لیے پیش

www.PakiBooks.Site
FATIMA TRADER KHEWRA فاطمہ ٹریڈر کھیوڑہ
سالٹ کرافٹ، جسم اور پلاسٹر آف پیرس
خوردنی سالٹ اور سالٹ کرافٹ کی سیل کے لیے امریکہ، یورپ، کینیڈا، چائنہ، کوریا، انڈیا اور دنیا بھر سے ڈسٹری بیوٹرز کی ضرورت ہے۔ یہ دمہ کے مریضوں، کیمیکلز، کپڑا، چمڑا، پیپر سازی اور صرف و غیرہ بنانے کے کام آتا ہے۔
پلاسٹر آف پیرس جو کہ تعمیرات، سیلنگ، سرامکس فیکٹریوں، سرجری اور دندان سازی میں استعمال ہوتا ہے کی سیل کے لیے میرپور، جہلم، گوجرانوالہ لاہور، سیالکوٹ، سرگودھا، فیصل آباد، ملتان اور بہاولپور وغیرہ سے
ڈسٹری بیوٹرز کی ضرورت ہے۔
ملک فرحت 03421820579
www.fatimatrader.com

www.PakiBooks.Site

کی گئی تو وہ اس کی پروڈکشن تکنیک کوالٹی، شاٹ ڈویژن، ڈاکومنٹری، زبان بیان، تلفظ، ادائیگی Stresses Pauses سے بہت متاثر اور خوش ہوئے کہیں کسی جگہ پر کوئی بے ترتیبی یا بے جا طوالت پر مبنی منظر نظر نہیں آیا چنانچہ جذباتی ہو کر اپنی سیٹ سے اٹھے اور ضیاء الرحمٰن امجد کو گلے لگاتے ہوئے داد اور شاباش دی مگر ساتھ ہی ایک اعتراض بھی جڑ دیا کہنے لگے ضیاء صاحب آپ کی اس پروڈکشن میں افتخار رجاز جس طرح Involve رہا ہے آپ کو چاہیے تھا کہ فلم کی پروڈکشن میں جوائنٹ پروڈیوسر کے طور پر ان کا نام بھی دیتے۔ Boss کے ان ریمارکس پر ہم دونوں ضیاء الرحمٰن اور میں ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھ کر زیر لب مسکرائے مگر Boss نے کہا کہ مجھے معلوم تھا کہ آپ دونوں مل کر یہ اہم دستاویزی فلم مکمل کر رہے ہیں مگر مجھے T.V کے کسی بڑے کا حکم تھا کہ یہ بھاری پتھر صرف ضیاء الرحمٰن کو ہی چومنے دیا جائے، چنانچہ میں نے Officially تو آپ دونوں کو یکجا ہو کر کام نہ کرنے دیا مگر جب آپ باہم مل کر کام کر رہے تھے تو بالائی حکم کے باوجود کوئی رخنہ اندازی نہ کی۔ اس کے بعد یہ دستاویزی فلم ISPR کو Approval کے لیے بھجوائی گئی۔ عرفان صدیقی تو ہمہ وقت ہمارے ساتھ ہوا ہی کرتے تھے چنانچہ یہ فلم ISPR سے بھی OK ہو گئی تو عرفان صدیقی نے ہمیں یہ اطلاع دیتے ہوئے مبارکباد بھی پیش کی۔ چنانچہ تب سے اب تک یہ دستاویزی فلم لاتعداد مرتبہ پی ٹی وی سے آن ایئر جا چکی ہے میں نے ایک مرتبہ تجویز پیش کی تھی کہ اس اردو فلم کا انگریزی Version بھی تیار ہونا چاہیے مگر اس زمانے میں پی ٹی وی کے کنٹرولر کرنٹ افیئرز نے یہ تجویز محض اس لیے رد کر دی کہ اسے افتخار رجاز نے Forward کیا تھا تاہم یہ دستاویزی فلم پی ٹی وی کا ایک قیمتی اثاثہ ہے جس کی تخلیق میں اسکرپٹ رائٹر عرفان صدیقی اور اس کے Official پروڈیوسر ضیاء الرحمٰن امجد کا خون جگر صرف ہوا۔ اس دستاویزی فلم کے مصنف کے طور پر عرفان صدیقی سے جو تعارف ہوا وہ رفتہ رفتہ بے تکلفی اور گہرے تعلقات میں تبدیل ہوتا گیا اور اب صورت یہ ہے کہ چاہے عرفان صاحب سے لمبے لمبے وقفوں کے بعد ملاقات ہو، وہی محبت اور گرم جوشی ہم دونوں کے حصے میں آتی ہے۔ جو تسلسل سے ملاقاتوں کے دنوں میں باہم ہوا کرتی تھی۔

اب لگے ہاتھ جنگ ستمبر اور یوم دفاع پاکستان کے حوالے سے دو دلچسپ باتیں بھی ہو جائیں، بی بی بینظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں یوم دفاع کا خصوصی پروگرام پیش کرنے کے لیے اس جنگ کے شرکاء کو میں بارڈر ایریا میں لے گیا اور وہاں جا کر ان کے انٹرویوز ریکارڈ کیے، بی آر بی نہر کے کنارے کھڑے ہو کر جب کرنل شفقت بلوچ انٹرویو دے رہے تھے انہوں نے جنگ ستمبر کے پہلے ہی روز یہ دعویٰ کرنے والے بھارتی جرنیل کہ وہ شام کا مشروب (شراب) لاہور جمخانہ میں پئیں گے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ اتنی بڑی سینا کے ساتھ لاہور میں جام پینے کا جو دعویٰ کر رہا تھا میرے جوانوں نے اس سے وہ سلوک کیا کہ وہ چھپڑ (جوہڑ) کا پانی بھی نہ پی سکے۔'' کرنل شفقت نے جب یہ جملے ادا کیے تو مجھے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک نظر آئی جو شاید ان لمحوں کا تسلسل تھی جب انہوں نے بھارتی یلغار کو روک کر لاہور کے محاذ پر بطور میجر خدمات انجام دیں تھیں، جنگ ستمبر کے دوران لاہور کے محاذ پر خدمات انجام دینے والے کرنل (تب میجر) اکرام اللہ جو ماشاء اللہ اب بھی حیات ہیں، سے انٹرویو کے دوران ناقابل فراموش واقعات پوچھے تو کہنے لگے، جنگ ستمبر کے دوران بھارتی ہوائی حملوں کے حوالے سے یہ بات مشہور اور زبان زد عام ہوتی تھی کہ جب بھارتی ایئر فورس کے اہلکار لاہور خصوصاً دریائے راوی کے پلوں پر بم پھینکتے ہیں تو نیچے سے سبز لباس، سفید داڑھیوں اور نورانی چہروں والے بزرگ انہیں Catch کر کے ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ کرنل صاحب کہنے لگے یہ بات اور تاثر جنگی حکمت عملی کا حصہ ہوتی ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ عام لوگ بھارتی فضائی حملوں سے خوف زدہ نہ ہوں اور اب اس حوالے سے حرف آخر، ایک یوم دفاع پر میں نے 6 ستمبر سے 23 ستمبر تک، 17 دن جاری رہنے والی جنگ کے تناظر میں خصوصی پروگرام کا آئیڈیا پیش کیا اور پروگرام کا نام تجویز کیا۔ ''وہ سترہ دن'' اب آپ یہ المیہ ملاحظہ فرمائیں کہ میرے Boss یہ نام پڑھ کر طنزیہ انداز میں مسکرائے اور پھر اس نابغے نے تجویز دی کہ بھلا سترہ کا ہندسہ کیا ہوا۔ اسے آپ سیدھا دس، پندرہ یا بیس دن کریں، میں Boss کا یہ اعتراض سن کر سٹپٹا گیا تاہم جب اسی نام ''وہ 17 دن'' سے میرا یہ پروگرام پروڈیوس ہوا تو یہ بھی PTV ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا۔

www.PakiBooks.Site

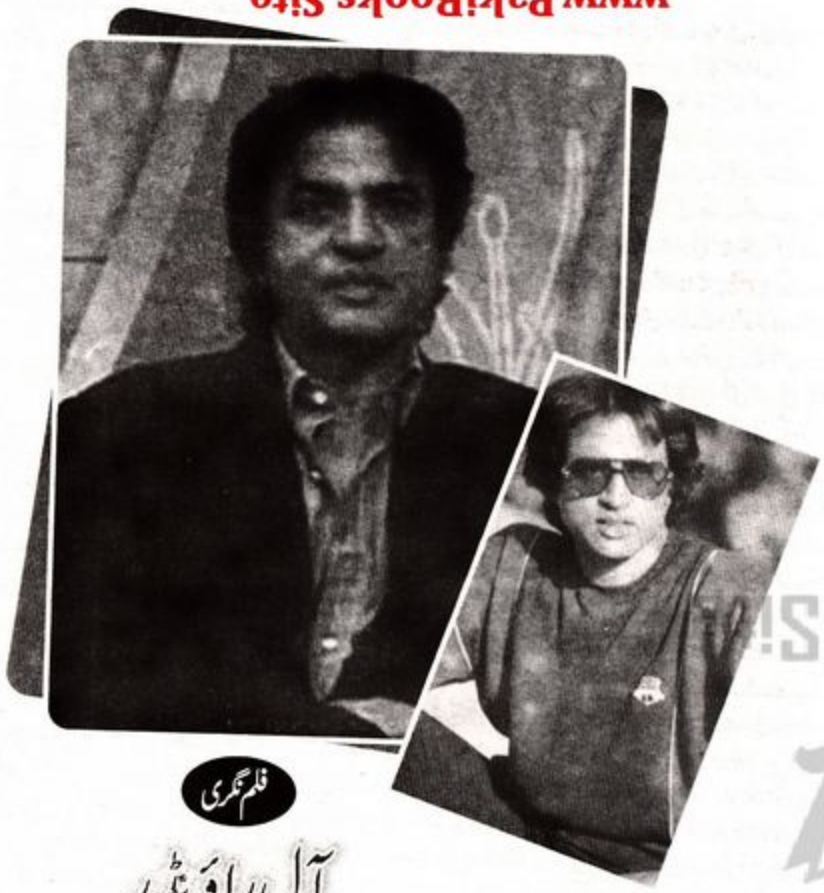

فلم نگری

آل راؤنڈر

انور فرہاد

کسی بھی شعبہ میں اپنا مقام بنانا آسان نہیں ہے۔ اس نے بھی جہد مسلسل کی مثال قائم کی، ہر قسم کے کام کیے اور پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ ہر سُو اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔

پاکستان کے ایک نامور اداکار کی زندگی کا نامہ

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔

جی ہاں یہی قدرت کا نظام ہے۔ جب تک رب راضی نہیں ہوتا تب تک بندے کی کوششیں سود مند نہیں ہوتیں۔ اللہ اس سے راضی ہوتے ہیں جو اس کی رضا پر بھروسا کر کے محنت اور جدوجہد کرتے ہیں۔ اس کی مثال ہماری فلم انڈسٹری میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ فنکار جو شہرت، عزت اور مقبولیت کے آسمان پر چاند سورج بن کر چمکے، انہیں اس کے لیے اپنی ابتدائی زندگی میں بڑی محنت کرنی پڑی، بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ محمد علی، جاوید شیخ اور اکمل جیسے سوپر ڈوپر پرفارمر ایک دم اس مقام پر نہیں پہنچے۔ ابتداء

www.PakiBooks.Site

میں انہیں بڑے پاپڑ بیلنے پڑے لیکن انہوں نے صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اللہ اسی کی مدد کرتے ہیں جو اپنے لیے خود کوشش کرتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت کسی کی محنت رائیگاں جانے نہیں دیتے۔

ایسے ہی ایک پاکستانی فنکار کی جدوجہد اور آگے بڑھنے کی لگن کی کہانی آج آپ کو سناؤں گا، جسے پڑھ کر پڑھنے والوں کو یہ سبق حاصل کرنا چاہیے کہ کچھ کرنے کے لیے، کامیابی حاصل کرنے کے لیے اوّلین شرط یہ ہے کہ محنت کی جائے، جان توڑ محنت کی جائے، محنت سے ہرگز جان نہ بچائی جائے۔

ہمارا آج کا فنکار غلام محی الدین ہے جنہیں ان کے بے شمار چاہنے والے گلو بھائی اور خوش اخلاق غلام محی الدین جیسے پیار کے ناموں سے مخاطب کرتے ہیں۔ ان کا ذکر کرتے ہیں۔ جن کا شمار آج پاکستان کے سینئر فنکاروں میں ہوتا ہے۔ جنہیں ورسٹائل اسٹار سمجھا جاتا ہے۔ جو ہر طرح کے کردار میں اسی طرح ڈھل جاتے ہیں جیسے وہ حقیقتاً یہی ہیں۔ ڈاکو کا رول کریں تو وہ حقیقی ڈاکو لگیں، بگڑے ہوئے رئیس کے کردار میں وہ جدی پشتی بگڑے ہوئے رئیس لگیں۔ وکیل کے روپ میں اسکرین پر نظر آئیں تو پیشہ ور وکیل لگیں۔ رومانوی کردار کریں تو مکمل ہیرو دکھائی دیں۔ مزاحیہ کردار ادا کریں تو ناظرین کے پیٹ میں بل ڈال دیں۔ یہ ہنر، یہ گر، یہ فن ایک دن میں انہیں حاصل نہیں ہوا۔

آیئے ان کی جدوجہد کی کہانی آپ کو سناؤں۔

غلام محی الدین نے اپنے فنی کیریئر کی ابتداء بطور صدا کار ریڈیو سے کی۔ ریڈیو پر ایک پروگرام ''بزم طلباء'' آیا کرتا تھا۔ اس پروگرام میں مختلف اسکولوں اور کالجوں کے طلباء شریک ہوتے تھے۔ اسی پروگرام بزم طلبہ میں ایک ڈراما ''ڈاکٹر فورلیس'' کے نام سے پیش کیا گیا تھا جس میں غلام محی الدین نے پہلی بار صدا کاری کی تھی۔ اس ڈرامے کے پروڈیوسر یاور مہدی نے انہیں چانس دیا تھا۔

ظاہر ہے اس وقت غلام محی الدین طالب علم تھے اس لیے ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ غلام محی الدین سات آٹھ سال کے تھے جب ان کے والد گرامی جناب حاجی غلام محمد حیدرآباد دکن (انڈیا) سے ہجرت کر کے کراچی آئے تھے۔ حاجی صاحب حیدرآباد دکن میں پولیس کے محکمے سے وابستہ تھے۔ کراچی آنے کے بعد انہوں نے ناظم آباد کے علاقے میں رہائش اختیار کی اور غلام محی الدین کو اسی علاقے میں واقع فیڈرل اسکول میں داخل کرایا۔ بعد ازاں انہیں پی ہوم اسکول میں داخل کرا دیا گیا جہاں سے انہوں نے میٹرک پاس کیا اس کے بعد غلام محی الدین نے جناح کالج کراچی میں داخلہ لیا۔ انہوں نے اپنی تمام تر تعلیم کراچی سے ہی حاصل کی اور کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ بی اے کے بعد انہوں نے لاء کالج میں داخلہ لیا۔ کچھ ان کا، کچھ گھر کے بڑوں کا ارادہ تھا کہ وہ وکیل بن کر کامیاب زندگی کا آغاز کریں مگر اکثر ایسا نہیں ہوتا جو بندے چاہتے ہیں۔ ہوتا وہی ہے جو رب کو منظور ہوتا ہے۔ انہیں تو ایک اداکار بننا تھا اس لیے وکالت کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ انہیں شروع ہی سے آرٹ اور فن سے انسیت تھی۔ فنونِ لطیفہ سے لگاؤ تھا اس لیے ان کا رجحان تعلیمی دور سے ہی اداکاری کی طرف تھا اور پھر جب ریڈیو کے پروگرام بزم طلبہ میں انہیں صداکاری کا چانس ملا تو گھر اور بزرگوں سے اجازت لیے بغیر انہوں نے صداکاری شروع کر دی۔

اداکاری میں آواز کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے جو اداکار ریڈیو سے ہو کر اداکاری کے میدان میں قدم رکھتے ہیں، انہیں زیادہ کامیاب اداکار کا درجہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ ریڈیو میں آواز کے صحیح استعمال کی تربیت دی جاتی ہے۔ غلام محی الدین پر چونکہ مولا مہربان تھا اس لیے ان کی ابتدائی فنی زندگی کا آغاز صداکاری سے ہوا۔ ریڈیو پاکستان کراچی میں انہیں بڑے اچھے استاد ملے جن کی رہنمائی میں انہیں اپنی آواز کے صحیح استعمال کا ہنر حاصل ہوا۔

ریڈیو کے بعد اسٹیج وہ جگہ ہوتی ہے جہاں اداکار کو اپنی اداکاری کے ساتھ اپنی آواز کا جادو بھی جگانا پڑتا ہے۔ ریڈیو میں صداکاری کرتے ہوئے جب غلام محی الدین کو خاصی مہارت حاصل ہو گئی تو انہیں شیخ محی الدین چنگیزی نے اپنے اسٹیج ڈرامے ''انسان اور انسانیت'' میں پہلی بار پرفارم کرنے کا موقع دیا اور اپنی آواز کے ساتھ ساتھ اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے بھی متاثر کیا۔ اس کامیابی کے بعد وہ ریڈیو کے ساتھ ساتھ اسٹیج پر بھی نمودار ہوتے رہے اور صداکاری کی طرح اداکاری میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے۔

کب تک گھر والوں کو ان کی غیر نصابی مصروفیات کا پتا نہ چلتا۔ جب معلوم ہوا کہ اظہر میاں ریڈیو اور اسٹیج پر پرفارم کرنے لگے ہیں تو انہیں نکما سمجھا گیا۔

''دیکھو بھئی! ہم تو تمہیں اس لیے لکھا پڑھا رہے ہیں کہ تم کسی قابل ہو کر کامیاب زندگی بسر کرو۔''

''تو میں نے کب لکھنا پڑھنا چھوڑا ہے؟''

''مگر اس طرح تو تعلیم حاصل نہیں کی جاتی۔ یک سوئی کے ساتھ پڑھو گے تب ہی کامیابی حاصل کرو گے نا۔''

''چونکہ صدا کاری اور اداکاری میرا شوق ہے۔'' اظہر میاں بولے۔ ''اس لیے اگر میں اسے ترک کر کے صرف پڑھوں گا تو پڑھائی میں میرا دل نہیں لگے گا۔''

''یہ کیا منطق بیان کر رہے ہو تم؟''

''سچ کہہ رہا ہوں۔ یہی حقیقت ہے مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ تعلیمی سلسلے میں آپ لوگوں کو مایوس نہیں کروں گا۔''

اظہر میاں نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ ان کا تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا اور غیر نصابی سرگرمیاں بھی۔

آپ کہیں یہ تو نہیں سوچنے لگے کہ یہ اظہر میاں کون ہیں اور کہاں سے ٹپک پڑے؟ تو آپ کی حیرانی اور پریشانی ہم دور کیے دیتے ہیں۔ اظہر، غلام محی الدین کا گھریلو نام ہے۔ گھر کے تمام لوگ انہیں شروع سے اب تک اسی نام سے پکارتے اور مخاطب کرتے ہیں۔

گریجویشن کرنے کے بعد تک بلکہ لاء کالج میں داخلہ لینے تک غلام محی الدین جی لگا کر لکھتے پڑھتے رہے اور اپنا ہر امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرتے رہے مگر جب اسٹیج سے جو کرنی وی تک پہنچے اور ان کی اداکارانہ مصروفیات بہت بڑھ گئیں تو انہیں تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور وہ وکالت کی تعلیم مکمل کر کے وکیل نہ بن سکے۔

دوستو! میری کہی ہوئی بات سے یہ نتیجہ اخذ نہ کر لیجیے گا کہ غلام محی الدین کو ٹی وی پر کام آسانی سے مل گیا۔ بھلا ٹی وی والے اتنی آسانی سے کسی نو آموز کو اپنی دنیا میں انٹری دے سکتے ہیں؟ صداکاری اور اسٹیج پر اداکاری کے بعد جب انہیں خیال آیا کہ اب انہیں ٹی وی ڈراموں میں بھی کام کرنا چاہیے تو وہ کئی مہینوں تک مسلسل ٹی وی اسٹیشن کے چکر لگاتے رہے اور ٹی وی والوں کے نامناسب رویے کا سامنا بھی کرتے رہے۔

''جاؤ میاں! کوئی اور کام کرو۔ ہمارے پاس پہلے ہی اداکاروں کی بھرمار ہے۔'' یہ اور ایسے ہی سرد رویوں سے انہیں گزرنا پڑا مگر لگن سچی ہو تو جدوجہد رائیگاں نہیں جاتی۔ نرم گرم حالات کا وہ مقابلہ کرتے رہے کہ کبھی تو انہیں پیار

زندگی نامہ

گھریلو نام: محمد اظہر محی الدین
پیدائش: 2 اکتوبر 1949ء بروز اتوار
مقام ولادت: حیدرآباد دکن (انڈیا)
والد: حاجی غلام محمد
بھائی بہن: تین بہنیں، پانچ بھائی (غلام محی الدین سمیت) ان میں غلام محی الدین کا نمبر تیسرا ہے۔
ہجرت: غلام محی الدین جب سات آٹھ سال کے تھے ان کے والدین دکن سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کراچی کے علاقے ناظم آباد میں رہائش اختیار کی۔
تعلیم: ابتدائی تعلیم فیڈرل اسکول میں حاصل کی پھر پی ہوم اسکول کراچی سے میٹرک پاس کیا، کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔
فنی کیریئر: بطور صدا کار ریڈیو سے ابتدا کی پھر اسٹیج پر اداکاری کی اور ٹی وی تک رسائی حاصل کی۔ ماڈلنگ بھی کی۔ ٹی وی ڈراموں سے متاثر ہو کر فلم والوں نے ان کی خدمات حاصل کیں۔
پہلی فلم: ''دل والے'' تھی جس کے ہدایت کار اداکار ابراہیم نفیس تھے مگر یہ فلم انتہائی سست رفتاری کا شکار رہی اور اس وقت ریلیز ہوئی جب غلام محی الدین کی گیارہ فلمیں نمائش پذیر ہو چکی تھیں۔ نمائش کے لحاظ سے ان کی پہلی فلم ظفر شباب کی فلم شکوہ تھی جو 1975ء کو ریلیز ہوئی۔ ان کی فلموں کی تعداد 247 ہے۔ یہ تعداد ''سوال سو کروڑ ڈالر کا'' تک ہے۔

آئے گا کبھی تو حالات بدلیں گے۔ قدرت بھی ایسے لوگوں کو آزمائش میں ڈال کر ان کا امتحان لیتی ہے۔ جب غلام محی الدین اس آزمائش میں پورے اترے تو ٹی وی کے ایک ڈرامے ''ٹیپو سلطان'' میں ایک مختصر سا کردار مل گیا۔ یہ مختصر سا کردار تھا مگر غلام محی الدین کے لیے بہت اہم تھا کیونکہ یہ اس دور کے سب سے زیادہ نامور ٹی وی پروڈیوسر کنور آفتاب کا ڈراما تھا۔ ٹی وی تک اور پھر کنور آفتاب تک ان کی رسائی ان کے ایک ٹی وی اداکار دوست شکیل چغتائی نے کرائی تھی۔ دوست وہی ہوتے ہیں جو دوستوں کے کام

www.PakiBooks.Site

آتے ہیں۔ چغتائی کو جب معلوم ہوا کہ ریڈیو کا صداکار اور اسٹیج کا اداکار اس کا یار ٹی وی میں انٹری کا طلب گار ہے تو اس نے کہا۔

''تم ٹی وی والوں سے ملے؟ کسی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا؟''

ٹی وی اسٹیشن میں تو کوئی ہم جیسوں کو گھاس نہیں ڈالتا۔ ہم سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا۔ ''جاؤ جاؤ میاں! ہمیں کسی نئے اداکار کی ضرورت نہیں، کہہ کر دھتکار دیتا ہے۔''

''ہاں ایسا یقیناً ہوتا ہوگا کیونکہ ایک انار اور ایک ہزار بیمار والا معاملہ ہے نا۔ ایک ٹی وی چینل اور کام کرنے والے اتنے ڈھیر سارے اداکار۔ ایسے میں نئے اداکاروں کو کون چانس دے گا؟''

''تو میں ٹی وی سے بالکل مایوس ہو جاؤں؟''

''نہیں مایوسی کفر ہے۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔ وہ کوئی سبیل پیدا کر دے گا۔ میں بھی اپنے طور پر کوشش کروں گا۔''

اور اللہ پر بھروسا کرنے والوں کو اللہ کبھی مایوس نہیں کرتے۔ شکیل چغتائی کوئی بہت بڑا اور بااثر اداکار نہیں تھا مگر اس کے کہنے سے کنور آفتاب صاحب نے غلام محی الدین کو ایک مختصر سا کردار اپنے ڈرامے ''نیپو سلطان'' میں دے ہی دیا۔

ریڈیو ہو، اسٹیج ہو، ٹی وی ہو یا فلم کسی بھی جگہ کسی نئے فرد کی پہلی انٹری ہی دشوار ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس کے لیے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اگر اس میں فنی خوبی ہوتی ہے تو وہ دوسروں کو متاثر کرتا ہے اور اپنے لیے آگے جگہ بناتا ہے۔ ہمارے گلو بھائی ابتداء ہی سے ایک ذہین اور اچھی سوجھ بوجھ رکھنے والے پرفارمر تھے۔ ریڈیو پر گئے تو اپنی صلاحیتوں سے متاثر کر کے وہاں اپنی جگہ بنالی۔ اسٹیج پر نمودار ہوئے تو وہاں سرخرو ہوئے اور اسٹیج والے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے لگے۔ ٹی وی ڈرامے میں پرفارم کیا تو اپنے مختصر کردار میں بھی ٹی وی والوں کو باور کرایا کہ وہ باصلاحیت ہیں۔ ان میں اداکارانہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ ابتداء میں انہیں مختصر اور چھوٹے موٹے کردار ملتے رہے۔ جنہیں وہ جی لگا کر اور محنت و لگن کے ساتھ کرتے رہے اور متاثر کرتے رہے پھر زیادہ بڑے اور اہم کردار ملنے لگے اور اس صورت میں بھی انہوں نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ پروڈیوسر بھی ان کے کام سے مطمئن ہوئے اور ناظرین نے بھی انہیں پسند کیا۔

ایسے ڈراموں میں کشکول، انسان اور آدمی، پڑوسی، بڑا آدمی، خالق، خدا کی بستی، سکون، مہربان کیسے کیسے، انار کلی، کتنی آنکھیں کتنے خواب، صاحب بی بی غلام، ممی، روشن تارا، تیز تر گامزن، بہادر، سورج کے داغ اور ضمیر کا قیدی شامل ہیں۔

''ضمیر کا قیدی'' مولانا محمد علی جوہر پر انگریزوں کے دور میں خالق دینا ہال کراچی میں چلنے والے مقدمہ پر ڈراما بنایا گیا تھا۔ اس ڈرامے میں نامور اداکار منور سعید نے مولانا محمد علی جوہر کا کردار بڑی خوبی سے نبھایا تھا جب کہ غلام محی الدین کا کردار اس ڈرامے میں بھی مختصر سا تھا۔ وہ پولیس کے ایک سپاہی کے روپ میں پیش ہوئے تھے جو عدالت کے باہر کندھے پر بندوق رکھے گھومتا رہتا ہے۔

پروڈیوسر ڈائریکٹر کنور آفتاب کے ڈرامے ''ٹیپو سلطان'' میں مختصر کردار سے ٹی وی کی دنیا میں متعارف ہونے والے غلام محی الدین نے اپنے ابتدائی دور میں ہدایت کار محسن شیرازی کے ڈرامے ''انسان اور آدمی'' ہدایت کار کنور آفتاب کے ایک اور ڈرامے ''بڑا آدمی'' اور ہدایت کار قاسم جلالی کے ڈرامے ''پڑوسی'' میں ثانوی سے کردار ادا کیے تھے جب کہ ''ممی'' نامی ڈرامے میں انہوں نے قدرے بہتر کردار ادا کیا تھا۔ اس ڈرامے میں خالدہ نامی ایک ٹی وی آرٹسٹ نے ان کے مقابل ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ ''ممی'' کے ڈائریکٹر کنور آفتاب تھے۔ ''خالق'' میں بھی ان کا کردار واجبی سا تھا۔ البتہ ہدایت کار قاسم جلالی کے ڈرامے ''کتنی آنکھیں کتنے خواب'' میں غلام محی الدین نے بڑی عمدہ اور یادگار پرفارمنس دی اور یوں لوگوں کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنالی۔ اس ڈرامے کی شہرت اور ان کے کردار نے ان کے لیے فلم انڈسٹری کے دروازے بھی کھول دیئے۔

اس دوران غلام محی الدین نے اسٹیج کے ایک نئے ڈرامے ''داماد اپنی پسند کا'' میں بھی کام کیا۔ اس ڈرامے کے ڈائریکٹر صمد یار خان تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ہدایت کار ظہور احمد کے اسٹیج ڈرامے ''لہو کا رنگ'' میں بھی کام کیا۔

ٹی وی ڈراموں میں کام کے دوران غلام محی الدین نے ماڈلنگ بھی کی۔ بطور ماڈل انہوں نے ایک ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار میں کام کیا جب کہ وہ ایک ٹریژر نامی گھڑی کے

www.PakiBooks.Site

اشتہار میں بھی وارد ہوئے۔

ٹی وی ڈرامے ''کتنی آنکھیں کتنے خواب'' کے بعد غلام محی الدین نہ صرف ٹی وی ناظرین کی نظروں میں آ گئے بلکہ فلم ساز و ہدایت کار شباب کیرانوی کی نظر بھی ان پر جم گئی لیکن ان ہی دنوں اداکار ابراہیم نفیس بھی بطور ہدایت کار اپنی پہلی فلم ''دل والے'' بنا رہے تھے چونکہ بدر منیر اور اداکارہ یاسمین خان اپنی پہلی پشتو فلم ''یوسف خان شیر بانو'' کی ملک گیر کامیابی سے خاصے مشہور ہو چکے تھے اس لیے ہدایت کار ابراہیم نفیس نے ان دونوں کو اپنی فلم ''دل والے'' میں بطور ہیروئن کاسٹ کر لیا۔ جب کہ اس فلم میں غلام محی الدین کو ایک بہادر شخص کے کردار میں لیا گیا تھا۔ فلم کے ہیرو بدر منیر کا کردار ایک ایسے مفرور شخص کا تھا جو غلام محی الدین کے پاس آ کر پناہ لیتا ہے اور اس کے دشمن اسے ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں۔ ابراہیم نفیس کی یہ فلم انتہائی سست روی کا شکار رہی اور جب یہ فلم سنیما اسکرین کی زینت بنی اس وقت تک غلام محی الدین کی گیارہ فلمیں ریلیز ہو چکی تھیں۔ اس فلم کی نمائش 1976ء میں ہوئی تھی۔ اس فلم کی کہانی بھی ابراہیم نفیس نے خود لکھی تھی، اس کے چند گیت

☆ موسم رنگ بدلتا ہے۔ شعلہ آگ میں جلتا ہے
(آواز رونا لیلیٰ)

☆ جانے بھی دو سہمے سہمے ان ہونٹوں پر (آواز گلوکارہ شہناز بیگم)

☆ چل دیئے بلا کر چل دیئے دل جلا کر چل دیئے
(آواز رونا لیلیٰ)

11 جون 1976ء کو ریلیز ہونے والی اس فلم کے موسیقار دبیو بھٹاچاریہ تھے۔ یہ دبیو بھٹاچاریہ کی پاکستان میں آخری فلم بھی تھی۔ اس فلم کی کاسٹ میں بدر منیر یاسمین خان، غلام محی الدین، شہناز، ننھا اور ابراہیم نفیس شامل تھے۔ باکس آفس پر یہ فلم ناکام ثابت ہوئی تھی۔ کاسٹنگ کے لحاظ سے یہ غلام محی الدین کی پہلی فلم تھی۔ جن دنوں وہ اس فلم میں کام کر رہے تھے ان ہی دنوں ہدایت کار اقبال رضوی نے بھی ایک فلم ''کنوارا'' کے نام سے بنانا شروع کی اور اس فلم میں بھی غلام محی الدین کو کاسٹ کیا لیکن ناگزیر وجوہ کی بنا پر یہ فلم مکمل نہ ہو سکی۔ اسی دوران شباب کیرانوی کراچی آئے اور غلام محی الدین سے ملاقات کی اور پھر انہیں اپنے ساتھ لاہور لے گئے اور اپنی فلم ''شکوہ'' میں انہیں سیکنڈ ہیرو کے طور پر کاسٹ کیا۔ اس فلم کے فرسٹ ہیرو محمد علی تھے۔ اس فلم کو شباب کیرانوی کے فرزند ظفر شباب نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ یہ فلم 13 جون 1975ء میں نمائش پذیر ہوئی اور اس نے سلور جوبلی کامیابی حاصل کی۔ ''شکوہ'' ریلیز کے اعتبار سے غلام محی الدین کی پہلی فلم کہلائی۔ اس فلم کے موسیقار نا شاد تھے جب کہ اس کی کہانی شباب کیرانوی کی تحریر کردہ تھی۔ اس کی کاسٹ میں دیبا، محمد علی، نشو، غلام محی الدین، امیر، علاؤ الدین اور ننھا شامل تھے۔ اس فلم کے یہ دو گیت بہت مقبول ہوئے۔

☆ دامن سے لپٹ گیا دیوانہ (آواز مہدی حسن)

☆ کلیوں پر بھنورا (آوازیں عمران علی ناشاد، ناہید اختر)

ظفر شباب کی فلم شکوہ میں غلام محی الدین علاؤ الدین کے چھوٹے بیٹے بنے تھے جب کہ محمد علی کے چھوٹے بھائی کا کردار ادا کیا تھا۔ غلام محی الدین نے دونوں بڑے اور پختہ کار اداکاروں کی موجودگی میں بڑے اعتماد کے ساتھ جم کر اداکاری کی اور اپنی صلاحیتوں کو منوایا۔ اس فلم میں غلام محی الدین ایک بے باک، خوددار اور ہمدرد وکیل کے روپ میں جلوہ گر ہوئے جو اپنی معصوم اور بے گناہ بھابی کو ان کا حق دلا کر رہتے ہیں۔ عدالت کے اس منظر میں ان کی ڈائیلاگ ڈیلیوری کی محمد علی اور علاؤ الدین کے علاوہ شباب کیرانوی نے بھی بے حد تعریف کی۔ ظفر آرٹ پروڈکشنز کے بینر تلے بننے والی فلم ''شکوہ'' نے سلور جوبلی کی تو غلام محی الدین کو اپنی پہلی فلم سے ہی قابل ذکر کامیابی حاصل ہوئی۔ کسی نئے آرٹسٹ کو جب اس کی ریلیز ہونے والی پہلی فلم میں عوامی پذیرائی حاصل ہو جاتی ہے تو فلم والے اس کی مقبولیت سے فائدہ اٹھانا لازمی سمجھتے ہیں۔ غلام محی الدین کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے بھی کئی فلموں میں کاسٹ کر لیا گیا جو اسی سال یعنی 1975ء میں ریلیز ہوئیں۔ ایسی چار فلمیں تھیں۔

1۔ ''اناڑی'' ریلیز یکم اگست 1975ء۔

2۔ ''میرا نام ہے محبت'' ریلیز 8 اگست 1975ء۔

3۔ ''شرارت'' ریلیز 24 اکتوبر 1975ء۔

4۔ ''معصوم'' ریلیز 26 دسمبر 1975ء۔

ریلیز کے اعتبار سے 1975ء میں ''شکوہ'' کو ملا کر غلام محی الدین کی 5 فلمیں ریلیز ہوئیں۔ شکوہ کے بعد ریلیز ہونے والی فلموں میں ''اناڑی'' ہدایت کار الیس سلیمان کی فلم تھی۔ اس فلم میں غلام محی الدین نے ایک ہمدرد اور پُرخلوص ڈاکٹر کا مختصر کردار کیا تھا مگر یہ کردار انہوں نے اس

www.PakiBooks.Site

خوبی کے ساتھ ادا کیا تھا کہ فلم بین بہت متاثر ہوئے۔

''معصوم'' ایک پرانی فلم ''میرا کیا قصور'' کا ری میک تھی۔ اس فلم نے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی۔ اسی طرح ''شرارت'' نے بھی بہت زیادہ متاثر نہیں کیا لیکن شباب کیرانوی کی رومانوی اور نغمہ بار فلم ''میرا نام ہے محبت'' نے کامیابی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر کے غلام محی الدین کو بھی کامیاب ہیروؤں کے صفِ اول میں جگہ دلوادی۔

بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ اس فلم کی نمائش کے ابتدائی دنوں میں تماشائیوں نے اسے نئے ہیرو ہیروئن (غلام محی الدین اور بابرہ شریف) کی فلم ہونے کی وجہ سے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ یوں بھی یہ فلم رمضان المبارک سے قبل ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے بزنس پر بہت برا اثر پڑا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اس فلم کا تقسیم کار اسے اتارنے ہی والا تھا کہ رمضان المبارک کی آمد ہوگئی۔ رمضان کے دنوں میں کوئی نئی یا اچھی فلم کی نمائش نہیں کی جاتی ہے کہ کم لوگ فلم دیکھنے آتے ہیں۔ لہٰذا سنیما مالکان نے ان سے کہا۔ ''فی الحال یہی فلم چلنے دیجیے۔ اس کی جگہ کوئی پرانی فلم چلانے سے تو یہی نئی فلم بہتر ہے۔''

تقسیم کار مان گئے۔ ''میرا نام ہے محبت'' کی نمائش جاری رہی اور پھر وہ سب کچھ ہو گیا جس کا کسی کو گمان نہیں تھا۔ اس فلم نے رش لینا شروع کر دیا دیگر سنیماؤں میں جو پرانی فلمیں چلائی جا رہی تھیں ان کے مقابلے میں یہ نئی فلم تماشائیوں کی توجہ حاصل کرنے لگی۔

فلم دیکھ کر باہر آنے والے تماشائی کہتے۔

''ارے یار! اس نئے جوڑے نے تو کمال کر دیا۔''

''ہاں! ایسی جاندار اداکاری کی کہ پرانے فنکاروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔''

''شباب صاحب کی کہانی اور ڈائریکشن بھی تو غضب کی ہے۔''

''دراصل شباب صاحب، جوہر شناس ہیں۔ انہی نے تو اس نئے ہیرو جو ٹی وی ڈراموں میں کام کرتا تھا۔ اسے کراچی سے لا کر فلموں میں متعارف کرایا۔''

''اور اس نئی ہیروئن نے بھی اپنے کردار میں ایسی اداکاری کی ہے کہ......''

فلم کی بنیادی چیز پاورفل کہانی ہوتی ہے۔ کہانی اچھی ہو اور اس کو فلمانے والا تجربہ کار اور ہنر مند ہو تو نئے آرٹسٹوں کے باوجود فلم کی کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ غلام محی الدین اور بابرہ شریف ان دنوں بالکل نئے تھے۔ غلام محی الدین کی اس فلم سے پہلے ''شکوہ'' اور ''اناڑی'' نمائش پذیر ہو چکی تھیں جن میں وہ ہیرو نہیں تھا اور بابرہ شریف تو بالکل ہی نو وارد تھی۔ وہ تماشائی جو صرف سپر اسٹارز کا نام دیکھ کر فلم دیکھنے جاتے ہیں انہوں نے نئے ہیرو ہیروئن کی فلم کو دیکھنے کے قابل ہی نہیں سمجھا مگر جب انہیں لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ فلم نہ صرف اپنی کہانی کی وجہ سے بلکہ اپنے ہیرو ہیروئن کی سپر پرفارمنس کی وجہ سے لاجواب ہے تو اس کے دیکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس فلم نے اس قدر بزنس کیا کہ عید بھی کراس کر گئی اور گولڈن جوبلی جیسی شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

وہ نئی فلمی جوڑی جس کی وجہ سے تماشائی اس فلم کو دیکھنے سے گریزاں تھے، اس فلم کی فقید المثال کامیابی کے بعد شہرت کی بلندیوں تک پہنچ گئی۔ دونوں نے اس فلم میں کمال فن کی انتہا کر دی تھی۔

''شکوہ'' اور ''اناڑی'' کے بعد ''میرا نام ہے محبت'' غلام محی الدین کی تیسری فلم تھی۔ اس فلم کے فلم ساز اے حمید تھے۔ کہانی اور ہدایت کاری شباب کیرانوی کی تھی۔ موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی تھی۔ نغمہ نگار تسلیم فاضلی تھے۔ عکاس صادق موتی تھے۔ کاسٹ میں بابرہ شریف، غلام محی الدین، مسعود اختر، فرزانہ ریحان، زرقا، بہار، تمنا، خالد سلیم موٹا، کمال ایرانی اور علاؤ الدین شامل تھے۔ اس فلم کے نغمات بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ان گیتوں کی وجہ سے کہانی اور اداکاری کے تاثر میں بہت اضافہ ہوا تھا۔ چند گیت نمونتاً پیشِ خدمت ہیں۔

☆ تجھے پیار کرتے کرتے مری عمر بیت جائے۔

☆ یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہمدم۔ کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔

اس فلم کو اس کی بہترین کارکردگی کی بنیاد پر سات نگار ایوارڈ ملے تھے جب کہ گریجویٹ ایوارڈ اور مصور ایوارڈز اس کے علاوہ تھے۔ غلام محی الدین کو ان کی اداکاری پر نگار کا اسپیشل ایوارڈ دیا گیا تھا جب کہ بہترین اداکار کا اعزاز گریجویٹ، مصور اور ایشین اکیڈمی نے دیا تھا۔

''میرا نام ہے محبت'' اندرونِ ملک ہی نہیں، ملک سے باہر بھی بے حد پسند کی گئی۔ چین میں اس فلم سے پہلے بھی کئی پاکستانی فلموں کی کامیاب نمائش ہو چکی تھی مگر ''میرا نام ہے محبت'' نے چین میں کامیابی کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔

یہاں اردو زبان کے علاوہ اسے چینی زبان میں ڈب کر کے اس کی نمائش کی گئی۔ چینی تماشائی اس فلم اور اس کے کلیدی کرداروں بابرہ شریف اور غلام محی الدین سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے مجسمے بنا کر بیجنگ کے چوراہوں پر یادگار کے طور پر نصب کیا جو آج بھی چینی عوام کی اس فلم کے حوالے سے محبت کی نشانی کے طور پر موجود ہیں۔

''میرا نام ہے محبت'' کی بے مثال کامیابی کے بعد غلام محی الدین کے لیے فلم انڈسٹری کے سارے دروازے کھل گئے۔ اسے ایک کامیاب اور باصلاحیت اداکار کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا اور ہر طرح کے کردار اس اعتماد کے ساتھ ان سے کروائے جانے لگے کہ وہ مایوس نہیں کریں گے اور گلو بھائی نے واقعی کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔ ہر رول میں وہ انگوٹھی کے نگینے کی طرح فٹ نظر آئے۔ دراصل وہ بنیادی طور پر ایک دیانتدار شخص ہیں۔ اپنا کام وہ نہایت ذمہ داری سے کرنے کے عادی ہیں۔ جب انہیں چھوٹے اور مختصر کردار ملتے تھے اس وقت بھی انہوں نے کبھی تساہل پسندی سے کام نہیں لیا۔ اپنے کردار کو کامیاب بنانے میں جان توڑ کوشش کی اور جب وہ مکمل ہیرو بن گئے اور فلم کے کلیدی کردار ادا کرنے لگے تب بھی انہوں نے اپنی تمام فنی صلاحیتوں سے کام لیا۔

''میرا نام ہے محبت'' کے بعد شباب کیرانوی نے ایک نئی فلم ''انسان اور فرشتہ'' بنائی جس میں روحی بانو فلم کی ہیروئن تھیں۔ وہ ایک دکھی خاتون تھیں۔ غلام محی الدین ان سے محبت کرتے تھے مگر اس طرح کہ ان سے دور رہ کر ان کے دکھوں کا مداوا کرتے تھے۔ محبت کا یہ انوکھا انداز تھا۔ جسے غلام محی الدین نے اس طرح ادا کیا تھا کہ فلم بین آج بھی اسے فراموش نہیں کر پائے ہیں۔

اس فلم کے پروڈیوسر اے حمید، مصنف و ہدایت کار شباب کیرانوی اور موسیقار ایم اشرف تھے۔ کاسٹ کے دیگر فنکاروں میں دیبا، ندیم، امیر، تمنا اور علاؤ الدین شامل تھے۔ اس فلم نے سلور جوبلی کی۔ یہ فلم 6 فروری 1976ء کے دن نمائش پذیر ہوئی۔ یہ فلم اگرچہ میرا نام ہے محبت جیسی شاندار کامیابی حاصل نہیں کر سکی لیکن غلام محی الدین کی اداکاری ہر طرح کے تماشائیوں نے پسند کی۔ ایک فنکار کا سرمایہ یہی عوامی پذیرائی ہوتی ہے۔

غلام محی الدین ریڈیو سے ہو کر ٹیلی ویژن پہنچے اور پھر ٹی وی سے ان کی اگلی منزل فلم انڈسٹری تھی، انہوں نے بے

ایوارڈز کی بہاریں

''میرا نام ہے محبت'' نگار ایوارڈ اسپیشل ایوارڈ، گریجویٹ ایوارڈ، مصور ایوارڈ اور ایشین الہدیٰ ایوارڈ بہترین اداکاری پر دیے گئے۔ ''آنسو اور شعلے'' مصور ایوارڈ بہترین اداکاری پر ملا۔ ''مٹھی بھر چاول'' نگار کا خصوصی ایوارڈ برائے اداکاری، پی آئی اے اکیڈمی ایوارڈ، برائے بہترین اداکار۔ ''لازوال'' نگار ایوارڈ برائے بہترین معاون اداکار، پاک و ہند مشترکہ ایوارڈ، ایشین اکیڈمی ایوارڈ، برائے بہترین اداکار و بہترین معاون اداکار۔ ''ڈوریا'' نگار ایوارڈ برائے بہترین اداکار پنجابی وحید مراد میموریل ایوارڈ، باہو اکیڈمی ایوارڈز، الفنکار ایوارڈ، ایشین اکیڈمی ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''آخری جنگ'' ایشین اکیڈمی ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''آگ ہی آگ'' گریجویٹ ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''امیر خان'' وحید مراد میموریل ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''جنگ باز'' افتخار احمد اچیولمنٹ ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''کالے چور'' گریجویٹ ایوارڈ برائے بہترین معاون اداکار۔ ''ضد'' نگار ایوارڈ، شاعرِ مشرق علامہ اقبال ایوارڈ برائے بہترین معاون اداکار، باہو ایوارڈ، بولان ایوارڈ، ایس ایم ظفر میموریل ایوارڈ، ایشین ایوارڈ، وحید مراد میموریل ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''عالمی جاسوس'' بولان ایوارڈ برائے بہترین پنجابی اداکار۔ ''سپرا'' وحید مراد میموریل ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''محبت کے سوداگر'' سندھ عوامی ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''ماچھو'' باہو ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''سرکٹا انسان'' نگار ایوارڈ، احمد رشدی ایوارڈ، سندھ عوامی ایوارڈ، وحید مراد میموریل ایوارڈ، بولان ایوارڈ، تھمیز ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''بیچارہ گروپ'' گریجویٹ ایوارڈ برائے بہترین معاون اداکار۔ ''بت شکن'' ٹیلنٹ ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''جیوا'' بولان ایوارڈ، مصور ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''جنگل کا قانون'' گریجویٹ ایوارڈ برائے بہترین معاون اداکار۔ ''کڑی بادشاہ'' باہو ایوارڈ، پاکستان گزٹ ایوارڈ، بشیر نیاز ایوارڈ برائے بہترین اداکار۔ ''اکوڈس نمبری'' وحید مراد میموریل ایوارڈز برائے بہترین اداکار۔ ''قرض'' نگار ایوارڈ برائے بہترین ساتھی اداکار۔ ''سورج کا داغ'' (ڈراما) سندھ عوامی ایوارڈ برائے بہترین اداکاری۔ پاکستان کی گولڈن جوبلی پر جنگ ایوارڈ (سال 1997ء)۔ سماجی خدمات پر 1992ء میں ایس ایم ظفر میموریل ایوارڈ۔ 1993ء میں قائداعظم ایوارڈ کے بولان ایوارڈ سال بھر کی مجموعی کارکردگی پر 1988ء میں ایشین اکیڈمی ایوارڈ۔ 1993ء میں ٹیلنٹ ایوارڈ 1994ء میں ایس ایم ظفر میموریل ایوارڈ۔ 1995ء میں ایشین اکیڈمی ایوارڈ۔ خوش لباسی پر 1993ء میں نیشنل کلچر ایوارڈ۔

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

شارٹی وی ڈراموں میں اداکاری کی۔ ان کا پہلا ٹی وی ڈراما ''ٹیپو سلطان'' تھا جس کے ڈائریکٹر کنور آفتاب تھے جب کہ آخری ٹی وی ڈراما ''سورج کے داغ'' تھا جس کے ڈائریکٹر قاسم جلالی تھے۔ اس ڈرامے میں غلام محی الدین کو ان کی بہترین اداکاری پر سندھ عوامی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ ٹی وی سے ان کا ناتا اس لیے ٹوٹا کہ وہ فلموں میں بے حد مصروف ہوگئے تھے۔

فلموں میں کامیابی کارکردگی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اچھا پرفارمر ہی فلم والوں کو متاثر کرتا ہے اور وہ اسے نت نئے انداز کے رول میں آزماتے ہیں۔ فلم میکرز کو جب اس بات کا اندازہ ہوا کہ یہ ابھرتا ہوا اداکار بڑی صلاحیتوں کا مالک ہے تو وہ اسے مشکل سے مشکل اور بے جان سے بے جان کرداروں میں آزمانے لگے۔ گلو بھائی نے ایسے کرداروں کو کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ چیلنج سمجھ کر انہیں قبول کیا اور کمال مہارت سے انہیں ادا کر کے ثابت کیا کہ وہ ہر طرح کے کردار کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر فلم لازوال، ضد اور دنیا دس نمبری میں ان سے منفی نوعیت کے کردار کروائے گئے۔ اگرچہ بہت سے ہیرو ایسے کردار نہیں کرتے کہ ان کی ساکھ پر اس کا ناخوشگوار اثر پڑے گا مگر ''میرا نام ہے محبت'' میں سپر رومانوی ہیرو کا کردار ادا کر کے صفِ اوّل کے ہیروؤں میں جگہ بنانے کے باوجود، غلام محی الدین نے منفی نوعیت کے کردار بھی بخوشی ادا کیے اور اپنی خداداد فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ایسے کرداروں میں بھی اعلیٰ درجے کی کردار نگاری کر کے پوری فلم میں اپنے آپ کو حاوی رکھا۔ ''ضد'' کا چربہ بھارت میں ''صاحباں'' کے نام سے بنایا گیا اور اس میں غلام محی الدین کا کردار سنجے دت نے ادا کیا مگر وہ غلام محی الدین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔

فلم ''ضد'' میں غلام محی الدین نے ایک سفاک، ظالم اور درندہ صفت امیر ترین رئیس زادے کا کردار ادا کیا تھا جو ایک مظلوم لڑکی کو اپنانے کے لیے ظلم کی انتہا کر دیتا ہے۔

کچھ تجربہ کار فلم میکرز کا خیال ہے کہ غلام محی الدین کا چہرہ ایسے ہی کرداروں کے لیے موزوں ہے۔ کبھی کبھی، آنسو اور شعلے، کندن اور آگ ہی آگ میں بھی غلام محی الدین نے انتہائی اہم اور پاور فل کردار ادا کیے ہیں۔ یہ وہ رولز تھے جو پیچیدہ اور مشکل ترین تھے۔ عام طور پر ایسی آزمائش میں ڈالنے والے کردار کو اداکار قبول نہیں کرتا۔ ہدایت کارہ سنگیتا کی فلم ''محل میرے سپنوں کا'' غلام محی الدین کو ایک مکرانی کا کردار دیا گیا۔ غلام محی الدین نے اس کردار کو یوں ادا کیا جیسے وہ جدی پشتی مکرانی ہوں۔ ان کا لب و لہجہ اور انداز بالکل مکرانیوں جیسا تھا۔ عوام نے انہیں اس عوامی کردار میں بہت پسند کیا اور ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔ سنگیتا ہی کی ایک اور بڑی اور معرکتہ آرا فلم ''مٹھی بھر چاول'' میں اس عوامی اداکار نے سکھ کے کردار میں نہایت اعلیٰ معیار کی کردار نگاری کر کے اس کردار کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ یہ فلم 1978ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ جسے پانچ نگار ایوارڈ ملے تھے۔ جن میں غلام محی الدین کو ان کی اداکاری پر خصوصی ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ ''مٹھی بھر چاول'' کے دیگر ایوارڈز یہ تھے۔

1۔ بہترین اردو فلم ''مٹھی بھر چاول'' فلم ساز طیب حسین رضوی۔

2۔ بہترین ہدایت کارہ۔ سنگیتا۔

3۔ بہترین اداکارہ۔ سنگیتا۔

4۔ بہترین تدوین کار۔ زیڈ اے زلفی۔

ایوارڈ کے حوالے سے یہ بات بتانا بھی ضروری ہے کہ فلم ''ضد'' (جس کا ذکر ہم آگے کر چکے ہیں) میں بھی غلام محی الدین کو بہترین معاون اداکار کا نگار ایوارڈ ملا تھا۔ ''ضد'' کے ہدایت کار محمد جاوید فاضل تھے جب کہ اس کی کہانی سید نور کی تحریر کردہ تھی۔ اس فلم میں ندیم اور بابرہ شریف نے لیڈنگ رول کیے تھے جب کہ غلام محی الدین نے اپنی زندگی کا یادگار کردار ادا کیا تھا اور شائقین فلم نے ان کو اس منفرد نوعیت کے کردار میں بے حد پسند کیا تھا۔ اس فلم نے سلور جوبلی کا اعزاز حاصل کیا تھا یہ فلم 17 مئی 1991ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

غلام محی الدین نے ہدایت کار جاوید فاضل کی اور بھی کئی فلموں میں اپنی اداکاری کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ جن میں گونج، لازوال، کندن، آگ ہی آگ، مس قلوپطرہ اور دنیا دس نمبری شامل ہیں۔ ''گونج'' ہدایت کار جاوید فاضل کی بطور ہدایت کار پہلی فلم تھی جو 2 دسمبر 1977ء کو ریلیز ہوئی تھی اس کی کہانی آغا حسن امتثال نے لکھی تھی۔ اس کے موسیقار نذیر علی اور وجاہت عطرے تھے۔ سعید گیلانی اس کے نغمہ نگار تھے۔ چند نغمات درج ذیل ہیں۔

☆ دل کا شہزادا اس بے یارو (آواز۔ منیر حسین، نور جہاں)

www.PakiBooks.Site

☆ یہ ہری چیز پینے سے کیا فائدہ (آواز۔ مہناز)

☆ سینے میں دل ہے دل میں دھڑکن (آواز۔ مہناز)

☆ پھول نہ رہیں گے نظارے نہ رہیں گے (آواز۔ مہناز)

''گونج'' کا شمار غلام محی الدین کی بہترین فلموں میں ہوتا ہے۔ اس فلم نے سلور جوبلی منائی تھی۔ ہدایت کار محمد جاوید فاضل کی فلم ''لازوال'' میں بھی غلام محی الدین کا کردار منفی نوعیت کا تھا۔ ''لازوال'' کی ہیروئن شبنم تھیں جن کے چاہنے والے تین تھے۔ ندیم، جاوید شیخ اور غلام محی الدین۔ غلام محی الدین کا کردار منفی اور مختصر تھا لیکن اتنا اثر انگیز تھا کہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ یہ ان تینوں اداکاروں کی پہلی مشترکہ فلم تھی۔ اس فلم کے مصنف سید نور اور موسیقار امجد بوبی تھے جب کہ نغمہ نگاری مسرور انور نے کی تھی۔

''لازوال'' کے چند بے مثال گیت۔

☆ آپ اپنی مثال ہوتا ہے۔ پیار تو لازوال ہوتا ہے (آوازیں۔ اخلاق احمد، ناہید اختر، اے نیر)

☆ رشتہ پیار کا نہ ٹوٹے۔ چاہے دنیا ہم سے روٹھے (آوازیں۔ اخلاق احمد، مہناز)

☆ تیرے سوا کسی کو نہ چاہوں گی۔ کیا ہے جو وعدہ نبھاؤں گی (آواز۔ مہناز)

☆ زندگی کیا ہے پیار بنا۔ دل ہے سونا دلدار بنا (آواز۔ ناہید اختر)

23 نومبر 1984ء کو ریلیز ہونے والی اس فلم کے دیگر آرٹسٹوں میں زمرد، فردوس، عابد کشمیری، منا لاہوری، چکرم، نگو، سجاد کشور اور آغا طالش شامل تھے۔

فلم ساز طارق مسعود قریشی اور ہدایت کار محمد جاوید فاضل کی فلم ''کندن'' کے ہیرو غلام محی الدین تھے جب کہ ان کی ہیروئن بابرہ شریف تھیں۔ اس فلم نے سلور جوبلی کی تھی اور اسے چھ نگار ایوارڈز ملے تھے۔ جو کچھ یوں تھے۔

1۔ بہترین اداکارہ۔ بابرہ شریف

2۔ بہترین مزاحیہ اداکار۔ عمر شریف

3۔ بہترین موسیقار۔ کمال احمد

4۔ بہترین گلوکارہ۔ مہناز

5۔ بہترین گلوکار۔ اخلاق احمد

6۔ بہترین تدوین کار۔ اصغر

''کندن'' 27 مارچ 1987ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔ سید نور نے اس فلم کی کہانی لکھی تھی۔ خواجہ پرویز اور سعید گیلانی اس فلم کے نغمہ نگار تھے۔ اس فلم کے مقبول ہونے والے چند گیت۔

☆ بے وفا ہم نہیں ہیں تیری قسم (آواز۔ مہناز)

☆ کھلونے تیری زندگی کیا۔ سب کا دل بہلائے (آوازیں۔ اخلاق احمد، مہناز، الگ الگ)

☆ آؤ چلیں ہم دونوں وہاں (آوازیں۔ اخلاق احمد، مہناز)

غلام محی الدین کی ہیروئن بابرہ شریف نے اس فلم میں ندیم کی بہن کا کردار کیا تھا۔ دیگر کاسٹ میں ممتاز، عمر شریف، نگہت بٹ، سونیا، عابد کشمیری، منور سعید اور افضال احمد شامل تھے۔

فلم ساز شاہد شفاعت اور آفتاب زیدی کی فلم ''آگ ہی آگ'' کے ہدایت کار جاوید فاضل تھے۔ یہ بیرونِ ملک فلمائی جانے والی سنیما اسکوپ فلم تھی جس کے مصنف سید نور اور نغمہ نگار مسرور انور تھے۔ موسیقی امجد بوبی کی تھی۔ اس فلم نے باکس آفس پر سلور جوبلی کی اور اسے چار نگار ایوارڈز ملے۔

1۔ اسپیشل عکاس۔ منور ایوب

2۔ بہترین عکاس۔ منور ایوب

3۔ بہترین تدوین کار۔ زیڈ اے زلفی

4۔ بہترین صدا بند۔ افضل حسین شاہ

اس فلم کی کاسٹ میں جاوید شیخ، سیتا، غلام محی الدین، نوین تاجک، عمر شریف، ابراہیم نفیس، جہانگیر مغل، آصف خان، مصطفیٰ قریشی اور ہمایوں قریشی شامل تھے جب کہ سلمیٰ آغا نے آصف خان کی ناجائز بیٹی کا کردار بڑے احسن طریقے پر ادا کیا تھا۔ سلمیٰ آغا نے ہم شکل ماں بیٹی کا کردار پرفارم کیا تھا۔ یہ فلم عیدالفطر کے دن بروز بدھ 18 مئی 1988ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ غلام محی الدین کا کردار اس فلم میں بہت اہم تھا۔ شائقین فلم نے ان کی خوب صورت پرفارمنس کی وجہ سے انہیں پسند کیا تھا۔

اس فلم کے چند گیتوں کے تیور دیکھیے۔

☆ بے وفا بے وفا تو ہے کہ ہم (آواز۔ سلمیٰ آغا)

☆ دھک دھک دل دھڑکے۔ دل کی کنڈی کھڑکے (آواز۔ نور جہاں)

☆ میں نظر ہوں تو نظارہ۔ میں ندی ہوں تو کنارہ (آوازیں۔ نور جہاں، ناہید اختر، سلمیٰ آغا)

www.PakiBooks.Site

ہدایت کار محمد جاوید فاضل کی فلم مس ''قلوپطرہ'' مس سیریز کی فلم تھی جس کی ملکہ بابرہ شریف تھیں۔ جن کے ہیرو ان کے پرانے پارٹنر غلام محی الدین تھے۔ یہ جاوید فاضل مرحوم کی پہلی ڈبل ورژن فلم تھی۔ مصنف شہباز آغاز تھے۔ اردو ورژن کے مکالمے سید نور نے لکھے تھے۔ ''مس قلوپطرہ'' کے گیت عبداللہ چلی، مسرور انور اور وارث لدھیانوی نے لکھے تھے۔ پنجابی ورژن کے تمام گانے ملکہ ترنم نور جہاں نے گائے تھے جب کہ اردو ورژن کے سارے گیت مہناز کی آواز میں ریکارڈ کرائے گئے تھے۔ اس فلم کی کاسٹ کے دیگر فنکاروں میں جہاں زیب، منزہ شیخ، عابد کشمیری، ستارہ، کلیم شاہ، اسلم لارٹر، سلیم قریشی، ہمایوں قریشی، ابراہیم نفیس اور سلطان راہی شامل تھے۔ واضح رہے کہ سلطان راہی کی جاوید فاضل کے ساتھ یہ پہلی فلم تھی۔

دونوں ورژنوں میں غلام محی الدین اور بابرہ شریف کو ان کی پرفارمنس کی وجہ سے شائقین فلم نے پسند کیا تھا۔ اس فلم کی تاریخ نمائش 7 دسمبر 1990ء ہے۔

''دنیا دس نمبری'' گلو بھائی کی فلم اس لیے قابل ذکر ہے کہ یہ ہدایت کار جاوید فاضل کے ساتھ ان کی آخری فلم ہے۔ یہ بھی ڈبل ورژن فلم ہے۔ اس فلم میں غلام محی الدین کی کردار نگاری اعلیٰ درجے کی ہے۔ پوری فلم میں انہوں نے کسی دوسرے اداکار کو اپنے آپ پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ جاوید فاضل کی اس دوسری ڈبل ورژن فلم کی کہانی سید نور کی تحریر کردہ تھی جب کہ مسرور انور اور سعید گیلانی نے نغمہ نگاری کی تھی۔ موسیقار ایم اشرف تھے اور کاسٹ میں سروش، نشاشا، سلیم شیخ، سیمی زیدی، شاہدہ منی، عرفان کھوسٹ، صنوبر خان، عابد بٹ، انیل چوہدری، شہنشاہ اور غلام محی الدین شامل تھے۔ 15 مئی 1992ء کو ''دنیا دس نمبری'' نمائش پذیر ہوئی اور گلو بھائی کی کامیاب فلموں میں ایک اور فلم کا اضافہ کیا۔

''مٹھی بھر چاول'' گلو بھائی کی ایک یادگار فلم ہے جس میں انہوں نے ایک سکھ کا کردار ادا کیا ہے۔ اس فلم کی کہانی ایک سکھ مصنف راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ''ایک چادر میلی سی'' پر مبنی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی بھی سکھ تھے اور اردو کے جید لکھاری تھے۔ کہانی سکھوں کے معاشرے اور ماحول کی تھی۔ اس کی زبردست پسندیدگی کے باوجود ممبئی کے فلم ساز اسے فلمانے کا حوصلہ نہ کر سکے کیونکہ کہانی کے اعتبار سے یہ ایک مشکل سبجیکٹ تھا مگر ہماری اداکارہ اور ہدایت کار سنگیتا نے اس مشکل سبجیکٹ کو اس خوبی کے ساتھ فلم کا روپ دیا کہ بھارتی فلم میکرز بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس کے بعد وہاں بھی اسی کہانی پر ایک فلم بنائی گئی مگر وہ ''مٹھی بھر چاول'' جیسی معیاری ثابت نہیں ہوئی۔ غلام محی الدین نے مٹھی بھر چاول میں سکھ کے کردار میں ایسی اداکاری کی کہ ماضی کی فلم ''کرتار سنگھ'' میں لیجنڈ اداکار علاؤ الدین کے کیے ہوئے سکھ کے کردار کی یاد تازہ کر دی۔ ''کرتار سنگھ'' میں علاؤ الدین کی کردار نگاری بھی عروج پر تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جدی پشتی سکھ ہیں۔

غلام محی الدین نے ''مٹھی بھر چاول'' میں سکھ کی کردار نگاری میں جس مہارت کا ثبوت دیا تھا، اس کی وجہ سے سید نور نے انہیں اپنی فلم ''جیوا'' میں بھی ایک سکھ کے روپ میں پیش کیا مگر یہ کردار ''مٹھی بھر چاول'' کی طرح سنجیدہ نہیں تھا۔ ''جیوا'' میں انہیں ایک سیدھے سادے بھولے بھالے سکھ کے کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ ایک مزاحیہ ٹائپ کا کردار تھا مگر آفرین ہے اس ورسٹائل اداکار نے یہ ہنسنے ہنسانے والا کردار بھی اس خوبی سے ادا کیا کہ فلم دیکھنے والے بے حد محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہے۔ یہ کردار انہوں نے اس قدر مہارت اور عمدگی سے ادا کیا تھا کہ لگتا تھا جیسے وہ ایک مستند مزاحیہ اداکار ہوں۔ ان ہی کے کردار سے فلم بینوں کو قدم قدم پر ریلیف ملتی تھی۔

سید نور ''جیوا'' کے مصنف، ہدایت کار اور فلم ساز تھے۔ یہ فلم عیدالفطر کے موقع پر 3 مارچ 1995ء کو ریلیز ہوئی تھی اور اس نے ٹاپ کلاس بزنس کیا تھا۔ نیلی اس فلم میں غلام محی الدین کی ہیروئن تھیں۔

اس فلم کے حوالے سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہدایت کار سید نور نے غلام محی الدین کے کردار کے بہت سے حصے کاٹ دیئے تھے۔ یعنی فلمائے تو گئے تھے مگر فلم میں شامل نہیں تھے۔ غلام محی الدین کا کہنا ہے کہ یہ بڑے جاندار اور دلچسپ حصے تھے۔

جب ان سے پوچھا گیا۔ ''اس کی وجہ کیا تھی۔'' تو ان کا جواب تھا۔ ''فلم بہت زیادہ طویل ہو گئی تھی۔''

غلام محی الدین نے بڑی فراخدلی کے ساتھ کہا۔ ''شاہ جی کو کوئی مجھ سے دشمنی تو نہیں تھی کہ انہوں نے مجھ پر شوٹ کیے ہوئے یہ حصے نکالے۔ انہوں نے میرے علاوہ بھی دیگر آرٹسٹوں پر فلمائے ہوئے کچھ حصے نکال دیئے تھے کیونکہ فلم کو

www.PakiBooks.Site

اس کی محدود حد میں رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایسا کریں۔''

اس موقع پر ان کا یہ بھی کہنا تھا۔ ''میرے اوپر فلمائے ہوئے وہ بریدہ حصے اگر فلم میں موجود ہوتے تو فلم اور بھی دلچسپ ہو جاتی۔''

''جیوا'' اپنے انداز کی ایک منفرد، دلچسپ اور معیاری فلم تھی جس کے موسیقار ایم ارشد اور نغمہ نگار سعید گیلانی اور خواجہ پرویز تھے۔ اس فلم کے کئی گیت مقبول ہوئے۔

☆ جانو سن ذرا پلکیں تو اٹھا (آواز۔ انور رفیع، گیت سعید گیلانی)

☆ بال کھول کے میدان وچ آ گئی۔ تے بلو دا جوڑ کوئی نہ (آوازیں۔ نور جہاں، شوکت علی، گیت خواجہ پرویز)

☆ چھو لے اگر تجھ کو ہوا۔ لگتا ہے یہ مجھ کو برا (آوازیں۔ انور رفیع، جمیرا چنا، گیت سعید گیلانی)

''جیوا'' میں ہدایت کار سید نور نے اداکار بابر علی اور اداکارہ ریشم کو متعارف کرایا تھا۔ جنہیں اس سال کے بہترین نئے چہروں کا نگار ایوارڈ ملا جب کہ گلوکار انور رفیع کو بہترین گلوکار کا نگار ایوارڈ دیا گیا۔ اس فلم کی کاسٹ میں نیلی، غلام محی الدین، جاوید شیخ، بابر علی، دیبا، ریشم، ندیم، خالد بٹ، شرجیل انجم اور مصطفیٰ قریشی شامل تھے۔

''انتخاب'' ہدایت کار پرویز ملک کی فلم تھی جس میں غلام محی الدین اپنے شوخ اور رومانوی کردار میں خوب جچے تھے۔ اس فلم میں انہوں نے ایک وکیل کا کردار اس طرح ادا کیا تھا جیسے وہ حقیقتاً وکیل ہی ہوں۔ اس کامیاب اور نغماتی فلم نے باکس آفس پر پلاٹینم جوبلی کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ نامور نغمہ نگار مسرور انور نے اس فلم کے گیتوں کے ساتھ اس کی کہانی بھی لکھی تھی۔ نثار بزمی نے اس فلم کے لیے بڑی دل موہ لینے والی دھنیں کمپوز کی تھیں اس لیے اس فلم کو ایک نغماتی فلم کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ غلام محی الدین نے اپنے کردار میں ڈوب کر اداکاری کی تھی اس لیے ان کی پرفارمنس بے حد عمدہ اور قابل دید تھی۔ دیگر کاسٹ میں محمد علی، شبنم، تمنا، گڈو اور منور سعید شامل تھے۔ اس فلم میں غلام محی الدین کے بھانجے یاسر قادری نے بھی بطور چائلڈ اسٹار کام کیا تھا۔ آپ کی معلومات میں اضافہ کے لیے یہ بتاتا چلوں... کہ غلام محی الدین کے دو بھانجے ڈبو اور یاسر قادری

پیشہ و آباء

غلام محی الدین کے والد حاجی غلام محمد جن کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا، پولیس کے محکمے سے وابستہ تھے جب کہ غلام محی الدین کے دادا حیدر آباد دکن میں کمشنر تھے۔ غلام محی الدین کے کئی بھائی بینکوں میں بحیثیت آفیسر کام کرتے ہیں۔

کرکٹر غلام محی الدین

غلام محی الدین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر وہ اداکار نہ ہوتے تو کرکٹر ہوتے۔ وہ بہت اچھے کرکٹر ہیں۔ ابھی تک انہیں کرکٹ کھیلنے کا شوق ہے۔ انہوں نے اپنے اس شوق کو اس طرح پورا کیا کہ فلم اسٹاروں پر مبنی ایک کرکٹ کلب بنا دیا جس کے وہ کپتان بھی تھے۔ یہ ملک کے مختلف شہروں میں اپنی ٹیم لے کر جاتے اور وہاں کے کرکٹرز کے ساتھ میچ کھیلتے۔ خاص طور پر جب ریلیف فنڈ جمع کرنا ہوتا تو وہ ایسے میچ کا انعقاد کر کے فنڈ جمع کرتے۔ غلام محی الدین اپنی ٹیم کے مایہ ناز بلے باز ہیں۔

ہر فن مولا

غلام محی الدین کو اردو، پنجابی، سندھی، اور پشتو چاروں زبانوں کی فلموں میں کام کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ جب کہ ڈبل ورژن فلموں میں بھی انہوں نے اداکاری کی ہے۔ ان کی پہلی اردو فلم ''شکوہ''، پہلی پنجابی فلم ''قاتل تے فرشتہ''، پہلی سندھی فلم ''باغی'' اور پہلی پشتو فلم ''سر لیے'' جب کہ ڈبل ورژن فلم حسینہ 420 تھی۔

شہرت اور مقبولیت کی مثال

پاکستان کے عظیم دوست ملک چین میں ہماری بہت سی پاکستانی فلمیں ریلیز ہو کر پسندیدگی کی سند حاصل کر چکی ہیں مگر غلام محی الدین اور بابرہ شریف کی فلم ''میرا نام ہے محبت'' نے چین میں کامیابی کا ایک ریکارڈ قائم کیا۔ چین کے لوگ ان دونوں فنکاروں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے مجسمے بنا کر بیجنگ کے چوراہوں پر یادگار کے طور پر نصب کیا۔ یہ غلام محی الدین اور بابرہ شریف کی شہرت اور مقبولیت کی ایک مثال ہے۔

www.PakiBooks.Site

ٹی وی پر بھی کام کر چکے ہیں۔ ڈبو نے ڈراما سیریل ''روحی گڈو'' میں اداکاری کے جوہر دکھا کر خود کو منوایا تھا جب کہ یاسر نے اس ڈرامے ''روحی گڈو'' میں کمال کی کردار نگاری کی تھی۔ فلم ''انتخاب'' میں بھی یاسر قادری کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ''انتخاب'' 2 جون 1978ء کو ریلیز ہوئی تھی۔

''آج اور کل'' غلام محی الدین کی ایک یادگار اور کامیاب فلم تھی جس نے کامیابی کے لحاظ سے ڈائمنڈ جوبلی کی تھی۔ یہ فلم جہیز کی لعنت پر بننے والی ایک معرکتہ آرا موومی تھی جس کی کہانی نذیر اجمیری نے تحریر کی تھی اور اسے ایک کامیاب فلم کے روپ میں ہدایت کار ایس سلیمان نے ڈھالا تھا۔ اس فلم میں غلام محی الدین کا کردار ایک امیر زادے کا تھا جو شبنم سے بے انتہا پیار کرتا تھا، اسے اپنانا چاہتا تھا مگر اسے اپنا نہ سکا۔ اس ڈائمنڈ جوبلی فلم کے موسیقار کمال احمد تھے۔ کاسٹ میں غلام محی الدین، شبنم، راحت کاظمی، لہری، بہار، قوی اور خالد سلیم موٹا شامل تھے۔ یہ اس سال کی بہترین اردو فلم تھی جسے آٹھ نگار ایوارڈ ملے تھے۔ یہ فلم 2 اپریل 1976ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

غلام محی الدین کے چاہنے والے پرستار ان کی خوش اخلاقی اور بے لوث محبت کی وجہ سے انہیں نہ صرف گلو بھائی کہہ کر پکارتے ہیں بلکہ خوش اخلاق غلام محی الدین کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ ان کے پرستاروں کی انجمن کا نام بھی ''خوش اخلاق غلام محی الدین فین کلب'' ہے۔ غلام محی الدین کو اس بات کا اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے پاکستان میں بننے والی ہر زبان کی فلم میں کام کیا ہے۔ ان کی پہلی اردو فلم ''شکوہ'' تھی۔ پہلی سندھی فلم ''باغی'' پہلی پنجابی فلم ''قاتل تے فرشتہ'' اور پہلی پشتو فلم ''سرلیے'' تھی جب کہ پہلی ڈبل ورژن فلم ''حسینہ 420'' تھی۔

غلام محی الدین اپنی فنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ہر طرح کے کردار کر لیتے اور یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس کا سائیڈ افیکٹ کیا ہوگا۔

فلم ساز و ہدایت کار وزیر علی کی فلم ''کبھی کبھی'' میں انہیں ایک منفی کردار میں پیش کیا گیا۔ انہوں نے بے دھڑک یہ کردار کرنا قبول کر لیا۔ یہ نہیں سوچا کہ وہ ایک بے حد رومانوی فلم ''میرا نام ہے محبت'' کے ایک کامیاب ہیرو ہیں۔ اس منفی کردار کا ان کی ہیروشپ پر برا اثر بھی پڑ سکتا ہے۔ اس فلم میں انہیں ایک عیاش اور مکار شخص کے کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ عیاش شخص خوب صورت عورتوں کی عزت و عصمت کو پامال کرتا اور پھر اسے چھوڑ کر دوسری عورت کی طرف مائل ہو جاتا۔ اس بدکردار، عیار اور مکار شخص کے روپ میں بھی غلام محی الدین نے اتنی پرفیکٹ کردار نگاری کی کہ ناقدین فن نے ان کی اداکارانہ صلاحیتوں کی تعریف کی اور اسے ان کی یادگار پرفارمنس قرار دیا۔ سنگیتا، کویتا، شاہد، لہری اور قوی اس فلم کے نمایاں کرداروں میں پیش ہوئے تھے۔ عزیز میرٹھی نے اس فلم کی کہانی لکھی تھی۔ موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی تھی۔ ''کبھی کبھی'' بھی غلام محی الدین کی ایک کامیاب فلم تھی جو 21 اپریل 1978ء میں سنیماؤں کی زینت بنی تھی۔

فلم ''بارات'' میں بھی غلام محی الدین نے ایک امیر زادے کا کردار ادا کیا تھا جس کے پاس آنسوؤں کے سوا ہر چیز موجود تھی۔ اس رئیس زادے کے کردار میں بھی غلام محی الدین نے اعلیٰ معیار کی کردار نگاری کی تھی۔ جسے فلم بینوں نے بہت پسند کیا تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار ایس اے حافظ اور مصنف خورشید اللہ تھے موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی تھی جب کہ کاسٹ میں غلام محی الدین، بابرہ شریف، شاہد، نیر سلطانہ، نیلو اور محمد علی شامل تھے۔

غلام محی الدین جن کا شمار اب سینئر اداکاروں میں ہوتا ہے۔ اردو فلموں کے ساتھ ساتھ پنجابی فلموں میں بھی اپنی کردار نگاری کا لوہا منوا چکے ہیں اگرچہ بنیادی طور پر وہ اردو اسپیکنگ ہیں۔ حیدرآباد دکن (انڈیا) میں پیدا ہوئے اور ان کا بچپن، لڑکپن اور جوانی کے ایام کراچی میں گزرے لیکن انہوں نے اپنے ملک میں بننے والی ہر زبان کی فلموں میں اس خوبی کے ساتھ کام کیا کہ پتا ہی نہیں چلا کہ ان کی مادری زبان اردو ہے۔ ان کی کامیاب اداکارانہ صلاحیتوں کو دیکھ کر جب پنجابی مووی میکرز نے انہیں اپنی پنجابی فلموں میں پیش کیا تو پنجابی فلموں میں بھی وہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ نظر آئے۔ پنجابی فلموں کی ڈیمانڈ کے مطابق انہوں نے اپنی آواز، اپنی ڈائیلاگ ڈلیوری اور انداز اپنایا۔ کسی پہلو سے بھی انہوں نے شائقین کو یہ محسوس ہونے نہیں دیا کہ وہ پنجابی فلموں کے پرفارمر نہیں، اردو فلموں کے فنکار ہیں۔

غلام محی الدین کی پہلی پنجابی فلم ''قاتل تے فرشتہ'' تھی۔ انہوں نے مرکزی کردار ادا کیا تھا اور اپنی پہلی ہی فلم میں پنجابی فلم بینوں کو متاثر کر دیا تھا۔ اس فلم میں ان کی ہیروئن ممتاز تھیں۔ انتقام کے موضوع پر بننے والی اس فلم کے فلم ساز ایم اے نجم اور ہدایت کار الطاف حسین تھے، موسیقی قادر علی نے مرتب کی تھی۔ کاسٹ کے دیگر فنکار عفت چوہدری، صبیحہ خانم اور اسلم پرویز تھے۔ اسلم پرویز نے اس فلم میں ایک ڈاکو کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کے گیت حزیں قادری، نازش کشمیری اور بشیر کھوکھر نے لکھے تھے۔ ان کے پہلے ہی پرفارمنس نے ان پر پنجابی فلموں کے سارے دروازے کھول دیے تھے۔ غلام محی الدین کی پنجابی موویز درج ذیل ہیں۔

ماچھو، بلندا، چراغ بالی، گواہ تے بدمعاش، جگا ڈاکو، گجر بادشاہ، گجر دا ویر، رووی رانی، چن بدمعاش، مولا تے مکھو، بابل دا ویر، شیرو تے سلطان، مندری، سکندرا، میلا جٹ، ات خدا دا ویر، چوہدری بادشاہ، لاہوریا، شیر فلک، کوبرا، میری جنگ، قانون اپنا اپنا، لشکرا، کنگوا، شیر افگن، جنگ باز، شیر جنگ، سپرا، میرا انتقام، خان بہادر، کرما، چنگیزا، ناگن جوگی، پانی، ننگی تلوار، کالا ہیرا، ہوشیار، مجرم، اللہ وارث، سلطانہ، آخری ٹاکرہ، جیلر، شعلے ہی شعلے، آخری شکار، جادوگرنی، امانت، دہشت خان، مقدر، وڈیرا، جانی دشمن، اندھا قانون، آخری جنگ، بلو جانے ڈاکو، جانباز، بادل، کالا قانون، کمانڈو ایکشن، مولا بخش، حکومت، برداشت، مفرور، پیار تیرا میرا، دلاور خان، جال، آخری مقدمہ، مولا سائیں، آخری قتل، یارانہ، زبردست، ڈکیت، میرا چیلنج، ویرا، سارنگا، موسیٰ خان، شیر ملنگ، اشتہاری مجرم، اکودس نمبری، تخی بادشاہ، منڈا اشرارتی، فوجا، رانی خان، ٹکر، دوپٹا، ہتھیارا، سہاگ، جگ ماہی، بدمعاش، راکا، تحفہ یار دا، غازی علم دین شہید، کالیا، لاہوری ٹھگ، گجر دا کھڑاک، یار بادشاہ ان کے علاوہ بھی کچھ پنجابی فلمیں ہو سکتی ہیں۔

غلام محی الدین نے اپنے سے سینئر فنکاروں کے ساتھ بھی اداکاری کی اور ان کی موجودگی میں بھی اپنی صلاحیتوں کو منوایا۔ ایسی ہی ایک فلم تھی ''جیو اور جینے دو'' جس میں انہوں نے وحید مراد اور ندیم کے ساتھ کام کیا اور ان سے جونیئر ہونے کے باوجود جم کر اداکاری کی۔ اس فلم میں وہ وحید مراد کے بڑے بھائی اور ندیم کے فرزند ارجمند کے کردار میں نمودار ہوئے تھے جب کہ ان کی والدہ کا کردار شمیم آراء نے ادا کیا تھا۔ ندیم نے اس فلم میں بطور مہمان اداکار کے کام کیا تھا۔ ''جیو اور جینے دو'' شمیم آراء کی بطور ہدایت کارہ پہلی فلم تھی۔ شمیم آراء پروڈکشنز کے بینر تلے بننے والی اس فلم کی فلم ساز بھی شمیم آراء تھیں۔ اس کی کاسٹ میں غلام محی الدین، ممتاز، وحید مراد، شمیم آراء، کویتا، ندیم اور علاؤ الدین شامل تھے۔ ممتاز اس فلم میں غلام محی الدین کی ہیروئن تھیں۔ روبن گھوش ''جیو اور جینے دو'' کے موسیقار تھے۔ اس فلم نے سلور جوبلی کا اعزاز حاصل کیا تھا اس کی نمائش 5 نومبر 1976ء میں ہوئی تھی۔

گلو بھائی نے اپنے عروج کے دور میں ایک فلم پروڈیوس بھی کی تھی۔ یہ فلم ''آندھی اور طوفان'' تھی۔ ایس اے حافظ نے یہ فلم ڈائریکٹ کی تھی۔ اس کے اداکاروں میں شبنم، محمد علی، دردانہ رحمٰن، ننھا اور غلام محی الدین شامل تھے۔ موسیقی کمال احمد کی تھی۔ 7 ستمبر 1984ء کو یہ فلم نمائش پذیر ہوئی تھی۔

غلام محی الدین نے ''سورج'' کے نام سے بھی ایک فلم بنانی شروع کی تھی جس کے ہدایت کار اقبال یوسف تھے۔ اس فلم میں ان کی ہیروئن بابرہ شریف تھیں جب کہ محمد علی ایک اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب غلام محی الدین فلموں میں بے حد مصروف تھے اور ان کی انہی مصروفیات نے اس فلم کو مکمل ہونے نہیں دیا۔

غلام محی الدین صحیح معنوں میں ایک ورسٹائل فنکار ہیں جس روپ میں بھی انہیں پیش کیا گیا، اس میں کامیاب ثابت ہوئے۔ رومانوی کردار سے ابھرنے والے اس اداکار نے منفی کردار میں بھی اپنے آپ کو منوایا اور ایکشن ہیرو کے طور پر بھی فلم بینوں کی بھرپور داد وصول کی۔ ایسی ہی ان کی ایک فلم ''آنسو اور شعلے'' تھی جس میں انہوں نے ایک ایسے نوجوان کا کردار ادا کیا تھا جس کے ماں باپ کو اس وقت قتل کر دیا گیا تھا جب وہ بہت چھوٹے تھے اور انہوں نے یہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بعد ازاں جوان ہو کر وہ اپنے ماں باپ کے قاتل سے عبرت ناک انتقام لیتے ہیں اور ایکشن ہیرو کے روپ میں بھی اپنی پسندیدگی کا ایک در کھولتے ہیں۔ ویسٹرن اسٹائل کی ایکشن سے بھرپور اس فلم کے مصنف خورشید اللہ اور ہدایت کار ایس اے حافظ تھے۔

ایکشن کے حوالے سے یہ غلام محی الدین کی بہترین فلم تھی۔ فلم ساز ایس اے مجید کی اس فلم کے موسیقار امجد بوبی تھے۔ بابرہ شریف اس فلم میں غلام محی الدین کی ہیروئن تھیں۔ کہانی نویس خورشید اللہ نے بھی اس فلم میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ پہلے اس فلم کا نام ''خون کے آنسو'' رکھا گیا تھا۔ جسے بعد میں بدل کر ''آنسو اور شعلے'' کر دیا گیا۔ اس فلم نے سلور جوبلی کی۔ اس کی نمائش 16 اگست

www.PakiBooks.Site

1976ء کو ہوئی تھی جو عیدالفطر کا دن تھا۔

اسی 16 اگست 1976ء کو عید کے دن ریلیز ہونے والی ایک اور فلم ''محبت اور مہنگائی'' بھی تھی جس میں غلام محی الدین نے اداکار خالد سلیم موٹا کے دفتر میں کام کرنے والے ایک شخص کا کردار بڑے مزاحیہ انداز میں ادا کیا تھا۔ وہی اداکار جو ایک فلم میں غیض و غضب کا سمبل بنا نظر آتا ہے، دوسری فلم میں ایک شوخ و شنگ نوجوان کے روپ میں دیکھنے والوں کے لبوں پر مسکراہٹوں کی کلیاں کھلاتا ہے۔ یہ پی این آر پروڈکشنز کی فلم تھی اس کے فلم ساز رضا علی رضوی اور ہدایت کار و مصنف اقبال رضوی تھے۔ سنگیتا، کویتا، ندیم، غلام محی الدین، تمنا اور خالد سلیم موٹا اس فلم کی کاسٹ میں شامل تھے۔ موسیقار کمال احمد تھے۔ اس فلم نے گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا تھا۔

ایک ہی دن غلام محی الدین کی دو فلمیں ریلیز ہوئی تھیں جن میں وہ دو مختلف کرداروں میں جلوہ گر ہوئے تھے اور ان کا ہر روپ اداکاری کے حوالے سے قابل ستائش تھا۔ یہ ان کی فنی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اسی طرح غلام محی الدین کی ایک اور فلم ''آواز'' تھی جس میں اسے دولت کے نشے میں چور ایک اوباش نوجوان کے روپ میں پیش کیا گیا تھا۔ فلم ساز و ہدایت کار ظفر شباب کی اس فلم میں غلام محی الدین نے عام ڈگر سے ہٹ کر ایک اچھوتا کردار ادا کیا تھا۔ اس کا باپ (مسعود اختر) اور اس کی ماں (نجمہ محبوب) محمد علی کے ملازم تھے۔ وہ اپنے بیٹے غلام محی الدین کو بڑا آدمی بنانے کے لیے محمد علی کے اصل بیٹے کو چھپا کر رکھتے ہیں اور غلام محی الدین کو محمد علی کا بیٹا ظاہر کرتے ہیں۔ غلام محی الدین جب بڑا ہوتا ہے تو دولت ہی دولت دیکھتا ہے اور یہی دولت کا نشہ اسے ایک اوباش اور عیاش شخص بنا دیتا ہے۔ ایک دن تو اپنی ہی بہن پر نیت خراب کر بیٹھتا ہے۔ شبنم جو اس فلم کی ہیروئن تھیں اور وحید مراد پر فریفتہ تھیں اس سے کہتا ہے۔ ''رات کو بنگلے پر آنا خوش کردوں گا۔''

اس فلم کا آخری سین دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جب محمد علی اپنے بیٹے غلام محی الدین کے لیے مسعود اختر کی بیٹی کا رشتہ مانگتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ''میں اپنے بیٹے غلام محی الدین کی شادی تمہاری بیٹی سے کرنا چاہتا ہوں۔'' مسعود اختر کہتا ہے۔ ''سرکار! یہ نہیں ہوسکتا۔''

(ظاہر ہے کہ مسعود اختر کی بیٹی حقیقتاً غلام محی الدین کی بہن تھی جسے اس کے باپ نے محمد علی کا بیٹا بنادیا تھا)

''آواز'' کا یہ آخری سین فلم کا کلائمکس سین ہے۔ اس منظر میں محمد علی اور غلام محی الدین کی اداکاری قابل دید ہے۔ غلام محی الدین نے اس فلم میں جو منفی کردار ادا کیا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

اس فلم کی پُراثر کہانی شباب کیرانوی کی تحریر کردہ تھی۔ اچھی ہدایت کاری اور پاور فل اداکاری نے اس فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ ''آواز'' 93 ہفتے چلی یعنی 7 ہفتوں کی کمی سے ڈائمنڈ جوبلی سے محروم رہ گئی۔ اے حمید نے اس فلم کی موسیقی ترتیب دی۔ ان کے کمپوز کیے ہوئے گیتوں نے بھی اپنا حصہ احسن طریقے پر ادا کیا تھا۔ یہ فلم 17 اکتوبر 1978ء کو ریلیز ہوئی تھی۔

''آواز'' سے ملتا جلتا منفی کردار غلام محی الدین نے فلم ''کس نام سے پکاروں'' میں بھی ادا کیا۔ اس فلم کی کہانی ایک ایسے بچے کی ہے جسے معاشرہ ناجائز اولاد کا نام دیتا ہے پھر جب یہ بچہ بڑا ہوتا ہے تو اس میں بھی باپ کی طرح بری خصلتیں اجاگر ہوجاتی ہیں۔ شاید یہ خون کا اثر تھا۔ بڑا ہوکر یہ بچہ آوارہ، بدچلن اور عیاش بن جاتا ہے۔ اس فلم میں بھی اس کردار کو اس کی اپنی بہن سے وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کرتا دکھانے کی سعی کی گئی ہے جسے معاشرے میں اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن جب اس کردار کو حقائق کا علم ہوتا ہے تو اپنی آنکھیں پھوڑ لیتا ہے۔ غلام محی الدین نے اس قابل نفرین کردار میں اپنی فنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے جس کی وجہ سے ان کا یہ منفی کردار بھی یادگار بن گیا ہے۔

اس فلم کی کہانی ریاض شاہد کی تحریر کردہ ہے۔ اس کے فلم ساز حاجی محمد حنیف اور ہدایت کار ایس اے بخاری تھے۔ موسیقی نذیر علی نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم تین ہفتوں کی کمی سے گولڈن جوبلی نہ کرسکی یعنی ٹوٹل 47 ہفتے چلی۔

اس موقع پر ایک ایسی فلم کا ذکر نہ کرنا جس میں باپ بیٹے نے ایک ساتھ اداکاری کے جوہر دکھائے میرے قارئین کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔

ہمارے گلو بھائی نے اپنی سپرڈپر فلم ''میرا نام ہے محبت'' میں ایک گیت گایا تھا۔ تجھے پیار کرتے کرتے میری عمر بیت جائے، انہوں نے اپنی حقیقی زندگی میں بھی ایسا ہی پیار کیا ہے۔ خاص طور پر انہوں نے اپنے کام سے ایسا ہی پیار کیا ہے۔ اداکاری کرتے کرتے اس عمر کو پہنچ گئے کہ اب ان کے فرزند ارجمند علی محی الدین بھی ان کی طرح فلموں میں اداکاری کرنے لگے ہیں۔ دونوں باپ بیٹے کی ایسی ہی

www.PakiBooks.Site

فلم ''سوال سو کروڑ ڈالر کا'' ریلیز ہوچکی ہے جس میں علی محی الدین فلم کے ہیرو ہیں جنہوں نے عینی (قرۃ العین) کے ساتھ خوب صورت پیئر کے روپ میں یہ ثابت کردیا ہے کہ ان کے DNA میں اداکاری کس قدر موجود ہے جب کہ اس فلم میں ان کے والد گرامی (غلام محی الدین) نے خصوصی گیٹ اپ میں ایک منفرد رول کیا ہے۔ ان کا کردار رنگو کا ہے جو فلم کے فرسٹ ولن ہیں۔ یعنی باپ ولن اور بیٹا ہیرو کے روپ میں نظر آئے ہیں۔ یہ ہدایت کار جمشید جان محمد کی بہوی بجٹ سے بنائی ہوئی فلم تھی۔ یہ نوجوان ہدایت کار ماضی کے نامور ڈائریکٹر جان محمد جمن کے فرزند ارجمند ہیں۔ جان محمد جمن کی شناخت اس طور پر بھی ہوتی تھی کہ وہ عیدالفطر کے موقع پر بلاک بسٹر فلمیں پیش کرنے میں مشہور تھے۔ ان کی فلمیں ہانگ کانگ کے شعلے، بینکاک کے چور، نیلا کی بجلیاں، انٹرنیشنل گوریلے، چوروں کا بادشاہ، عالمی جاسوس، روپ کی رانی، عیدالفطر کے مواقع پر ریلیز ہوئیں اور سپر سے اوپر ثابت ہوئیں۔ ان کے بیٹے جمشید جان محمد نے بھی 2016ء کی عیدالفطر کے موقع پر اپنی فلم ''سوال سو کروڑ ڈالر کا'' پیش کی۔ جس کو ہر طرح سے کامیاب بنانے کے لیے اس کے فلم ساز شاہد قریشی اور ہدایت کار جمشید جان محمد نے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کی شوٹنگز تھائی لینڈ (بینکاک) اور سری لنکا کے علاوہ ممبئی (انڈیا) میں بھی کی گئی۔ ممبئی میں اس فلم کا ایک آئٹم سانگ پکچرائز کیا گیا۔ اس فلم کے کئی گانے بالی ووڈ کے سنگرز کے تعاون سے مکمل کیے گئے۔ پانچ گانے الکا یاگنک، شان، محمد عرفان، خوشبو جبیں اور کلپنا نے گائے۔ چونکہ یہ فلم ایکشن موی تھی اس لیے اسے انگریزی فلموں کی طرح CGI جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ مکمل کیا گیا جس کی وجہ سے حیران کن ویژول ایفکس شامل کیے گئے۔ سنیما ٹو فوٹو گرافی بھارت کے معروف عکاس سندیپ تیاگی نے کی۔ جب کہ اس کی کاسٹ میں بھی سپر اسٹارز کا تعاون حاصل کیا گیا۔ جاوید شیخ، غلام محی الدین، شمعون عباسی، اسماعیل تارا، افتخار ٹھاکر، ببرک اعجاز اور قیصر مستانہ (مرحوم) شامل تھے جبکہ علی محی الدین اور عینی کو پہلی بار متعارف کرایا گیا تھا۔ جاوید شیخ نے اس فلم میں ٹائیگر نامی انٹرنیشنل چور کا کردار ادا کیا جب کہ غلام محی الدین نے رنگو کے رول میں ''ہانگ کانگ کے شعلے'' کے رنگو کی یاد تازہ کردی تھی۔ (رنگو... کا کردار ادیب نے ادا کیا تھا)

پہلی کارکردگی

پہلا ریڈیو پروگرام بزم طلبہ کا ڈاکٹر فورلیس، پہلا اسٹیج ڈراما ''انسان اور انسانیت''۔ پہلا ٹی وی ڈراما ''ٹیپو سلطان'' پروڈیوسر کنور آفتاب۔ پہلا کمرشل فلم بطور ماڈل ایک ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار۔ پہلی فلم دل والے مگر ریلیز ہونے والی پہلی فلم شکوہ۔

جوبلیاں

ڈائمنڈ جوبلی فلمیں۔ اناڑی، آج اور کل۔ پلاٹینیم جوبلی فلمیں انتخاب، آواز۔ گولڈن جوبلی فلمیں میرا نام ہے محبت، محبت اور مہنگائی۔ سلور جوبلی فلمیں شکوہ، انسان اور فرشتہ، گونج، کندن، آگ ہی آگ، جیو اور جینے دو، آنسو اور شعلے، کس نام سے پکاروں، آندھی اور طوفان۔ سندھی فلمیں باغی D/V، وڈیرہ سائیں۔ پشتو فلمیں د انصاف قافلہ، زما فیصلہ، ملنگ باچا، بٹ خمار، زما پیغام، داکرائے گوریلا، بدگمان، سرلمبے۔

ڈبل ورژن فلمیں

حسینہ 420، رنگیلے جاسوس، امیر خان، انٹرنیشنل گوریلے، کالے چور، عالمی جاسوس، جوشیلے، محبت کے سوداگر، حسینوں کی بارات، دنیا دس نمبری، ڈاکو راجا، ڈنڈے کا دور، بچارو گروپ، بت شکن، جنگل کا قانون، میڈم رانی، عالمی غنڈے، ہم نہیں یا تم نہیں، مس قلوپطرہ۔

نامکمل فلمیں

فلسطین میرا پیار (ہدایت کار کنور آفتاب)، جذبہ (ہدایت کار پرویز کلیم)، بہارو گواہ رہنا (ہدایت کارہ شمیم آراء)، جوشیلے (ہدایت کار محمد جاوید فاضل)، شریکا (ہدایت کار ناصر غزالی)، سورج (ہدایت کار اقبال یوسف)، قسمت کا فیصلہ (ہدایت کار محمد حسین مداری)، جاگو ہوا سویرا (کاسٹ کویتا، غلام محی الدین)، آخری گناہ (کاسٹ آرزو، غلام محی الدین)، آدھی لڑکی، ڈینجر مین (کاسٹ نجمہ، غلام محی الدین)، لو اسٹوری (غلام محی الدین، نجمہ)، راجو کراچی والا (ممتاز، غلام محی الدین)، کنوارا (ہدایت اقبال رضوی)

www.PakiBooks.Site

قصہ مختصر یہ کہ جمشید جان محمد نے اس فلم کو کامیاب بنانے میں اپنی جانب سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر افسوس کہ وہ اپنے والد جان محمد جمن کی طرح کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

غلام محی الدین کی ایک فلم ''انسان اور فرشتہ'' تھی۔ اس فلم کے بارے میں تو بتا چکا ہوں۔ غلام محی الدین کے متعلق یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ انسان کے روپ میں فرشتہ تھے۔ انہوں نے فلموں میں بھلے شیطان صفت کردار ادا کیے مگر وہ حقیقی زندگی میں بڑے بھلے مانس ہیں۔ ان کا تعلق ایک انتہائی مہذب، متمدن اور تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے جس کے اثرات ان کے ہر قول و فعل میں نظر آتے ہیں اس لیے ہمارے گلو بھائی انتہائی نیک، خوش اخلاق، ملنسار، مہذب، ہنس مکھ، سادہ دل، سادہ طبیعت، یاروں کے یار اور ایک ہمدرد انسان ہیں۔ ان کی ہمدردی اور اعلیٰ ظرفی کی کئی مثالیں ہیں مگر میں ایک دو مثال ہی اس موقع پر دوں گا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب غلام محی الدین اپنی فلموں میں خاصے مصروف تھے۔ انہیں اطلاع ملی کہ پاکستانی فلموں کے سینئر اداکار راشد بیمار ہیں اور کراچی کے ایک اسپتال میں زیر علاج ہیں گلو بھائی اپنی مصروفیت کے باوجود وقت نکال کر اسپتال پہنچ گئے اور پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے آپ کو؟''

''دل کی تکلیف میں مبتلا ہوں۔'' راشد نے جواب دیا۔ پھر پوچھا۔ ''تم کہاں سے آئے ہو؟''

''میں ان دنوں لاہور میں ہوں۔ وہاں کی کئی فلموں میں کام کر رہا ہوں۔ جیسے ہی آپ کی علالت کی خبر ملی، آپ سے ملنے کے لیے کسی نہ کسی طرح وقت نکالا اور آ گیا۔''

''بہت شکریہ! تم لاہور سے آ گئے جب کہ یہاں کراچی میں رہنے والوں کو میری مزاج پرسی کا وقت نہیں ملتا، میں تمہارا مشکور ہوں۔''

''آپ اپنا علاج تو صحیح طریقے پر کروا رہے ہیں نا؟''

اداکار راشد نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ انہیں گومگو کی حالت میں دیکھ کر غلام محی الدین نے بڑی محبت سے کہا ''بات کیا ہے؟ آپ بے جھجک ہو کر بتایئے۔''

راشد نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''بات یہ ہے کہ ابھی تک میرا علاج شروع ہی نہیں ہوا ہے۔''

''کیا مطلب ہے! میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر میرے علاج کے لیے 25 ہزار روپے کا خرچ بتا رہے ہیں اور اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔''

غلام محی الدین، راشد کی باتیں سن کر خاموش رہے۔ کچھ بولے نہیں مگر اسی دن وہ اداکار راشد کے گھر گئے اور ان کے گھر والوں کو ایک بند لفافہ دے کر کہا۔ ''اسے آپ راشد صاحب کو دے دیجیے گا۔''

اس کے بعد غلام محی الدین لاہور واپس چلے گئے اور کسی کو کچھ نہیں بتایا۔

ان تمام باتوں کا انکشاف اس وقت ہوا جب کچھ دنوں کے بعد اداکار راشد کا ایک خط ہفت روزہ نگار کراچی میں شائع ہوا۔ انہوں نے اس خط میں اپنی اور اپنے علاج کے سلسلے میں مدد کرنے کی ساری روداد لکھنے کے بعد تحریر کیا۔ ''میں غلام محی الدین کا بہت احسان مند ہوں۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم اداکار ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان بھی ہیں۔''

ایسا ہی ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ غلام محی الدین وطن عزیز کے شمالی علاقوں میں اپنی ایک فلم کی شوٹنگ کر رہے تھے۔ یہ ایسا علاقہ تھا جہاں اخبار نہیں پہنچتے۔ ان ہی دنوں کی بات ہے اداکار حنیف کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ جب گلو بھائی اپنی اس آؤٹ ڈور شوٹنگ سے فارغ ہو کر لاہور واپس آئے تو انہیں حنیف کی وفات حسرت آیات کا علم ہوا۔ لہٰذا انہوں نے فوری طور پر کراچی آنے کا پروگرام بنایا اور پھر کراچی آ کر کچھ دوستوں کے ساتھ حنیف کی قبر پر پہنچے، فاتحہ خوانی کی اور قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی جب کہ کراچی میں رہتے ہوئے حنیف کے بہت سے ساتھیوں اور دوستوں کو اس کی میت میں شریک ہونے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔

غلام محی الدین نے اپنے ابتدائی دور سے اب تک اپنے اعلیٰ کردار اور اعلیٰ ظرفی کا ہر موقع پر ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے اپنے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو بھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وہ ایسے اداکار ہیں جن کا کبھی کوئی اسکینڈل نہیں بنا۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والے اداکار ہیں۔ وہ نہ صرف دلکش خدوخال، پُرکشش آنکھوں اور پُراثر آواز کے مالک ہیں بلکہ ایک باوقار شخصیت کے حامل ہیں بلکہ ایک خوش اخلاق، ملنسار، انسان دوست انسان بھی ہیں۔ جن لوگوں نے انہیں ان کے ابتدائی دنوں سے دیکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ غلام محی الدین جب مختصر ترین کرداروں میں پیش کیے جاتے تھے،

www.PakiBooks.Site

تب بھی اسی خلوص، محبت، لگن اور محنت سے کام کیا کرتے جس طرح سپر اسٹار بننے کے بعد کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے کام سے پہلے بھی مخلص تھے اور آج بھی ہیں۔ ان کی کامیابی کا راز یہی بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک دیانتدار انسان ہیں۔ جس کام کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ اس میں رتی برابر کوتاہی نہیں برتتے۔

ان کے قریبی دوست احباب انہیں پیار سے گلو بھائی کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان کی بیگم منور سلطانہ اپنے شوہر کو گل کہہ کر پکارتی ہیں جب کہ وہ اپنی بیگم کو سونا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

بات بیگم کی چلی ہے تو یہ بتانا ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کی بیگم منور سلطانہ کون ہیں۔ منور سلطانہ ایک سابق اداکارہ ہیں۔ انہوں نے کئی ٹی وی ڈراموں میں کام کیا ہے ان میں مشہور ڈراما ''خدا کی بستی'' بھی شامل ہے۔ اس میں انہوں نے سلطانہ کا کردار بڑے احسن طریقے سے ادا کیا تھا۔ وہ ایک ڈراما ''سکون'' میں غلام محی الدین کے ساتھ بھی کام کر چکی ہیں۔ پی ٹی وی کے ڈراموں میں کام کرنے کے دوران ہی دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے پھر جب شریک حیات منتخب کرنے کا وقت آیا تو دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے اور منور سلطانہ نے مکمل طور پر ہاؤس وائف بن کر زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اداکاری چھوڑ دی۔

گلو بھائی کا ذکر خیر کرتے ہوئے ان کی پہلی ذاتی فلم ''آندھی اور طوفان'' کے بارے میں بتا چکا ہوں مگر وہ سرسری طور پر چند سطروں میں بیان کیا گیا تھا۔ ان کے پرستاروں کو شاید شکایت ہو کہ ان کے محبوب فنکار کا اتنا بڑا واقعہ چند سطروں میں بیان کر کے میں نے ان کے ساتھ اور گلو بھائی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ لہٰذا گلو بھائی کے اس زندگی نامے میں اس فلم کا تفصیلی احوال بیان کر رہا ہوں۔

گلو بھائی کے کچھ فلمی دوستوں نے ان سے کہا۔ ''ہماری فلم انڈسٹری میں اکثر لوگ فلموں سے کمائے ہوئے پیسوں سے فلم بنا کر فلمی صنعت کو کچھ تقویت پہنچاتے ہیں۔''

''ہاں ایسا اکثر ہوتا ہے۔''

''تم نے بھی تو فلموں سے اتنا کمایا ہے۔ تم کب فلم بنا رہے ہو؟''

''یارو! فلم بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ میں اپنی فلموں میں اتنا مصروف رہتا ہوں۔ اگر فلم بناؤں گا تو اس کے لیے وقت کہاں سے نکالوں گا؟''

''ہاں یار! یہ تو تم درست کہہ رہے ہو فلم سازی کے لیے وقت تو نکالنا پڑے گا۔''

اس وقت تو یہ بات یہیں تک رہی مگر گلو بھائی اکثر تنہائی میں سوچنے لگے۔ میں نے فلم انڈسٹری سے اتنا کچھ حاصل کیا ہے تو اسے کچھ لوٹانا بھی چاہیے پھر اس سلسلے میں انہوں نے کچھ تجربہ کار لوگوں سے مشورہ بھی کیا۔ سب نے یہی کہا۔ ''اپنی فلمی مصروفیات میں سے وقت نکال کر فلم سازی پر بھی توجہ دینی پڑے گی۔ اگر تم اپنے آپ کو اس پر عمل پیرا کر سکو تو فلم بنا سکتے ہو۔''

اور کچھ دنوں کے بعد ایک دن وہ نامور فلم رائٹر ناصر ادیب سے ملے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولے۔ ''سر جی! میرا ارادہ ہو رہا ہے ایک فلم پروڈیوس کرنے کا۔''

''ماشاءاللہ! اچھا ارادہ ہے مگر......''

''مگر کیا؟'' گلو بھائی نے قطع کلامی کرتے ہوئے ناصر ادیب صاحب سے سوال کر دیا۔

''مگر یہ کہ فلم بناؤ تو بہت سوچ سمجھ کے۔''

''اسی لیے تو آپ سے مشورہ کر رہا ہوں۔ بتایئے کن باتوں پر مجھے سوچنا اور غور و فکر کرنا پڑے گا؟''

''دیکھو بھائی! تمہارا کوئی بھینسوں کا باڑہ نہیں ہے۔ نہ ہی تم کوئی ایسا ویسا دھندا کرتے ہو کہ اپنے بلیک منی کو وائٹ کرنے کے لیے فلم بناؤ گے۔ تمہارے پاس جو پیسا ہے وہ بڑی محنت سے کمایا ہوا ہے اس لیے فلم بناؤ تو ایسی بناؤ جو لگایا ہوا سرمایہ واپس لانے کے ساتھ کچھ کما کر بھی دے۔''

''جی ہاں! یہ تو بنیادی بات ہے اور اسی مقصد سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ کوئی ایسی کہانی لکھیں جس پر ایک کامیاب فلم بنے جو دیکھی اور پسند کی جائے۔''

ناصر ادیب ذرا دیر خاموش رہے پھر بولے۔ ''بتاؤ تم کس نوعیت کی فلم بنانا چاہتے ہو؟''

''بس ایسی فلم ہو جو پسند کی جائے، چلے اور کما کر دے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کوئی ایسی ہی کہانی لکھنے کی کوشش کروں گا۔''

غلام محی الدین نے اطمینان کا سانس لیا اور اٹھتے ہوئے ایک لفافہ ان کو دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے رکھیے کہانی فائنل ہونے کے بعد باضابطہ ایگریمنٹ کر لیا جائے گا۔''

www.PakiBooks.Site

کچھ دنوں کے بعد انہیں ناصر ادیب صاحب کا پیغام ملا کہ تمہارا کام ہوگیا ہے گلو بھائی ان سے ملے اور کہانی ان کی زبانی سنی تو بولے۔ ''بہت اچھی ہے مگر مار دھاڑ سے بھرپور ایکشن فلم کی کہانی ہے۔''

''اگر اس کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق فلم بناؤ گے تو اس کی کامیابی یقینی ہے۔''

گلو بھائی خاموش رہے کچھ بولے نہیں۔ انہیں سوچتا ہوا دیکھ کر ناصر ادیب بولے۔ ''فلم مختلف لوگوں کے تعاون سے بنتی اور کامیاب ہوتی ہے اگر ٹیم ورک اچھا ہوگا تو کامیابی کی توقع کی جاسکے گی۔''

''اس فلم کا نام کیا ہونا چاہیے؟''

''میرے ذہن میں ایک نام ہے اور اس کہانی کی مناسبت سے وہ نام ''آندھی اور طوفان'' ہے۔''

''جی ہاں، کہانی کی مناسبت سے یہی نام مناسب ہے مگر اس نام سے شاید انڈیا میں بھی کوئی فلم بن چکی ہے۔''

''کوئی ایک فلم نہیں، وہاں اس نام سے چار فلمیں بن چکی ہیں اگر وہ لوگ ایک نام سے چار فلمیں بنا سکتے ہیں تو ہم اپنے ہاں اس نام سے کوئی فلم کیوں نہیں بنا سکتے۔''

''ٹھیک ہے۔ یہی نام ہم بھی اپنی فلم کا فائنل کر لیتے ہیں۔ اب یہ بتائیے آپ کے تخلیق کردہ کرداروں کے لیے کن آرٹسٹوں کو سائن کیا جائے؟''

''بھئی! یہ کام تو تمہارا ڈائریکٹر ہی بہتر طریقے پر کر سکے گا۔ تم نے کسی ڈائریکٹر سے کوئی معاہدہ کیا ہے؟''

''جی ہاں، ایس اے حافظ صاحب سے بات پکی کر لی ہے۔''

''تمہارا انتخاب غلط نہیں ہے۔ ایس اے حافظ اچھے اور تجربہ کار ہدایت کار ہیں۔ توبہ، شکار، راجا جانی جیسی کامیاب فلمیں بنا چکے ہیں۔ کمار صاحب جیسے لیجنڈ اداکار کے فرزند ارجمند ہیں۔ اپنے اخلاق اور آداب کے لحاظ سے بھی اپنے والد گرامی کی طرح نفیس انسان ہیں۔''

''تو میں یہ سمجھوں کہ میں نے ایک اچھے ہدایت کار کی خدمات حاصل کر لی ہیں؟''

''ہاں اب تم یہ کہانی ان کے ساتھ ڈسکس کرو، اگر وہ اس میں کوئی ردوبدل کرنا چاہیں تو مجھے بتاؤ اور آرٹسٹوں کے بارے میں بھی ان سے مشورہ کرو۔''

''آپ کو اس کے مکالمے بھی لکھنے ہیں۔ وہ آپ کب لکھیں گے؟''

''جب تم لوگ آرٹسٹوں کا انتخاب کر لو گے۔ ان آرٹسٹوں کی مناسبت سے ان کے ڈائیلاگ تحریر کروں گا۔''

پروڈیوسر غلام محی الدین نے ناصر ادیب کی لکھی ہوئی کہانی ڈائریکٹر ایس اے حافظ کو دی اور کہا۔ ''اسے پڑھ کر بتائیے۔ کیسی کہانی ہے؟ آپ کے خیال سے اس میں کوئی تبدیلی ممکن ہے یا نہیں؟ اور کس کردار کے لیے کون سا آرٹسٹ مناسب ہوگا یہ بھی آپ کی پسند سے ہوگا۔''

ایس اے حافظ تجربہ کار ہدایت کار تھے۔ کہانی نام ادیب جیسے سینئر کہانی نویس کی تھی اس لیے بڑے دھیان سے پڑھا اور گلو بھائی سے بولے۔ ''دیکھو بھائی! یہ ایک فل ایکشن فلم ہے۔ ناصر ادیب صاحب نے جس انداز میں اسے لکھا ہے اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ بڑے اور ٹاپ اسٹار انہیں پر فارم کریں۔''

''ناصر صاحب نے کہا ہے کہ حافظ صاحب ہی کی پسند سے آرٹسٹوں کا انتخاب کیا جائے۔''

''میں نے اپنے طور پر جن فنکاروں کا انتخاب کیا ہے ان کی وجہ سے بجٹ ذرا بیوی ہو جائے گا۔''

''اب جب سر اوکھلی میں ڈالا ہے تو.....'' گلو بھائی مسکراتے ہوئے بولے۔ ''آپ بتائیے تو.....''

''اب اپنا دل تھام کر بیٹھیے اور سنیے۔ رحمداد خان کے کردار کے لیے محمد علی، فلم کی ہیروئن شبنم کے لیے شبنم، نادر خان کے لیے غلام محی الدین جو کہانی کے حساب سے ہیرو ہے۔ فخر الدین کے لیے ننھا، رنگیلے کے لیے رنگیلا، دارا ڈاکو کے لیے حبیب۔ جگو کے لیے ادیب، منگو کے لیے ہمایوں قریشی، آئی جی پولیس کے لیے اسلم پرویز، اللہ رکھی کے لیے نیر سلطانہ، شہباز خان کے لیے مصطفیٰ قریشی، شہباز خان کی بیوی بانو کے لیے بانو۔''

حافظ صاحب رکے تو گلو بھائی نے ایک لمبی سانس لی۔ ان کی کیفیت دیکھ کر ان کے ڈائریکٹر نے کہا۔ ''آپ اگر اس میں کوئی ردوبدل کرنا چاہتے ہیں کسی سپر اسٹار کی جگہ کوئی کم معاوضے کا.....''

گلو بھائی نے جھٹ بول کر انہیں آگے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ ''نہیں حافظ صاحب! آپ کی چوائس فائنل ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔''

''کچھ چھوٹے موٹے کرداروں کے لیے جن آرٹسٹوں کو لیا جاسکتا ہے وہ بھی میں نے سوچ لیا ہے اور وہ ہیں احمد حسین، اعجاز اختر، زیدی سعید، اختر شاد، ننھو، منگو،

www.PakiBooks.Site

ہاں اور چائلڈ اسٹار علی امین مانی۔''

''ٹھیک ہے حافظ صاحب مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ باقی بھی تو کچھ لوگ ہیں۔ ان کے بارے میں بھی آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔''

''باقی لوگوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''میری مراد پس پردہ ہنرمندوں سے ہے۔''

اور یہ کام بھی ہدایت کار اور فلم ساز کی مشترکہ پسند سے انجام دے دیا گیا۔ عکاسی کا شعبہ علی اظہر زیدی کو سونپا گیا۔ موسیقی کے لیے کمال احمد سے معاہدہ کیا گیا۔ نغمہ نگاری کے لیے سعید گیلانی اور قاضی اعجاز کا انتخاب کیا گیا۔ حاجی محی الدین کو آرٹ ڈائریکٹر کے طور پر چنا گیا۔

پروڈکشن آفس کے لیے ایور نیو اسٹوڈیو میں کمرا بک کروایا گیا اور فلم سازی کا کام باضابطہ شروع کر دیا گیا۔ اب فلم ''آندھی اور طوفان'' سے متعلق تمام لوگ اسی دفتر میں آنے لگے۔

اس فلم کے کرداروں کا انتخاب ہوگیا تو ناصر ادیب صاحب کو وہ نام دیئے گئے۔ انہوں نے کاغذ پر درج ان ناموں کو دیکھ کر کہا۔ ''اس سے بہتر انتخاب نہیں ہوسکتا اگر میں بھی اپنے کرداروں کے لیے فنکاروں کا انتخاب کرتا تو کم و بیش یہی لوگ ہوتے۔ اب مجھے ان کے مکالمے لکھنے میں آسانی ہوگی۔ ان کی شخصیت کو سامنے رکھ کر ان کے ڈائیلاگس تحریر کروں گا تو فلم دیکھنے والوں کو ان میں حقیقت کا رنگ نظر آئے گا۔''

ناصر ادیب صاحب نے قانون کی بالادستی پر مبنی ایک خوب صورت اور بہترین کہانی لکھی تھی جس میں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ مجرم چاہے کتنا بھی طاقت ور کیوں نہ ہو، قانون سے زیادہ طاقتور نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے قانون کے ایسے آفیسرز کو ہائی لائٹ کیا جو قانون کی بالادستی کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے شہنشاہ جذبات محمد علی اور گریٹ مصطفیٰ قریشی کے لیے خوب صورت کردار تحریر کیے تو دوسری طرف منفی کرداروں دارا ڈاکو (حبیب) اور جگو (ادیب) اور منگو (ہمایوں قریشی) جیسے جاندار اور شاندار کردار بھی تخلیق کیے اور ان تمام بھلے اور برے کرداروں کو پرفارم کرنے والے فنکاروں کی مناسبت سے ایسے مکالمے تحریر کیے کہ شائقین داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

''آندھی اور طوفان'' کے ایک دو جذباتی مناظر کی

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

موسم کی بدلتی صورتیں
اکتوبر کے شمارے کی نکہتیں

اولین صفحات

خود اعتمادی کامیابی کی کنجی ہے جس کے ذریعے ہر منزل پر پہنچا جاسکتا ہے۔ ایک کم ہمت شخص کی داستانِ حیات، کاشف زبیر کے قلم سے.....

انگارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتی طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت.....

عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سروق کے رنگ

جرائم کی دنیا سے منسلک ہوجانے والوں کا عبرت انگیز ماجرا

مسائل و مصائب سے گھبرا کے غلط راہوں کا انتخاب کرنے والوں کا انجام

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

www.PakiBooks.Site

اگر منظر کشی کروں تو شاید آپ کو بھی مزہ آجائے۔

یہ وہ منظر ہے جب نادر خان (غلام محی الدین) کو معلوم ہوتا ہے کہ دارا (حبیب) کوئی شریف آدمی نہیں بلکہ ایک ڈاکو ہے تو وہ گھر آکر دیوار سے حبیب کی تصویر اتار کر پھینکتا ہے دونوں کے مکالمے کچھ یوں ہیں۔

نادر خان! میں اپنی ماں کو کعبہ کہوں اور میرے کعبے پر ایک ڈاکو کا سایہ پڑے۔ نہیں نہیں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔

حبیب! (دارا) میری بے عزتی تمہاری غیرت کی دلیل ہے بیٹے۔

نادر خان! مجھے بیٹا مت کہو اگر میرے بس میں ہو تو میں 20 سال پہلے والے وہ لمحات واپس لے لوں جب میں نے تمہیں چاچا اور میری ماں نے تمہیں بھائی کہا تھا۔

حبیب! ٹھیک ہے، ٹھیک ہے تمہارا غصہ بجا ہے۔ تمہاری مجھ سے نفرت سر آنکھوں پر مگر بیٹے! جہاں سر اٹھا کر اتنی بڑی سزا دے رہے ہو وہاں سر جھکا کر یہ بھی سوچو کہ بیس سالوں میں دارا نے کون سا ڈاکا ڈالا ہے؟ دیکھو بیٹے دنیا کو لوٹنے والے دن رات محنت مزدوری نہیں کیا کرتے۔ ان کے ہاتھوں کی لکیریں مٹا نہیں کرتیں۔ ان کے بالوں میں اتنی جلدی سفیدی نہیں آیا کرتی اور ایک اتنا بڑا ڈاکو ایک چھوٹے سے بچے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی نہیں مانگا کرتا۔

دوسرا منظر وہ ہے جب محمد علی رنگ پور کے تھانے کا چارج سنبھالتے ہیں تو تھانے میں حبیب اور ان کے درمیان کچھ یوں مکالمے ہوتے ہیں۔

محمد علی: (تھانے کی دیوار پر لگی دارا کی تصویر کو پھاڑتے ہوئے سپاہیوں سے کہتے ہیں) اس پورے علاقے میں یہ ایک ہی مفرور ہے؟

سپاہی: سر اس ایک مفرور کے پیچھے 101 آفیسرز معطل ہو چکے ہیں۔ اسی وقت حبیب کی انٹری ہوتی ہے جو محمد علی سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

حبیب: اچھا کیا یہ تصویر اگر تھانے میں ہو تو رات کو نیند نہیں آتی۔

محمد علی: اچھا کیا تم خود ہی آگئے ورنہ میں جس مجرم کو پکڑ کر لاتا ہوں وہ آدھے راستے ہی میں ختم ہو جاتا ہے۔

حبیب: میرا اصول ہے میں آنے والے ہر آفیسر کو پہلے حصہ دیتا ہوں۔ لے لے تو صرف معطل ہوتا ہے نہ لے تو مر جاتا ہے۔

محمد علی: حبیب کے ہاتھ سے رقم لیتے ہوئے کہتے ہیں مرنے سے پہلے یہ بھی بتا دو کہ لوٹ کا باقی مال کہاں ہے؟

حبیب: دارا جس کا دشمن ہو جائے اس کے سر کے بال ایک رات میں سفید ہو جاتے ہیں۔

محمد علی! دارا قانون کا دشمن جب بھی میرے سامنے آتا ہے وہ واپس گھر نہیں جاتا۔

حبیب! اور میرے پیچھے آنے والا کبھی واپس نہیں آیا۔

غلام محی الدین کی ملٹی اسٹار فلم ''آندھی اور طوفان'' جہاں اپنی پُراثر کہانی، زوردار مکالمے اور چست اسکرین پلے کی وجہ سے فلم بینوں کی توجہ کا مرکز بنی وہاں اس کے مسحور کن گیتوں نے بھی فلم کی کامیابی میں اپنا کردار ادا کیا۔

موسیقار کمال احمد کی دل کش دھنوں پر سعید گیلانی اور قاضی اعجاز نے بڑے خوب صورت گانے لکھے جنہیں مہناز، اے نیر اور ناہید اختر نے اپنی آوازوں میں پیش کیا جو پیش خدمت ہیں۔

☆ رات کے سناٹے میں جب یاد کسی کی آتی ہے (یہ گیت شبنم پر پکچرائز ہوا)

☆ پیار مانگتی ہوں میں تم سے جانِ جاناں (شبنم اور غلام محی الدین پر فلمایا گیا)

☆ کیسا انسان ہے تو دشمنِ جان ہے تو (شبنم اور غلام محی الدین پر عکس بند کیا گیا)

واضح رہے کہ ناہید اختر نے اسے گایا اور اس گانے کے درمیان غلام محی الدین بھی شامل ہیں۔ یعنی درمیان میں ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ اس طرح وہ بھی گلوکاروں میں شامل ہو گئے۔

☆ کیا رنگ بدلتا ہے زمانہ۔ میرے آگے ہوتا ہے روز تماشا (پکچرائزیشن، سیاں اور گلو)

☆ آج ہم ایسا جلوہ دکھائیں گے (شبنم، نمو، رنگیلا اور ننھا پر پکچرائز کیا گیا)

اس فلم میں پرفارمنس کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ تمام فنکاروں کی کردار نگاری لاجواب تھی۔ اس ایکشن مووی میں سارے ہی پرفارمرز نے اپنے کرداروں میں شاندار اداکاری کے جوہر دکھائے۔ شہنشاہ جذبات محمد علی اور ملکۂ جذبات نیر سلطانہ کے کردار فلم کی بنیاد ہیں۔ ان دونوں نے اپنے کرداروں میں نہایت

www.PakiBooks.Site

اعلیٰ پرفارمنس دی ہے۔ فلم کے ٹائٹل کرداروں یعنی آندھی اور طوفان کو سینئر فنکاروں ہمایوں قریشی اور مصطفیٰ قریشی نے بہترین طور پر ادا کیا ہے۔ غلام محی الدین تو ایکشن کے بادشاہ ہیں انہوں نے زبردست ایکشن پرفارمنس پیش کی ہے۔ شبنم ان کی ہیروئن اور رنگیلا کی بہن کے کردار میں بہت اچھی لگی ہیں۔ دونوں بہن بھائی ایک ہوٹل چلاتے ہیں اور پولیس کی مخبری بھی کرتے ہیں۔ رنگیلا نے جی بھر کر ہنسایا۔ ننھا کی جوڑی مصطفیٰ قریشی کے ساتھ ہے۔ دونوں پولیس کے سپاہی ہیں۔ انہوں نے بھی خوب ہنسایا ہے۔ ان دونوں پر آخر میں ایک گیت بھی فلمایا گیا ہے۔ ادیب نے بھی ہمایوں قریشی کے باپ اور حبیب کے ایک مکار ساتھی کے کردار کو بخوبی ادا کیا ہے۔ حبیب نے شروع میں خطرناک ڈاکو اور بعد میں ایک مجبور مزدور کے رول میں لاجواب کردار نگاری کی ہے۔ نمو، گلو، سیاں اور اسلم پرویز نے اس فلم میں بطور مہمان اداکار کام کیا تھا۔ اسلم پرویز نے آئی جی پولیس، نمو نے غلام محی الدین سے پیار کرنے والی لڑکی کے کردار کیے ہیں۔ سیاں اور گلو پر ایک خوب صورت گیت ''کیا رنگ بدلتا ہے زمانہ۔ میرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا'' بڑی خوب صورتی سے پکچرائز کرایا ہے۔ مجموعی طور پر فلم کا یہ شعبہ لاجواب ہے۔

اس بات کا کریڈٹ فلم کے ہدایت کار ایس اے حافظ کو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی ملٹی اسٹار کاسٹ سے کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق کام لیا۔ اداکاری کی طرح فلم کے دیگر تمام شعبوں پر بھی ان کی گرفت مضبوط رہی۔ خاص طور پر اس ایکشن مووی کے مار دھاڑ کے مناظر انہوں نے بڑی چابکدستی سے فلمائے۔ بڑے آرٹسٹوں کو اپنی ہدایات پر کام کروانا ذرا مشکل ہوتا ہے مگر حافظ صاحب نے یہ مشکل کام بھی بڑی مہارت سے کیا ہے۔ ایک لحاظ سے ناصر ادیب کی کہانی بڑی پیچیدہ تھی مگر ایس اے حافظ نے اپنی ہدایت کارانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے اس کہانی کو بھرپور تاثر کے ساتھ سلولائیڈ پر منتقل کیا اگرچہ حافظ صاحب کی وجۂ شہرت فلم ''توبہ'' ہے جو ایک تہذیبی اور معاشرتی فلم تھی اس فلم نے سپرہٹ کامیابی حاصل کر کے گویا انہیں سوشل فلموں کے ہدایت کار کی چھاپ لگا دی تھی مگر بعد میں انہوں نے کئی کامیاب ایکشن فلمیں بنا کر ثابت کیا کہ وہ ہر طرح کی فلمیں تخلیق کر سکتے ہیں۔

گلو بھائی کی بحیثیت فلم ساز یہ پہلی فلم تھی جو کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔ اس میں لگایا ہوا سرمایہ منافع کے ساتھ واپس آیا۔ اس موقع پر یہ بتانا ضروری ہے کہ اس ملٹی اسٹار فلم کے اخراجات جب تیزی سے بڑھنے لگے تو انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ کسی دوسرے کو شریک فلم ساز کے طور پر شامل کریں اور انہوں نے افضال حسین بھٹی صاحب کو اپنی فلم کا پروڈیوسر بنایا۔ وہ چاہتے تو ایسا نہ بھی کر سکتے تھے مگر اس طرح فلم سے وابستہ افراد کی ادائیگی میں کچھ دشواری پیش آتی اور فلم کسی قدر تاخیر کا بھی سبب بنتی مگر گلو بھائی کی طبیعت یہ سب کچھ کیسے برداشت کر سکتی تھی؟ سب کو خوش رکھنے والا خوش اخلاق فنکار کسی کو کیسے ناخوش کر سکتا تھا؟

گلو بھائی کی ملٹی اسٹار ایکشن فلم آندھی اور طوفان 1984ء کو عیدالاضحیٰ کے دن نمائش پذیر ہوئی مگر عید ونگل میں اس فلم کے ساتھ نذر شباب کی فلم ''بوبی'' اور پنجابی فلمیں باز شہباز، تاوان اور دلا بھٹی (یوسف خان والی) کے علاوہ ایک پشتو فلم دو غرونان (دو پہاڑ) بھی سلور اسکرین کی زینت بنیں۔ اتنی فلموں کے درمیان ''آندھی اور طوفان'' کو کس طرح کا مقابلہ کرنا پڑا ہوگا آپ بخوبی سوچ سکتے ہیں جب کہ نذر شباب کی ''بوبی'' ڈائمنڈ جوبلی فلم ثابت ہوئی۔ ناقدین فن کا خیال ہے کہ اگر گلو بھائی عید قرباں کے موقع پر اپنی فلم ریلیز نہ کرتے تو انہیں مزید کامیابی ہو سکتی تھی۔ فلموں کے اس دنگل میں سلور جوبلی کرنے والی فلم ''آندھی اور طوفان'' بڑی آسانی سے گولڈن جوبلی کر سکتی تھی۔

غلام محی الدین کے حوالے سے یہ دلچسپ جائزہ بھی یقیناً آپ کی دلچسپی کا سبب بنے گا۔ اگست کے مہینے میں ریلیز ہونے والی گلو بھائی کی فلمیں درج ذیل ہیں۔

(1) اناڑی (2) میرا نام ہے محبت (3) آنسو اور شعلے (4) محبت اور مہنگائی (5) انصاف کا ترازو (6) دہشت خان (7) خون اور پانی (8) اندھا قانون (9) سن آف اَن داتا (10) چنگیزا (11) کوبرا (12) میری جنگیں (13) چراغ بالی (14) موسیٰ خان (15) گھائل (16) شیر املنگ۔

''اناڑی'' یکم اگست 1975ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے ہدایت کار ایس سلیمان تھے۔ غلام محی الدین نے اس فلم میں ڈاکٹر کا کردار کیا تھا۔ یہ گلو بھائی کی پہلی ڈائمنڈ جوبلی فلم تھی۔

www.PakiBooks.Site

میرا نام ہے محبت 8 اگست 1975ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔ غلام محی الدین اس فلم کے ہیرو تھے یہ ان کے کیریئر کی یادگار فلم تھی۔ یہ فلم اندرونِ اور بیرونِ ملک سپرہٹ ہوئی۔

''آنسو اور شعلے'' ہدایت کار ایس اے حافظ کی ایکشن مووی تھی جو 16 اگست 1976ء کو ریلیز ہوئی۔ اس فلم کا مرکزی کردار غلام محی الدین نے ادا کیا تھا۔ ان کی ایکشن پرفارمنس زبردست تھی۔

''محبت اور مہنگائی'' بھی 16 اگست 1976ء کو ریلیز ہوئی۔ یہ ہدایت کار و مصنف اقبال رضوی کی فلم تھی۔ غلام محی الدین اس فلم میں سنگیتا کے مقابل ہیرو تھے۔ پوری فلم میں بہت عمدہ اداکاری کی۔

''انصاف کا ترازو'' 12 اگست 1983ء کو سلور اسکرین کی زینت بنی۔ ہدایت کارہ وحیدہ خان کی اس فلم میں غلام محی الدین نے بطور ہیرو لاجواب اداکاری کی۔ اداکارہ گوری اس فلم میں ان کی ہیروئن تھیں۔

دہشت خان 26 اگست 1983ء کو ریلیز ہوئی۔ غلام محی الدین نے اس فلم میں چونکا دینے والی ایکشن سے بھرپور اداکاری کی۔

''خون اور پانی'' ہدایت کار یونس ملک کی فلم تھی جو 27 اگست 1985ء کو نمائش پذیر ہوئی۔ یہ یونس ملک کی پہلی فلم تھی۔ غلام محی الدین نے اس فلم میں بابرہ شریف کے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا اور لاجواب اداکاری کی تھی۔

''اندھا قانون'' ہدایت کار الطاف حسین کی فلم تھی جو 28 اگست 1986ء میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے مین رول میں ہیرو غلام محی الدین نے زبردست ایکشن سے بھرپور لاجواب کردار نگاری کی تھی۔

''سن آف ان داتا'' ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم تھی جو 16 اگست 1987ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔ غلام محی الدین نے اس فلم میں ایکشن سے بھرپور کردار نگاری کی تھی۔ بابرہ شریف لن کی ہیروئن تھیں۔

''چنگیزا'' کامیاب پنجابی فلم تھی جس کے ہدایت کار داؤد بٹ تھے یہ فلم 18 اگست 1989ء میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں ستارہ، غلام محی الدین کی ہیروئن تھیں۔ غلام محی الدین نے بہت عمدہ اداکاری کی تھی۔

''کوبرا'' ہدایت کار شاہد رانا کی فلم تھی۔ یہ ایکشن فلم 9 اگست 1991ء میں سلور اسکرین کی زینت بنی۔ اس فلم میں بھی غلام محی الدین نے زبردست ایکشن پرفارمنس کا مظاہرہ کیا ان کی عمدہ کردار نگاری نے فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ نادرہ اس فلم میں ان کی ہیروئن تھیں۔

''میری جنگ'' 16 اگست 1991ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے ہدایت کار رشید ڈوگر تھے۔ اس فلم میں بھی غلام محی الدین کی اداکاری اے ون تھی۔ نادرہ ان کی ہیروئن تھیں۔

''چراغ بالی'' غلام محی الدین کی سپرہٹ پنجابی فلم تھی جو 23 اگست 1991ء کو ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے ہدایت کار مسعود بٹ تھے۔ اس فلم میں بھی سدا بہار غلام محی الدین کی اداکاری لاجواب تھی۔

''سپیرا'' غلام محی الدین کی سپرہٹ پنجابی فلم تھی۔ یہ یادگار فلم 28 اگست 1992ء کو ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں غلام محی الدین نے ایک بدمعاش کے کردار میں ایسی چونکا دینے والی اداکاری کی تھی کہ یہ کردار یادگار بن گیا۔ انجمن اس فلم میں گلو بھائی کی ہیروئن تھیں۔ فلم کے ہدایت کار فیض ملک اور مصنف ناصر ادیب تھے۔

''موسیٰ خان'' غلام محی الدین کی یہ فلم 19 اگست 1994ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ ہدایت کار سلیم قاضی کی یہ فلم باکس آفس پر ناکام ثابت ہوئی تھی۔ اداکارہ نین تارا اس فلم میں غلام محی الدین کی ہیروئن تھیں۔

''شیر الملنگ'' ہدایت کار پرویز رانا کی کامیاب پنجابی فلم تھی جو 25 اگست 1995ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ غلام محی الدین نے اس فلم میں بھی اپنی لاجواب اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ اداکارہ نرگس ان کی ہیروئن تھیں۔

''گھائل'' ماہ اگست میں ریلیز ہونے والی غلام محی الدین کی آخری فلم ہے جو 8 اگست 1997ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ یہ ہدایت کار حسنین مرحوم کی فلم تھی جس کے مصنف سید نور تھے۔ اس فلم کا ٹائیٹل اور مرکزی کردار شہنشاہ ایکشن غلام محی الدین نے ادا کیا تھا۔ انہوں نے ناقابل شکست پرفارمنس دے کر اس فلم کی کامیابی میں بھرپور کردار ادا کیا تھا جسے بے حد پسند کیا گیا تھا۔ بابرہ شریف اس فلم میں ان کی ہیروئن تھیں۔

غلام محی الدین کو سپر اسٹار بنانے میں ان کی خداداد فنی صلاحیتوں کا ذکر نہ کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ انہوں نے اپنی فلمی اداکاری کا آغاز مختصر ترین کرداروں سے کیا تھا مگر ان کے اندر جو اداکاری کے جوہر تھے وہ ایسے ہی

www.PakiBooks.Site

چھوٹے موٹے کرداروں سے ابھر کر سامنے آنے لگے پھر جب انہیں بڑے اور قابل ذکر رول ملنے لگے تو کھل کر ان کی خوبیاں اجاگر ہونے لگیں۔ فلم میکرز ان پر اعتماد کرنے لگے کہ وہ ان کے معیار پر پورے اتریں گے اور ایسا ہی ہوا۔ غلام محی الدین نے کسی کو مایوس نہیں کیا جس نوعیت کا بھی انہیں کردار دیا گیا انہوں نے احسن طریقے پر اسے ادا کر کے ثابت کر دیا کہ وہ ورسٹائل اداکار ہیں۔

نئے آرٹسٹوں کے لیے سینئرز اور تجربہ کار فنکاروں کے ساتھ کام کرنا بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ غلام محی الدین کو بھی جب فلموں میں سینئرز کے ساتھ کام کرنا پڑا تو اندر سے وہ گھبرائے ضرور مگر اللہ کا نام لے کر انہوں نے جب ان کے سامنے پرفارم کیا تو سینئرز نے بھی ان کی تعریف کی۔ اس موقع پر اگر لالہ سدھیر کا نام لیا جائے تو آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ کہاں لالہ سدھیر اور کہاں غلام محی الدین! ایک فن اداکاری کا کے ٹو پہاڑ اور دوسرا اس کے سامنے ایک عام انسان مگر جب دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو آفرین ہے جونیئر غلام محی الدین پر کہ ناظرین کو فلم دیکھتے وقت ذرا محسوس نہیں ہوا کہ کوئی چھوٹا اداکار کسی بڑے فنکار کے سامنے ہے۔ وہ بالکل ہی دبا ہوا یا نروس دکھائی نہیں دیا۔

لالہ سدھیر کے ساتھ غلام محی الدین کی فلمیں جینے کی راہ، بڑا بھائی، سن آف ان داتا اور حسینوں کی بارات ہیں۔

''جینے کی راہ'' ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم تھی۔ اس فلم میں لالہ سدھیر اور محمد علی نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ غلام محی الدین نے فلم کے مین ہیرو کے رول میں بھرپور کردار نگاری کی تھی۔

''بڑا بھائی'' ہدایت کار سلیم بٹ کی ایکشن فلم تھی۔ اس فلم میں لالہ سدھیر غلام محی الدین کے بڑے بھائی بنے تھے۔ جہاں لالہ سدھیر کی اداکاری اس فلم میں لاجواب تھی وہاں غلام محی الدین کی پرفارمنس بھی سپر کلاس تھی۔ غلام محی الدین نے کسی ایک سین میں بھی اپنے آپ کو لالہ سدھیر سے کمتر ثابت نہیں کیا۔ وہ فلم کے مین ہیرو تھے۔ رومانوی مناظر کے علاوہ ایکشن کے سین بھی انہوں نے بڑے اعتماد سے نبھائے اور شائقین فلم سے داد وصول کی۔

''سن آف ان داتا'' سپر کاسٹ کی ایکشن فلم تھی۔ لالہ سدھیر نے اس فلم میں (جو ان کی آخری فلم تھی) مرکزی کردار ادا کیا تھا اور پوری فلم میں چھائے رہے تھے۔ جب کہ غلام محی الدین نے بھی زبردست ایکشن سے بھرپور اے ون پرفارمنس کا مظاہرہ کیا تھا اور اس فلم کے نمایاں فنکاروں میں شمار کیے گئے تھے۔ دوسری طرف بابرہ شریف کے ساتھ ان کی رومانوی اداکاری بھی قابل تحسین تھی۔

''حسینوں کی بارات'' ہدایت کار اقبال کشمیری کی فلم تھی جس میں لالہ سدھیر نے مہمان اداکار کے طور پر کام کیا تھا جب کہ غلام محی الدین فلم کے ہیرو تھے اور تمام اداکاروں پر حاوی نظر آئے جہاں جہاں لالہ سدھیر سے ان کا سامنا ہوا وہاں ان کی اداکاری قابل دید تھی۔

اداکار شاہد بھی غلام محی الدین سے سینئر فنکار ہیں۔ ان کے ساتھ بھی غلام محی الدین نے آمنا سامنا، شمع محبت، گونج، بارات، کبھی کبھی، کس نام سے پکاروں، فرزانہ، انصاف کا ترازو اور دہشت خان میں بڑے اعتماد کے ساتھ اداکاری کی اور اپنے جونیئر ہونے کا احساس نہ ہونے دیا۔

سدا بہار غلام محی الدین کو ہر فن مولا شاہد کے ساتھ سب سے پہلے ہدایت کار جان محمد نے اپنی کامیاب فلم ''آمنا سامنا'' میں ایک ساتھ کاسٹ کیا تھا۔ اس فلم میں جان محمد نے گلو بھائی اور شاہد سے زبردست کام لیا تھا۔ شاہد نے ایک اسمگلر اور غلام محی الدین نے ایک پولیس افسر کے کردار میں لاجواب اداکاری کی تھی۔ 17 جون 1977ء کو ریلیز ہونے والی اس فلم میں نشو، غلام محی الدین کی اور نجمہ شاہد کی ہیروئن تھیں۔

''شمع محبت'' میں شاہد اور غلام محی الدین کی اداکاری بھی قابل دید تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر اداکاری کرنے کی کوشش کی تھی۔ فلم کے آخری سین میں گلو بھائی نے لاجواب جذباتی اداکاری کر کے زبردست پذیرائی حاصل کی تھی۔ یہ ہدایت کار شباب کیرانوی کی فلم تھی جس میں غلام محی الدین کی ہیروئن شبنم تھیں۔ یہ فلم 15 جون 1977ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔

''گونج'' ہدایت کار محمد جاوید فاضل کی بطور ہدایت کار پہلی فلم تھی جس میں غلام محی الدین نے شاہد کے ساتھ زبردست کردار نگاری کی تھی۔ یہ ایکشن سے بھرپور فلم تھی اور اپنے دور کی کامیاب فلم تھی۔ شاہد اور غلام محی الدین کے علاوہ نجمہ، عثمان پیرزادہ، عشرت چوہدری اور نیر سلطانہ سے بھی فاضل صاحب نے بھرپور اداکاری کروائی تھی۔ یہ فلم 24 دسمبر 1977ء کو ریلیز ہونے والی شاہد اور غلام محی الدین کی یادگار مشترکہ مووی ثابت ہوئی تھی۔

www.PakiBooks.Site

"بارات" میں بھی غلام محی الدین نے شاہد کی موجودگی میں زبردست کردار نگاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہدایت کار ایس اے حافظ کی یہ لاجواب اور اعلیٰ معیار کی فلم 14 اپریل 1978ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ شاہد کے علاوہ محمد علی نے بھی غلام محی الدین کے ساتھ فلم کے کلیدی کردار کیے تھے مگر غلام محی الدین کی کردار نگاری کو فلم کی جان تسلیم کیا گیا تھا۔

"کبھی کبھی" میں غلام محی الدین نے شاہد کے مقابل فل ولن کا مرکزی رول ادا کیا تھا اور ایسی زبردست اداکاری کی تھی کہ نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے ان کی کھل کر تعریف کی تھی۔ "کبھی کبھی" ہدایت کار وزیر علی کی فلم تھی جو 21 اپریل 1978ء کو ریلیز ہوئی تھی مگر باکس آفس پر کامیابی حاصل نہ کرسکی البتہ شاہد اور غلام محی الدین کی ایک یادگار مشترکہ فلم شمار کی گئی۔

"کس نام سے پکاروں" بھی غلام محی الدین اور شاہد کی یادگار مشترکہ فلم تھی۔ ہدایت کار ایس اے حافظ کی یہ فلم بہت معیاری اور کامیاب فلم تھی۔ انہوں نے غلام محی الدین سے زبردست جذباتی اداکاری کروائی تھی۔ اداکار شاہد نے بھی اپنی لاجواب اداکاری سے سب کو متاثر کیا تھا۔ یہ فلم یکم جون 1979ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔

"فرزانہ" جو 8 فروری 1980ء میں ریلیز ہوئی تھی ایک ناکام فلم ثابت ہوئی۔ غلام محی الدین اور شاہد نے اس فلم میں بہترین اداکاری کی تھی جب کہ اداکارہ کویتا نے اپنی زندگی کا ایک یادگار کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں نجمہ گلو بھائی کی ہیروئن تھیں۔

"انصاف کا ترازو" میں شاہد کے ساتھ غلام محی الدین نے لاجواب کردار نگاری کی تھی۔ اس فلم میں حبیب اور بدر منیر جیسے سینئر اداکاروں کی موجودگی میں غلام محی الدین نے جس اعتماد کے ساتھ اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا اس کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ شاہد اور غلام محی الدین کی یہ کامیاب مشترکہ فلم تھی جو 12 اگست 1983ء کے دن نمائش پذیر ہوگی۔

"دہشت خان" غلام محی الدین اور شاہد کی پہلی مشترکہ پنجابی فلم تھی۔ یہ کامیاب ایکشن مووی 26 اگست 1983ء کو نمائش پذیر ہوئی، پوری فلم میں غلام محی الدین اور شاہد نے ایکشن سے بھرپور کردار نگاری کی اور گلو بھائی نے ثابت کیا کہ وہ جونیئر ہونے کے باوجود سینئرز سے کمتر نہیں!

"آج کا انسان" میں بھی غلام محی الدین نے شاہد کے مدِمقابل ڈٹ کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا مگر بدقسمتی سے یہ فلم کامیاب نہ ہوسکی۔ اس ناکام ترین فلم کے ہدایت کار گلزار احمد تھے جو 19 اکتوبر 1984ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

"نازک رشتے" بھی ایک ناکام ترین فلم تھی جس کے ہدایت کار مشتاق بابر تھے۔ شاہد اور غلام محی الدین کی عمدہ اداکاری بھی اس فلم کو کامیاب نہ کراسکی۔ یہ فلم 26 جون 1987ء کو ریلیز ہوئی تھی۔

کمانڈو ایکشن بھی شاہد اور غلام محی الدین کی ایک مشترکہ فلم تھی مگر یہ پنجابی ایکشن مووی بھی ناکام ترین ثابت ہوئی۔ اس فلم میں شاہد نے پہلی بار غلام محی الدین کے مقابل ولن کا کردار ادا کیا تھا اور زبردست اداکاری کی تھی۔ غلام محی الدین کی ایکشن سے بھرپور اداکاری بھی لاجواب تھی۔ 8 جنوری 1988ء کو یہ فلم ریلیز ہوئی تھی۔

دلاور خان، غلام محی الدین اور شاہد کی آخری مشترکہ فلم تھی جس کے ہدایت کار عابد شجاع تھے۔ اس فلم کا ٹائٹل رول سلطان راہی نے ادا کیا تھا۔ غلام محی الدین اس فلم کے ہیرو تھے اور نیلی ان کی ہیروئن تھیں۔ شاہد نے بھی اس فلم میں لاجواب اداکاری کی تھی۔ یہ فلم 30 دسمبر 1988ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔

دوسرے کئی سپر اسٹارز کے ساتھ بھی غلام محی الدین نے بڑے پُراعتماد انداز میں اداکاری کی اور ثابت کیا کہ ان کے مقابل کتنا ہی بڑا پہاڑ ہو ان کے پائے استقلال میں لرزش پیدا نہیں ہوسکتی۔ یہ اعتماد، پُرعزم، یہ ہمت اور حوصلہ ایک دن میں پیدا نہیں ہوا۔ مدتوں ریاض اور جدوجہد کے بعد وہ اردو اور پنجابی فلموں کے یکساں مقبول فنکار تسلیم کیے گئے۔ آج بھی اگر وہ ان گنت چاہنے والوں کے دلوں پر راج کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے فن اور کام سے ہمیشہ مخلص رہے اور اسے فریضہ سمجھ کر ادا کرتے رہے۔ ان کا شمار بھی پاکستان کی فلمی صنعت کے سپر اسٹارز میں ہوتا ہے مگر انہوں نے کبھی اس بات پر غرور اور فخر کا اظہار نہیں کیا۔ ایسا عجز و انکساری کا برتاؤ ہر ایک کے ساتھ کیا کہ ان کی عرفیت ہی خوش اخلاق غلام محی الدین بن گئی۔ ہماری دعا ہے کہ سب کو خوش رکھنے والا یہ فنکار ہمیشہ شاد اور آباد رہے، آمین۔

www.PakiBooks.Site

موسیقار

چوہدری قمر جہاں علی پوری

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ والدین بچوں کے حوالے سے کچھ اور سوچتے ہیں اور بچے کچھ اور۔ یہ ٹکراؤ مثبت بھی ہوتا ہے اور منفی بھی۔ اس کے والدین نے بھی اس کے حوالے سے جو کچھ سوچا تھا وہ تعبیر نہ پاسکا۔ اس نے اپنی زندگی خود بنانے کی سعی کی جس میں وہ سو فیصد کامیاب ٹھہرا اور دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔

عالمی پیمانے پر مقبول موسیقار کا ذکرِ خاص

23 فروری 1685ء میں جارج فریڈک نے جرمنی کے ایک معمولی سے قصبے پیلے ایون سالے فامیگڈ برگ میں جنم لیا۔ اس کے والد ایک نامور ڈاکٹر تھے جو اپنی قابلیت اور اہلیت کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز تھے ایک بار انہوں نے جارج سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ایک روز تم بھی میری طرح شہرت حاصل کرو گے، شاید تم بھی میری طرح ڈاکٹر بنو گے۔"

ننھے جارج نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں ڈاکٹر نہیں بننا چاہتا۔"

"تو پھر شاید تم کوئی نامی گرامی وکیل، جج بننے کا ارادہ رکھتے ہو؟" باپ نے خیال ظاہر کیا۔

جارج فوراً بولا۔ "ابا جان میں موسیقار بننے کا شوق رکھتا ہوں۔" اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اتنا عظیم موسیقار کہ تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف میں رقم کروا سکوں۔ میری آرزو ہے کہ میں موسیقار بن کر نئے نئے سُر ایجاد کروں۔"

"موسیقار۔" جارج کا والد برہم ہو کر بولا۔ "کیا فرسودہ شوق ہے، میرا کوئی بیٹا موسیقی جیسی بھونڈی چیز پر اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرسکتا۔ تم جلدی سے اپنا بستا اٹھاؤ اور اسکول کی طرف بھاگو، شاید تمہاری نصابی کتب تمہارے ذہن سے یہ بے ہودہ خیال کو نکال باہر کریں۔"

باپ کی ڈانٹ سن کر ننھا جارج اسکول چلا گیا۔ وہ اپنے اسکول میں شوق سے تعلیم تو حاصل کرتا ہی تھا مگر فرصت کے اوقات میں اپنے ذوق کی تسکین کے لیے ساز بھی بجاتا [illegible] سے محو نہ ہو سکا۔ اکثر شام کے اوقات میں وہ اپنے والد سے نظریں بچا کر قریبی گرجا گھر چلا جاتا اور وہاں پر انہماک سے کسی پادری کو مقدس گیت گاتے سنتا اور دھیمے دھیمے انہی سُروں میں گنگناتا۔ عبادت کا وقت ختم ہونے پر پھر وہاں سے گھر واپس لوٹ آتا، گھر آتے وقت وہ سوچتا تھا کہ کاش وہ بھی کسی روز اس طرح کے دل بہلانے والے سُر نکال سکے۔

جارج کی ایک چچی بھی تھی جو اس سے والہانہ لگاؤ رکھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جارج فن موسیقی میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ اس لیے اس نے ایک دوست بن کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ایک روز اس کی چچی اسے اپنے ایک کمرے میں لے گئیں اور انہوں نے جارج کو ایک پرانی طرز کا پیانو دیا اور بولی۔ "جارج گرچہ یہ چھوٹا سا پیانو ہے اور اس کی آواز بھی اونچی نہیں ہے مگر تم اس سے اپنا شوق آسانی سے پورا کرسکتے ہو اور تمہارے والد کو بھی اس کی خبر نہ ہوگی۔ چند ہی روز بعد تم اچھا پیانو بجانا سیکھ جاؤ گے۔"

www.PakiBooks.Site

تعارفِ حضرت سخی سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ

سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باہوؒ 1039ھ میں شورکوٹ میں پیدا ہوئے۔ شورکوٹ پنجاب کے ضلع جھنگ کا تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے۔ آپ کے والد ماجد حضرت محمد بازیدؒ ایک صالح، حافظ قرآن اور فقیہہ تھے۔ مغلیہ خاندان کے فرماں روا شاہ جہان کے دور میں قلعہ شورکوٹ کے قلعہ دار تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی راستی اولیائے کاملین میں سے تھیں۔ آپؒ نسب کے لحاظ سے اعوان ہیں اور مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ کو الہامی طور پر بتا دیا گیا تھا کہ عنقریب آپ کے بطن سے ایک ولی کامل پیدا ہوگا جو تمام روئے زمین کو اپنے انوار و فیضان اور اسرار و عرفان سے بھر دے گا، ان کا نام ''باھو'' رکھنا۔ چنانچہ مائی صاحبہ نے آپ کا نام باھو ہی رکھا۔ آپ مادرزاد ولی اللہ تھے اور آپ کے ابتدائی بچپن ہی سے آپ کا فیض جاری ہوگیا تھا۔ جو غیر مسلم آپ کے چہرۂ پُرانوار پر نظر ڈالتا وہ فوراً کلمہ طیبہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا۔ آپ کے اس تصرف سے غیر مسلم اتنے پریشان ہوئے کہ ان کے سرکردہ آدمی وفد کی شکل میں آپ کے والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہو کر ملتمس ہوئے کہ جب بھی اس بچے کو گھر سے باہر نکلنا ہو تو پہلے اعلان کر دیا جائے تاکہ ہم لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے رہا کریں اور اپنے مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہونے سے بچ جائیں۔ اپنی کتاب ''امیر الکونین'' میں آپ فرماتے ہیں کہ عرصہ 30 سال تک میں

ننھے جارج کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں اور وہ اپنی چچی سے لپٹ کر چلایا۔ ''پیاری چچی آپ کتنی سویٹ ہیں۔ میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔''

اس کے بعد سے وہ راتوں کو خاموشی سے چچی کے کمرے میں آجاتا اور جب گھر کے تمام افراد اپنے نرم نرم بستروں میں گھسے نیند کی وادیوں میں ہوتے تو وہ مدھم مدھم سُروں میں پیانو بجانے میں مگن ہو جاتا۔ کئی مرتبہ تو یہ بھی ہوا کہ اس کی چچی بھی سو گئیں مگر وہ موسیقی کی دنیا میں کھویا رہا..... نیند کا اسے خیال تک نہ رہتا۔

جس چھوٹے سے قصبے میں جارج رہتا تھا وہاں سے کوئی ساٹھ کلومیٹر دور ایک بہت بڑے کے نائٹ کا عظیم الشان قلعہ تھا۔ جارج نے اس قلعے کی شان و شوکت کے بارے میں بہت سی باتیں سن رکھی تھیں مگر اب تک اس کی سیر سے محروم تھا۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ نائٹ کے محل میں بڑے بڑے موسیقار جلوہ گر ہوتے ہیں اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک دن اس کے والد ہینڈل کو قلعہ میں مدعو کیا گیا اس کے والد نائٹ کے خصوصی معالج تھے۔

''اچھا خدا حافظ۔'' اس نے جارج سے کہا اور اپنی گھوڑا گاڑی میں سوار ہونے لگا۔

''میں تقریباً ہفتہ عشرہ تک گھر واپس آؤں گا تم، یکسوئی اور دلجمعی سے اپنی پوری توجہ تعلیم پر مرکوز رکھنا اور خبردار اگر تعلیم کے علاوہ کسی فضول شے کی طرف متوجہ ہوئے تو؟''

''اوکے ڈیڈ!'' جارج نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ مجھے اپنے ہمراہ نہیں لے جاسکتے؟''

''وہ کیوں؟'' جارج کے والد نے تعجب سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بھلا نائٹ کے قلعہ میں تمہارا کیا کام۔''

''ابا جان میں نائٹ کے شاندار اور عظیم الشان قلعے کا نظارہ کرنا چاہتا ہوں اور وہاں پر آنے والے موسیقاروں کو سن کر انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہونہہ! اس لڑکے کا تو دماغ ہی خراب ہوگیا ہے۔'' باپ نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا اور غصے سے پاؤں پٹخا۔ ''میں کہتا ہوں یہ ساز تمہیں برباد کر کے چھوڑیں گے۔'' یہ کہہ کر ہینڈل نے اپنا قدم آگے بڑھایا اور اپنی گھوڑا گاڑی میں سوار ہوگیا۔ گاڑی حرکت میں آئی اور نائٹ کے قلعے کی طرف گامزن ہوگئی۔

''مجھے بھی ہمراہ لے چلیں ڈیڈ .... مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔'' ننھے جارج نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

اس کے آنسو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ روتے ہوئے وہ دوڑنے لگا۔ سڑک ناہموار تھی اور جارج کو دوڑتے ہوئے مشکل پیش آرہی تھی۔ وہ مسلسل بھاگ رہا تھا۔ اس نے گاڑی کا پیچھا کرتے ہوئے دو تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کرلیا تھا، اچانک گاڑی بان کی نگاہ اس پر پڑی اور اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''جناب عالی! آپ کا بیٹا مسلسل گاڑی کا پیچھا کر رہا ہے۔''

باپ نے مڑ کر دیکھا پھر کوچوان کو رکنے کا اشارہ دیا۔

www.PakiBooks.Site

مرشد کامل کی تلاش میں پھرتا رہا لیکن مجھے اپنے مطلب کا مرشد نہ مل سکا، آخر ایک مرتبہ اس فقیر کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ باطن میں ہاتھ پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں لے گئے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا: ''میرا ہاتھ پکڑو۔'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دست بیعت فرما کر تعلیم و تلقین فرمائی اور حکم فرمایا کہ اے باھو! خلقِ خدا کی باطن میں امداد کیا کرو۔ رسالہ ''روحی شریف'' میں آپ فرماتے ہیں۔

دست بیعت کرد ما را مصطفیٰ
خواندہ است فرزند مارا مجتبیٰ
شد اجازت باھو را از مصطفیٰ
خلق را تلقین بکن بہراز خدا

ترجمہ: ''مجھے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دست بیعت فرمایا اور انہوں نے مجھے اپنا (نوری حضوری) فرزند قرار دیا۔ مجھے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اجازت دی کہ میں خلق خدا کو تلقین کروں۔''

اقتباس: محک الفقر از سید امیر خان نیازی قادری

اسی اثناء میں جارج گاڑی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ مسلسل دوڑنے کے باعث وہ ہانپ رہا تھا لیکر بنا گئے اشک اس کی آنکھوں سے اس کے رخساروں پر بہہ کر خشک ہو چکے تھے، اس کا باپ اسے دیکھ کر آپے سے باہر ہوگیا اور پھر چٹاخ کی آواز کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ جارج کے منہ پر پڑا پھر اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''احمق! تم نے ہمارا پیچھا کرنے کی جسارت کیسے کی، واپس دفع ہو جاؤ۔''

''ڈیڈ مجھے بھی..... اپنے ساتھ لے چلیں آپ کو خدا کا واسطہ۔''

''بالکل بھی نہیں۔'' اس کے والد نے گرج کر کہا۔

''لیکن جناب عالی! گاڑی بان نے لب کشائی کرتے ہوئے کہا، دیکھئے پہلے ہی بچے کا سانس پھولا ہوا ہے اور بدن پسینے سے شرابور ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ راستے میں گم ہو جائے، آپ کو تو اچھی طرح معلوم ہے کہ ادھر ڈاکوؤں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔''

''اس بدمعاش کو ضرور سزا ملنا چاہیے۔'' ڈاکٹر نے بے رخی سے جواب دیا۔ پھر انہوں نے جارج کا کان پکڑ کر کہا۔ ''چلو بیٹھ جاؤ، احمق اب تمہاری ماں کو بھی باخبر کرنا ہوگا، اس طرح اسی شام ننھا جارج قلعے میں پہنچ گیا۔ اپنے قیام کے دوران جب اس کا ڈاکٹر باپ مریض دیکھنے میں مصروف ہوتا تو موقع ملتے ہی وہ وہاں سے گرجا کی طرف آجاتا جہاں بہت سے لڑکے مقدس گیت گانے کی مشق کر رہے ہوتے تھے۔ ایک دن لڑکوں کے استاد نے اس سے دریافت کیا۔ ''کیوں بیٹے تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟'' اس کی آواز میں بڑی شفقت اور محبت کی آمیزش تھی۔

''اس لیے کہ مجھے موسیقی سے لگاؤ ہے اور میں آپ اور ان لڑکوں کو گیت گاتا دیکھ کر خوشی محسوس کرتا ہوں۔'' جارج نے حسرت سے کہا۔

''کیا تم باجا بجا لیتے ہو۔'' استاد نے سوال کیا۔

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کو بجا کر دیکھا سکتا ہوں۔''

''اچھا تو اِدھر آؤ۔'' استاد نے بڑی چاہت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا اور اپنا باجا اس کے آگے کر دیا کیونکہ جارج اپنی چچی انپا کے گھر پر باجا بجانے کی خاصی مشق کر چکا تھا اس لیے اس نے بلا کسی جھجک کے ہارمونیم کے ہر ریڈوں پر اپنی انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔ ساز کے سُر فضا میں گونجنے لگے اگرچہ یہ باجا کوئی بڑا نہ تھا مگر اس نے بڑی مہارت سے اس سے بڑی مترنم دھن نکالی۔

''خوب، بہت خوب بیٹا۔'' استاد نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا اور پھر گویا ہوا۔ ''کیا تم نائٹ کے قلعے میں ان کے سامنے باجا بجانا پسند کرو گے۔''

''نائٹ کے سامنے!'' جارج کے پاؤں تو زمین پر ہی نہیں ٹک رہے تھے، وہ بمشکل کہہ سکا۔ ''جی ہاں کیوں نہیں، میں ان کا جی بہلانے کی پوری کوشش کروں گا۔''

www.PakiBooks.Site

''تو پھر اتوار کی عبادت کے بعد تمہیں موقع دیا جائے گا۔'' استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ عبادت کے اختتام پر جب نائٹ گرجے سے اٹھ کر واپس مڑنے لگے تو ان کے کانوں میں ایک بڑی سریلی اور دل نشیں آواز آئی تو اس نے سوچا کہ آج ہولی فادر نے بڑی سریلی اور رسیلی دھن چھیڑی ہے مگر جونہی ان کی نگاہ ایک چھوٹے سے بچے سے ٹکرائی جو بڑے انہماک سے باجا بجا رہا تھا تو وہ اپنی جگہ پر مبہوت ہو کر رہ گئے۔

''اوہ میں بھی کتنا غلط سمجھا، یہ مقدس باپ نہیں کوئی اجنبی بچہ ہے جو رسیلے اور میٹھے سُر نکال رہا ہے۔'' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور پھر وہ جارج کی طرف لپکا۔ ڈاکٹر ہینڈل اس کے پہلو میں تھا جھٹ سے بولا۔ ''حضور یہ میرا بیٹا ہے، بڑا بے وقوف ہے، میں نے اسے باجا بجانے سے منع کیا تھا مگر یہ باز نہیں آیا۔''

''کیا تم نے اسے باجا بجانے سے منع کیا تھا؟'' نائٹ نے ڈاکٹر کو حیرت بھرے انداز میں کہا۔

''جی ہاں جناب عالی! میرا ارادہ تھا کہ میں اسے موسیقی کے چکروں میں نہ پڑنے دوں۔'' ڈاکٹر نے گھبراہٹ سے جواب دیا۔

''ڈاکٹر! تم نے غلط سوچا ہے۔'' نائٹ نے ہنس کر کہا۔ ''موسیقی تو ایک نعمت ہے۔ پرندوں، جھرنوں میں سے پھوٹتی ہے پھر انسان کیوں نہ گائے، مجھے یقین ہے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ایک معروف موسیقار بنے گا، میں اسے بہترین اساتذہ سے فن موسیقی کی تعلیم دلواؤں گا۔'' یہ کہہ کر جارج کے قریب آئے۔ ڈاکٹر ہینڈل اور دوسرے صاحب اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے، جونہی جارج نے اپنے والد اور نائٹ کو اپنے بہت قریب پایا تو اٹھ کھڑا ہوا اور ادب سے سلام بجا لایا۔ نائٹ نے بڑی اپنائیت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''بیٹے! مجھے تمہاری یہ دھن بڑی پسند آئی ہے، تمہاری انگلیوں میں جادو ہے، میں تمہیں اپنے پاس قلعہ میں رکھوں گا۔''

''جناب والا میں اسے یہاں کیسے چھوڑ سکتا ہوں، اس کی تعلیم کا حرج ہوگا۔'' جارج کے والد نے تعجب سے کہا۔

''تو پھر میں تمہارے ہاں موسیقی کا کوئی بہت بہترین قسم کا استاد بھیج دوں گا۔'' نائٹ نے سنجیدگی سے کہا۔

''جناب والا میں تو چاہتا ہوں کہ یہ ساز اور سازندوں کو بھول جائے۔'' ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔

یہ سن کر نواب صاحب اچانک بھڑک اٹھے اور ان کا موڈ خراب ہو گیا۔ غصے سے بولے۔ ''اچھا ڈاکٹر میں اب تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس بچے کو اسکول کے ساتھ ساتھ موسیقی کی تعلیم بھی دلواؤ۔ میں اس کے تمام اخراجات برداشت کروں گا۔''

ڈاکٹر ہینڈل نواب صاحب کے سامنے مزید کچھ نہ کہہ سکے۔ ننھے جارج نے نائٹ کی طرف دیکھتے ہوئے زوردار آواز میں کہا۔ ''تھینک یو سر۔''

اور پھر جارج کے لیے موسیقی کے قابل اساتذہ کا تقرر کر دیا گیا جنہوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کے ذوق کی تسکین کی اور اسے فن کے رموز سے آشنا کیا۔ تھوڑی ہی مدت بعد جارج فن کی بلندیوں کو چھونے لگا اور اپنے اساتذہ کو بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ اس نے چند ہی دنوں میں دنیا موسیقی میں تہلکہ مچا دیا اور برلن کے شاہی دربار میں ملکہ نے اسے کئی بار بلا کر انعام و اکرام سے نوازا۔

چند برس کے بعد 1713 میں وہ برطانیہ منتقل ہو گیا۔ وہاں بھی اس کے فن کی دھوم مچ گئی۔ اس نے نئے نئے سروں سے دنیا کو آشنا کرایا اور انہیں کتابی شکل میں محفوظ کر دیا۔

اگست 1750 میں جب وہ جرمنی سے لندن واپس آ رہا تھا اس کی آنکھ حادثے کا شکار ہو گئی۔ یہ حادثہ نیدرلینڈ کے علاقے ''گ'' اور ہارلم کے درمیان پیش آیا تھا۔ اسی حادثے کے سبب 1751 میں ایک آنکھ کی بینائی چلی گئی۔ 1752 میں وہ پوری طرح نابینا ہو چکا تھا، ریڑھ کی ہڈی بھی متاثر ہوئی تھی۔ اس تکلیف میں بھی اس نے موسیقی سے ناطہ جوڑے رکھا۔ وہ بہ ہزار دقت اوپرا میں شرکت کے لیے جایا کرتا۔ وہ دن بھر تکلیف سے آہیں بھرتا۔ نیند بھی اس سے روٹھ گئی تھی۔ بالآخر 14 اپریل 1759 کو اپنے بروک اسٹریٹ، لندن والے مکان میں اس نے زندگی سے ناتا توڑ لیا۔ اس نے مجرد زندگی گزاری، شادی سے گریزاں رہا۔ اس کی تدفین ''ویسٹ منسٹر ابے'' قبرستان میں ہوئی، جنازے میں تقریباً تین ہزار افراد شریک تھے۔

www.PakiBooks.Site

تصویر

محمد سجاول خان

مصوری کے قدیم شہکار عالمی منڈی میں لاکھوں ڈالرز قیمت رکھتے ہیں۔ اس نے بھی ایک ہی تصویر کو کئی خریداروں کو بیچنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس کام کے لیے اپنے ہی اسکول کے ایک طالب علم کا انتخاب کیا تھا۔

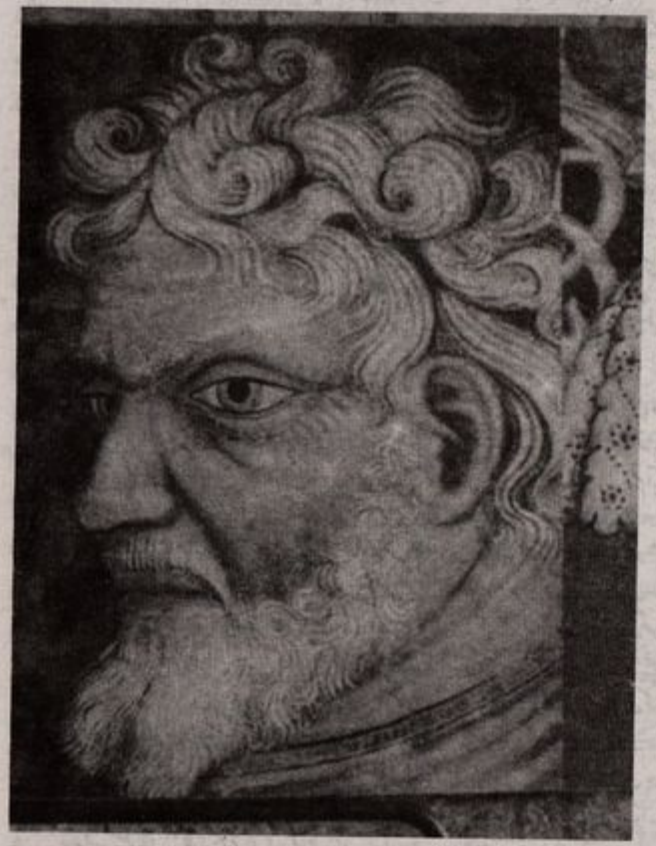

ایسے جرائم یورپ میں بہت زیادہ ہو رہے ہیں

آرٹ روم میں مدھم سی روشنی جل رہی تھی۔ آئل پینٹنگ کی مخصوص بُو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی مگر اسپسٹن پر وہ بو کوئی خاص اثر نہیں کر رہی تھی۔ وہ تو اس کا عادی تھا اور وہ گھنٹوں بیٹھا پینٹنگ کرتا رہتا تھا۔ وہ کینوس پر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک چھوٹی سی مسکان ابھری جب اس نے کینوس پر نیچے دائیں جانب کچھ مبہم سے الفاظ لکھے.....

اچانک دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا اور وہ بولا۔ ''اسپسٹن! تمہیں پتا ہے کیا وقت ہو گیا ہے؟'' اس نے گھڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اسپسٹن نے اپنے فون کی جانب نظر دوڑائی جس پر

www.PakiBooks.Site

رات کے پونے بارہ کا وقت ظاہر ہو رہا تھا۔

"میں بس چاہتا ہوں کہ کل سے پہلے آپ کے لیے اس پینٹنگ کو مکمل کرلوں۔"

"تمہیں اسے آج ہی مکمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اسے کل بھی مکمل کر سکتے ہو۔" مسٹر ولیم نے اسے تسلی دی۔

مسٹر ولیم آرٹ سینٹر کالج آف ڈیزائن کا ایک پروفیسر تھا۔

وہ طالب علموں اور کالج کی انتظامیہ دونوں کا ہر دلعزیز شخصیت تھا۔

"اپنا ہاتھ منہ دھولو اور تم جا سکتے ہو۔" مسٹر ولیم نے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں..... میں اسے آپ کے جانے سے پہلے ہی مکمل کرلوں گا۔" اسپسٹن مسکرایا۔

مسٹر ولیم اسپسٹن کا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ وہ پینٹنگ دیکھنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ پینٹنگ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اور نظریں اس سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ اسپسٹن ایک جانب خاموش کھڑا پروفیسر کی پینٹنگ پر رائے کا انتظار کر رہا تھا۔

"حیرت انگیز! یہ تو بالکل اصل تصویر کے عکس کی طرح لگ رہی ہے۔" پروفیسر نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

اسپسٹن نے وین گوخ کی ایک شاہکار پینٹنگ "ملبری ٹری" کو پینٹ کیا تھا۔

پروفیسر ولیم ابھی بھی اس کی پینٹنگ دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا۔ "اسپسٹن میں جانتا تھا کہ اس کام کے لیے تم ہی موزوں طالب علم تھے۔"

"اب تمہیں اپنے کمرے میں چلے جانا چاہیے۔" پروفیسر اپنے آپ کو اس کیفیت سے باہر نکالتے ہوئے بولے۔

اسپسٹن نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور ولیم کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکل آیا۔

"مجھے میرا معاوضہ کب ملے گا؟" اسپسٹن نے پوچھا۔

پروفیسر مسکرایا۔ "کل صبح تمہاری رقم مل جائے گی۔ وہ میرے آفس میں پڑی ہے لیکن ابھی ہم گھر جا رہے ہیں۔"

"پلیز مسٹر ولیم! مجھے اس رقم کی ابھی ضرورت ہے۔" اسپسٹن نے التجا کی۔

"تمہیں تمہاری رقم مل جائے گی۔" ولیم چلتے چلتے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

تبھی اسپسٹن کا فون بج اٹھا۔

"نہیں اس نے مجھے ابھی ادائیگی نہیں کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ مجھے کل ادائیگی کرے گا۔" اسپسٹن نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"ہولڈ آن....." فون کی دوسری جانب سے آواز ابھری۔

"مجھے رقم کے لیے اس کے آفس کی تلاشی لینی ہوگی۔" اسپسٹن یہ سوچتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆.....☆

"اسپسٹن!" ولیم نے مسٹر روز کی کلاس میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "تم میرے ساتھ آؤ ابھی۔"

اسپسٹن مسٹر ولیم کے پیچھے چلتا ہوا آفس میں داخل ہو گیا۔ ولیم نے اپنی کرسی اٹھائی اور اسے ڈیسک کے پار رکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ اسپسٹن جیبوں میں ہاتھ ڈالے ڈیسک کے سامنے کھڑا تھا۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھ سے یہ پوچھنے کی۔ میں جانتا ہوں تم کل میرے آفس میں گھسے تھے۔" پروفیسر ولیم نے غصے سے کہا۔

"میں نے تو بس وہ چیز لی جو میری تھی باقی سب میں نے ویسے ہی چھوڑ دیا تھا۔" اسپسٹن نے کمرے میں نظریں گھماتے ہوئے کہا۔ "تم ایک بدنظم قسم کے انسان ہو۔"

"تم اب جا سکتے ہو۔" ولیم کھڑا ہو گیا۔

اسپسٹن گھوما اور شیٹ کی جانب دیکھتے ہو بولا۔

"پروفیسر میرا آپ سے ایک سوال ہے۔"

پروفیسر نے اسے گھورا۔

"اس شیٹ کے نیچے کیا ہے؟"

"تمہارا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔" پروفیسر نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ویسے کل رات جب میں تمہارے آفس میں داخل ہوا تھا تو یہ میرا اس سے واسطہ بن چکا تھا۔" اسپسٹن شیٹ کی جانب بڑھا۔

"پہلے میں نے سوچا کہ یہ تمہاری ہی کوئی پینٹنگ ہوگی مگر پھر میں نے یہ خیال دماغ سے جھٹلا دیا کیونکہ اگر یہ تمہاری پینٹنگ ہوتی تو تم اسے چھپا کر کیوں رکھتے۔ تو کل رات میں نے شیٹ کو اٹھایا۔" اسپسٹن نے شیٹ کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ وین گوخ کی پینٹنگ ابھی بھی وہیں پڑی ہوئی تھی۔ پروفیسر ولیم نے جلدی سے اسپسٹن سے شیٹ چھینی اور اسے دوبارہ

www.PakiBooks.Site

پینٹنگ پر ڈال دیا۔

"تم نے مجھے بالکل اس پینٹنگ جیسی پینٹ کرنے کو کیوں کہا تھا۔ یہاں آخر چل کیا رہا ہے۔" اسپسٹن چلایا۔

پروفیسر ولیم اپنے آفس کے فون کی جانب بڑھا اور کچھ نمبر ملائے۔ "ہیلو! جی میرا نام مسٹر ولیم ہے اور میں آرٹ سینٹر کالج آف ڈیزائن میں ایک آرٹ پروفیسر ہوں اور میں نے آپ لوگوں کا آرٹ چور پکڑ لیا ہے۔"

اسپسٹن ہکا بکا رہ گیا اور اس کے قدم وہیں جم گئے۔

"وہ میرے کالج کے آفس میں ہی ہے..... ہاں ٹھیک ہے شکریہ۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔

"اب یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں تمہیں نارٹن سیمن میوزیم سے وین گوخ کی پینٹنگ چوری کرنے کے الزام میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈلواؤں۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے تو کچھ نہیں چرایا۔" اسپسٹن اچانک سے آنے والی اس مصیبت سے بوکھلا اٹھا۔

"لیکن یہ تو تم نے ہی کیا ہے۔ تم نے ہی کل رات میرے آفس میں گھس کر اس پینٹنگ کو یہاں چھپا دیا تھا۔ تمہارے علاوہ کوئی اور ایسا کیسے کر سکتا ہے۔" ولیم نے ڈھٹائی سے کہا۔

"نہیں..... نہیں..... یہ تم نے چرائی ہے اسی لیے تم نے مجھے ایسی ہی پینٹنگ پینٹ کرنے کے لیے کہا تھا تاکہ تم مجھے مورد الزام ٹھہرا سکو۔" اسپسٹن نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تمہارا یقین کون کرے گا؟ میں ایک عزت دار آرٹ پروفیسر ہوں اور تم کیا ہو..... بس ایک معمولی اسٹوڈنٹ....." ولیم نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

باہر سے سائرن کی آوازیں سنائی دینا شروع ہو گئی تھیں۔ اسپسٹن کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے پاس ولیم کے کیے ہوئے جرم کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اسپسٹن نے ولیم کے لیے وہ پینٹنگ پینٹ کی تھی۔

"تم نے جو کیا ہے میں اس کے لیے جیل نہیں جاؤں گا۔" اسپسٹن نے پشت پر بندھے ہوئے بیگ کی ڈوریوں کو تھامتے ہوئے کہا۔

"پولیس آ رہی ہے۔"

"تو پھر سیڑھیاں استعمال نہ کرنا ہی بہتر ہوگا۔"

مبارک مونگیری

(1914-1988)

مبارک احمد صوبہ بہار (انڈیا) کے ضلع مونگیر میں 10 جنوری 1914 کو پیدا ہوئے۔ مبارک تخلص اور مبارک مونگیری قلمی نام تھا۔ مونگیر کالجیٹ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ریلوے ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان آ گئے اور تبادلہ کروا کر چٹاگانگ میں مستقل قیام رکھا۔ مشرقی پاکستان کے سینئر شعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ایک مشاق اور پختہ گو شاعر کی حیثیت سے انہوں نے مشرقی پاکستان اور سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی میں ادبی زندگی گزاری۔ نام نمود اور صلہ کی پروا کیے بغیر شعری سفر جاری رکھا اور "صحرا سے گلستان تک" کا سفر کیا۔ مبارک مونگیری کو نظم اور غزل دونوں اصناف پر عبور حاصل رہا۔ منقبت بھی لکھی اور نعت کے حوالے سے بھی مبارک مونگیری کا نام ادبی حلقوں میں شناسا رہا ہے۔ بعد از مرگ ان کا نعتیہ مجموعہ "ذکرِ ارفع (1994) میں طبع ہوا۔ جب کہ "صحرا سے گلستاں تک" غزلوں کا مجموعہ ان کی زندگی میں (1982) میں شائع ہوا تھا۔ سادہ لفظوں میں اپنے جذبے کا اظہار روایتی انداز میں کرتے ہوئے انہوں نے جو نعتیہ یا منقبتی کلام پیش کیا ہے اسے قبولیتِ عام کا درجہ مل گیا۔ مبارک مونگیری کا انتقال 6 اکتوبر 1988 کو کراچی میں ہوا۔ ان کے صاحبزادے اقبال مجیدی جو خود بھی بطور شاعر متعارف ہیں انہوں نے اپنے والد کا کلام بھی شائع کرایا اور کراچی کی بلدیہ گورنمنٹ سے شادمان ٹاؤن نارتھ کراچی سے ناگن چورنگی تک ایک داخلی شارع بھی ان کے نام سے منسوب کرائی جس کا نام اب "شارع مبارک مونگیری" ہے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

www.PakiBooks.Site

اسپیسٹن نے ولیم کے پیچھے موجود ایک بڑی سی کھڑکی کی جانب نظریں گاڑھیں۔ وہ دروازے تک گیا اور پھر ولیم کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ ولیم نیچے جھک گیا اور چلانے لگ گیا۔

اسپیسٹن نے میز پر چھلانگ لگائی اور جیسے ہی پولیس کمرے میں داخل ہوئی وہ کھڑکی توڑتا ہوا باہر کود گیا۔

☆.....☆

''میں اسے سنبھال لوں گا۔'' اس نے دھیمے لہجے میں ایک پے فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھا اور اور شہر کی اس مشہور سڑک پر چلنے لگا پھر وہ اس بھیڑ میں گم ہو گیا۔

ٹی وی ریڈیو اور ہر گلی کوچے پر اسپیسٹن کے اس جرم پر ایسے بات ہو رہی تھی جیسے کہ یہ روزمرہ زندگی کا حصہ ہو۔

اس کے پاس ولیم کے جرم کو ثابت کرنے کے لیے نہ تو کوئی چیز تھی اور نہ ہی کوئی شخص.....

اسپیسٹن نے اپنی گھڑی چیک کی جس پر رات کے پونے بارہ جگمگا رہے تھے۔ اس نے گلی کی دوسری جانب ایک پیفون دیکھا اور وہ اس کی جانب لپکا۔ اس نے اپنی جیب میں بچا ہوا آخری سکہ اس میں ڈالا اور نمبر ملایا۔ ''تو پلان یہ ہے۔''

اسپیسٹن نے پولیس کی ممکنہ موجودگی کے پیشِ نظر اردگرد نظریں دوڑائیں۔

''اس منصوبے کو کامیاب کرنے کے لیے تمہیں ہر قدم پھونک پھونک کر اور بڑی احتیاط سے رکھنا ہوگا۔''

☆.....☆

''911! کیا کوئی ایمرجنسی ہے؟'' ایمرجنسی پر موجود ایک عورت نے ہیڈسیٹ میں کہا۔

''نہیں..... یقیناً نہیں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''آپ جانتے ہیں نا اس نمبر پر مذاق کرنا ایک جرم ہے۔''

''تو پھر میں نے پچھلے 48 گھنٹوں میں دو جرم کیے ہیں۔''

وہ عورت کرسی پر متوجہ ہو کر سیدھی بیٹھ گئی۔

''جناب! آپ سے کیا جرم سرزد ہوئے ہیں؟ کیا کسی کو چوٹ پہنچائی ہے؟ یا آپ کو چوٹ پہنچائی گئی ہے.....؟''

دوسری طرف سے مرد کے ہنسنے کی آواز آئی۔ ''ارے ارے..... ایک وقت میں اتنے سوالات۔''

اس نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ''سنو..... میں تمہیں یہ سب بتا سکتا ہوں۔ آپ پولیس والوں کو آرٹ سینٹر کالج آف ڈیزائن میں بھیجیں اور پروفیسر ولیم کو گرفتار کر لیں۔''

''سر..... جیسے آپ چاہتے ہیں ویسے ہم کسی کو بھی گرفتار نہیں کر سکتے۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔''

''اوہ..... تم کتنی اچھی ہو..... مگر میرے لیے ہتھکڑیاں ضرور لانا۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

''تم جانتی ہو میں کون ہوں..... میں اسپیسٹن ہوں..... آرٹ چور.....''

یہ سن کر عورت نے فوراً پولیس کو فون ملانا شروع کر دیا۔

☆.....☆

''یہاں چل کیا رہا ہے؟'' پروفیسر ولیم نے آفس میں داخل ہوتے ہی پولیس والوں سے سوال کیا۔ پولیس والے ولیم کے آفس میں موجود تھے اور ثبوت کی تلاش میں دفتر کو کھنگال رہے تھے۔

''یہ سب بے ہودگی کس بات کے لیے ہے؟'' ولیم نے دوبارہ سوال داغا۔

تبھی ہال سے ایک جانی پہچانی آواز گونجی۔ ''مسٹر ولیم..... کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہارے بنا ہی جیل چلا جاؤں گا..... کیا واقعی تمہیں لگتا ہے۔''

اسپیسٹن ہتھکڑیوں میں جکڑا دو افسران کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

''اس کا کہنا ہے کہ تمہارے اس کام میں ملوث ہونے کے اس کے پاس ثبوت ہیں۔ اور ہم ان الزامات کو بڑی سنجیدگی سے لیتے ہیں۔'' اس نے اسپیسٹن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اسپیسٹن نے نظریں گھمائیں اور آفس کا معائنہ کیا۔ ''تم نے ابھی تک یہ گندگی صاف نہیں کی۔'' اسپیسٹن مسکرایا۔

چیف آف پولیس آفس میں داخل ہوا اور اسپیسٹن کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''کہاں ہیں ثبوت؟ تم نے یقیناً بغیر کسی وجہ کے میرے آدمیوں کو یہاں تک نہیں ذلیل کیا ہوگا۔''

پولیس چیف کے چپ ہوتے ہی اسپیسٹن بولا۔ ''سر! میرا ثبوت اس کتابوں کی الماری کے پیچھے شیٹ کے نیچے پڑا ہوا ہے۔''

ایک پولیس افسر چرڈ اس الماری کی جانب بڑھا۔ اس نے شیٹ کھینچی تو ''ملبری ٹری۔'' سب کے سامنے پڑی منہ چڑا رہی تھی۔

''یہ تو وہی پینٹنگ ہے جس کی ہمیں تلاش تھی مگر یہ

www.PakiBooks.Site

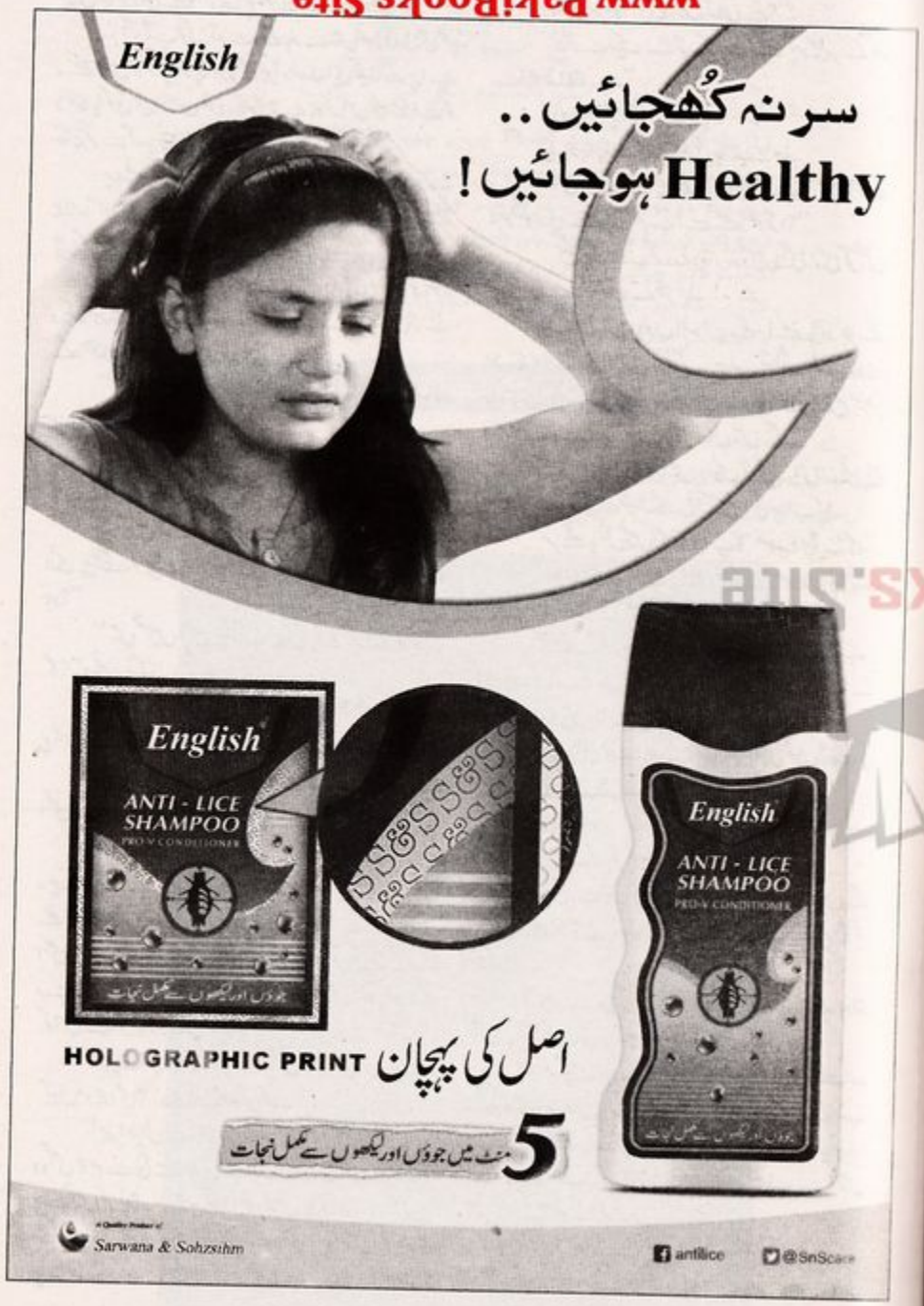

www.PakiBooks.Site

یہاں کیا کر رہی ہے؟'' ایک پولیس والے نے سوال کیا۔

''اگر آپ لوگ آرٹ کے بارے میں تھوڑا سا بھی علم رکھتے ہوں تو آپ کو پتا ہوگا کہ ہر آرٹسٹ اپنی تخلیقات پر اپنے دستخط یا کوئی ایسا نشان ضرور چھوڑتا ہے جو کہ اس کی شناخت کو ظاہر کرے کہ یہ چیز اس کی ہے۔''

پروفیسر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اور اس کے نیچے دائیں کونے پر دیکھیں، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اسپیسٹن کے دستخط وہاں پر موجود ہیں.....''

آفیسر رچرڈ نے پینٹنگ کے نچلے دائیں کونے کو بغور دیکھا اور پھر بولا ''چیف..... یہ ٹھیک کہہ رہا ہے..... اس لڑکے کے دستخط واقعی یہاں پر موجود ہیں۔''

''لیکن اس نے چرائی ہوئی پینٹنگ کو ہی کیوں دوبارہ پینٹ کیا؟''

''اچھا سوال ہے۔'' اسپیسٹن مسکرایا اور چھوٹے چھوٹے قدم بھرتا ہوا آرٹ پروفیسر کی جانب بڑھا۔

''کیوں ایک آرٹ پروفیسر اپنے اسٹوڈنٹ کو ایک ایسی پینٹنگ کو پینٹ کرنے کے لیے کہے گا جو کہ چوری شدہ ہو؟''

''میں تمہیں ایسی پینٹنگ کیوں پینٹ کرنے کو کہوں گا؟'' ولیم نے کہا۔

''کیونکہ..... تم ایسا کر چکے ہو.....'' اسپیسٹن چلایا، دو پولیس اہلکار اسے بازوؤں سے پکڑ کر ولیم سے دور لے گئے۔

''ہم ان دونوں کو پولیس اسٹیشن لے کے جائیں گے ابھی۔'' چیف بولا۔

وہ سب چلتے ہوئے بلڈنگ سے باہر نکل آئے۔ آفیسرز رپورٹ لکھ رہے تھے۔ ''جائے وقوعہ کی تصویریں اتار رہے تھے اور ان افسران سے وائی ٹا کی کے ذریعہ رابطے میں تھے جو ابھی بھی بلڈنگ میں موجود تھے اور ولیم کے آفس کی تلاشی لے رہے تھے۔ پولیس نے اسپیسٹن کو پہلی گاڑی میں بٹھایا اور ولیم کو اس سے اگلی گاڑی میں سوار کیا۔''

''چیف! پروفیسر ولیم کے پاس اسپیسٹن کی پینٹنگ کیوں موجود تھی؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے کہ پروفیسر نے شاگرد کو بتایا ہوگا کہ وہ تبھی جرم سے بچ سکتے ہیں جب تک کہ وہ اس جیسی پینٹنگ کو پینٹ نہیں کر لیتا۔ پروفیسر تھوڑا خود غرض ہو گیا اور سارا الزام شاگرد پر ڈالنے کی کوشش کی مگر شاگرد بھی اکیلا جیل نہیں جانا چاہتا تھا۔''

''لیکن سر وہ اصلی پینٹنگ کہاں ہے؟''

''ہمارے ایک نئے لڑکے نے اسے پروفیسر کے گھر سے ڈھونڈ نکالا ہے۔''

''ایون!'' پروفیسر نے بلایا۔

ایک دبلا پتلا نوجوان ان کی جانب بڑھا۔

''اس لڑکے نے پینٹنگ ڈھونڈی ہے؟'' رچرڈ نے ناخوشگواری سے کہا۔ ''تم نے اسے کیسے ڈھونڈا؟''

''صحیح جگہ تلاش کرنے پر..... تمہیں بھی ایسی کوشش کرنی چاہیے۔'' ایون نے طنز کیا۔

چیف نے ان دونوں افسران کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اچھا اچھا..... ٹھیک ہے اب تم لوگ ٹھنڈے ہو جاؤ۔ ایون تم مسٹر مئیر کو واپس اسٹیشن لے جاؤ اور رچرڈ تم مسٹر ولیم کو لے جاؤ۔ اب ہم ہر چیز کو سنبھال لیں گے۔''

آفیسر ایون اپنی کار میں واپس آ گیا۔ اس نے اپنی سیٹ بیلٹ باندھی اور شیشہ کا رخ اسپیسٹن کی جانب کیا۔

''سر مجھے بالکل نہیں لگا تھا کہ آپ کا منصوبہ کام آئے گا۔''

''ایجنٹ کیٹ! تمہیں ہمیشہ میرے منصوبوں پر شک کیوں ہوتا ہے؟'' اسپیسٹن مسکرایا۔

کیٹ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے روڈ پر لے آیا۔ ''اس چور کو پکڑنے میں ہمیں چار سال لگ گئے۔'' کیٹ نے آنکھیں گھمائیں۔

''ہاں واقعی بہت عرصہ لگ گیا لیکن ہمیں ٹھوس ثبوت کی ضرورت تھی۔ تمہیں اس کے گھر سے ساری پینٹنگ مل گئی؟''

''جی ہاں سر..... اور میرے ساتھ موجود پولیس والوں نے پہلے ہی چیف کو یہ خوشخبری سنا دی ہے۔''

وہ کالج سے شمال کی جانب ایک میل ہی گئے ہوں گے کہ کیٹ کا وائرلیس بج اٹھا۔ اس نے گاڑی ایک سائڈ پر لگا کر بند کر دی۔

''ہیلو..... جی چیف..... اچھا..... ٹھیک ہے ہولڈ آن.....'' کیٹ نے ریسیور کو اسپیکر پر ڈال دیا۔

ایجنٹ کیٹ اور ایجنٹ ایلن..... تم لوگوں کی محنت اور لگن کو میں سلام پیش کرتا ہوں..... تم لوگوں نے دنیا کے سب سے بدنام آرٹ چوروں میں سے ایک کو پکڑا ہے۔ یہ تمہارا اب تک کا سب سے بہترین کیس تھا۔'' چیف نے انہیں شاباشی دیتے ہوئے کہا۔

''شکریہ جناب۔''

www.PakiBooks.Site

آگ کا دریا

ضیاء تسنیم بلگرامی

تاریخ کی گرد نے ایسے لاتعداد چہرے چھپا دیئے کہ اب وہ عام افراد کے حافظے سے بھی محو ہو چکے ہیں جب کہ ان کے دور میں ان کے قصیدہ خوانوں کو زر و جواہر سے نوازہ جاتا تھا۔ یہ نوازنے والے اپنی تعریف کے لیے تو موتیوں کی بارش کرتے تھے اور تنقید کرنے والے کے جسم سے چندی تک نوچ لیتے تھے۔ ان کے ظلم و جبر سے تاریخ تک شرمندہ ہے۔ ایک ایسے ہی شہنشاہ کا ذکرِ خاص جس کا نام ہی دہشت کی علامت تھا۔

تاریخ کے دریچے سے ایک دلچسپ قصہ

میرے آباؤ اجداد ابدالی تھے۔ ابدالی کون ہیں اور انہیں ابدالی کیوں کہا جاتا ہے، یہ ایک پیچیدہ اور پریشان کن سوال ہے۔ اس سلسلے میں دو روایتیں مشہور ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے خاندان میں ایک بزرگ ابدال ابن ترین ابن شرف الدین گزرے ہیں ان ہی سے ہم لوگ ابدالی کہلائے لیکن بعض کا قول ہے کہ ابدال کسی کا نام نہیں تھا بلکہ

www.PakiBooks.Site

چشتیہ سلسلے کے ایک بزرگ خواجہ ابو احمد نے جو اپنے زمانے کے ابدال تھے، ترین ابن شرف الدین کے بیٹے کو ابدال کا لقب مرحمت فرمایا تھا، اس سے ہم لوگ ابدالی کہلائے۔

جب عرب کے یہودی مسلمان ہو گئے تو انہوں نے اپنا ایک مبلغ خالد اپنی قوم افغان میں بھیجا۔ اس نے افغانوں میں اسلام کی تبلیغ کی... اور انہیں بتایا کہ سرزمین عرب میں اللہ کا آخری پیغمبر ظہور فرما چکا ہے۔ وہ پیغمبر جس کی بشارتیں تواتر سے مقدس کتابیں اور اخبار یہود دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور ان نومسلموں کے سرداروں کا ایک وفد رسول اللہ کی خدمت میں پہنچا۔ اس وفد میں قیس نامی سردار بھی شامل تھا۔ اس سردار کا شجرۂ نسب سینتالیس واسطوں سے اسباط بنی اسرائیل سے مل جاتا تھا، چنانچہ رسول اللہؐ نے بھی قیس کا نام عبدالرشید رکھتے ہوئے بطور خاص ارشاد فرمایا۔ ’’اے عبدالرشید تو امیر ہے کیونکہ تو بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا ہے۔‘‘

پھر جب رسول اللہؐ نے مکہ کو فتح فرمایا تو افغانوں کے یہ نومسلم سردار بھی رسول اللہؐ کے شریک و سہیم تھے۔ فتح مکہ کے بعد ان سرداروں نے اپنے وطن کی سمت مراجعت کی۔ اس وقت خدا کے آخری پیغمبرؐ نے بطور خاص ان کے لیے خیر و برکت کی دعا مانگی۔ کہا جاتا ہے کہ مدینے کی یہود بستی خیبر کی یاد تازہ رکھنے کے لیے یہاں بھی درہ خیبر کو وجود میں لایا گیا۔

انہی میں نامی نام کے ایک سردار کا بیٹا سردار خان تھا۔ سردار خان کو غالباً پیار میں سدو کہا جاتا تھا۔ جب سدو نے اپنی عقل اور بہادری کی وجہ سے شہرت حاصل کی تو اس کی نسل سدوزئی کے نام سے شہرت پا گئی۔ چنانچہ میں جہاں ابدالی ہوں وہیں سدوزئی بھی اور مشہور فاتح افغان اور ہندوستان احمد شاہ درانی بھی میرے ہی خاندان کا مشہور سپوت تھا۔

زمانے کے نشیب و فراز نے میرے خاندان کو بحیرۂ خزر کے ساحلی شہر بندرانزلی میں پھینک دیا تھا۔ ہم لوگ یہاں عسرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ میرے والد کو سپاہ گری کے علاوہ کچھ آتا ہی نہ تھا لیکن نادر شاہ افشار سے ایک معرکے میں ان کا بایاں ہاتھ کٹ گیا تھا۔ اب وہ نادر شاہ سے محفوظ اور مامون بندرانزلی میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ میری ماں نے کھیتی باڑی شروع کر دی اور بہت بڑے حصے میں تربوز بو دیا۔ والد صاحب بھی اپنی مرضی کے خلاف ماں کا ہاتھ بناتے رہتے تھے۔ اپنے باپ کی طرح مجھے بھی کھیتی باڑی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن جو کچھ والدین کو کرتے دیکھتا خود بھی کرنے لگتا۔

کبھی کبھی ہم لوگ اپنے دائیں بائیں پانی کی کھاڑیوں میں چلے جاتے۔ میرے والدین بیتے دنوں کی داستان چھیڑ دیتے اور میں پانی میں اتر جاتا، مچھلیاں پکڑنے لگتا۔ یہاں اور بھی بہت سے لوگ مچھلیاں پکڑتے رہتے تھے۔ میں مچھلیاں پکڑنے کے دوران پانی کے اندر غائب ہو جاتا اور جب اوپر نمودار ہوتا تو کوئی نہ کوئی مچھلی میرے ہاتھ میں ہوتی۔ میرے والدین مجھے پانی میں غائب ہوتے دیکھتے اور واپسی میں میرے ہاتھ میں مچھلی دیکھتے تو خوش ہو جاتے۔ میرا خیال تھا کہ میرے ماں باپ دفور محبت میں مجھے پانی میں غوطہ زنی سے روکیں گے لیکن انہوں نے کبھی بھی منع نہیں کیا میں سوچنے لگتا کہ کیا میرے والدین مجھ سے محبت نہیں کرتے؟ میرے اس سوال کا نہ تو میرے پاس کوئی جواب تھا اور نہ کسی اور سے اس کا جواب مل سکتا تھا۔ بعد میں مجھے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی کہ میرے والدین میرے مچھلیاں پکڑنے کو میرا فرض سمجھتے تھے اور جب میں اپنا یہ فرض کسی وجہ سے نہیں انجام دیتا تھا تو وہ بتاکید مجھے اس پر مجبور کر دیتے تھے۔

میری ماں نے مکان سے ملحق عقبی حصے میں آلو بخارا، سیب اور انگور لگانے کی کوشش کی مگر اس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ یہیں انہوں نے گیہوں بھی بویا تھا۔ اس میں وہ کامیاب ہو گئی تھیں۔ زمین کے لیے انہیں کھاد درکار تھی، وہ ایک ٹوکری میرے ہاتھ میں تھما دیتیں اور حکم دیتیں کہ جا اور انسانی فضلہ اور پرندوں کی بیٹ جہاں سے بھی ملے اٹھالا۔ میں کھاد کی تلاش میں میلوں مارا مارا پھرتا رہتا تھا۔ گھنٹوں کی تگ و دو کے بعد کہیں میری ٹوکری بھرتی تھی۔ کھاد کی تلاش اور فراہمی کا کام دوسرے لوگ بھی کرتے رہتے تھے۔ انسان کتنا خود غرض اور چھچھورا ہے۔ اس کا پہلا تجربہ اسی کام کے دوران ہوا۔ میں نے پرندوں کی بیٹ اور انسانی فضلے کے لیے لوگوں کو دست و گریباں بھی دیکھا ہے۔ ان لوگوں کو جو آپس میں دوست ہوتے تھے، آپس میں ہنسی مذاق کرتے تھے اور ایک ساتھ مل بیٹھ کر کھاتے پیتے تھے مگر انسانی فضلے اور پرندوں کے بیٹ کے لیے آپس میں ہاتھا پائی بھی کرتے تھے، سر پھٹول میں حصہ لیتے تھے۔

میرا یہ کام میرے باپ کو پسند نہیں تھا۔ اس سلسلے میں

www.PakiBooks.Site

... اصطلاح میں وہ فاضل پیداوار جو لگان، اجرت، سود اور دیگر مصارف ادا کرنے کے بعد ناظم کے پاس بچ رہتی ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: (1) خالص منافع (Net Profit) وہ معاوضہ جو ناظم کو اس کی تنظیمی خدمات اور کاروبار میں نفع و نقصان کی ذمہ داری اٹھانے کے صلے میں ملتا ہے۔ (2) مرکب منافع (Gross profit) اس میں خالص منافع کے علاوہ یہ رقوم بھی شامل ہیں لگان، سود، اجرت، اتفاقیہ نفع، اجارہ داری کا نفع، تخمینی نفع۔ مرسلہ: یمنیٰ سہیل۔ کراچی

جب میں نے ٹوکری ایک طرف رکھ دی تو میری ماں نے مجھے روک لیا اور پوچھا۔ ’’خواجک! خبردار جوان دونوں کی باتوں میں آیا۔‘‘

میں نے پوچھا۔ ’’ماں! یہ معاملہ کیا ہے؟‘‘

ماں نے جواب دیا۔ ’’وہ تجھے سپاہی بنانا چاہتا ہے مگر میں تجھے سپاہی نہیں بننے دوں گی کیونکہ میں نے سپاہیوں کو ہمیشہ اجاڑ اور ویران دیکھا ہے۔‘‘

دوسری طرف سے باپ کی آواز آئی۔ ’’بیٹے خواجک کیا کرنے لگا۔‘‘

ماں نے باآواز بلند جواب دیا۔ ’’ابھی وہ نہائے گا، کپڑے بدلے گا پھر کھانا کھائے گا، اس کے بعد......‘‘

لیکن اسی وقت میرا باپ اندر داخل ہوا اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اپنے مہمان کے سامنے لے گیا، بولا۔ ’’یہ ہے میرا بیٹا خواجک۔ میں اس کی بات کر رہا تھا تجھ سے۔‘‘

مہمان نے پوچھا۔ ’’اسے فن سپہ گری سکھا بھی رہے ہو یا یوں ہی خالی خولی......‘‘

میرے باپ نے جواب دیا۔ ’’اسے سپہ گری کا فن تو ہی سکھا، ابھی تو اسے کچھ بھی نہیں آتا۔‘‘

میری ماں نے دیوار کی آڑ سے کہا۔ ’’دیکھو مہمان! تم یہاں جس کام سے آئے ہو وہ کرو اور اپنا راستہ لو، بس مجھے تم سے اتنا ہی کہنا ہے۔‘‘

میرے باپ نے پیار سے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ’’بیٹے خواجک! کیا تجھے اپنا گندا کام پسند ہے؟‘‘

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’نہیں مجھے اپنا یہ کام ذرا بھی پسند نہیں۔‘‘

باپ نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ ’’اور پسند ہونا بھی نہیں چاہیے، تو سدوزئی ہے، ابدالی ہے، تیرا آبائی پیشہ سپہ

وہ مجھ سے کہتے تو کچھ نہیں ... سویرے سویرے گھر سے نکلتا، تو وہ مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھتے تھے جن سے ان کی ناپسندیدگی اور عدم مرضی کا صاف اظہار ہوتا تھا۔

پھر میں نے ایک دن اپنے والدین کو آپس میں لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ میں نے سنا میرا باپ میری ماں سے کہہ رہا تھا۔ ’’خانم! میرے بیٹے خواجک سے تو جو کام لے رہی ہے وہ مجھے بالکل پسند نہیں۔‘‘

میری ماں نے جواب دیا۔ ’’کیوں پسند نہیں۔ کیا یہ کام کوئی اور نہیں کرتا؟ اور پھر محنت میں شرم کیسی، وہ چوری تو نہیں کرتا۔ میں اس سے ڈاکا تو نہیں ڈلوائی۔‘‘

میرے باپ نے کہا۔ ’’وہ سدوزئی ہے، ہمارا پیشہ سپہ گری ہے اور تو نے اسے کس غلیظ کام میں لگا دیا ہے۔‘‘

میری ماں بھی مشتعل ہو گئی۔ چیخ کر بولی۔ ’’پھر لگا دو نا سپاہ گری میں اسے اور کٹوا دو اس کے بھی ہاتھ پاؤں۔‘‘

میرا باپ ہار گیا۔ تھکے تھکے اور یاس زدہ لہجے میں بولا۔ ’’اے کاش میں ایک ہاتھ سے محروم نہ ہوا ہوتا۔‘‘

اسی وقت میری ماں میرے پاس آئی اور ٹوکری میرے ہاتھ میں تھما دی۔ ’’لڑکے! تیرا باپ تجھے سپاہی بنانا چاہتا ہے، میری بھی یہی خواہش ہے کہ تیرے باپ کی آرزو پوری ہو لیکن جب تک تو سپاہی نہیں بنتا، اپنا کام کیے جا کیونکہ زندہ رہنے کے لیے کام بہت ضروری ہے۔‘‘

میں نے ٹوکری میں بندھی ہوئی رسی کو داہنے بازو سے پھنسایا اور اپنے کام پر نکل کھڑا ہوا۔

انسانی فضلہ تو مجھے میدانوں اور باغوں سے مل جاتا تھا مگر جانوروں کی بیٹ کا مسئلہ ذرا دشوار اور پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے ان کی بیٹ کی خاطر قدیم اور ویران عبادت گاہوں میں جانا پڑتا تھا۔ میں ان کے ہال اور میناروں میں چلا جاتا اور وہاں فرش پر بکھری ہوئی بیٹ کو ٹوکری میں بھر لیتا۔

ایک دن دوپہر کو جب میں گھر میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ کسی دور دراز علاقے سے ایک مہمان آیا ہوا ہے اور والد صاحب اس کی مہمان نوازی میں کھو سے گئے ہیں۔ جب میں گھر میں داخل ہوا تو میں نے اپنے باپ اور مہمان کو برآمدے میں بیٹھے دیکھا۔ میرے باپ نے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا۔ ’’یہی ہے وہ میرا بیٹا جس کی میں ابھی بات کر رہا تھا۔‘‘ پھر مجھے حکم دیا۔ ’’جا اپنی ٹوکری کہیں رکھ کر اپنا منہ ہاتھ دھولے اور پھر میرے پاس آجا۔‘‘

www.PakiBooks.Site

گری ہے اور تیری ماں تجھ سے کیا کام لے رہی ہے، توبہ توبہ استغفراللہ۔"

مہمان نے میری صحت اور قد و قامت کا کسی بردہ فروش کی طرح جائزہ لیا۔ بولا۔ "بڑی محنت کرنا پڑے گی اس کے ساتھ تب کہیں کچھ بن سکے گا یہ۔"

میرے باپ نے پوچھا۔ "تو یہاں رہے گا کب تک؟"

مہمان نے جواب دیا۔ "پتا نہیں کب تک رہوں گا لیکن جب تک رہوں گا اسے کچھ نہ کچھ سکھا دوں گا۔"

میرے باپ نے مجھ سے کہا۔ "دیکھو بیٹے خواجک! اب تو بڑا ہو رہا ہے ہمارے قبائل کو نادر شاہ افشار نے منتشر کر دیا۔ میرا ایک ہاتھ کٹ گیا۔ پردیس اور ایک ہاتھ کی محرومی نے میرا انداز فکر ہی بدل ڈالا۔ یہ شخص جو آج میرا مہمان بنا ہوا ہے میدان جنگ میں میرا ساتھی ہوا کرتا تھا۔ نادر شاہ افشار نے جو سزا ابدالیوں کو دی وہی اس کے قبیلے کو بھی بھگتنا پڑی لیکن اب یہ ایک خوش خبری لے کر آیا ہے۔ اس کو معلوم ہوا ہے کہ نادر شاہ افشار ابدالیوں پر اعتبار کرنے لگا ہے اور آج کل اس کے گرد و پیش جو لوگ موجود ہیں ان میں بیشتر ابدالی ہیں۔ میرا دوست میرے لیے یہ پیغام لایا ہے کہ اگر میں پسند کروں تو نادر شاہ کے پاس چلا چلوں، وہاں مجھے کوئی نہ کوئی منصب مل جائے گا۔" اس کے بعد میرے باپ نے ایک سرد آہ بھری۔ "لیکن وہ مجھے کون سا منصب دے گا۔ کم از کم میں تو پُرامید نہیں ہوں۔ ہاں اگر میرا دوسرا ہاتھ بھی ہوتا تو میں بے شک چلا جاتا۔"

مہمان نے کہا۔ "باغر! تو کچھ زیادہ ہی مایوس ہو گیا ہے ورنہ ایک ہاتھ کی کمی اتنا تو بیکار نہیں کر دیتی انسان کو۔"

میرے باپ نے کہا۔ "مجھے تو تو بھول ہی جا۔ میرے بیٹے کو فن سپہ گری کی تعلیم دے اور اس کو کوئی مقام دلانے کی کوشش کر۔"

مہمان نے بجھی بجھی آواز میں جواب دیا۔ "ٹھیک ہے جب تک میں یہاں ہوں اسے سکھاتا رہوں گا۔"

میرے باپ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ٹھیک ہے جب تک تو یہاں ہے، اسے فن سپہ گری کی تعلیم دیتا رہ اور جب تو جانے لگے تو اسے اپنے ساتھ لے جانا اور اپنے ساتھ جنگلوں میں رکھ کر اسے تجربات کرانا کیونکہ اصل درس گاہ میدان جنگ ہی ہے۔"

مہمان نے حیرت سے پوچھا۔ "تو کیا باغر! تو خواجک کو میرے ساتھ بھیج دے گا؟"

میرے باپ نے جواب دیا۔ "ہاں میں اس کو تیرے ساتھ کر دوں گا۔" پھر پوچھا۔ "سچ سچ بتا کیا یہ تیرا بھتیجا نہیں ہے؟"

مہمان نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، میں نے اگر تجھے اپنا بھائی نہ سمجھا ہوتا تو تیرے پاس آتا ہی کیوں؟"

پھر مہمان مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "بھتیجے تو نے کچھ تو سیکھی ہی ہو گی سپہ گری؟"

میں نے جواب دیا۔ "نہیں مجھے فنِ سپہ گری ذرا بھی نہیں آتی۔"

مہمان نے تسلی دی۔ "پھر بھی گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں سکھا دوں گا۔"

میں دیر تک ان دونوں کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ میری ماں دیوار کے پیچھے بیٹھی ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔

شام کو ہم سب ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے تو ہنسی مذاق کا سلسلہ چل پڑا۔ میرا باپ بہت خوش تھا۔ اس دن مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ میرا باپ میرے کاموں سے ذرا بھی خوش نہیں تھا، وہ سپاہی تھا اور مجھے بھی سپاہی دیکھنا چاہتا تھا۔

دوسرے دن صبح ماں نے پھر مجھے نوکری تھمائی اور حکم دیا۔ "جا اور کوشش کر کہ زیادہ سے زیادہ کھا مل جائے تجھے۔"

لیکن اسی وقت مہمان نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور کہا۔ "یاد ہے نا تجھے۔ میں آج ہی سے تجھے شمشیر زنی کی تربیت دینا چاہتا ہوں۔"

ماں نے اس کی یہ بات سن لی تھی، ماں نے کہا۔ "میرے بیٹے کو تو شمشیر زنی کی تربیت دینے والا کون ہوتا ہے؟"

اب میرے باپ نے درمیان میں مداخلت کی اور میرے ہاتھ سے نوکری چھین کر ایک طرف پھینک دی اور کہا۔ "یہ دوسروں کی غلاظت اب نہیں اٹھائے گا۔ یہ سپاہی زادہ ہے اور سپاہی زادہ ہی رہے گا۔"

میری ماں نے پوچھا۔ "ٹھیک ہے پھر یہ کام کون کرے گا؟ میں یا تم؟"

میرے باپ نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا کہ یہ کام کون کرے گا، آج میں پچھتا رہا ہوں کہ آخر میں نے تجھ

www.PakiBooks.Site

میں کیا دیکھا تھا جو شادی کر لی۔"

میری ماں تو بالکل ہی مشتعل اور حواس باختہ ہو گئی۔ انہوں نے اپنے بال نوچ ڈالے، پھر اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالا اور بین کرنے کے انداز میں بولیں۔ "باغر! یہ تو نے کیا کہہ دیا۔" پھر رونے لگیں۔ "یا اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے، یا میرے مولیٰ! میں یہ کیا سن رہی ہوں۔"

میرے باپ نے مجھے اپنے مہمان دوست کے حوالے کر دیا اور کہا۔ "تم دونوں اپنا وقت کیوں ضائع کرو، جاؤ اور اپنا کام کرو۔ اس کی فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

مہمان مجھے بحیرۂ خزر کے ساحل پر لے گیا اور شمشیر زنی کی تربیت دینے لگا۔

☆.....☆

میں نے اپنے باپ سے بہادروں کی کہانیاں سنی تھیں۔ مشہور آدمیوں کے کارنامے سنے تھے اور یہ بھی سنا تھا کہ آدمی کو شہرت حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ باپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ انسان کی وہ شہرت جو انتھک محنت، دیانت، دانائی، سچائی اور بہادری سے حاصل کی گئی ہو، عظیم اور پائیدار ہوتی ہے۔ میں نے اپنے باپ سے یہ بھی سنا تھا کہ کسی اونچے مقام تک پہنچنے کے لیے انسان کو بڑی قربانیاں دینا پڑتی ہیں اور کسی کام سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے کافی دنوں تک ٹوکریوں میں انسانی فضلہ اور پرندوں کا بیٹ اٹھایا ہے مجھے کسی کام سے عار نہیں تھا چنانچہ جب مجھے اچانک حربی تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا تو میں تن من سے اس میں مشغول ہو گیا۔

میری ماں کی مخالفت جاری تھی لیکن میرا باپ میری حمایت میں سپر بنا ہوا تھا۔ میری ماں نے میرے باپ کے ایما اور استقلال کو بے اثر کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ان میں کئی طریقے ایسے تھے جنہوں نے میرے باپ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کے پائے ثبات میں تزلزل پیدا ہو گیا اور میں بھی خاصا پریشان اور خوفزدہ ہو گیا۔ میری ماں نے کھیتی باڑی اور پھل دار درختوں کی نشوونما سے منہ موڑ لیا اور میرے باپ سے صاف صاف کہہ دیا۔ "میں خاتون خانہ ہوں، میں گھر کے سارے کام انجام دے سکتی ہوں مگر باہر کے کام تمہارے ذمہ ہیں، بہت ہو چکا۔ اب اٹھو اور اپنا کام سنبھالو۔"

میرے باپ نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں کہ تیری سرپرستی، معاشی اور اقتصادی ذمہ داریاں پوری کرنا میرا فرض ہے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

ماں نے کہا۔ "تب پھر خواجک کو میرے حوالے کر دو۔ ہم دونوں حسبِ معمول اپنے اپنے کام کرتے رہیں گے اور تم اطمینان اور سکون سے اپنے کام کرتے رہو۔"

اس دن میں نے اپنے باپ کو ہمیشہ سے زیادہ فکرمند اور دکھی محسوس کیا۔ انہوں نے کہا۔ "خانم تو میرا منصوبہ سمجھنے کی کوشش کر، خواجک اگر حربی تعلیم حاصل کر کے کچھ بن گیا تو ہمارے دن پلٹ جائیں گے۔"

ماں ... زہر خند لہجے میں بولی۔ "معلوم نہیں دن پلٹیں گے یا ہم سب الٹ پلٹ کر رہ جائیں گے۔ میں تم سے کتنی بار اپنے اس خطرے کا اظہار کر چکی ہوں کہ جنگیں مجھے پسند نہیں۔ شر پسند انسانوں نے معلوم نہیں کب سے اور کیوں یہ وتیرہ اختیار کر رکھا ہے کہ لاڈ، پیار اور ناز و نعم سے جوان کی جانے والی اولاد نرینہ کو جنگ کی بھٹیوں میں جھونک دیا جائے لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، میں اپنے خواجک کو پال پوس کر جوان کروں گی تاکہ وہ بڑھاپے تک زندہ رہے اور لذائذ دنیوی سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکے۔"

میرے باپ نے اتنی بڑی بڑی باتیں خانم سے پہلے نہیں سنی تھیں۔ وہ خانم کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا، اس نے کہا۔ "خانم تو عورت ہے اور تو نہیں جانتی کہ مردوں کا وقار اور عزت ان کی تلوار اور جنگی کارناموں سے وابستہ ہوتے ہیں، خواجک کو سورما اور نبرد آزما بننا ہے۔"

خانم نے میرا کان پکڑ لیا اور پوچھا۔ "بول! تجھے کیا پسند ہے، جوان ہو کر کسی نامعلوم دشمن سے قتل ہو کر گمنام ہو جانا یا میرے ساتھ رہ کر اناج اگانا اور پھل پھلاری پیدا کرنا، زیادہ دنوں تک زندہ رہنا۔"

میں نے اپنے باپ کی طرف دیکھ کر جواب دینا چاہا تو ماں نے میرا چہرہ زبردستی اپنی طرف کر لیا اور کہا۔ "ادھر کیا دیکھتا ہے، میری طرف دیکھ اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دے۔"

میں نے اپنی ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ "ماں میں پرندوں کی بیٹ اور انسانوں فضلہ نہیں اٹھاؤں گا اور مردوں کی طرح زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

میرے باپ نے فرطِ جوش میں مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنا ایک ہاتھ میری پشت پر محبت سے پھیرتا رہا۔

www.PakiBooks.Site

میری ماں کے اندر کی کمزور عورت سامنے آگئی وہ رونے لگی، اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے اگر تو نے بھی وہی فیصلہ کیا ہے جو تیرے باپ نے کر رکھا ہے اور تو بھی بے مقصد موت مرنا چاہتا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں، جا اور مر جا۔''

اس کے بعد میری ماں اپنے بستر پر گر کر رونے لگی۔

میرے باپ نے اسی وقت میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے مہمان دوست کے حوالے کر دیا، کہا۔ ''دوست! موقع غنیمت ہے تو خواجک کو اپنے ساتھ لے جا اور اسے مرد میدان بنا دے۔ میں اس کی جدائی کا غم اس اُمید پر گزار لوں گا کہ ... ایک نہ ایک دن میرا بیٹا کوئی نامی گرامی سردار بن کر ہمارے دن پلٹ دے گا اور ہم سب عزت و آبرو سے زندہ رہ سکیں گے۔''

مجھے مہمان کے حوالے کر دیا گیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت میں بھی خوش تھا کیونکہ میں بندرانزلی جیسی چھوٹی سی جگہ سے اکتایا ہوا تھا۔ میں دنیا دیکھنا چاہتا تھا میں بڑا آدمی بننا چاہتا تھا۔ میں آدمیوں کی بھیڑ بھاڑ میں معزز، مشہور اور نامور آدمی بننا چاہتا تھا۔

میں اپنے والدین کو سوگوار چھوڑ کر اپنے باپ کے دوست کے ساتھ رشت کی طرف روانہ ہو گیا۔ چلتے وقت والد نے اپنے دوست سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ وہ ہر دوسرے سال کسی نہ کسی طرح مجھے ان سے ملانے کے لیے بندرانزلی لایا کرے گا۔ مجھے ابھی تک اپنے مہمان کا نام تک نہیں معلوم تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے پر آگے بٹھا لیا، راستے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''خواجک! کیا تجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے؟''

گو کہ گھر چھوٹنے کا اثر دل و دماغ پر طاری تھا مگر میں نے خوشدلی کا مظاہرہ کیا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں، مجھے گھر نہیں یاد آ رہا۔''

کچھ دیر بعد اس نے دوسرا سوال کیا۔ ''کیا تجھے اپنے ماں باپ یاد آ رہے ہیں؟''

میں نے اس بار بھی جھوٹ کا سہارا لیا اور جواب دیا۔ ''نہیں مجھے وہ بھی نہیں یاد آ رہے۔''

اس نے کہا۔ ''خوب! اور بندرانزلی؟''

میں نے جواب دیا۔ ''وہ بھی نہیں، بندرانزلی بھی نہیں۔''

وہ میرے جوابوں سے خوش ہوا یا حیرت زدہ مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی میں اس کی باتوں سے اس کے اصل جذبات یا احساسات کا اندازہ لگا سکا، اس نے کہا۔ ''تب تو خواجک تو بہت کارآمد ثابت ہوگا اور شاید خطرناک بھی۔ اللہ نے چاہا تو تو بڑی ترقی کرے گا۔''

کچھ ہی دیر بعد ہم رشت میں داخل ہو گئے۔ میں نے رشت کے بازار میں انگور اور آلوچوں کی کثرت دیکھی، یہاں تربوز بھی موجود تھا اور خربوزہ بھی، وہ ایک جگہ گھوڑے سے اتر کر پھل خریدنے لگا۔ ان پھلوں کو ایک بڑے رومال میں باندھ کر گھوڑے کے پاس لایا اور پھر اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''انہیں اپنے آگے رکھ لے آج رات انہی پھلوں پر گزارہ کرنا ہے کیونکہ میں رشت کا کھانا پسند نہیں کرتا۔''

میں نے پھلوں کا گٹھر اپنے آگے رکھ لیا۔ وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو گیا، اونچے نیچے راستوں کے سفر نے میرے جوڑ جوڑ ہلا کر رکھ دیئے تھے اور میں ہر چیز کو گھومتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شخص پریشان، فکرمند اور خوفزدہ کیوں تھا؟ لوگ اگر پوچھیں کہ تو نے اس کی کن باتوں سے پریشانی فکرمندی اور خوفزدگی محسوس کی تھی تو میرے پاس ان باتوں کا جواب موجود ہے۔ وہ بازار سے گزرتے اور پھل خریدتے ہوئے نڈھال اور پژمردہ سا ہو رہا تھا۔ گویا یہ اس کی پریشانی کا مظہر تھی، جب اس نے پھلوں کا گٹھر میرے حوالے کیا تو اس کی پوری توجہ میری یا اس کام کی طرف نہیں تھی۔ وہ سوچ کچھ رہا تھا اور کر کچھ رہا تھا۔ یہ کیفیت اس کی فکرمندی کو ظاہر کر رہی تھی۔

اسی طرح جب ہم بازار سے گزر رہے تھے تو وہ بار بار سہمے ہوئے انداز میں اپنے آس پاس نظریں ڈال رہا تھا اور اس کی اس کیفیت میں خوفزدگی کا عنصر واضح تھا۔ وہ مجھے ایک مکان میں لے گیا۔ یہاں کچھ لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے، انہوں نے اس کے ساتھ مجھے دیکھا تو ان کی خوشی کا ٹھور ہو گئی۔

ایک نے کسی گونگے کی طرح ہاتھوں کو جنبش دی اور پھر سوالیہ انداز میں ہاتھ کو اوپر نیچے کرنے لگا۔ اس پر میرے ساتھی نے جواب دیا۔ ''یہ اپنا ہی ساتھی ہے کوئی غیر نہیں ہے۔ میں اسے آدمی بنانے کے لیے لایا ہوں۔''

کسی نے پوچھا۔ ''کیوں کیا یہ آدمی نہیں بندر ہے۔''

مجھے اس آدمی پر غصہ آ گیا مگر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

www.PakiBooks.Site

میں نے اس روز کھانا نہیں کھایا، اس نے انگور اور آلوچے میرے آگے رکھ دیئے اور کہا۔ ''آج رات ہم کھانا نہیں پھل کھائیں گے کیونکہ میں بازار کا کھانا نہیں کھاتا۔''

میں نے انگوروں میں ترشی محسوس کی، شاید کھٹاس نے میرا منہ ٹیڑھا کر دیا تھا اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے تیرا منہ کیوں بن رہا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''انگور کھٹے ہیں۔''

وہ میرے جواب پر ہنسنے لگا اور بولا۔ ''بے شک انگور کھٹے ہیں۔'' اس نے آلوچے میری طرف بڑھا دیئے اور کہا۔ ''اور یہ گوجل؟ انہیں کھا کر تو دیکھ۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ گوجل ہے؟ خوب یہ گوجل کیا چیز ہوتی ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''آلوچہ، ہم لوگ آلوچے کو گوجل کہتے ہیں۔''

پانی رشت کا بھی کھارا تھا، سمندر کے پانی کی طرح۔ میں چونکہ اس پانی کا عادی تھا اس لیے غٹا غٹ پی گیا مگر اس نے منہ بنا بنا کے پیا۔

رات کو سونے سے پہلے مجھے اپنا گھر اور والدین بہت زیادہ یاد آئے، میں اداس ہو گیا۔ میں دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کا بستر بھی میرے قریب تھا۔ شاید وہ میری کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے خواجک؟ کہیں گھر تو نہیں یاد آ رہا؟''

میں نے ایک بار پھر تیکھی میں جواب دیا۔ ''نہیں، مجھے اپنا گھر یاد نہیں آ رہا۔''

وہ پھر چونک پڑا اور کہا۔ ''خوب! خواجک میرا خیال ہے مجھے تجھ سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا۔'' پھر پوچھا۔ ''کیا تجھے اس وقت بھی اپنے ماں باپ نہیں یاد آ رہے؟''

میں نے ایک بار پھر تیکھی میں جواب دیا۔ ''ہاں مجھے اپنے ماں باپ بھی نہیں یاد آ رہے۔''

وہ دم بخود بس سوچتا کا سوچتا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور شاید طنزاً کہا۔ ''اب تک تو کہاں تھا خواجک! بخدا اگر تیرے جیسے مجھے ہزار بارہ سو آدمی مل جائیں تو میں دنیا کو فتح کر سکتا ہوں۔''

پھر وہ تو سو گیا مگر میں جاگتا رہا۔

رات کے پچھلے پہر وہ اٹھا اور مجھ پر جھک کر یہ جاننے کی کوشش کی میں اب بھی جاگ رہا ہوں یا سو گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور دم سادھے بناوٹی سویا ہوا تھا۔

میں نے سنا وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ''خواجک! بخدا تو خدا کی طرف سے ایک انعام ہے جو مجھے دیا گیا ہے، میں تجھے فن سپہ گری میں طاق کر دوں گا مگر اس کی شرط یہ ہوگی کہ میں تجھ سے جو کام بھی کہوں گا تجھے کرنا ہوگا۔''

شاید صبح ہوتے ہوتے میری بھی آنکھ لگ گئی تھی اور میں دن چڑھے تک سوتا رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا وہ شخص کھانا پکانے میں مشغول ہے، میں نے اس کے ہاتھ کا پکا کھانا کھایا، کھانا بہت لذیذ تھا۔ اس شخص کی محبتوں نے مجھے بندہ بے دام کر لیا تھا۔ اس کے ساتھی منہ پھیر پھیر کر اس پر ہنستے رہتے۔ اب میں ان نمک حراموں پر غور کرنے لگا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ان کا میرے محسن اور میرے ولی نعمت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

اسی دن شام کو اس نے کہا۔ ''خواجک! کئی دن سے میں ایک جگہ جانے کا منصوبہ بنا رہا ہوں اگر مجھے اس جگہ جانا نہ ہوتا تو میں یہاں رشت میں بالکل نہ رکتا لیکن میں یہاں کچھ لینے آیا ہوں، کیونکہ یہ میرا اعتقاد بھی ہے اور یقین و تجربہ بھی۔''

شام کو میں اس کے ساتھ ایک ایسی عمارت کے سامنے پہنچا جس کے باہر سیاہ علم لٹکے ہوئے تھے اور ان علموں پر پنجتن کے نام لکھے ہوئے تھے، آج اس بات کو زمانہ گزر گیا مگر میں اسے چشم تصور سے یوں دیکھ رہا ہوں گویا سب کچھ اب بھی میری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے، وہ جمعہ کا دن تھا۔

میں اس کے ساتھ اس عمارت میں داخل ہو گیا، اندر ایک وسیع صحن تھا، اس صحن میں ایک باغ لگا ہوا تھا، باغ کی روشوں پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان چٹائیوں پر سیاہ پوش عورتوں کا ہجوم تھا۔

سامنے ایک لمبی عمارت تھی۔ اس کی کرسی زمین سے کوئی تین سارھے تین ہاتھ اونچی تھی۔ میں سیڑھیوں کے ذریعے اوپر چڑھ گیا۔ یہاں مرد بیٹھے ہوئے تھے، میں اپنے محسن اپنے بزرگ سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ یہاں کیا ہوتا ہے اور ہم یہاں کیوں آئے ہیں مگر نہیں پوچھ سکا۔ کچھ دیر بعد شاید اسے خود ہی اس کا خیال آ گیا اور میرے کان سے اپنا منہ لگا کر آہستہ سے کہا۔ ''جانتا ہے کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں اور یہاں کیا ہوتا ہے؟''

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں، میں نہیں

www.PakiBooks.Site

جانتا۔''

اس نے کہا۔ ''تیری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''آپ خوب جانتے ہیں کہ میں بندرانزلی سے آپ کے ساتھ کیوں چلا آیا اور میرے باپ کی سب سے بڑی کیا خواہش رہی ہے جو میرے باپ کی خواہش تھی وہی میری خواہش ہے۔''

اس نے منہ بنا کر گفی میں گردن ہلائی۔ ''نہیں صاحبزادے، اس طرح کام نہیں چلے گا، یہاں یوں کام نہیں ہوتا۔ یہاں تو ہر شخص اپنی خواہش کا اظہار لفظوں میں واضح طور پر کرتا ہے، اب تو کیا چاہتا ہے؟''

میں نے اٹک اٹک کر رک رک کر جواب دیا۔ ''میں دیانت دار، محنتی کامل اور عاقل بہادر سردار بننا چاہتا ہوں۔ ایک ایسا بہادر سردار جو دولت مند بھی ہو اور مشہور اور نامور بھی۔ یہی میرے باپ کی بھی خواہش تھی۔''

اس نے کہا۔ ''تب پھر تو یہاں اپنی اس خواہش کو دعائیہ انداز میں زیر لب دہرا۔ اللہ نے چاہا تو تیری یہ خواہش پوری ہو کر رہے گی۔ یہ روضہ خوانی کی محفل ہے۔ یہاں مرثیہ خوانی ہوتی ہے، میں نے ماضی میں کئی بار یہاں آ کر منتیں مانی تھیں جو بعد میں حیرت انگیز طور پر پوری ہوئیں مثلاً یہ کہ میں نے کئی سال پہلے یہ منت مانی تھی کہ مجھے نادر شاہ افشار کا قرب حاصل ہو جائے چنانچہ آج میں نادر شاہ کا میر سامان خاص ہوں۔''

میں نے اپنی خواہش کو زیر لب لفظوں میں ادا کیا۔ میر محسن میں نے سنا آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ''میرے آقا میرے مولا علی حشکل کشا، یا پنجتن پاک ان دنوں میں جتنی ذہنی اذیتوں میں مبتلا ہوں آپ ان سے اچھی طرح واقف ہوں گے، میں چاہتا ہوں کہ اس دور کے ظالم ترین انسان کا سر میں کچلوں، میں ایک ایسے شخص کو کمزور انسان پر ظلم ڈھانے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روک دوں جو اس دور کا سنگ دل ترین انسان ہے۔ میں اس کی ہلاکت کا شرف خود حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد دبلے پتلے جسم کے ایک صاحب تشریف لائے۔ وہ ایک لمبا چغہ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں لمبا عصا تھا۔ وہ ایک نمایاں مقام پر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے آتے ہی ایک شعر پڑھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اب انہوں نے مرثیہ خوانی شروع کر دی تھی۔ موثر اور دلوں میں اتر جانے والی طرز ادا میں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ انہوں نے جب بھی کسی کو وہاں مخاطب کیا نو جوان با تمیز کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

میں نے دوران مرثیہ خوانی عورتوں کو زور زور سے روتے ہوئے سنا تھا، وہ بھی اپنی الگ الگ تمنائیں لے کر آئی تھیں۔

عمارت سے باہر نکل کر وہ شخص اتنا مطمئن اور خوش نظر آ رہا تھا گویا جو کچھ اس نے مانگا تھا، اسے مل چکا تھا۔

راستے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''خواجک! میں نے وہاں جو دعا مانگی تھی کیا تو نے وہ سنی تھی؟''

میں نے جواب دیا۔ ''نہیں کیوں کہ اس وقت میں خود بھی دعا مانگنے میں مشغول تھا۔''

اس نے کہا۔ ''چلو اچھا ہوا کہ نہیں سنی مگر پھر بھی ایک ضروری بات بتا دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔''

اس کے بعد انہوں نے مجھے سمجھانا شروع کیا۔ ''صاحبزادے اس ماحول میں یعنی اس مقدس ماحول میں جو کچھ بھی کہا سنا جاتا ہے وہ ایک طرح کی امانت ہوتا ہے، اس کو کسی اور پر نہیں ظاہر کیا جا سکتا اور اگر کوئی بدطینت ایسا کرتا بھی ہے تو اسے لمبے عرصے تک پریشانیوں میں گھر جانا پڑتا ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش رہا مگر میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ شخص کسی وجہ سے بہت بے چین ہے اور شاید وہ میری اس بات پر یقین نہیں کر رہا کہ میں نے اس کی دعا نہیں سنی۔

رات کو اس کے ساتھیوں نے پوچھا۔ ''صالح خان! تم نے کیا دعا مانگی تھی آج؟''

اس رات مجھے پہلی بار اس کا نام معلوم ہوا تھا۔ وہ صالح خان تھا، نادر شاہ کا میر سامان خاص، یکا یک میرے اندر کسی نے پوچھا۔ ''تو کیا یہ شخص اپنے آقا اپنے ولی نعمت کی نسبت ایسے خیالات ایسے احساسات رکھتا ہے؟ مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔''

صالح خان نے اپنے ساتھی کو جواب دیا۔ ''میں ظلم و جور سے ٹکرا کر اسے ختم کر دینا چاہتا ہوں، میں اس چراغ کو بجھا دینا چاہتا ہوں جس کی لو سے لاکھوں گھر جل کر بھسم ہو گئے، بس یہی میری دعا تھی اور یہی میری خواہش ہے۔''

معلوم نہیں کیوں صالح خان دعائیں مانگنے کے بعد بھی رشت ہی میں ٹھہرا تھا۔ تیسرے دن کسی نے اسے بتایا

www.PakiBooks.Site

کہ نادر شاہ کا بھتیجا علی قلی خان رشک کے باہر خیمہ اندوز ہے اور اس نے صالح کو یاد فرمایا ہے۔ وہ اس پیغام کے ساتھ ہی علی قلی خان کے پاس چلا گیا۔ ان دونوں میں کیا باتیں ہوئیں، میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ میں صالح خان کے ساتھ علی قلی خان کے پاس نہیں گیا تھا۔ صالح خان نے آتے ہی کہا۔ ''خواجک! میں نے تیرے سلسلے میں شہزادہ علی قلی خان سے بات کر لی ہے۔ شہزادے نے کہا ہے کہ میں تجھ کو ایک نظر شہزادے کے سامنے پیش کر دوں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''جب آپ کہیں۔''

صالح خان اسی شام کو مجھے رشت کے باہر شہزادہ علی قلی خان کے خیمے میں لے گیا۔ وہاں میں نے دیکھا، صالح خان کی شہزادے کے دل میں بڑی عزت تھی۔ وہ صالح خان کے ساتھ مجھے بالکل تخلیہ میں لے گیا اور مجھ سے نرم و ملائم لہجے میں اچھی اچھی باتیں کیں۔ شہزادے نے مجھے یقین دلایا کہ میں جو کچھ بننا چاہتا ہوں ایک نہ ایک دن بن کے رہوں گا۔

پھر اچانک صالح خان کو کہیں بھیج دیا گیا اور میں شہزادے کے پاس تنہا رہ گیا۔ اس وقت میرا برا حال تھا۔ شہزادے کا رعب مجھے کپکپائے دے رہا تھا۔ شہزادے کے حشم و خدم اور جسم پر اس کا لباس فاخرہ دیکھ کر میری جان نکلی جا رہی تھی مگر اس کے ساتھ ہی میں یہ سوچ سوچ کر بہت خوش ہو رہا تھا کہ میں جو کل تک بندرانزلی کے میدانوں اور ویرانی عمارتوں میں انسانی فضلے اور پرندوں کی بیٹ اکٹھا کیا کرتا تھا۔ آج نادر شاہ کے بھتیجے علی قلی خان سے شرف ہم کلامی حاصل کر چکا تھا۔ جب میں یہ سب سوچ رہا تھا تو شہزادے کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تیرا نام کیا ہے لڑکے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''خواجک شہزادہ عالی۔''

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''بھلا یہ کیا نام ہوا؟ کیا تو پٹھان ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں میں پٹھان ہوں ابدالی نسل سے تعلق رکھتا ہوں۔''

شہزادے نے منہ بنایا۔ ''ابدالیوں نے میرے چچا نادر شاہ کو بے حد ستایا ہے لیکن تو خوش قسمت ہے کہ تو صالح خان سے اس وقت ملا جب کہ نادری دربار میں ابدالیوں نے ایک خاص جگہ بنالی ہے۔''

میں چپ چاپ شہزادے کی باتیں سنتا رہا پھر شہزادے نے پوچھا۔ ''کل جب تو روضہ خوانی میں گیا تھا تو وہاں کیا دعا مانگی تھی؟''

میں نے جو دعا مانگی تھی سنا دی۔ اس پر شہزادے نے یہ پوچھا۔ ''اور صالح خان نے کیا دعا مانگی تھی؟''

میں نے جواب دیا۔ ''اوّل تو یہ کہ اس وقت میں خود اتنا منہمک تھا کہ کسی دوسرے پر توجہ ہی نہ دے سکا، دوسرے یہ کہ اس وقت میرے محسن صالح خان نے زیر لب دعا مانگی تھی کہ میں کیا اسے کوئی بھی نہیں سن سکا ہوگا۔''

شہزادے نے کہا۔ ''خدا کرے یہی سچ ہو جو تو کہہ رہا ہے۔''

صالح خان کچھ دیر بعد ہی آ گیا۔

شہزادہ علی قلی خان کو شاید میں بہت اچھا لگا تھا۔ اس نے صالح خان کو ہدایت کی۔ ''صالح خان! لڑکا ہونہار ہے، یہ آگے چل کر شہرت حاصل کرے گا اور سردار بن کر حکومت کرے گا۔''

ان باتوں سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ صالح خان نے عرض کیا۔ ''شہزادے! میں نے بھی اس میں کچھ دیکھا ہے، یہ ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔''

ہم رشت میں دو دن اور ٹھہرے۔ ان دو دنوں میں بھی صالح خان نے مجھے شمشیر زنی کی تربیت دی۔ سمند شوق کو تازیانہ لگ چکا تھا۔ میں بڑی لگن اور دل جمعی سے فن سپہ گری سیکھ رہا تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''استاد محترم! ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''مشہد مقدس، وہیں میرا خاندان بھی رہتا ہے، تو میرے ساتھ میرے گھر چل۔''

مشہد میں صالح خان مجھے اپنے گھر لے گیا، اس کا کنبہ بہت مختصر تھا، ایک بیٹی زرغونہ، ایک بیوی، ان کے علاوہ ایک کنیز بھی تھی۔ زرغونہ میری ہم عمر تھی، بہت اچھی شکل صورت کی۔ دیکھو تو بس دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ مجھے ان لوگوں میں شرم بہت لگی۔ گھر میں داخل ہو جانے کے بعد صالح خان کے رویوں اور سلوک میں فرق آ گیا۔ اب اس نے فن سپاہ گری سکھانا چھوڑ دیا اور مجھ سے گھر کے کام کروانے لگا۔ ان دنوں صالح خان کی بیوی گٹھیا میں مبتلا تھی۔ ہاتھ پاؤں اور انگلیوں کے جوڑوں میں اتنی شدید تکلیف ہوتی کہ وہ چیخنے چلانے لگتی۔ جوڑوں پر ورم آ جاتا تھا۔ گھر کا کام کاج

www.PakiBooks.Site

کنیز کرتی تھی۔ صالح خان نے کنیز کو حکم دیا کہ کھانا پکانا خواجک کو سکھا دیا جائے۔

میں نے کہا۔ ''لیکن میں یہاں کھانا پکانے تو نہیں آیا۔''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''تجھے سب کچھ سیکھنا چاہیے کیونکہ کچھ پتا نہیں کہ عملی زندگی میں کیا کچھ کرنا پڑے۔''

میں خاموش ہو گیا اور کنیز نے مجھے امور خانہ داری کی تربیت دینا شروع کر دی۔ وہ باورچی خانے کے سارے کام مجھ ہی سے لینے لگی۔ جب میں ان کاموں میں ہوشیار ہو گیا تو کپڑوں کی دھلائی کا کام بھی میرے ہی سپرد کر دیا گیا۔ بازار سے سودا سلف لانا بھی میرے ہی فرائض میں شامل ہوا۔ میں حیران اور فکر مند تھا کہ میرے باپ نے مجھے کس غرض سے اس شخص کے حوالے کیا تھا اور مجھے کام کیا کرنا پڑ رہے ہیں۔

جب میں باورچی خانے میں تنہا کاموں میں مشغول ہوتا تو کنیز کو غائب دیکھ کر سوچتا رہتا کہ وہ آخر کہاں چلی جاتی ہے، پھر ایک دن یہ معما بھی حل ہو گیا۔ کنیز کو صالح خان کی خلوتوں میں بھی کام انجام دینا ہوتے تھے۔

صالح خان ایک ہفتہ رہ کر نادر شاہ کے پاس جانے لگا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے ہدایتیں دیں۔ ''خواجک! میری عدم موجودگی میں گھر کا سارا کام نہایت ہوشیاری اور لگن سے انجام دینا، زرغونہ کا خاص خیال رکھنا، کھانا پکانے اور گھر کی صفائی ستھرائی کے علاوہ سب کے کپڑے دھوتے رہنا۔''

مجھے سارے ہی کام سخت ناپسند ہیں۔ امور خانہ داری عورت کے حصے میں ہوتی ہے لیکن میں نے بخوشی یا عورت کی کسی سازش کے زیر اثر ان ذمہ داریوں کو بھی قبول کر لیا۔

میں نے صالح خان سے پوچھا۔ ''کیا آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے؟''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں تجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکوں گا۔ بیوی کی خطرناک علالت نے مجھے حواس باختہ کر دیا ہے۔''

میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''پھر میں کب تک اس گھر میں رہوں گا؟''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''جب تک میں واپس نہ آ جاؤں۔''

صالح خان نے کنیز کو مشہد کی مشرقی سرحد تک پہنچا دیا۔ واپسی میں مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ میرے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اب میں کسی اور ہی انداز میں سوچ رہا تھا۔ میرا باپ اور میری ماں بندرانزلی میں میرا بڑی بے چینی اور امیدوں سے انتظار کر رہے ہوں گے، انہیں یہ کون بتائے گا کہ ان کا خواجک امور خانہ داری میں الجھ کر رہ گیا ہے۔

اب کنیز بھی باورچی خانے میں دکھائی دینے لگی تھی۔ صالح خان کی بیوی بدستور صاحب فراش تھی۔

کسی کسی وقت زرغونہ باورچی خانے میں یہ پوچھنے آ جاتی تھی کہ تم لڑکے ہو یا لڑکی؟''

اور جب میں جواب دیتا کہ میں لڑکا ہوں تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی اور واپس چلی جاتی۔

یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب آسمان پر چاند ہلال سے بدر تک کی مسافت طے کر رہا تھا۔ میں شام کو کسی کو کچھ بتائے بغیر گھومنے پھرنے نکل کھڑا ہوا۔ چاندنی میں مکانات اور درخت دودھیا سے ہو رہے تھے۔ میں ہوا کی سنسناہٹ میں بانسری کی آواز سن رہا تھا۔ یہ آواز کہیں دور سے آ رہی تھی، مجھے یہ آواز بہت اچھی لگی اور میں اس کی تلاش میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں شہر کی حد تک پہنچ گیا۔ یہاں ایک مکان کے سامنے لوگ جمع تھے۔ بیچوں بیچ ایک ادھیڑ عمر شخص للا بجا رہا تھا۔ بانسری سے مشابہ یہ آلۂ موسیقی بانسری جیسا ہوتا ہے۔ شکل اور آواز میں بھی بانسری جیسا مگر آواز میں ذرا سا فرق تھا۔ بانسری کی آواز میں اگر ہوا کی سائیں سائیں کو شامل کر دیا جائے تو للا کی آواز بن جائے گی۔ میں نے دیکھا ہجوم اس آواز پر قربان ہونے جا رہی تھی۔

میں نے ایک شخص سے پوچھا۔ ''بھائی! کیا یہاں شادی ہو رہی ہے کسی کی؟''

اس شخص نے پہلے تو مجھے گھورا، اس کے بعد ڈانٹا، کہا۔ ''احمق لڑکے! یہ سرائے ہے اور سب مسافر۔ اپنا دل بہلا رہے ہیں۔''

میں نے سوچا، یہاں سے راہِ فرار اختیار کی جائے مگر پھر ارادہ بدل دیا اور خود بھی للا کی مسحور کن دھن میں کھو گیا۔

میں نے گھر سے باہر کافی وقت گزار کر واپسی اختیار کی۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ کتے اِکا دُکا راہگیروں پر بھونک رہے تھے۔ میں نے گھر کے صدر دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا تو پتا چلا وہ اندر سے بند کیا جا چکا ہے۔ میں چپ

چاپ کھڑا ہو گیا اور یہ سوچنے لگا کہ دروازے پر زور زور سے ہاتھ ماروں یا شب بسری کے لیے کہیں اور چلا جاؤں مگر پھر سوچا کہ کہیں اور کہاں جاؤں گا، ناچار دروازے کو زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ میں اندر کی آہٹ سے بے نیاز پیٹے چلا جا رہا تھا، حالانکہ اندر دروازے کی طرف آتے ہوئے کوئی کہہ رہا تھا۔ ''کیا پاگل ہوا ہے، کہہ تو دیا ہے کہ آتی ہوں مگر پاگل سنتا ہی نہیں۔ دروازے توڑ کر دم لے گا۔''

یہ آخری جملہ میں نے توجہ سے سن لیا تھا، کسی نے اندر سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میں ہوں خواجک۔''

اندر سے آواز آئی۔ ''کہاں چلا گیا تھا؟''

میں نے اپنی بات دہرائی۔ ''دروازہ کھولیے۔''

غصے کی شدت میں جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھلا، میں نے دیکھا زرغونہ کی گٹھیا زدہ ماں شیرنی کی طرح بپھری کھڑی تھی۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا، زرغونہ کی ماں نے مجھ پر بھانپڑوں کی بوچھاڑ کر دی وہ کہہ رہی تھی۔ ''تو یہ رات کو کہاں غائب ہو جاتا ہے ہر روز۔''

مجھے اس جھوٹ پر بڑا غصہ آیا مگر میں اپنے غصے کو کسی پر اتار بھی تو نہیں سکتا تھا۔ ہاں میں نے زبان سے البتہ منع کیا میں نے کہا۔ ''بس خاتون! اب بس کیجیے ورنہ میں آپ کا ہاتھ پکڑ لوں گا۔''

زرغونہ کی ماں اور زیادہ مشتعل ہو گئی اور پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگی۔ ''یہ میرا ہاتھ پکڑے گا تو میرا ہاتھ پکڑ کے تو دیکھ اگر ہاتھ نہ توڑ دوں تو میرا.....''

میں گونگا اور بہرہ بن کے اندر داخل ہوا اور سیدھا اپنے بستر پر گر گیا۔ زرغونہ کی ماں کے دو ہتڑوں نے مجھے بہت دل برداشتہ کر دیا تھا۔ فوری یہ ارادہ پیدا ہوا کہ والدین کے پاس چلا جاؤں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ کچھ بنے بغیر واپس جانا فضول ہے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اب میں یہ سوچنے لگا تھا کہ میری دستکوں کی آواز پر کنیز یا زرغونہ نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟ اس وقت تو مجھے اپنے اس سادہ سے سوال کا جواب نہیں مل سکا تھا مگر صبح مل گیا۔ وہ دونوں سوئی ہوئی تھیں اور زرغونہ کی ماں بیدار تھی۔ گٹھیا کچھوے کی طرح جسم کے باہری حصے سے زیادہ کہیں اندر دبک گئی تھی۔

صبح جب باورچی خانے میں سل پر کچھ پیس رہا تھا تو بھوکی شیرنی کی طرح زرغونہ کی ماں میرے سر پر آ کھڑی ہوئی اور رات والی بات چھیڑ دی، پوچھا۔ ''ہاں، اب بتا تو میں نے پوچھا۔ ''آپ چاہتی کیا ہیں؟ میرے پاس آپ کے فضول سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔''

وہ دیوانہ وار مجھ پر جھپٹیں اور سل کے بٹے سے میری انگلیاں کچل دیں۔ میں شدت کرب سے چیخنے لگا۔ زرغونہ اور کنیز ایک ساتھ باورچی خانے میں داخل ہوئیں، زرغونہ نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟'' اور پھر جیسے ہی میری لہولہان انگلیوں پر نظر پڑی اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بلکنے لگی۔ ''یہ آپ کو کیا ہو گیا؟ یہ کس نے کیا؟ کیوں کیا؟'' پھر اپنے باپ کی برائیاں کرنے لگی۔ ''میں کیا کروں میرے مولا! میرا باپ معلوم نہیں چاہتا کیا ہے جب اسے معلوم ہے کہ میری ماں سنگ دل اور ضدی ہے تو وہ لوگوں کو کیوں لے آتے ہیں؟'' پھر مجھ سے کہا۔ ''تم یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ مار دیئے جاؤ گے۔''

لیکن زرغونہ کی ماں نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ بولی۔ ''میں دیکھتی ہوں یہاں سے کس طرح بھاگتا ہے یہ۔''

زرغونہ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا، گھر میں ایک کہرام برپا ہو چکا تھا۔ اس شور و غل نے پڑوسیوں کو پریشان کر دیا اور پڑوسی عورتیں ان کے گھر میں داخل ہو گئیں۔ زرغونہ کی ماں نے کئی عورتوں کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو دوڑ کر ان کا راستہ روک لیا اور کہا۔ ''آپ لوگ بھاگ جائیں یہاں سے ورنہ میں خون خرابے پر مجبور ہو جاؤں گی۔''

پڑوسنیں کسی طرح بھی گھر سے نکلنے پر آمادہ نہ تھیں، وہ بھی جھگڑنے مچلنے لگیں۔ زرغونہ کو مجھ سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا، بولی۔ ''خواجک! میں نے تمہیں بھاگ جانے کا صحیح مشورہ دیا ہے کیونکہ تم سے پہلے بھی یہاں تین لڑکے آ چکے ہیں اور ان تینوں کو اسی طرح مار مار کر لہولہان کیا جا چکا ہے۔ میں نے انہیں بھی اسی طرح سمجھایا تھا مگر وہ نہیں بھاگ سکے اور میری ماں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔''

میں نے پوچھا۔ ''مگر تیری ماں ایسا کیوں کرتی ہے؟''

زرغونہ نے جواب دیا۔ ''میری ماں پر کبھی کبھی پاگل پن کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ انہی دوروں کی حالت میں وہ ایسا کر گزرتی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ تمہیں بھی اسی طرح مارتی ہے

www.PakiBooks.Site

کبھی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''نہیں، ماں نے میرے ساتھ ایسا ایک بار بھی نہیں کیا۔''

میں نے سنا پڑوسی عورتوں میں سے کوئی کہہ رہی تھی۔ ''بہنو! چلو اپنے اپنے گھر چلیں۔ یہ عورت تو پاگل ہے دیوانی کہیں کی۔''

زرغونہ کی ماں کو اس بار زیادہ شدید غصہ آیا۔ اس نے پاگل دیوانی کہنے والی عورت کے بال پکڑ لیے اور زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔ اس عورت کی چیخ نکل گئی۔ دوسری عورتوں نے بیچ میں پڑ کر بمشکل اس سے نجات دلائی۔

اس بار زرغونہ کے پیچھے کنیز بھی باورچی خانے میں داخل ہوگئی، بولی۔ ''صاحبزادے! آپ نے زرغونہ بی بی کی بات نہیں سنی، یہاں سے بھاگ جایئے ورنہ ایک دن مفت میں جان چلی جائے گی۔''

میں نے ان دونوں کو جواب دیا۔ ''آپ دونوں کے مشوروں کا بہت بہت شکریہ لیکن افسوس کہ میں یہاں سے اس طرح نہیں بھاگوں گا زرغونہ! تیرے باپ صالح خان کی میرے باپ سے بڑی دوستی ہے۔ ان دونوں کی اسی دوستی نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے، اب میں تیرے باپ کی عدم موجودگی میں یہاں سے بھاگ کر خود کو اور ان دونوں کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔''

کنیز نے کہا۔ ''زرغونہ! یہ تو خود اچھا خاصا پاگل معلوم ہوتا ہے۔''

زرغونہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ خوشامد کرتی ہوئی بولی۔ ''آپ کو خدا اور اس کے رسول کا واسطہ آپ یہاں سے بھاگ جائیں۔''

میرے پاس ان دونوں کی ساری باتوں کا ایک ہی جواب تھا۔ ''نہیں، میں ایسا نہیں کرسکتا زرغونہ۔''

زرغونہ اور کنیز نے ایک دوسرے کا حیرت سے منہ دیکھا اور زرغونہ نے کہا۔ ''اگر آپ نے یہی فیصلہ کرلیا ہے کہ یہاں خوامخواہ اپنی جان دے دیں تو میں کیا کرسکتی ہوں۔ آؤ چلیں یہاں سے۔''

کنیز کی صورت بتا رہی تھی کہ اسے مجھ پر رحم آرہا تھا۔ میں نے کنیز سے پوچھا۔ ''ماں نے تمہیں نہیں مارا کبھی؟''

کنیز کے بجائے زرغونہ نے فوراً جواب دیا۔ ''ماں ان حالات میں ہمیشہ لڑکوں یا مردوں کو مارتی ہیں عورتوں یا لڑکیوں کو نہیں مارتیں۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم دونوں میرا فیصلہ سن لو اگر میری موت اسی طرح لکھی گئی ہے تو میں بخوشی مرنے کو تیار ہوں۔''

زرغونہ کنیز کو لے کر چلی گئی اور اس نے پڑوسنوں کی مدد سے اپنی ماں کو ایک کمرے میں بند کردیا اور کچھ کپڑا اور پانی لے کر میرے پاس پھر واپس آئی، بولی۔ ''مہمان میں نے اپنی ماں کو کمرے میں قید کردیا ہے اب آپ اپنی زخمی انگلیوں کو پانی سے دھو کر کپڑے سے پونچھ ڈالیں، میں مرہم لے کر آتی ہوں زخموں پر لگا کر پٹی باندھ لیں۔''

میں نے ہمت کر کے عرض کیا۔ ''تیری ہمدردیوں کا شکریہ لیکن میں ایک ہاتھ سے یہ سب نہیں کرسکوں گا جب تو نے اتنی ہمدردی کی ہے تو یہ تھوڑی سی ہمدردی اور سہی۔''

زرغونہ نے کہا۔ ''اچھا پہلے آپ زخم تو دھوئیں، اتنی دیر میں مرہم لے آؤں گی۔''

وہ دوبارہ وہاں سے چلی گئی اور میں اپنی زخمی انگلیاں دھونے لگا۔

کچھ دیر بعد میری زخمی انگلیوں کی مرہم پٹی بھی ہوگئی۔ زرغونہ نے کنیز سے کہا۔ ''صبوحی! باورچی خانے کا سارا کام تو کرلے، آج یہ اس لائق نہیں ہیں کہ کوئی کام کریں۔''

کنیز باورچی خانے میں گھس گئی اور میں زرغونہ کے ساتھ باورچی خانے سے باہر آگیا۔ وہ مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے گئی، بولی۔ ''مہمان! آپ یقین کریں میرے باپ کو ماں کے اس غم نے بہت پریشان کردیا ہے۔ وہ محاذ جنگ پر بھی گھر ہی کی فکر میں پریشان رہتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس جنون کا کبھی علاج بھی ہوا یا نہیں؟''

زرغونہ نے خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور سہمے سہمے لہجے میں کہا۔ ''کیا کہا، جنون کا علاج؟ آپ نے یہ کیا کہہ دیا؟ خدا آپ پر رحم فرمائے۔ پتا نہیں آپ یہاں کیسی قسمت لے کر آئے ہیں۔ میری ماں کو معالج کے علاوہ ملاؤں اور عاملوں کو بھی دکھایا گیا۔ وہ بیک زبان یہی کہتے ہیں کہ میری ماں کی جان کسی طاقتور جن کے قبضے میں ہے۔''

میں نے زرغونہ کی ہمت بندھائی اور کہا۔ ''ایسا نہیں ہوسکتا محترمہ۔''

زرغونہ نے مایوسی سے کہا۔ ''خدا کرے آپ کی بات درست ہوجائے۔''

اس دن میں زرغونہ اور کنیز سے بہت زیادہ بے تکلف

www.PakiBooks.Site

ہوگیا۔

میں کئی بار اس کمرے کے پاس سے گزرا، اندر بالکل خاموشی تھی۔ میں نے زرغونہ سے پوچھا۔ ''کیا ماں نے کھانا بھی کھایا تھا؟''

زرغونہ روہانسی ہوگئی، بولی۔ ''نہیں میری ماں کو معلوم نہیں کس شے نے یوں ستا رکھا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''جب بند کمرے میں تیری ماں خاموش ہوجاتی ہے تو عموماً اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

زرغونہ نے جواب دیا۔ ''اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ میری ماں ہوش میں آچکی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ اپنے ہوش میں آچکی ہیں۔''

زرغونہ نے جواب دیا۔ ''ہوسکتا ہے مگر کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ میری ماں نے باہر والوں کو دھوکا دینے کی نیت سے خاموشی اختیار کرلی اور جب کوئی شخص اندر داخل ہوا تو وہ اس پر جھپٹ پڑی اور اسے مار مار کر لہولہان کردیا۔''

میں نے ماں کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''اب میں ماں کو باہر لے آؤں گا۔ وہ بھوکی ہوگی۔ اگر وہ ہوش میں آچکی ہیں تو میری خوش قسمتی اور اگر انہوں نے میری مزید پٹائی کے لیے خاموشی اختیار کرلی ہے تو میری قسمت۔''

زرغونہ کے دل پر میری باتوں کا بڑا اثر ہو رہا تھا، حیرت سے پوچھا۔ ''مگر آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''انسانی ہمدردی میں۔''

جب میں نے دروازہ کھولنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے تو زرغونہ نے انہیں پکڑ لیا، بولی۔ ''خدا کے لیے یہ غلطی نہ کیجیے آپ کی جان خطرے میں ہے۔''

میں نے جواب دیا۔ ''زرغونہ! میں نے کہہ جو دیا کہ میری قسمت۔''

اور میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے نہایت شائستگی سے عرض کیا۔ ''ماں! اب آپ کیسی ہیں؟ میرا خیال ہے آپ بھوکی تو ہوں گی۔ آیئے باہر آیئے اور کھانا نوش فرمائیں۔''

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے آہستہ آہستہ دروازے کو کھولنا شروع کردیا۔ زرغونہ سکتے میں کھڑی میری صورت اور اس کا رروائی کو دیکھ رہی تھی، کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا اور ان دونوں نے ماں کو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے دیکھا۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ نیند میں ہو اور عنقریب سو جائے گی۔

میں نے زرغونہ سے کہا۔ ''تو نے دیکھی اپنی ماں کی کیفیت؟ اب کیا کہے گی تو؟''

زرغونہ نے کہا۔ ''اگر اس حال میں اسے نیند آگئی تو وہ بالکل ٹھیک ہوجائیں گی ورنہ یہ.....''

میں نے زرغونہ کو تسلی دی اور اسے سمجھایا۔ ''زرغونہ! یہ تو نے جو کچھ بھی کہا یا بتایا، ان میں ایک بھی ایسی بات نہیں جس کو علامت قرار دے کر علاج شروع کردیا جائے۔ میرے پاس ایسا ویسا کوئی تجربہ بھی نہیں لیکن میں اپنے والدین کی نظر سے گرنا نہیں چاہتا۔ جب تک میں اس گھر میں ہوں ماں کی عزت اور خدمت کرتا رہوں گا۔''

میں ان کے بالکل قریب اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا، میں نے کہا۔ ''ماں! کیا آپ کو نیند آرہی ہے؟ اگر آپ کو واقعی نیند آرہی ہے، تو آیئے میرے ساتھ چلیے اور کھانا کھا کر اطمینان سے آرام کیجیے۔''

ماں عجیب حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہیں۔ میں نے انہیں سہارا دے کر ان کے بستر تک پہنچا دیا۔ زرغونہ اور کنیز ان کے پاس بیٹھ گئیں۔ میں وہاں سے جانے لگا تو ماں نے اپنی کمزور آواز میں پکارا۔ ''خواجک تو کہاں چلا، ادھر میرے قریب آ۔''

میں ان کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے پاؤں سمیٹ کر میرے بیٹھنے کے لیے جگہ خالی کردی۔ پھر انہوں نے اپنی بیٹی کو مخاطب کیا۔ ''زرغونہ کچھ پتا ہے تیرا باپ کب آئے گا؟''

زرغونہ نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں ماں، انہوں نے کچھ بتایا نہیں تھا اس سلسلے میں۔''

ماں نے مجھ سے پوچھا۔ ''تیری ماں زندہ ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میری ماں بھی زندہ ہے اور باپ بھی۔''

انہوں نے کہا۔ ''اگر دونوں زندہ ہیں تو انہوں نے تجھے خود سے جدا کیوں کردیا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میرے باپ کا جنگ میں ایک ہاتھ ضائع ہوگیا اور ان کی خواہش ہے کہ میں سپاہی بنوں۔''

ماں نے کہا۔ ''اگر تو میرا مشورہ مانے تو میں کہوں گی کہ تو سپاہی نہ بن کیونکہ سپاہی بننے کے بعد کچھ پتا نہیں کہ آدمی کب تک زندہ رہے اور اگر وہ زندہ بھی رہے تو اس کے

www.PakiBooks.Site

بیوی بچے بے موت مر جاتے ہیں کیونکہ وہ ساری زندگی جنگلوں میں گھر سے باہر گزار دیتا ہے۔"

میں ماں سے زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا، ماں نے زرغونہ سے کہا۔ "زرغونہ! اس کا خیال رکھا کر، خواجک شریف ماں باپ کا بچہ لگتا ہے۔"

زرغونہ نے پٹیاں بندھی ہوئی زخمی انگلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ماں آپ نے تو خواجک کو لہولہان کر دیا تھا۔"

ماں نے آنکھیں بند کرلیں اور آہستہ سے کہا۔ "زرغونہ! میں خود پریشان ہوں کہ یہ مجھے رہ رہ کیا ہو جاتا ہے۔"

کچھ دیر بعد ماں کو نیند آ گئی۔ ہم سب وہاں سے اٹھ آئے۔ زرغونہ نے مجھ سے کہا۔ "میری ماں بہت اچھی ہے مگر معلوم نہیں رہ رہ انہیں کیا ہو جاتا ہے۔"

میں نے باورچی خانے میں کام کرنا چاہا مگر زرغونہ اور کنیز نے منع کر دیا کہ چند دن آرام کرلو کیونکہ زخمی انگلیاں کام نہیں کرنے دیں گی۔"

میں خالی وقت گزارنے کے لیے باہر نکل گیا۔ وہاں میرا کسی سے کوئی رابطہ نہیں تھا لیکن اس کے بعد محلے کے لڑکوں سے میری دوستی ہونے لگی، پہلے محلے والے مجھے اس گھر کا رشتے دار سمجھتے تھے لیکن جب میں نے انہیں اپنی بابت صحیح صحیح بتایا تو ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔ "تو کیا تم فنِ سپہ گری سیکھنا چاہتے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں میری خواہش تو یہی ہے۔"

لڑکے نے کہا۔ "اس محلے میں ایک احاطہ ہے، اس احاطے میں لڑکوں کو فنِ سپہ گری کی تربیت دی جاتی ہے اگر تم چاہو تو وہاں چلے جاؤ۔"

میں نے پوچھا۔ "اور یہ سکھاتے کس وقت سے کس وقت تک ہیں؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "دو گھنٹے صبح، دو گھنٹے شام۔"

میں نے کہا۔ "یار صبح میں باورچی خانے میں ہوتا ہوں اور شام کو اگر تاخیر سے گھر لوٹوں گا تو ماں ناراض ہو جائے گی۔"

لڑکے نے کہا۔ "اگر تمہیں کچھ سیکھنا ہے تو باورچی خانے سے نکلنا پڑے گا اور دل سے خوف اور ادب نکالنا ہوگا۔"

میں اس لڑکے کے ساتھ مذکورہ تربیت گاہ میں چلا گیا اور بات کرلی۔ اس تربیت گاہ کے استاد اسد علی کرمانی نے انہیں سکھانے کا بہت شوق تھا۔ لوگ اس کا پورا نام نہیں لیتے تھے بس استاد کہتے تھے صالح خان نادر شاہ افشا کے سامان خاص سے ہر کوئی واقف تھا۔ لوگ نادر شاہ کی موت سے صالح خان سے بھی ڈرتے تھے۔ استاد کرمانی نے کسی قدر تامل سے کہا۔ "صاحبزادے! کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے جواب دیا۔ "خواجک۔"

استاد کرمانی نے کہا۔ "تو میاں خواجک! قصہ دراصل یہ ہے کہ صالح کی پاگل زوجہ جب تک تمہیں یہاں آنے کی اجازت نہ دے دے میں کیا، یہاں کی کوئی بھی فنی تربیت گاہ تمہیں تربیت دینے کو تیار نہ ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "تو میں اجازت لے لوں گا۔"

استاد نے جواب دیا۔ "اگر اجازت لے لو گے تو میں بھی سکھا دوں گا۔"

میں گھر پہنچ کر دیر تک اس پر سوچتا رہا کہ ماں سے اجازت کس طرح حاصل کروں، ان سے میں خوفزدہ ہو چکا تھا، میں خاموش گم صم ایک طرف بیٹھ گیا۔ زرغونہ نے خاموشی کی وجہ پوچھی میں نے کہا۔ "زرغونہ! تو جانتی ہے میں نے اپنا گھر کیوں چھوڑا؟"

زرغونہ نے پوچھا۔ "تم نے اپنا گھر کیوں چھوڑا؟"

میں نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ میں فنِ سپہ گری سیکھ کر بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں میں کوئی مقام حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

زرغونہ نے پوچھا۔ "تو یہ کس طرح حاصل کرو گے؟ میرے باپ نے تمہیں یہاں گھر میں چھوڑ دیا۔ اب یہاں سے کہاں اور کس کے ساتھ جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "زرغونہ! مسئلہ کہیں جانے یا کسی کے ساتھ جانے کا نہیں ہے، فی الحال تو میں فنِ سپہ گری سیکھنا چاہتا ہوں۔"

زرغونہ نے پوچھا۔ "پھر سیکھ لو فنِ سپہ گری۔ مگر یہ فن تمہیں سکھائے گا کون؟"

میں نے زرغونہ کو سب کچھ بتا دیا اور کہا۔ "استاد کرمانی اس گھر سے ڈرتے ہیں، کہتے ہیں کہ میں اس وقت تک اپنی تربیت گاہ میں داخل نہیں کروں گا جب تک کہ صالح خان کی بیوی اس کی اجازت نہیں دے دیتی۔"

زرغونہ سوچ میں پڑ گئی، بولی۔ "یہ تو بڑا دشوار معاملہ ہے شاید ماں اس کی اجازت نہیں دیں گی۔"

www.PakiBooks.Site

میں نے کہا۔ "اگر وہ مجھے اجازت نہیں دیں گی تو استاد کرمانی مجھے اپنی تربیت گاہ میں داخل بھی نہیں کریں گے۔"

اس دوران میں نے ماں کو بہتر مہربان پایا مگر کسی کسی وقت اس کی دماغی کیفیت کچھ سے کچھ ہو جاتی اور وہ پاگل پنے میں ایسی ویسی حرکتیں کرنے لگتیں۔

آخر ایک دن میں نے یہ اعلان کر دیا کہ اب میں اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہوں۔

زرغونہ سہم گئی پوچھا۔ "گھر کیوں؟ کیا یہاں....."

میں نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔ "میں جس مقصد سے یہاں لایا گیا تھا وہ پورا نہیں ہو رہا، پھر یہاں رہنا فضول ہے۔"

زرغونہ نے کہا۔ "ماں سے پوچھ کر جانا، یوں نہ چلے جانا۔"

میں نے جواب دیا۔ "میں نے تیری ماں کو اپنی ماں سمجھ کر ان کی عزت کی، احترام کیا لیکن میں یہ سوچ کر کہ وہ روکنا چاہیں گی، ان سے پوچھے بغیر ہی چلا جاؤں گا۔"

زرغونہ اس کے پاس سے اٹھ کر جانے لگی، میں نے اسے آواز دی۔ "زرغونہ ذرا سننا تو۔"

زرغونہ رک گئی، مڑ کر میری طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اگر ماں مجھے فنِ سپہ گری سیکھنے کی اجازت دے دیں تو میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

زرغونہ نے کہا۔ "میں بات کروں گی مگر اُمید نہیں کہ وہ مان جائیں۔"

میں نے کہا۔ "میں دو دن انتظار کرلوں گا۔ تیسرے دن یا تو گھر واپس چلا جاؤں گا یا استاد کرمانی کی تربیت گاہ کا رخ کروں گا۔"

زرغونہ اور کنیز کھسر پھسر کرنے لگیں، دوسرے دن شام تک ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ ماں سے بات کریں۔ دوسرے دن شام کو میں نے زرغونہ کو یاد دلایا۔ "زرغونہ آج آخری دن ہے، کل میں چلا جاؤں گا۔"

مجھے اندازہ تھا کہ زرغونہ اس وقت اپنی ماں سے ضرور بات کرے گی اس لیے اس کے پیچھے پیچھے میں بھی ان دونوں کی باتیں سننے پہنچ گیا۔

میں نے ماں کے کمرے کے دروازے سے کان لگا دیئے۔ میں نے سنا وہ کہہ رہی تھی۔ "ماں! خواجک جا رہا ہے۔"

میں دروازے کی جھری سے اندر دیکھنے لگا۔ ماں لیٹی ہوئی تھیں وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں، پوچھا۔ "کہاں جا رہا ہے؟"

زرغونہ نے جواب دیا۔ "اپنے گھر، اسے اپنے ماں باپ بہت یاد آ رہے ہیں۔"

ماں نے کہا۔ "یہ ماں باپ اچانک بہت کیوں یاد آنے لگے؟"

زرغونہ نے کہا۔ "یاد تو پہلے بھی آتے تھے مگر اب بہت یاد آنے لگے ہیں وہ دونوں۔"

ماں نے کہا۔ "زرغونہ! زیادہ باتیں نہ بنا، بات کوئی اور ہے جسے تو کہنا نہیں چاہتی، خیر جانے دو۔"

زرغونہ نے کہا۔ "ماں، جو بات ہے ہم کہنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ ڈر ہے کہ آپ ہماری وہ بات مانیں گی نہیں۔"

ماں کھڑی ہو گئیں پوچھا۔ "کیا بات ہے بتا۔"

زرغونہ نے جواب دیا۔ "خواجک فنِ سپہ گری کی تربیت حاصل کرنا چاہتا ہے اور جب اس نے سمجھ لیا کہ آپ اسے اجازت نہیں دیں گی تو وہ اپنے گھر جانے لگا۔"

ماں کے چہرے پر کرب کے آثار ظاہر ہونے لگے، انہوں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے، بولی۔ "اگر وہ اسی شرط پر یہاں رکے گا تو میں اسے استاد کرمانی کے پاس جانے کی اجازت دیتی ہوں۔"

شاید زرغونہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، ہمہ تن گوش بن کے پوچھا۔ "ماں! کیا آپ نے اجازت دے دی؟"

ماں نے جواب دیا۔ "ہاں خواجک کو بلا لا، اس سے کہہ دے کہ میں نے اسے استاد کرمانی کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔"

اب مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ زرغونہ میرے پاس آئے گی۔ میں بھاگ کر اپنی جگہ پر چلا گیا، کنیز نے مجھے دیکھ لیا تھا اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

میں نے اس سے التجا کی۔ "میں تجھے بعد میں سب کچھ بتا دوں گا اس وقت خاموش رہ۔"

کنیز میرے کمرے میں بیٹھی تھی کہ زرغونہ بھاگی بھاگی آئی اور مجھے خوش خبری سنا دی۔ میں نے بناوٹی حیرت سے پوچھا۔ "کیا سچ؟ نہیں، شاید تو نے اچھی طرح بات نہیں سنی ہوگی۔"

www.PakiBooks.Site

زرغونہ نے جواب دیا۔ ''تم میرے ساتھ چلو، ماں کے پاس، جو کچھ میں کہہ رہی ہوں تم اپنے کانوں سے بھی سن لو۔''

میں زرغونہ کے ساتھ ماں کے پاس چلا گیا۔ ماں دوسری طرف کروٹ لیے لیٹی ہوئی تھیں، زرغونہ نے کہا۔ ''ماں! خواجک حاضر ہے۔''

شاید ماں نے اپنے آنسو پونچھے تھے کیونکہ ان کی آواز میں بھراہٹ پائی جاتی تھی۔ انہوں نے میری طرف کروٹ لیے بغیر ہی پوچھا۔ ''خواجک! کیا تو اپنے والدین کے پاس واپس جا رہا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں میں اپنے گھر واپس جا رہا ہوں۔''

ماں نے کہا۔ ''شاید اس لیے کہ میں تجھے استاد کرمانی کی تربیت گاہ میں نہیں جانے دوں گی؟''

میں خاموش رہا کیونکہ میں اس تکلیف دہ گفتگو میں خود شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

ماں کچھ دیر تو میرے جواب کا انتظار کرتی رہیں لیکن جب کوئی جواب نہیں ملا تو پوچھا۔ ''خواجک! تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''جو بات آپ سمجھ چکی ہیں اسے میری زبان سے کیوں سننا چاہتی ہیں؟''

ماں نے اچانک کروٹ بدلی اور منہ میری طرف کرلیا، بولیں۔ ''اگر تو سپاہی بننا چاہتا ہے تو بن جا سپاہی، میں نہیں روکوں گی تو مرنا چاہتا ہے تو مر جا میں تجھے نہیں روکوں گی۔ تو میرا بیٹا تو ہے نہیں، کیا زمانہ آگیا ہے کہ لوگوں کے دلوں سے ہمدردی اور خلوص کی پہچان ہی جاتی رہی۔ جوان بچوں کی موت کا تصور ہی میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ تم مردوں کے لیے موت میں جانے کیسی کشش ہے جو تم ہوش سنبھالتے ہی ادھر بھاگنے لگتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میرا باپ مجھے غیر معمولی فوجی سردار دیکھنا چاہتا ہے۔''

ماں نے بگڑ کر کہا۔ ''مگر میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تیری ماں تجھے کیا دیکھنا چاہتی ہے۔''

میں لاجواب ہوگیا، ماں نے کہا۔ ''جواب کیوں نہیں دیتا۔ استاد کرمانی کے پاس جا اور اس سے کہہ دے کہ تجھے صالح خان کے گھر بلایا گیا ہے، باقی باتیں میں خود کرلوں گی۔''

ماں نے زرغونہ کو حکم دیا۔ ''زرغونہ! تو جا یہاں کیوں کھڑی ہے جب ضرورت ہوگی تو میں خود بلالوں گی۔''

زرغونہ چلی گئی تو ماں نے مجھے اپنے پاس ہی بٹھالیا بولیں۔ ''خواجک! آج میں اپنی زندگی کی چند خاص باتیں بتانا چاہتی ہوں۔''

زرغونہ ابھی باہر ہی تھی، ماں کہتی رہیں۔ ''پیلے خواجک! تجھے یاد ہے میرا ایک بھائی تھا میں اس سے بے حد محبت کرتی تھی۔ اس کی شکل تیری شکل سے ملتی جلتی تھی جب اس نے نوجوانی میں قدم رکھا تو قتل ہوگیا۔'' یہ کہتے کہتے وہ رونے لگی کچھ دیر بعد کہا۔ ''میں نے اسی دن یہ عہد کرلیا تھا کہ اگر میرا کوئی لڑکا ہوا تو میں اس کو سپاہی نہیں بننے دوں گی۔ مجھے مردوں سے اس لیے نفرت ہوگئی کہ یہ جوان ہوکر خود بخود میدان جنگ کی طرف بھاگنے لگتے ہیں۔ جب میری نفرت کے جذبے میں شدت پیدا ہوتی ہے تو میں پاگل سی ہوجاتی ہوں مجھے اس شدید جذبے نے پاگل بنا کر رکھ دیا ہے۔ سب کی طرح تو بھی میدان جنگ کی طرف جانا چاہتا ہے تو چلا جا۔ لیکن ساتھ ہی تو اس گھر کو بھی چھوڑ دے۔''

ماں ہچکیاں لے کر رونے لگیں۔ میرا دل کانپ گیا۔ ایک طرف میرے باپ کی اور میری خواہش تھی جو مجھے بڑا دیکھنا چاہتی تھی، نامور مشہور اور بہادر جنگ جو۔ جو ملک اور قوم کے لیے سرمایہ ہوتے ہیں مگر بڑی بے رحمی اور سنگ دلی سے قتل کردیے جاتے ہیں۔''

زرغونہ واپس آچکی تھی۔ ماں نے کہا۔ ''زرغونہ! میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔''

زرغونہ نے میری طرف دیکھا تو میں نے نظریں نہیں ملائیں سر جھکالیا۔

جب میں وہاں سے آنے کے لیے چلا تو ماں نے بطور خاص کہا۔ ''میں استاد کرمانی سے کہہ دوں گی کہ وہ تجھے اپنے پاس ہی رکھ لے۔''

میں باہر نکلا، وہاں کنیز میرا انتظار کر رہی تھی اس نے پوچھا۔ ''آپ کے مقدمے کا کیا فیصلہ سنایا گیا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''زرغونہ سے پوچھ لینا۔''

کچھ دیر بعد زرغونہ منہ لٹکائے میرے پاس آئی اور کہا۔ ''یہ ماں کو آخر ہوکیا گیا ہے پہلے تو انہوں نے یہ کہا تھا کہ میں فوجی تربیت حاصل کرسکتا ہوں اور اب یہ کہہ رہی ہیں کہ تو اس گھر سے نکل کر فوجی تربیت حاصل کرسکتا ہے، یہ بات کیا ہوئی؟''

www.PakiBooks.Site

میں نے کہا۔ ''تیری ماں بہت دکھی ہے۔''

شاید زرغونہ نے میری بات سنی ہی نہیں، اس نے پوچھا۔ ''تو تم نے کیا فیصلہ کیا؟ کیا تم اس گھر سے سچ مچ چلے جاؤ گے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ظاہر ہے کہ جب میں اس گھر سے نکلوں گا تو اسی وقت فوجی تربیت بھی حاصل کرسکوں گا۔''

زرغونہ نے کہا۔ ''باوا جان آجائیں تو میں ان سے کہوں گی کہ میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ میں ان کے ساتھ میدانِ جنگ میں چلی جاؤں گی۔''

میں نے کہا۔ ''زرغونہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو اپنی ماں کو چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤ گی؟ ایسا غضب بھی نہ کرنا۔''

زرغونہ نے جواب میں کہا۔ ''تم بھی تو ماں کو چھوڑ کر جا رہے ہو۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میری اور بات ہے۔''

زرغونہ نے مچلنے کے انداز میں کہا۔ ''بس میں نے فیصلہ کرلیا، میں اس جہنم میں نہیں رہ سکتی۔''

میں نے زرغونہ سے زیادہ بات نہیں کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میرے پیچھے پیچھے کنیز بھی پہنچی، اس نے پوچھا۔ ''اس گھر میں یہ کیا ہو رہا ہے کچھ مجھے بھی بتائیے۔''

میں نے اسے بتا دیا کہ ماں نے فوجی تربیت حاصل کرنے کی اجازت دے دی ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ میں اس گھر سے کہیں اور چلا جاؤں۔''

کنیز کا چہرہ فق ہوگیا، پوچھا۔ ''پھر آپ نے کیا کہا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میں کیا کہتا چپ چاپ چلا آیا۔''

کنیز نے کہا۔ ''یہ خاتون اس گھر کی تباہی کے درپے ہیں۔ یہ گھر اجڑ جائے گا۔''

شام کو معلوم نہیں کس کے ذریعے ماں نے استاد کرمانی کو گھر پر ہی بلوالیا۔ ان کی آمد کا مجھے اس وقت علم ہوا اب مجھے بھی وہیں بلوالیا گیا۔ میں نے دیکھا استاد کرمانی پردے کے باہر اور ماں پردے کے اندر کھڑی باتیں کر رہی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ماں نے کہا۔ ''استاد کرمانی یہ میرے بھائی کی اولاد ہے، میں اس کو پسند کرتی ہوں اور نہیں چاہتی کہ میرا یہ بھتیجا ابھی میدان جنگ سدھارے، یہ فن سپہ گری حاصل کرنا چاہتا ہے چنانچہ میں اس کو اجازت دیتی ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔''

استاد کرمانی نے مجھ سے پوچھا۔ ''اب تم کہاں رہو گے؟ کوئی دوسرا ٹھکانا ہے یا نہیں؟''

ماں درمیان میں بول پڑیں۔ ''استاد کرمانی! اسے آپ اپنے پاس ہی رکھ لیں۔''

استاد کرمانی نے کہا۔ ''میرے پاس اتنی جگہ تو نہیں لیکن آپ فرماتی ہیں تو میں اسے رکھ بھی لوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن میں اس گھر کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں یہیں اسی گھر میں رہنا چاہتا ہوں۔''

ماں ایک دم غصے میں آگئیں، چیخ کر بولیں۔ ''تو اس گھر میں اب نہیں رہ سکتا۔''

میں نے اعلان کردیا۔ ''میں فنِ سپاہ گری نہیں حاصل کروں گا۔''

ماں نے چیخ کر جواب دیا۔ ''تو فن سپاہ گری ضرور حاصل کرے گا، میں تیرا رحم کھانا برداشت نہیں کرسکتی۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میں آپ پر رحم نہیں کھا رہا بلکہ میری سمجھ میں آپ کی یہ بات آگئی ہے کہ مرد جوان ہوتے ہی آخر مرنے کے لیے میدانِ جنگ کی طرف کیوں چلے جاتے ہیں؟ میں نہیں مرنا چاہتا میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، بڑھاپے تک زندہ رہنا چاہتا ہوں۔''

شاید ماں کو کچھ کچھ میری باتوں پر یقین آگیا تھا۔ ان کا جوش کچھ کم ہوگیا، پوچھا۔ ''کیا سچ مچ میری بات تیری سمجھ میں آگئی ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ماں! میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔''

استاد کرمانی کا حال غیر ہو رہا تھا مجھ سے کہنے لگے۔ ''لڑکے! تو کیسا مرد ہے کہ جن سے تو بچنا چاہتا ہے وہی بہادری اور شجاعت ہے اور یہ مردوں کے اوصاف میں شمار کیے جاتے ہیں۔''

ماں استاد کرمانی پر گرم ہوگئیں بولیں۔ ''استاد کرمانی! اب آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ ہی جیسے لوگ مردوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اب آپ چلے جائیں یہاں سے۔''

استاد کرمانی وہاں سے چلے گئے ان کے جاتے ہی ماں نے مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔

زرغونہ بھی خوشی سے پاگل ہو رہی تھی اور کنیز بھی حیران تھی کہ یہ کیا ہوگیا۔

☆.....☆

اب میں ایک بار پھر اس الجھن کا شکار ہو رہا تھا کہ

www.PakiBooks.Site

میں کیا کروں، میں نے جو کچھ بھی کیا تھا زرغونہ کی ماں پر رحم کھا کر کیا تھا اور پھر یہ کہ میں نے زرغونہ کی ماں میں اپنی ماں کی خواہش کا پرتو دیکھا تھا میری ماں بھی جنگ سے نفرت کرتی تھی۔ زرغونہ کو یہ خوش فہمی ہو رہی تھی کہ ایسا میں نے اس کی وجہ سے کیا ہے۔

میں اپنے اعلان پر چند دن تو آسانی سے قائم رہا لیکن پھر میں نے اپنے اندر ٹوٹ پھوٹ سی محسوس کی۔ لڑکے مجھ پر ہنستے اور آوازیں کستے۔ ''باورچی خانے کا شیر میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔''

کسی نے کہا۔ ''بزدل ہے بزدل، یہ مسلمان نہیں لگتا۔''

ایک اور بولا۔ ''خدا اس پر رحم کرے یہ مرد تو کسی طرف سے بھی نہیں لگتا۔''

یہ سب اس طرح میرے اندر سوئی ہوئی اس روح کو بیدار کر رہے تھے جو سن شعور میں آتے ہی بڑا بننے کا خواب دیکھتی رہی تھی۔ میں اپنے اندر برپا طوفان کو روکنے کی سر توڑ کوشش کرتا رہا مگر نا کام رہا۔ اس بار میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اس گھر سے اس بہانے رخصت ہو جاؤں گا کہ میں کچھ دنوں کے لیے اپنے والدین کے پاس جا رہا ہوں۔

جب میں نے یہ بات زرغونہ سے کہی تو اس کا ماتھا ٹھنکا، پوچھا۔ ''کیا تم واقعی اپنے والدین ہی کے پاس جا رہے ہو؟''

میں نے پوچھا۔ ''زرغونہ تجھے اس پر شبہ کیوں ہے؟''

اس نے کہا۔ ''اس لیے کہ تم نے آج تک اپنے والدین کا مجھ سے ذکر تک نہیں کیا پھر اب والدین کا خیال کیوں کر آ گیا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''زرغونہ! تو یقین کر میں یہاں سے اپنے گھر ہی جاؤں گا۔''

لیکن زرغونہ کو یقین نہیں آیا۔

جب میں وہاں سے جانے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ بادلوں نے ہر طرف سے افق کو چھپا دیا تھا گہرے اور ہلکے سرمئی بادلوں نے پورے مشہد کو اپنے سائے میں چھپا لیا تھا۔ اب میں گھر سے نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ زرغونہ نے ازراہ شرارت کہا۔ ''اب تم جا سکتے ہو میں تمہیں نہیں روکوں گی۔''

میں نے جواب دیا۔ ''صاحبزادی! میں یہاں کسی کے رحم و کرم پر نہیں ہوں اس لیے جب تک جی چاہے گا رہوں گا۔ پھر چلا جاؤں گا۔''

زرغونہ نے اداسی سے کہا۔ ''مگر جاؤ گے ضرور، یہاں رکو گے نہیں۔ خیر تمہاری مرضی ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

بارش کا سلسلہ جاری تھا اس نے جل تھل ایک کر دیا تھا۔ میرے رگ و پے میں ایک عجیب سی سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔

اسی عالم میں کنیز میرے کمرے میں داخل ہوئی، اس کا بھی اندر سے جو حال تھا۔ وہ جانتی ہو گی لیکن کچھ پریشان پریشان سی لگ رہی تھی۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ ''خدا غارت کرے جنگوں کو کم از کم اس موسم میں تو مرد اپنے گھروں میں آ جایا کریں۔''

میں اپنے کمرے سے نکل کر ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کھڑکی سے بارش کا سماں دیکھ رہی تھیں۔ کنیز میرے پیچھے ماں کے کمرے کے دروازے تک آئی اور وہیں چھپ کر کھڑی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد کسی نے دروازے پر دستک دی اور میں بھاگ کر دروازے پر پہنچا کنیز میرے پیچھے تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ میرے سامنے شال میں منہ چھپائے کوئی شخص کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں اور آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

اس شخص نے اپنے ایک ہاتھ سے مجھے ایک طرف کر دیا اور خود گھر میں داخل ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔ جب ہم روشنی میں پہنچے تو اس شخص نے اپنی شال اتار دی اور ہنستے ہوئے کہا۔ ''کیوں لڑکے! اب مجھے اپنے گھر میں داخل ہونے کے لیے تجھ سے اجازت لینی ہو گی؟''

یہ صالح خان تھا، اس گھر کا مالک، زرغونہ کا باپ، اس گھر کی کنیز کا آقا، میرے باپ کا دوست۔ صالح خان کی اچانک آمد نے سنسان اور افسردہ گھر میں خوشی کی لہر سی دوڑا دی۔ زرغونہ اپنے باپ سے چمٹ کر آنسو بہانے لگی اور ماں کے اداس اور افسردہ چہرے پر تازگی اور شگفتگی پیدا ہو گئی۔ کنیز بھی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

صالح خان نے مجھ سے پوچھا۔ ''تیرا کیا حال ہے؟ تو نے گھر میں کسی کو پریشان تو نہیں کیا؟''

ماں نے میری تعریفیں شروع کر دیں۔

صالح خان اپنا بھیگا لباس بدلنے لگا اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنے کمرے میں جا کر آرام کروں صبح ملاقات ہو گی۔

جب صبح ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے تو صالح

www.PakiBooks.Site

خان مجھے بہت خوش نظر آیا۔ اس نے کہا۔ ''آؤ خواجک! میں نے تیرے ساتھ بڑی زیادتی کی۔''

صالح خان کے آس پاس ماں، کنیز اور زرغونہ بھی بیٹھی ہوئی تھیں میں ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ صالح خان نے یہاں سے اٹھا کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

صالح خان نے کہا۔ ''خواجک! میں تجھے تیرے باپ کے پاس سے کیا کہہ کر لایا تھا اور یہاں گھر داری میں پھنسا کر نادر شاہ کے پاس چلا گیا۔ تو سوچتا ہو گا کہ یہ میں نے کیا کیا لیکن میرے خیال میں جو لوگ دنیا میں کچھ کرنا چاہتے ہیں انہیں مختلف کسوٹیوں سے گزر کر اونچا مقام حاصل کرنا چاہیے۔ میں تیری عادات اور اوصاف سے ناواقف تھا۔ تیری وفاداری تیری ذہانت، تیرے استقلال، تیرے ایثار، تیرے جذب دروں اور تیری اعلیٰ فکر کا مجھے ذرا سا بھی علم نہیں تھا۔ تجھ کو سمجھنے کے لیے میں اپنے گھر چھوڑ گیا تھا، اب میں اتنے دن بعد آنے کے بعد تجھ سے اچھی طرح واقف ہو چکا ہوں۔ تو میری کسوٹی پر پورا اترا اور اب میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور کوشش کروں گا کہ تجھ کو وہ بنا دوں جس کا تو مستحق ہے۔''

میں صالح خان کی باتوں سے بہت خوش ہوا مگر ماں بے چین ہو گئیں۔ انہوں نے صالح خان سے پوچھا۔ ''تو کیا اب خواجک یہاں سے چلا جائے گا؟''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''ہاں، اب یہ میرے ساتھ جائے گا کیونکہ میں اس کے والدین کے پاس سے یہی کہہ کر لایا تھا کہ اس کو کام کا آدمی بنا دوں گا۔''

زرغونہ بھی تڑپ گئی، بولی۔ ''بابا جان! ہم سب خواجک سے کتنے مانوس ہو چکے ہیں، چند دن رہ کر آپ خود بھی اندازہ لگائیں گے، آپ خواجک کو یہاں سے کہیں بھی نہ لے جائیں۔''

ماں نے بھی یہی بات اپنے انداز میں کہی۔ ''صالح خان! اس گھر میں کسی مرد کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تمہاری عدم موجودگی میں خواجک کا وجود غنیمت ہے اس لیے اس کو کہیں لے جانے کا خیال ہی اپنے دل سے نکال دو۔''

صالح خان نے سختی سے کہا۔ ''لیکن یہ یہاں نہیں رہ سکتا میں اسے اس وقت تک اپنے ساتھ رکھوں گا جب تک کہ یہ اس لائق نہیں ہو جاتا کہ یہ اپنی خود اعتمادی اور لیاقت سے فرائض منصبی اور کار منتوضہ اپنے طور پر انجام نہ دے سکے۔''

ماں روہانسی ہو گئیں، پوچھا۔ ''اس گھر میں کبھی کوئی مرد رہے گا بھی یا نہیں، اسے کب تک اجاڑ اور ویران رکھو گے؟ صالح خان! آج تمہیں میرے اس سوال کا جواب دینا ہی پڑے گا۔''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''نیک بخت! کچھ دن اور صبر کر، حالات ایسا رخ اختیار کرنے والے ہیں کہ میں ہمیشہ کے لیے مشہد چلا آؤں گا اور اب میں یہاں آؤں گا تو یہ خواجک یہ بھی میرے ساتھ ہو گا اور.....'' اس کے بعد صالح خان نے پہلے میری طرف دیکھا اور اس کے بعد زرغونہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ ہمیشہ اسی گھر میں ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ اس کے والدین کو بھی میں یہیں بلوا لوں گا۔''

ماں نے مایوسی سے کہا۔ ''یہ بھی دیکھ لیں گے کچھ دن اور صبر کر لوں گی۔''

اس دن ظہر سے ذرا پہلے صالح خان مجھ کو اپنے ساتھ لے کر ایک باغ میں گیا اور کہا کہ خواجک! میں تجھے لینے آیا ہوں، میں خوش ہوں کہ تو نے میری عدم موجودگی میں میری بیوی، بیٹی اور کنیز کو اپنا مداح بنا لیا ہے، اب تجھے یہ عہد کرنا ہو گا کہ تو میرا وفادار رہے گا اور جو کام میں کروں گا تو اس میں میری مدد کرے گا۔''

میں نے اس سے اس کا عہد کیا لیکن شاید اس سے وہ مطمئن نہیں ہوا، بولا۔ ''خواجک! میری باتوں کو غور سے سن اور اس کے بعد یہ عہد کر، میں ملازمت تو نادر شاہ سے دلواؤں گا لیکن تو وفاداری کا عہد مجھ سے کرے گا یعنی تو نادر شاہ کے مقابلے میں میرا زیادہ وفادار رہے گا۔''

اس وقت تک میں صالح خان کا اصل مقصد نہیں سمجھ سکا تھا۔ میں نے سادہ لوحی میں جواب دے دیا۔ ''صالح خان! آپ میرے باپ کے دوست اور میرے محسن ہیں، میں خدا اور رسول کو بیچ میں ڈال کر یہ عہد کرتا ہوں کہ میں ہر حال میں آپ کا وفادار رہوں گا۔''

صالح خان میرے اس عہد سے بے حد خوش ہوا اس نے اپنے تھیلے میں سے آجیل نکالا اور کہا۔ ''یہ آجیل ہے، اسے کھا اسے میں تیرے لیے بطور خاص لایا ہوں۔''

یہ آجیل، ککڑی خربوزے اور دوسرے چیزوں کے بیجوں کو شکر میں ملا کر کے تیار کی جاتی ہے۔ صالح خان آجیل خود بھی کھاتا رہا اور مجھے بھی کھلاتا رہا۔

ہم کافی دیر باہر رہنے کے بعد نادر شاہ کے بھتیجے علی قلی

www.PakiBooks.Site

خان کے پاس گئے، وہ شاید ہمارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اس کی نظر مجھ پر جیسے ہی پڑی خوش ہو کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ اس لڑکے سے بات ہوئی؟''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''بات ہوگئی اب میں اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا، اُمید ہے یہ وہاں ہمارے کام آئے گا۔ میں نے اس سے وفاداری کا عہد بھی لے لیا۔''

علی قلی خان نے کہا۔ ''تب پھر یہ اپنے لیے ایک نمایاں مقام حاصل کر کے رہے گا۔ میں اپنے وفاداروں اور جاں نثاروں کی جو فہرست تیار کر رہا ہوں اس میں اس کا نام بھی شامل ہوگا۔''

علی قلی خان نے مجھے ایک مرصع ہار دیا، سچے موتیوں کا یہ ہار کتنا قیمتی تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا تھا مگر کام سے پہلے انعام کامل جانا میرے اسپ شوق پر مہمیز کا کام کر گیا۔ ابھی تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ صالح خان اور علی قلی خان مجھ سے کس قسم کی وفاداری اور جاں نثاری کے طالب ہیں لیکن میں یہ ضرور جان گیا تھا کہ یہ دونوں مجھ سے جو کام بھی لیں گے اس کا صلہ بہت اچھا دیں گے۔

کئی دن بعد صالح خان نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھا۔ اس بار میں بھی اس کے ساتھ جا رہا تھا ماں، زرغونہ اور کنیز کو میری جدائی گوارہ نہ تھی لیکن ان میں سے ایک بھی صالح خان پر یہ دباؤ نہیں ڈال سکتا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ نہ لے جائے۔

وہ منظر قیامت سے کسی طرح کم نہ تھا جب میں مشہد کو چھوڑ کر صالح خان کے ساتھ جا رہا تھا تو اس گھر سے میں نہیں میری میت باہر نکل رہی تھی۔

صالح خان کے دل و دماغ پر میری جاں نثاری وفاداری کا ایسا نشہ چڑھ چکا تھا کہ وہ میری چھوٹی موٹی غلطیوں سے بھی نہیں اتر سکتا تھا۔ صالح خان مجھے کہاں لیے جا رہا تھا کچھ پتا نہ تھا۔ کئی دنوں بعد ہم کوہستانی سلسلوں میں داخل ہو گئے۔ ہمارے چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا، آبادیاں دور دور تھیں۔ مجھے صالح خان کی بہادری اور ہمت کی داد دینا پڑی کہ جو یہ خطرناک اور دشوار سفر تنہا کر رہا تھا۔ آخر ہم دونوں ایک دریا کے کنارے خیموں کا ایک شہر آباد دیکھا۔ میں نے صالح خان سے پوچھا۔ ''عم محترم! یہ کون لوگ ہیں؟''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''بھتیجے! یہ نادری سپاہ ہے اور یہ جگہ دغستان کہلاتی ہے، نادر شاہ اسے فتح کر چکا ہے مگر آس پاس کے لوگ اب بھی سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہیں اس لیے نادر شاہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کی اینٹ سے اینٹ بجائے بغیر وہ یہاں سے نہیں جائے گا۔''

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ خوشی اور کچھ نہ کچھ بن جانے کے احساس سرشاری نے مجھے از خود گرفتہ سا کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا میں نادر شاہ کو قریب سے دیکھ سکوں گا؟''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں۔ میں خود تجھے نادر شاہ کے پاس لے جاؤں گا۔''

چنانچہ صالح خان مجھے ایک ایسے شاندار خیمے میں لے گیا جس پر ایک فوجی دستہ متعین تھا اور ایسا لگتا تھا گویا یہ دستہ صالح خان کا ملازم تھا کیونکہ اس خیمے میں صالح خان رہتا تھا۔ یہاں انواع و اقسام کا سامان موجود تھا۔ اسلحہ، سامان آرائش و زیبائش، لباس، پارچہ جات، خلعت فاخرہ کے ذخائر، سچے موتیوں کے ہار، نقدی، ہیرے جواہرات۔ میں صالح خان کو اتنا بڑا اور اہم آدمی نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''عم محترم! یہ سب کیا ہے؟''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''بھتیجے! یہ نادر شاہ کا سامان خاص ہے اور میں اس کا امیر ہوں۔ وہ جب کسی کو انعام دیتا ہے تو وہ یہیں سے بادشاہ کو پہنچایا جاتا ہے۔ میں ایک امانت دار ہوں، مانا ہوا امانتدار، دیانت دار۔''

یہاں صالح خان نے مجھے ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیا جو فن سپاہ گری کا بہت بڑا استاد تھا اور اس کے پاس میرے ہی جیسے بہت سارے لڑکے اور نوجوان فن سپاہ گری سیکھ رہے تھے۔ یہیں مجھے کسی نے بتایا کہ یہاں تربیت پانے والے نوجوان نادر شاہ کے براہ راست ملازم یا محافظ کہلائیں گے۔ یہاں تلوار بازی، شمشیر زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی اور گھڑ سواری کی شاندار تربیت دی جا رہی تھی۔ ان میں ایک ایسا استاد بھی تھا جو ہمیں خنجر پھینک کر مارنے کی تربیت دے رہا تھا۔ اس استاد کا نشانہ اتنا سچا تھا کہ کیا بیان کروں۔ یہ درخت پر بیٹھے ہوئے پرندے تک کو خنجر سے مار گراتا تھا۔ میں اس کے کمال سے اتنا متاثر ہوا کہ میں بھی اس کی مشق کرنے لگا۔

صالح خان مجھ پر کڑی نظریں رکھے ہوئے تھا۔ میں جو کچھ سیکھ رہا تھا، صالح خان ہر روز اس سلسلے میں پوچھ گچھ کیا کرتا تھا اور جو کچھ میں بتاتا یا کر کے دکھاتا تھا صالح خان

www.PakiBooks.Site

اس سے بہت خوش ہوتا تھا۔

داغستان میں ہمیں کئی سال رہنا پڑا۔ اس دوران میں نے بہت کچھ حاصل کر لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب میں اس لائق ہو چکا تھا کہ نادر شاہ سے ملوا دیا جاؤں لیکن اس کا کہیں ذکر تک نہیں تھا۔ میں ہر وقت یہ سننے کا منتظر رہتا کہ بھتیجے تیار ہو جا آج تجھے نادر شاہ سے ملوا دیا جائے گا اور اب تجھے نادر شاہ کے ذاتی محافظوں میں شامل کر دیا گیا ہے۔

لیکن میرے کان اس آواز کے لیے کئی سال تک منتظر اور پریشان رہے۔

جب میں انتظار سے عاجز آ گیا تو صالح خان سے پوچھا۔ ''عم محترم! آپ نے اپنا وعدہ پورا نہیں فرمایا۔''

صالح خان نے پوچھا۔ ''کون سا وعدہ؟ کیسا وعدہ؟''

میں نے جواب دیا۔ ''آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے نادر شاہ تک پہنچا دیں گے لیکن میں ابھی تک اس کو قریب سے دیکھ بھی نہیں سکا۔''

صالح خان نے مجھے ترچھی نظروں سے گھورا، کہا۔ ''خواجک! تو نادر شاہ کا نام کتنی بے ادبی اور بے تکلفی سے لے رہا تھا، اگر یہ خبر کسی طرح نادر شاہ تک پہنچ گئی تو وہ ہماری زندگی اجیرن کر دے گا اور ہم دونوں تباہ و برباد کر دیئے جائیں گے۔''

میں نے وعدہ کر لیا۔ ''عم محترم! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔''

ایک دن بہت صبح میرے خیمے میں ایک ایسا شخص داخل ہوا جس سے میں واقف نہیں تھا۔ خیمے سے باہر کھڑے ہوئے دربانوں نے اسے کیوں نہیں روکا؟ میں نے سوچا مگر اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اس شخص نے مجھ سے کہا۔ ''لڑکے! ذرا میرے ساتھ تو چل مجھے تجھ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کہاں اور کیوں؟ اور تم ہو کون مجھ سے سوال جواب کرنے والے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں تیرے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہوں مگر ابھی نہیں بعد میں پہلے تو میرے سوالوں کے جواب دے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اگر میں انکار کر دوں تو؟''

اس شخص نے غصے میں جواب دیا۔ ''لڑکے! میں زیادہ باتیں پسند نہیں کرتا، چپ چاپ میرے ساتھ چل تجھے کوئی.....''

مجھے یہ حیرت تھی کہ صالح خان یہ ساری باتیں سن رہا تھا اور خاموش تھا۔ میں نے صالح خان سے شکایتاً کہا۔ ''عم محترم! کیا آپ ان صاحب سے واقف ہیں اور یہ جو مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتے ہیں، آپ کیا کہتے ہیں؟''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''یہ جس طرح یہاں آیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی خاص آدمی ہوگا اگر تو جانا چاہے تو چلا جا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کہتے ہیں تو اس شخص کے ساتھ چلا جاؤں گا ورنہ.....''

اس شخص نے میری پوری بات نہیں سنی اور کہا۔ ''ورنہ ورنہ کیا چپ چاپ میرے ساتھ چل۔''

میں اس شخص کے ساتھ پیدل چل دیا، وہ مجھے ایک جنگل میں لے گیا۔ یہاں سفیدے اور چیڑ کے درختوں کی کثرت تھی میں نے دیکھا اس جگہ اور بھی لڑکے اور نوجوان موجود تھے ان کے ساتھ دو عمر رسیدہ مرد بھی تھے۔

اس شخص نے یہاں اعلان کیا۔ ''نوجوانو! تم وہ ہو جن کا زیر تربیت نوجوانوں میں سے انتخاب کر لیا گیا ہے، اب تم آپس میں مقابلے کر کے اپنے آپ کو اس بات کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کرو گے کہ کون نادر شاہ کی قربت کا مستحق ہے۔''

ایک دوسرے شخص نے ہم سب سے سوال کیا۔ ''تم میں ایرانی کون ہے اور افغانی کون؟''

پتا چلا کہ ان میں ایرانی ایک بھی نہیں سبھی افغانی ہیں، بعد میں ہم نے آپس میں رسمی مقابلے کیے اور ہم سب کو کامیاب قرار دے دیا گیا۔

سہ پہر کو اسی جگہ ہمیں ایک دوسرے سردار کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ اس سردار کا نام تھا احمد خان ابدالی، احمد خان ابدالی نے آتے ہی پوچھا۔ ''تم میں ابدالی کون ہے؟''

میں اپنے ساتھیوں کی صف سے نکل کر احمد خان ابدالی کے پاس کھڑا ہو گیا۔

احمد خان ابدالی نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا۔ ''تو کس کا بیٹا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''باغر سدوزئی کا۔''

احمد خان چونک پڑا۔ ''باغر سدوزئی کا! یہ وہ شخص ہے نا جس کا ایک ہاتھ کسی جنگ میں ضائع ہو چکا ہے؟''

www.PakiBooks.Site

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں میرے باپ کا ایک ہاتھ کٹ چکا ہے۔''

احمد خان نے پوچھا۔ ''تیرا باپ آج کل کہاں رہ رہا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''بندرانزلی میں۔''

احمد خان نے پوچھا۔ ''وہاں تیرا باپ کیا کررہا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''کچھ بھی نہیں، ایک ہاتھ کی کمی نے انہیں دنیا سے مایوس اور دل برداشتہ کردیا ہے۔ انہوں نے مجھے یہاں اس لیے بھیجا ہے کہ میں فن سپاہ گری سیکھ کر کوئی بلند و بالا مقام حاصل کروں اور نام پیدا کرکے ان کے آخری دنوں کو سکھ چین سے گزروادوں۔''

احمد خان ابدالی نے اپنے دانت بھینچے اور غصے میں کہا۔ ''اب جب کبھی باغر سے ملاقات ہو تو اس کو میرا یہ پیغام دے دینا کہ گوشہ عزلت میں انسان کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایک ہی ہاتھ سے میدانِ جنگ میں آجاؤ۔ یہاں عزت بھی ملے گی اور دولت بھی، میں اس کا انتظار کروں گا۔''

احمد خان ابدالی جو کچھ دیر تک صرف مجھ سے مخاطب رہا تو دوسرے اس سے حسد کرنے لگے۔ ایک نوجوان نے پوچھا۔ ''محترم ابدالی سردار! کیا جو لوگ ابدالی نہیں ہیں وہ اس لائق نہیں کہ آپ ان سے باتیں کریں۔''

احمد خان ابدالی نے ہنس کر جواب دیا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے نوجوان! میں باری باری تم سب سے باتیں کروں گا میں تمہیں کسی طرح بھی مایوس نہیں کروں گا۔''

اس کے بعد احمد خان ابدالی نے ہر ایک سے کھڑے کھڑے باتیں کیں اور ان سب کی بابت حکم دیا کہ انہیں نادر شاہ کے محافظ دستے کے لیے درکار سپاہیوں میں پہنچا دیا جائے اور میری بابت بطور خاص کہا کہ خواجک کو میرے پاس لایا جائے۔

پہلے تو ہم سب کو وہیں پہنچا دیا گیا جہاں جہاں سے ہمیں لایا گیا تھا۔ صالح خان میرا بڑی بے چینی سے انتظار کررہا تھا۔ میں جیسے ہی اپنے خیمے میں داخل ہوا، صالح خان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، مجھے ایک طرف لے جاکر پوچھا۔ ''وہ شخص تجھے کہاں لے گیا تھا؟''

میں نے بالتفصیل سب کچھ بتا دیا، صالح خان نے کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ آج تم لوگوں کا انتخاب ہوگا لیکن میں اس میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔ اگر میں غلطی سے دخل دے بیٹھتا تو نادر شاہ کے زیر عتاب آجاتا۔ میں نادری سپاہ سے نہیں اس کے ساز و سامان سے تعلق رکھتا ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

صالح خان نے کہا۔ ''اب تو ہم سے جدا ہو جائے گا اور نادر شاہ کا قرب حاصل کرلے گا۔''

میں بہت خوش ہوا اور صالح خان کا شکریہ ادا کیا۔

''عم محترم! آپ نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کردکھایا۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

صالح خان نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ ''بھتیجے! میں نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کردکھایا لیکن اگر تو یہ چاہتا ہے کہ ترقی کرے تو میرے چند مشوروں پر عمل کرنا ہوگا۔''

میں نے عرض کیا۔ ''میں آپ کو اپنے باپ کی جگہ سمجھتا ہوں۔ آپ کے مشوروں پر عمل کرنا میرا فرض ہے اور ہمیشہ اسے اپنی سعادت مندی سمجھوں گا۔''

صالح خان نے کہا۔ ''تو وقتاً فوقتاً مجھ سے ملتا رہے گا اور میں تجھے جو مشورے دوں گا ان پر عمل کرتا رہے گا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''ضرور بے شک، اس کا میں پہلے ہی وعدہ کرچکا ہوں۔''

صالح خان کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے کہہ نہیں پا رہا، اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''خواجک میرے بھتیجے! میں تجھے نادر شاہ کے بھتیجے علی قلی خان سے ملوا چکا ہوں ان دنوں وہ سیستان کا حاکم ہے۔ وہ ہم سب سے ایک کام لینا چاہتا ہے۔ میں اس کام میں تجھے بھی شریک کرلینا چاہتا ہوں اس لیے کہ علی قلی خان سے جو فائدہ میں اٹھاؤں تو بھی اٹھائے، بول کیا تو اس پر تیار ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''عم محترم! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں آپ کا حکم کبھی بھی نہیں ٹالوں گا۔''

صالح خان نے کہا۔ ''یہ ساری باتیں میں اس لیے کررہا ہوں کہ اب تو ابدالی سردار احمد خان کی تحویل میں چلا جائے گا اور میں جانتا ہوں کہ نسبتاً تو خود بھی ابدالی ہے اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ احمد خان تجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہے، اس لیے میں یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ کہیں تو نسلی عصبیت کے زیر اثر تو تجھے فراموش کردے اور احمد خان کا فرماں بردار بن جائے۔''

www.PakiBooks.Site

میں نے جواب دیا۔ ''جب میں احمد خان کی ماتحتی میں ہوں گا تو کہنا بھی انہی کا مانوں گا لیکن اس کے باوجود میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے حکم سے بھی سرتابی نہیں کروں گا۔ وقت آنے دیجیے آپ کو اس قول کا تجربہ بھی ہو جائے گا۔''

صالح خان نے کہا۔ ''میں تیرے کان میں ایک ایسی بات ڈال دینا چاہتا ہوں جس کی روشنی میں تجھ کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ مخلوق کی محبت اور اپنے آقا کی فرمانبرداری میں سے اگر کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو تجھے ایسے موقع پر حق اور سچائی ہی کا ساتھ دینا ہوگا۔ یہ حق کدھر ہے؟ کوئی بتائے گا نہیں تو خود فیصلہ کرے گا۔''

صالح خان کیا کہہ رہا تھا اور اس کے پیچھے اس کا کون سا منشا کارفرما تھا، میں نہیں سمجھ سکا تھا۔

دوسرے دن احمد خان نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ مجھے نادر شاہ کی محافظ سپاہ میں نہیں شامل کیا گیا بلکہ میں احمد خان کی سپاہ میں داخل کرلیا گیا تھا۔

احمد خان نے مجھے بڑی خوش دلی سے قبول کیا تھا۔ اس نے مجھے اپنا قرب بخشا اور مجھ سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کیں، اس نے کہا۔ ''دیکھ خواجک! یہاں کوئی کسی کا دوست نہیں، ہر شخص اپنا مطلب نکالنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اس لیے میں تجھے یہ مشورہ دوں گا کہ تو بہت محتاط رہ اور اپنی زبان کو قابو میں رکھ۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا میں زبان کو قابو میں نہ رکھنے کا مرتکب ہو چکا ہوں؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''بالکل ہو چکا ہے، جب میں نے پہلی بار تجھے دیکھا اور ابدالی نسل کے ایک فرد کی حیثیت سے بات شروع کی تو تو نے مجھے احمد شاہ کہا تھا کیا تو جانتا ہے کہ احمد خان اور احمد شاہ میں کیا فرق ہے؟ میرے نام کے ساتھ شاہ لگا کر تو کیا فتنہ کھڑا کرسکتا ہے، شاید تو نہیں جانتا۔''

میں نے کہا۔ ''ابدالی سردار! میں آپ کے نام کے ساتھ شاہ کیوں لگاؤں گا اور مجھے ذرا بھی یہ نہیں یاد آرہا کہ میں نے آپ کو احمد شاہ کہا ہو اور پھر میں آپ کا نام لوں گا ہی کیوں۔''

احمد خان نے کہا۔ ''بہرحال یہ میرا فرض ہے کہ میں تجھے باریکیاں سمجھاؤں، تجھ پر صالح خان نے احسان کیے ہیں؟ میں یہ نہیں کہتا کہ تو احسان فراموش کہلائے لیکن میں یہ

1965ء کی جنگ اور یاور مہدی

پاکستانی قوم کی یہ خاصیت رہی ہے کہ اس نے ہر مشکل وقت میں اندرونی اور بیرونی دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے خواہ وہ طالب علم ہو یا صنعت کار، سرکاری عہدہ دار ہو یا عام شہری، سب نے قوم کی پکار پر لبیک کہا تو بھلا یاور مہدی اس دوڑ میں کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ ان کی قومی ذمہ داریوں کا ایک مظاہرہ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران دیکھنے میں آیا، جب یاور مہدی نے اس مشکل مرحلے میں پاکستانی عوام کو باخبر رکھنے سے لے کر جذبہ حب الوطنی کی نشر و اشاعت تک ہر معاملے میں ریڈیو جیسے موثر نشریاتی ادارے کو ہر کام میں آگے رکھا۔ سن 1965ء کی جنگ کے دوران بحیثیت پروڈیوسر یاور مہدی کی ذمہ داری 12 سے 15 پروگراموں تک محدود تھی، جن میں بزم طلباء کے پروگرام، نیوز ویک، آئینہ وغیرہ شامل تھے۔ اس کے ساتھ مختلف علاقوں کے لوگوں کے تاثرات لینا جس میں ان کی معاونت ڈاکٹر خواجہ ذکی حسن اور صدر شعبہ عمرانیات جامعہ کراچی ڈاکٹر ایم ایس جیلانی کیا کرتے تھے۔ یاور مہدی نے جنگ کے دوران عوام میں شعور و آگاہی پیدا کرنے کے لیے پروگرام مرتب کیے جیسا کہ شہری دفاع سے متعلق ضروری ہدایات ریڈیو پاکستان سے نشر کی جانے لگیں جن میں بتایا جاتا تھا کہ اگر جنگ کے دوران شہری آبادی پر بم گر جائے تو کیا احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں، مزید تباہی سے کیسے بچا جاسکتا ہے۔ یاور مہدی جنگ کے دوران صرف تین سے چار گھنٹے سوتے تھے۔ باقی بیس گھنٹے مسلسل کام کرتے تھے۔ براڈ کاسٹنگ ہاؤس میں بھی خندقیں کھودی گئی تھیں کہ اگر سائرن بجے تو تمام عملہ ان میں پناہ لے لے لیکن یاور مہدی اور ان کی ٹیم نے اس دوران بھی اپنی جان کی پروا کیے بغیر اپنے کاموں کو جاری رکھا اور نشریات کو کسی صورت بھی رکنے نہ دیا۔ اس جنگ کے دوران ریڈیو پاکستان کی نشریات کو پوری دنیا نے سراہا، چاہے وہ ملی نغمے نشر کرنے کے حوالے سے ہو یا جنگ کی تازہ ترین صورتِ حال سے ملک کو باخبر رکھنا ہو، حد تو یہ ہے کہ ہنگامی صورتِ حال کے ان دنوں میں بھی بزم طلباء کے پروگرام جاری رہے تاکہ نوجوان کو ہر لحظہ اُمید کا پیغام دیا جاسکے وگرنہ یہ بات ریاست کے قوانین میں شامل ہوتی ہے کہ جب ہنگامی صورتِ حال کا اعلان ہو تو معمول کی سرگرمیاں روک دی جائیں۔ بحیثیت مجموعی ریڈیو پاکستان کے کردار کو اس وقت عالمی سطح پر پذیرائی ملی۔

مرسلہ: ناصر میمن۔ کراچی

www.PakiBooks.Site

بھی نہیں چاہتا کہ تو نمک حرام کہلائے۔''

احمد خان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں، میں خاموش ہوگیا۔

☆.....☆

داغستان کے ''قاضی قوموخ'' کے کنارے خیمے لگائے عرصہ گزر چکا تھا۔ نادر شاہ کے فوجی دستے قرب و جوار میں گھس کر سرکشوں کا قلع قمع کرنے میں مشغول تھے، یہاں کا سردار سرخائی خان مصیبت بنا ہوا تھا۔ نادر شاہ نے اس کی سرکوبی کی مہم احمد خان کے سپرد کی تھی چنانچہ مجھے پہلی بار اس خطرناک مہم میں حصہ لینے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ کوہستانی علاقہ جو کئی دریاؤں میں گھرا ہوا تھا بہت دشوار گزار تھا۔ میں نے اس مہم میں اپنی جان کی بازی لگا کے احمد خان کے دل میں جگہ بنائی۔ باغیوں اور سرکشوں کو پہاڑی چٹانوں اور غاروں میں گھس گھس کر ٹھکانے لگانے کے بعد مجھے اس لائق سمجھا گیا کہ نادر شاہ کو فتح مندی کی جو تفصیل پیش کی گئی اس میں میرا نام بھی بطور خاص شامل کردیا گیا۔

یہ میری خوش قسمتی ہی تو تھی کہ نادر شاہ نے مجھے اس لائق سمجھا کہ میں اس کو اپنی شکل دکھاؤں۔ یقین کیجیے جب احمد خان نے مجھ سے یہ کہا کہ نادر شاہ تجھ سے ملنا چاہتا ہے تو میری حالت ہی غیر ہوگئی۔ میں کانپنے لگا اور احمد خان سے کہہ دیا۔ ''میں نادر شاہ سے نہیں ملوں گا کیونکہ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔''

احمد خان نے مجھے ڈانٹ دیا، کہا۔ ''خواجک، نادانی نہ کر، اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میں چونکہ ابھی تک نادر شاہ کو دیکھ بھی نہیں سکا اس لیے اب جو مجھے اچانک عزت و توقیر کے ساتھ نادر شاہ کے سامنے پیش کیا جائے گا تو میں خود کو سنبھالوں گا کس طرح؟''

احمد خان نے کہا۔ ''احمق نوجوان! کسی مرتبے تک پہنچنے کے یہی زینے ہوتے ہیں اگر تو ان پر نہیں چلے گا تو ترقی کس طرح کرے گا؟''

بہرحال مجھے نادر شاہ کی خدمت میں پیش کردیا گیا۔ نادر شاہ سیدھے قد و قامت کا خوفناک انسان تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت کچھ ایسی تھی کہ کوئی آنکھ نہیں ملا سکتا تھا جب مجھے نادر شاہ کے روبرو پیش کیا گیا تو وہ کچھ دیر تو مجھے یوں ہی دیکھتا رہا۔ میری نظریں جھک چکی تھیں اور میں اتنا مسحور اور خوفزدہ ہو چکا تھا کہ کچھ بول تک نہیں سکتا تھا۔

نادر شاہ نے مجھ سے پوچھا۔ ''تو پٹھانوں کی کس نسل سے تعلق رکھتا ہے؟''

میں بولنا چاہتا تھا مگر زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ احمد خان نے مجھے کہنی ماری اور آہستہ سے کہا۔ ''خواجک! بولتا کیوں نہیں چپ کیوں ہے؟ بول۔''

مجھ سے اس بار بھی نہیں بولا گیا۔ احمد خان نے عرض کیا۔ ''جہاں پناہ یہ شرما رہا ہے اور پھر فرطِ رعب میں بھی یہ کچھ.....''

نادر شاہ نے احمد خان سے پوچھا۔ ''احمد خان! یہ کس خاندان کا چشم و چراغ ہے؟''

اس بار میں نے جواب دیا۔ ''جناب والا! میں سدوزئی خاندان کا.....''

معلوم نہیں کیوں میری قوت گویائی اس بار پھر جواب دے گئی۔ شاید نادر شاہ کو میری یہ بات سخت ناگوار گزری تھی لیکن اب احمد خان نے بولنا شروع کردیا۔ اس نے کہا۔ ''حضور والا! خواجک ابدالی ہے میری ہی قوم کا زندہ دل نوجوان۔ یہ سدوزئی بھی ہے کیوں کہ ہمارا جد اعلیٰ سدوزئی ہی تھا۔''

نادر شاہ نے کہا۔ ''جب اے نوجوان! تو سدوزئی ابدالی ہے تو وہ کون سی طاقت یا دبدبہ ہے جو تجھ کو میرے روبرو بولنے نہیں دے رہا ہے۔ میں احمد خان سے روز ہی باتیں کرتا ہوں آج میں تجھ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ ''بندہ پرور! میں سدوزئی ابدالی ہوں۔''

نادر شاہ نے احمد خان سے کہا۔ ''احمد خان! میں اس نوجوان سے بے حد خوش ہوں۔ مجھے ان جوانوں سے سخت نفرت ہے جو میرے ہی روبرو کھڑے ہو کر میری بابت بات کرجاتے ہیں۔ اس نوجوان میں اتنی ادب شناسی تو ہے کہ میرے روبرو بات نہیں کرتا۔''

اس کے بعد اس نے صالح خان کو طلب کیا، جب صالح خان ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا تو نادر شاہ نے اس سے پوچھا۔ ''صالح خان! کیا تو اس نوجوان سے واقف ہے؟''

صالح خان نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ ''جہاں پناہ! یہ خواجک ہے ابدالی سدوزئی۔''

نادر شاہ نے پوچھا۔ ''تو اسے کس طرح جانتا ہے؟''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''جہاں پناہ! یہ میری ہی دریافت تو ہے، اس کو میں ہی آپ کے دربار تک لایا

www.PakiBooks.Site

ہوں۔''

نادر شاہ نے کہا۔ ''جب یہ نوجوان تیری ہی دریافت ہے اور تو ہی اس کو میرے دربار تک لایا ہے تو پھر بتا، یہ تیرے ذریعے مجھ تک کیوں نہیں پہنچا؟''

صالح خان تھر تھر کانپنے لگا، بولا۔ ''میں انتظار کررہا تھا کہ خواجک فوجی تعلیم و تربیت حاصل کرلے، اس کے بعد آپ کی خدمت میں پیش کردیا جائے گا پھر حالات یوں بدلے کہ خواجک اچانک سردار احمد خان کی تحویل میں چلا گیا۔''

نادر شاہ نے درشت لہجہ اختیار کیا، بولا۔ ''نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ تو نے اس نوجوان کو اپنا اور میرے بھتیجے علی قلی خان کا وفادار بنانے کی کوشش کی، کیا یہ بھی جھوٹ ہے؟''

اس بار صالح خان چپ ہوگیا اور خاموشی کا جو مطلب ہوسکتا تھا اس کی تعزیر بہت ہی بھیانک اور عبرتناک تھی۔

نادر شاہ نے کہا۔ ''تو خوب جانتا ہے کہ میں انسانوں کو ان کی غلطیوں اور خطاؤں پر بہت کم معاف کرتا ہوں۔''

صالح خان بہت بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے نادر شاہ کے پاؤں پر گرتے ہوئے کہا۔ ''حضور والا رحم! سید کونین حضرت محمد مصطفیٰ کا واسطہ رحم۔''

نادر شاہ نے پاؤں کی ٹھوکر مار کر اسے کھڑے ہو جانے کا حکم دیا، بولا، ''آخر تم لوگ سمجھتے کیا ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم سات پردوں میں چھپ کر جو کام کرو گے وہ میرے علم میں نہیں آئے گا؟ ایسا نہیں ہوسکتا احمقو! میں شہنشاہ ہوں، شاہوں کا شاہ، مشیت ایزدی میرے ساتھ ہے۔ میرے حق میں ہے مجھ سے ڈرو، میں قہر خداوندی ہوں۔''

صالح خان پر بدستور کپکپی طاری تھی، اس بار اس کی آواز بھی کپکپانے لگی، مرتعش آواز میں رحم کی درخواست کی۔ ''جہاں پناہ! اس بار معاف فرمادیں آئندہ آپ میری بابت کوئی بھی ایسی ویسی بات نہیں سنیں گے۔''

نادر شاہ نے احمد خان سے پوچھا۔ ''ابدالی سردار! تو کیا کہتا ہے؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''حضور والا! حکومت اگر جسم ہے تو یہ امراء اور منصب دار اس کے اعضاء ہیں اگر آپ ان اعضاء کو کاٹ دیں گے تو گویا خود ہی اپنی حکومت کو کمزور کردیں گے۔''

نادر شاہ نے تلوار کی نوک صالح خان کے پیٹھ میں چبھوئی اور کہا۔ ''اب اٹھ بھی جا اور آئندہ اگر تو نے ذرا بھی ایسی ویسی حرکت کی تو میں تجھ کو یقین دلاتا ہوں کہ قتل کر کے تیری لاش چیل کوؤں کو کھلا دوں گا۔''

صالح خان نے تھرتھراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا حضور والا نے واقعی مجھے معاف کردیا ہے؟''

نادر شاہ نے جواب دیا۔ ''ہاں میں نے واقعی معاف کردیا۔ اس کے بعد پوچھا۔ ''اچھا اب تو یہ بتا دے کہ خواجک کو میرے دربار میں پیش نہ کرنے کی مصلحت کیا تھی آخر؟''

صالح خان نے کہا۔ ''بندہ پرور! میں جاہل اور نکھے نوجوان کو آپ کے دربار میں کس طرح پیش کرسکتا تھا؟ بخدا جیسا کہ میں بار بار عرض کررہا ہوں میں اس کو کسی لائق کردینے کے بعد جہاں پناہ کی خدمت میں ضرور پیش کردیتا۔''

نادر شاہ نے کہا۔ ''اچھا اب میں تجھ کو ایک معمولی سی سزا دے کر معاف کرتا ہوں۔''

صالح خان زار و قطار رونے لگا۔ ''جہاں پناہ رحم۔''

نادر شاہ نے کہا۔ ''میں تجھ کو اس شرط پر معاف کرسکتا ہوں کہ تو خواجک کے قدموں میں گر کر مجھ سے معافی طلب کرے۔''

صالح خان نے گڑگڑا کر عرض کیا۔ ''جہاں پناہ رحم، یہ بدترین بلکہ ذلیل ترین سزا ہے اس ناچیز کے لیے۔''

نادر شاہ نے کرخت لہجے میں حکم دیا۔ ''میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تو خواجک کے قدموں میں گر کر معافی مانگ۔''

صالح خان کے لیے جان بچانے کا اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ وہ نادر شاہ کے حکم کی تعمیل کرے، وہ میرے قدموں میں گر گیا اور میرے دونوں پاؤں پکڑ کر معافی طلب کرنے لگا۔ ''جہاں پناہ رحم!''

نادر شاہ نے کہا۔ ''اب تو جاسکتا ہے۔''

صالح خان میرے قدموں سے پھرتی سے اٹھا اور اتنی تیزی سے فرار ہوا کہ کسی نے جاتے دیکھا اور کسی نے نہیں دیکھا۔

اس کے بعد نادر شاہ نے مجھ سے بھی کہا۔ ''اب تو بھی جاسکتا ہے۔''

جب میں وہاں سے چلنے لگا تو نادر شاہ نے کہا۔ ''اور دیکھ خواجک اب صالح خان سے راہ و رسم نہ بڑھانا ورنہ میں

www.PakiBooks.Site

تجھے بھی سزا دوں گا۔''

اب میں احمد خان ابدالی کے ماتحت تھا اس لیے صالح خان سے راہ و رسم بڑھانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

کئی دن بعد دریائے آمدی کے آس پاس رہنے والوں نے ہم پر شب خون مارا۔ دریائے آمدی شمال میں قفقاز کے روبرو بہتی تھی اور نادری سپاہ کا وہاں تک پہنچنا ذرا دشوار امر تھا لیکن نادر شاہ اس شرارت کو برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے حکم دیا کہ دشمنوں کا اس وقت تک پیچھا کیا جائے جب تک کہ وہ ہاتھ نہ آجائیں انہیں تہ تیغ نہ کر دیا جائے۔

ہم ان کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے آمدی تک پہنچ گئے وہاں ساحلی آبادیوں کو خاک و خون میں ڈبو دیا گیا اور جو گرفتار ہوئے انہیں باندھ کر نادر شاہ کے پاس روانہ کر دیا گیا۔ یہاں احمد خان ابدالی نے مجھے یہ گر کی بات بتائی کہ نادر شاہ کو رحم اور مروت سے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں۔ وہ اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد کر دینے کا قائل ہے۔ احمد خان نے مجھے سمجھایا کہ ہم بھی اپنے دشمنوں کو معاف نہیں کرتے، اس لیے تو بھی اسی معیار کو اپنا رہبر بنا۔''

معلوم نہیں کیوں نادر شاہ نے ہمارے پیچھے اپنے بیٹے اور ولی عہد قرۃ العین رضا قلی مرزا کو بھیج دیا اور احمد خان کو لکھا کہ شہزادے کو اپنی سرپرستی اور نگرانی میں رکھ کر کام لے۔

شہزادہ رضا قلی مرزا اس زعم میں کہ وہ نادر شاہ کا بیٹا اور ولی عہد ہے، اپنے غیر معمولی اختیارات کا مظاہرہ کرنے لگا۔ وہ اپنے دشمنوں کو معاف کر دینے میں انتہائی سخی تھا۔ چنانچہ جب باغیوں اور سرکشوں کی ایک جماعت رحم اور معافی کی درخواست کرنے لگی تو شہزادے کو کچھ رحم آ گیا۔ ادھر کے بارے میں مخبروں نے ہمیں یہ خبر بھی دے دی تھی کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کی ایماء اور تحریک پر ہم پر شب خون مارا گیا تھا۔ یہ لوگ بدترین سزا کے مستحق تھے لیکن پتا نہیں کہ شہزادے رضا قلی مرزا نے ان میں کیا دیکھا کہ اس کا دل پسیج گیا۔

ہم دریائے آمدی کے مغربی ساحل پر خیمہ زن تھے۔ شہزادہ رضا قلی مرزا کا خیمہ ہمارے درمیان میں تھا۔

ہم لوگ باغی سردار کو اس کے ساتھیوں کے ساتھ مشکیں کسے ہوئے شہزادے کے خیمے میں لے گئے۔ یہ صبح کا وقت تھا اور شہزادہ اس وقت تک سویا ہوا تھا۔ شہزادے کے عملے میں کسی کی بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شہزادے کو بیدار کر دیتا۔ احمد خان نے شہزادے کے دربانوں سے کہا۔

''شہزادے کو جگا دیا جائے کیونکہ ان قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ اسی وقت ہونا ہے۔''

ایک دربان جو غالباً دوسرے تمام دربانوں کا سردار تھا۔ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواباً کہا۔ ''سردار! ہمیں معلوم ہے کہ آپ یہاں جس غرض سے تشریف لائے ہیں، وہ بہت اہم اور فوری توجہ طلب ہے لیکن ہم شہزادے کو نہیں جگا سکتے۔''

احمد خان بے بس اور مجبور تھا۔ ناچار شہزادے کی بیداری کا انتظار کرنے لگا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد شہزادہ بیدار ہوا تو اسے احمد خان کی آمد کی خبر دی گئی اور یہ بھی بتایا گیا کہ آمدی کے باغی بلکہ خونی بھی رسیوں سے جکڑے ہوئے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے خواہش مند ہیں۔

شہزادے نے اس بار پھر باغیوں کی بابت کوئی فیصلہ نہیں کیا اور اپنے دوسرے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ اس بار ہمارے سردار احمد خان نے ذرا جرأت سے کام لیا اور دربانوں کی پروا کیے بغیر اندر پہنچ گئے چاروں طرف ایک ہاہا کار سی مچ گئی۔ ہم دس آدمی دربانوں کو روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ شہزادہ رضا قلی مرزا بھاگ کر اپنے خیمے کے دروازے پر آ گیا اور اپنے سامنے احمد خان کو دیکھ کر پوچھا۔

''احمد خان! کیا بات ہے یہ شور و غل کیسا ہے؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''پہلے ہمیں اپنے خیمے میں لے چلیں۔ پھر اصل واقعہ بھی بتا دوں گا۔''

شہزادہ خود بھی بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ احمد خان نے اپنے آدمیوں کی مدد سے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اس وقت وہ شہزادے کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ شہزادے کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔ ''اگر میں تمہیں خیمے میں آنے دوں گا تو تم کہیں مجھے گرفتار تو نہیں کر لو گے؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''شہزادے! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ ہم اور آپ کو گرفتار کریں گے؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

شہزادہ احمد خان کو فوراً اندر لے گیا۔ ہم لوگ خیمے کے باہر ہی کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد اندر سے ایک ملازم نکلا اور کہا۔ ''اس وقت جو لوگ سردار احمد خان کے ساتھ آئے ہیں، اندر چلے جائیں۔''

اجازت کی دیر تھی ہم لوگ بھڑا مار کر اندر چلے گئے۔

www.PakiBooks.Site

دلفریب کہانیوں اور دلنشین سلسلوں سے مرصع ستمبر 2018 کا دل خوش کن شمارہ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

شیریں حیدر، رفعت سراج، حیا بخاری کی دلکش سلسلے وار کہانیاں

دردانہ نوشین خان کے زیرک خیالات کا مظہر.....
ایک یادگار متاثر کن منی ناول..... صفہ کی نئی قسط.....

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا پُربصیرت مضمون

عیدالاضحیٰ کی مناسبت سے نزہت جبیں ضیا کا مکمل ناول..... دل کی بساط پر

شمع ہدایت کے سلسلے میں اختر شجاعت کی تحریر.....
سخاوت..... نامور اسکالر و علمائے دین کی مستند کتابوں سے لی گئی تحقیق کا نچوڑ

پاکیزہ کے مہمان میں ملاقات کیجیے.....
ماضی و حال کے نامور اداکار فہمید احمد خان و
بیگم فہمید احمد سے.....

اسما قادری، ناہید فاطمہ حسنین، نفیسہ سعید کے مشاق قلم کے کرشمے

اس کے علاوہ

پڑھیے ہماری سینئر اور جونیئر رائٹرز کی پُرلطف و دلچسپ تحریریں جن میں ڈاکٹر زاہدہ پروین، سلمیٰ غزل، نظیر فاطمہ، منعم ملک و دیگر شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا دلکش اور دلربا امتزاج صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

www.PakiBooks.Site

اس وقت تک غالباً اصل معاملے پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی کیونکہ ہم نے سنا، اس وقت شہزادہ کہہ رہا تھا۔ ''احمد خان! یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کا اصل مقصد کیا ہے؟ یہ قوموں اور ملکوں پر لشکر کشی، خون خرابہ، لوٹ مار، قتل و غارت گری یہ سب کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''شہزادے! اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسری اقوام کے مقابلے میں اپنی قوم کو آگے بڑھایا جائے اور فاتح اپنے غیر معمولی کارناموں کے ذریعے دنیا کے عظیم فاتحین کی صف میں نمایاں مقام حاصل کرے۔''

شہزادے نے کہا۔ ''یہ تو کوئی خاص مقصد نہ ہوا۔''

احمد خان نے موضوع ہی بدل دیا، بولا۔ ''جن سرکشوں اور باغیوں نے ہم پر شب خون مارا تھا، گرفتار کر لیے گئے ہیں آپ اسی وقت ان کی قسمت کا فیصلہ صادر فرمائیں گے۔''

شہزادے نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہیں؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''باہر میدان میں۔''

شہزادہ کچھ سوچنے لگا، بولا۔ ''مجھے کیا فیصلہ کرنا ہے احمد خان، کچھ تو ہی مدد کر۔''

احمد خان نے کہا۔ ''شہزادے! ان کا گناہ ناقابل معافی ہے ان کا جرم انہیں بدترین سزا کا مستحق قرار دیتا ہے۔''

شہزادے نے کہا۔ ''اچھا! انہیں میرے سامنے لایا جائے میں خود ان سے بات کرتا ہوں۔''

احمد خان نے عرض کیا۔ ''شہزادے! آپ ان سے کیا بات کریں گے؟''

شہزادہ رضا قلی مرزا نے اپنے محافظ دستے کو بلوا کر اپنے چاروں طرف کھڑا کر لیا، اس کے بعد احمد خان سے بات شروع کی۔ ''ہاں احمد خان اب بتا تو کیا چاہتا ہے اور تیری اصل منشا کیا ہے؟''

احمد خان نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''شہزادے میری کیا منشا ہے؟ میری اپنی کوئی منشا نہیں ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ ان بدمعاشوں کو ایسی عبرتناک سزا سنا دیں کہ بس سننے والا کانپ جائے۔ جو سنے لرز جائے۔''

شہزادے کی مرضی سے باغیوں کو ایک بڑے خیمے میں یکجا کر دیا گیا۔ یہاں شہزادے نے اپنے آدمیوں کو خیمے کے آس پاس تعینات کر دیا۔ یہ اسلحہ بردار سپاہی شاید اس لیے متعین ہوئے تھے کہ شہزادے کو احمد خان پر اعتبار نہیں تھا، ہم سب احمد خان کے ساتھ اس خیمے میں باغیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

شہزادے نے احمد خان سے پوچھا۔ ''احمد خان! یہ لوگ کس جرم میں پکڑے گئے ہیں؟''

احمد خان نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔ ''ولی عہد بہادر! یہی وہ اصل آدمی ہیں جن کی ایما اور نگرانی میں ہم پر شب خون مارا گیا تھا۔''

شہزادے نے ان آدمیوں سے پوچھا۔ ''تم پر جو الزام لگایا گیا ہے اس کی بابت تم کیا کہتے ہو؟''

ان میں سے ایک آدمی نے جواب دیا۔ ''شہزادے! یہ ہم پر الزام ہے، ہم وہ نہیں ہیں جن کی ایما یا نگرانی میں نادر شاہی سپاہ پر شب خون مارا گیا تھا۔''

اب شہزادے نے ایک بار پھر احمد خان ابدالی سے کہا۔ ''تو نے اس شخص کا جواب سن لیا۔ اب تو کیا کہے گا اس کے جواب میں؟''

احمد خان کی پیشانی پر غصے سے شکنیں پڑ گئیں، بولا۔ ''شہزادے میں آپ کی فوج کا ایک معزز ترین سردار ہوں اور آپ کے والد میری بہت عزت کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کی عدم موجودگی میں، میں جو چاہوں کر سکتا ہوں مگر اس وقت چونکہ آپ ہم میں موجود ہیں، اس لیے میں خاموش ہوں۔''

شہزادے نے ایک بار پھر مجرموں سے پوچھا۔ ''تم لوگ کیا کہتے ہو؟ ہمارا سردار احمد خان تو تمہیں مجرم اور خطاکار قرار دے رہا ہے۔''

اس شخص نے ایک بار پھر اپنے جرم سے انکار کیا۔ ''شہزادے! ہم بے گناہ ہیں۔''

شہزادے نے احمد خان سے پوچھا۔ ''معزز سردار! ان حالات میں جب کہ تم انہیں خطاکار قرار دے رہے ہو، وہ اسے ماننے سے انکار کر رہے ہیں، بولو میں انہیں کیا سزا دوں؟ انہیں کوئی سزا کس طرح دے سکتا ہے؟''

احمد خان تلملا رہا تھا، بولا۔ ''شہزادے! یہ اصلی خطاکار ہیں، ان کی بات پر اعتبار نہ کیجیے۔''

شہزادہ اپنی جگہ سے اٹھا اور قیدیوں میں سے ایک شخص کو الگ لے گیا اور وہاں پوچھا۔ ''معزز سردار! اب یہاں تنہائی میں بتاؤ کہ تم نے ایسا کیا تھا یا نہیں جو احمد خان کہہ رہا ہے؟''

www.PakiBooks.Site

اس شخص نے جواب دیا۔ ''آپ ہم سے سب کے سامنے پوچھیں یا تخلیے میں ہمارے پاس ان باتوں کا کوئی خاص گواہ یا ثبوت تو ہے نہیں، سو ہم بار بار یہی کہیں گے کہ ہم بے گناہ اور بے قصور ہیں۔''

شہزادے نے پوچھا۔ ''یہ جنگیں تمہیں اچھی لگتی ہیں، اس خون خرابے سے تمہیں پیار ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہرگز نہیں، بالکل نہیں ہم بے گناہ ہیں۔''

شہزادے نے کہا۔ ''تب پھر آؤ اور ہم سے عہد کرو کہ جب اپنے باپ کے بعد میں برسر اقتدار آ جاؤں گا تو تم لوگ میرے مطیع اور فرمانبردار رہو گے، مجھ سے بغاوت نہیں کرو گے۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں اس کے لیے تیار ہوں۔ میں اور میرے ساتھی اسی وقت آپ کے دستِ حق پرست پر ہاتھ رکھ کر یہ عہد کریں گے کہ ہم آپ کے دور حکمرانی میں آپ کے وفادار رہیں گے۔''

شہزادے نے تالی بجا کر اپنے خدمت گزاروں کو اپنے پاس بلایا اور انہیں حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پر امن و سکون سے رہنے کی قسم کھائیں۔''

جب یہ لوگ شہزادے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھا رہے تھے، احمد خان بھی وہیں پہنچ گیا اور اس حیرت انگیز منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر حیران رہ گیا اور شہزادے سے پوچھا۔ ''شہزادے! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

شہزادے نے ترش لہجے میں جواب دیا۔ ''جو کچھ بھی ہو رہا ہے تیرے سامنے ہو رہا ہے پھر مجھ سے پوچھنا کیا معنی؟''

احمد خان نے پھر پوچھا۔ ''محترم شہزادے! ان لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر کس بات کی بیعت کی ہے؟''

شہزادے نے بے رخی سے کہا۔ ''ان لوگوں نے میرے ہاتھ پر اس بات کی بیعت کی ہے کہ جب میں برسر اقتدار آ جاؤں گا تو یہ لوگ مجھ پر چڑھائی نہیں کریں گے چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے اور امن و سکون سے رہیں گے۔''

احمد خان نے غصے میں کہا۔ ''شہزادے! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں ہوش و حواس میں نہیں کہہ رہے ہیں آپ اپنے باپ سے واقف نہیں ہیں۔''

شہزادے نے حکم دیا۔ ''ان سب کو رہا کر دیا جائے۔'' اس کے بعد احمد خان سے کہا۔ ''ہاں تو معزز سردار! آپ کیا فرما رہے تھے ابھی میں اپنے باپ سے واقف نہیں ہوں۔ خوب اپنے باپ سے میں نہیں تو کیا تو واقف ہوگا؟''

احمد خان نے دیکھا کہ باغیوں کی رسیاں کاٹی جا رہی ہیں، وہ بہت بے چین تھا اس سے کچھ بن نہیں رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر چیخا۔ ''شہزادے! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

شہزادے نے جواب دیا۔ ''میں جو کچھ کر رہا ہوں تو دیکھ رہا ہے۔''

باغی احمد خان کو دیکھ دیکھ کر طنزاً مسکرا رہے تھے۔

احمد خان نے ایک بار پھر شہزادے کو متنبہ کیا۔ ''شہزادے! یہ جو کچھ بھی آپ نے کیا ہے اپنے حق میں برا کیا ہے میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ آپ اپنے والد سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔''

شہزادے نے جواب دیا۔ ''احمد خان! میں تیری عزت کرتا ہوں اس لیے تو ایسی باتیں نہ کر کہ میں تیری بے عزتی کر دوں اگر میں قیدیوں کو اپنے حکم سے رہا کرا سکتا ہوں تو آزادوں کو قید بھی کر سکتا ہوں مگر میں یہ ناخوش گوار حکم دینا نہیں چاہتا۔''

احمد خان نے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے خاموشی اختیار کی اور کچھ دیر بعد شہزادے سے رخصت چاہی۔

شہزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''احمد خان! تو بہت چالاک ہے میں تیرا مطلب سمجھ گیا، تو ابھی کہیں نہیں جائے گا، یہیں رکے گا، اگر میں تجھ کو اسی وقت یہاں سے چلا جانے دوں گا تو تو ان سرداروں کا تعاقب کر کے دوبارہ قید کر لے گا اور اگر وہ تیرے ہاتھ نہ آئے تو تو انہیں تیروں سے ہلاک کر دینے کی کوشش کرے گا لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

احمد خان نے ایک بار پھر شہزادے کو متنبہ کیا۔ ''شہزادے! آپ میری بات مانیے اور ان سرداروں کو دوبارہ گرفتار کر لیجیے۔ آپ کے والد دریائے قاضی و اموخ کے کنارے موجود ہیں انہیں ان کے پاس بھیج دیجیے۔ وہ ان کے ساتھ جیسا سلوک مناسب سمجھیں گے، کریں گے۔''

شہزادہ بہت زیادہ برہم ہو گیا، بولا۔ ''احمد خان! مجھے بچوں کی طرح سبق نہ پڑھا، میں شہزادہ ہوں، ولی عہد ہوں

www.PakiBooks.Site

اور مجھے اپنے باپ نادر شاہ کی طرف سے اتنا اختیار حاصل ہے کہ جس کو جو سزا چاہوں، دوں اور جس کو معاف کرنا چاہوں، معاف کردوں۔''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''شہزادے! معلوم نہیں کیوں، آپ میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، آپ ابھی صرف ولی عہد ہیں حکومت اور اختیار آپ کے والد کے ہاتھ میں ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ یہ بات کبھی بھی پسند نہیں کریں گے کہ آپ ان کے دشمنوں اور غداروں کے معاملات خود طے کرنے لگیں۔''

شہزادے نے کہا۔ ''احمد خان! اب تو جاسکتا ہے۔ میں کیا کررہا ہوں اور میرا باپ کیا کرے گا یہ ہم دونوں کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ خوامخواہ تو ان میں کیوں پڑتا ہے، جا اپنے کام کر، ان فضول جھگڑوں میں نہ پڑ۔''

احمد خان ہم سب کے ساتھ شہزادے کے خیمے سے باہر نکلنے لگا تو شہزادے نے ایک بار پھر ہم سب کو متنبہ کیا، کہا۔ ''دیکھو تم لوگ اپنی جانیں بچا کے یہاں سے جاتو رہے ہو مگر خبردار! ان کا تعاقب نہ کرنا جنہیں میں نے چھوڑ دیا ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میرے سپاہی تمہیں جہنم رسید کردیں گے۔''

احمد خان افسردہ اور دل برداشتہ شہزادے کے خیمے سے باہر نکلا۔ ہم سب اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جب ہم وہاں سے اپنے خیموں کی طرف جارہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ شہزادے کے آدمی ہمارا پیچھا کررہے ہیں۔

احمد خان اپنی کرسی پر سر پکڑ کے بیٹھ گیا اور بولا۔ ''ہائے کمبخت یہ تو نے کیا کیا۔ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری، توبہ توبہ.....'' پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''اور دیکھ خواجک! تو ابھی بالکل ناتجربہ کار ہے یہ جو کچھ آج ہوا ہے تجھے پتا نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ بڑوں کی سیاست میں چھوٹے کیوں پڑیں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ابدالی سردار! میں کوئی بھی قدم آپ کی اجازت اور منظوری کے بغیر کبھی بھی نہیں اٹھاؤں گا۔''

اس واقعے کے تیسرے دن چند گھڑ سوار ہمارے خیموں کے درمیان آکے رکے۔ وہ نادر شاہ کے پاس سے ایک خاص پیغام لے کر آئے تھے اس فرمان میں یہ لکھا گیا تھا۔ ''احمد خان! تیری موجودگی میں باغیوں کو کس طرح رہا گیا؟ اب تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً میرے پاس چلا آ۔''

ان چند سطروں کے علاوہ اس میں کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔

نادر شاہ کے آدمی احمد خان کے خیمے سے نکل کر شہزادے کے خیمے میں داخل ہو گئے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ نادر شاہ نے اسے کیا لکھا تھا لیکن اسی وقت شہزادے کا ایک آدمی احمد خان کے پاس آیا اور کہا۔ ''سردار! ولی عہد بہادر آپ سے ملنا چاہتے ہیں آپ اسی وقت میرے ساتھ تشریف لے چلیں۔''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''آجاؤں گا جب فرصت ہوگی ضرور آجاؤں گا۔''

آدمی نے کہا۔ ''نہیں جناب! آپ کو اسی وقت چلنا ہے۔''

احمد خان نے کہا۔ ''تب پھر میں ایک شرط پر ابھی تیرے ساتھ چل سکتا ہوں۔''

اس آدمی نے کہا۔ ''سردار! آپ کو شہزادے نے یاد فرمایا ہے۔ یہ آپ شرط وغیرہ کی کیا بات کررہے ہیں؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''میرے پاس نادر شاہ ظل اللہ تعالیٰ کا فرمان طلبی آچکا ہے اس میں لکھا ہے کہ میں جس حال میں بھی ہوں اسی میں فوراً چلا آؤں۔ اس فرمان کی موجودگی میں شہزادے کا فرمان کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔''

شہزادے کے آدمی نے پوچھا۔ ''پھر میں شہزادے سے کیا کہہ دوں؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''یہ کہ میں شہزادے کے پاس تنہا نہیں آسکتا اپنے آدمیوں کے ساتھ مسلح آسکتا ہوں وہ بھی ذرا سی دیر کے لیے۔''

وہ شخص واپس چلا گیا اور جب کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس اجازت نامے کے ساتھ کہ احمد خان ذرا سی دیر کے لیے اپنے مسلح ساتھیوں سمیت آسکتا ہے۔

احمد خان نے ہمیں اپنے ساتھ لیا اور شہزادے کے پاس روانہ ہوگیا۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ شہزادہ اپنے خیمے کے در پر کھڑا ہمارا انتظار کررہا تھا۔ اس نے احمد خان کو چند قدم چل کر خوش آمدید کہا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''معزز سردار احمد خان! کیا آپ مجھ سے خفا ہیں؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''میں شہزادے سے کیوں خفا ہونے لگا۔ فی الحال تو آپ یہ فرمائیں کہ مجھے کیوں یاد فرمایا گیا ہے؟''

www.PakiBooks.Site

شہزادے نے نادر شاہ کا فرمان احمد خان کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں لکھا تھا۔ ''شہزادے کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ جہاں اور جس حال میں ہو میری خدمت میں حاضری دے تاکہ میں اسے بتاؤں کہ جہانبانی کسے کہتے ہیں۔''

احمد خان نے نادری فرمان پڑھ کے پوچھا۔ ''تو کیا سوچا آپ نے؟''

شہزادے نے جواب دیا۔ ''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ یہ تو فرمان طلبی ہے اس میں کسی بات کی گنجائش ہی کہاں۔''

احمد خان نے پوچھا۔ ''پھر آپ نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے؟''

شہزادے نے جواب دیا۔ ''یہ جاننے کے لیے کہ اس فرمان کے پیچھے کیا ہوسکتا ہے؟''

احمد خان نے کہا۔ ''میں کیا بتا سکتا ہوں جس طرح آپ کو بلایا گیا ہے اسی طرح مجھے بھی حاضری کا حکم دیا گیا ہے۔''

شہزادہ بہت پریشان نظر آرہا تھا اس نے کہا۔ ''میں نے چند باغیوں اور سرکشوں کو چھوڑ دیا تھا کیا یہ طلبی اسی سلسلے کی تو نہیں؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''شہزادے! مجھے بھی تو طلب کیا گیا ہے۔''

شہزادے نے پوچھا۔ ''احمد خان! تو بہت سمجھ دار انسان ہے، میرا باپ تیری سمجھ داری کا قائل ہے، اس وقت میں نے تجھے اس لیے بلایا ہے کہ تو اس فرمان کی روشنی میں مجھے یہ مشورہ دے کہ میں اس کی تعمیل کروں یا نہ کروں۔''

احمد خان کے کان کھڑے ہو گئے، پوچھا۔ ''شہزادے! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

شہزادے نے کہا۔ ''احمد خان! اگر تیرے دل میں ایمان ہے اور خدا نے تجھے عقل کی روشنی دی ہے تو تو خود بھی تسلیم کرے گا کہ خون خرابہ اچھی بات نہیں ہے۔ انسانی نسل کشی کہاں کی انسانیت ہے۔ میرا باپ نادر شاہ انسانی سروں سے جس قصر شاہی کی تعمیر کررہا ہے وہ کتنے دنوں تک کھڑا رہے گا۔ کیا ظلم اور بربریت کی بنیاد پر استوار مملکت تادیر زمانے کے سرد و گرم موسموں کا مقابلہ کرسکتی ہے؟ میں نے باغیوں اور سرکشوں کو اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ میرے عفو و کرم کے بار تلے دب کر نفرت اور سرکشی سے باز آجائیں۔''

احمد خان نے پوچھا۔ ''شہزادے! اس طرح آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

شہزادے نے جواب دیا۔ ''میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر میرا وہ عمل میرے باپ کی نظر میں اچھا نہیں ٹھہرتا تو وہ مجھ سے برہم ہوگا اور میرے باپ کی برہمی کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے اس سے ہم آپ بھی واقف ہیں۔ اگر آپ مشورہ دیں تو میں باپ کے پاس جانے کے بجائے راہ فرار اختیار کروں۔''

احمد خان نے کہا۔ ''شہزادے! معلوم نہیں اس طرح آپ خود سوچتے ہیں یا کوئی اور آپ کو اس طرح اپنی سوچ اپنی فکر دے رہا ہے۔ بہرحال آپ نے ایک غلطی کی ہے سرکشوں اور باغیوں کو چھوڑ کر اب دوسری بدترین غلطی یہ کریں گے کہ باپ کا حکم نہیں مانیں گے اور راہ فرار اختیار کریں گے، اگر آپ نے ایسا کیا بھی تو کیا اس طرح آپ اپنے باپ کے لمبے ہاتھوں سے محفوظ رہیں گے۔''

شہزادے نے کہا۔ ''میں بھاگ کر کہیں دور چلا جاؤں گا۔ اتنی دور جہاں میرے باپ کے لمبے ہاتھ بھی نہ پہنچ سکیں۔''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''شہزادے! میں اس مشورے میں آپ کا ساتھ نہیں دوں گا۔ آپ کا انداز فکر غلط ہے۔ اگر آپ نے اپنی اس سوچ کو نہیں بدلا تو میں یہ جانتا ہوں کہ اس کا انجام بہت برا ہوگا، نادر شاہی ہاتھ اس وقت بھی آپ کے آس پاس کہیں موجود ضرور ہوں گے۔''

شہزادے نے تھکے ہوئے مسافر کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا اور عالم یاس میں کہا۔ ''حفظ ماتقدم کے طور پر مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

احمد خان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''پھر مجھے اجازت دیجیے کیونکہ میں آپ کی باغیانہ سوچ کا گواہ نہیں بننا چاہتا۔''

شہزادے نے خود بھی کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''تو جاسکتا ہے۔''

احمد خان وہاں سے نکل کر اپنے خیموں میں پہنچا اور حکم دیا کہ خیموں کو اکھاڑ کر چھکڑوں، گدھوں اور اونٹوں پر بار کیا جائے۔ وہ تیزی سے قاضی قوموخ کی طرف روانہ ہوگیا۔ کئی دن بعد اسے نادری سپاہ کے خیمے نظر آنے لگے۔ اونچے نیچے راستوں کو طے کرتا ہوا وہ قاضی قوموخ کے کنارے نادری سپاہ کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ اس نے یہیں سے ایک

www.PakiBooks.Site

مینارہ دیکھا جو انسانی سروں سے بنایا گیا تھا۔ کشتیوں اور لکڑی اور رسوں کے پلوں کے ذریعے احمد خان کی فوج نے دریا پار کیا۔ یہاں نادر شاہ اپنے خیمے میں احمد خان اور شہزادے کا بڑی بے چینی سے انتظار کررہا تھا۔ نادری خیمے کے چاروں طرف افغان سپاہ کا پہرہ تھا۔ نادر شاہ کو احمد خان کی آمد سے مطلع کیا گیا۔ اس نے فوراً ہی طلب کرلیا۔

میں احمد خان کے ہم قوم ہونے کی وجہ سے اس سے بہت قریب ہوگیا تھا۔ میں نادر شاہ کو قریب سے بار بار دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ میری اس خواہش کے پیشِ نظر احمد خان مجھے نادر شاہ کے پاس لے گیا تھا۔

نادر شاہ نے مجھے احمد خان کے ساتھ جو دیکھا تو طنزاً پوچھا۔ ''یہ کسی کام کا بھی ہے یا محض نیچ کا کام دے رہا ہے۔''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''بندہ پرور! یہ میری ہی قوم کا ایک نوجوان ہے۔ وفاداری اور جاں نثاری اس کا طرۂ امتیاز ہے، اس لیے میں اس کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔''

نادر شاہ نے کہا۔ ''سنتا ہوں اس کا باپ باغر خان بھی جنگ جو انسان ہے، اس کو بلوایا جائے تاکہ اس کو بھی کوئی شایانِ شان خدمت سپرد کی جائے۔''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کا ایک ہاتھ کسی جنگ میں کام آچکا ہے، کیا ایک ہاتھ کا انسان ہمارے لیے کارآمد ہوسکتا ہے؟ بس یہی سوچ کر میں خاموش ہو جاتا ہوں۔''

نادر شاہ اس رسمی بات چیت سے اکتا گیا اور اپنے اصل موضوع پر آگیا، پوچھا۔ ''احمد خان! شہزادہ رضا قلی مرزا کہاں ہے؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''جب تک میں وہاں رہا شہزادہ وہاں سے چلا نہیں تھا۔''

نادر شاہ نے برہمی سے کہا۔ ''لیکن میں نے تو اپنے فرمان میں لکھا تھا کہ وہ جس حال میں اور جہاں بھی ہو فوراً چلا آئے۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر۔ ایک ہی جیسا فرمان جو تیرے لیے تھا وہی شہزادے کے لیے بھی تھا پھر اسے آنے میں تاخیر کیوں ہوئی؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''اس کا سچا جواب تو شہزادہ ہی دے گا۔''

نادر شاہ نے کھڑے ہو کر ٹہلتے ہوئے اپنی آنکھیں احمد خان کے چہرے پر گاڑ دیں، پوچھا۔ ''احمد خان! بات کیا ہے؟ کہیں تو ہم سے کچھ چھپا تو نہیں رہا؟ معاملہ کیا ہے؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''شہزادہ عنقریب آپ کی خدمت میں پیش ہونے والا ہے، آپ جو کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں شہزادے ہی سے معلوم کرلیجیے گا۔''

نادر شاہ نے پوچھا۔ ''کیا تو مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے آخر تو یہ چبا چبا کر باتیں کیوں کررہا ہے؟''

احمد خان نے جلدی جلدی کہا۔ ''میں چبا چبا کر کوئی بات نہیں کررہا۔ بندہ پرور کو شبہ ہوا ہوگا۔''

نادر شاہ نے پوچھا۔ ''شہزادے سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی تیری؟''

اب احمد خان سچ بولنے پر مجبور ہوگیا تھا، جواب دیا۔ ''آنے سے پہلے میں شہزادے سے ملا تھا۔''

نادر شاہ نے پوچھا۔ ''اس نے یہاں آنے کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟''

احمد خان نے مجبوراً ساری بات چیت نادر شاہ کو بتا دی اور کہا۔ ''بندہ پرور! یہ ناچیز آخر وقت تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ شہزادے کے پیچھے کون کارفرما ہے کیونکہ شہزادہ اتنی باتیں نہیں کرسکتا۔''

نادر شاہ نے مزید سوال کیا۔ ''اور وہ بیعت اور عہد وفاداری والی بات کیا تھی؟''

احمد خان نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا تھا نادر شاہ کے روبرو بیان کردیا۔ نادر شاہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہورہا تھا۔

دوسرے دن صبح نادر شاہ نے احمد خان اور دوسرے افغان سرداروں سے کہا۔ ''آیئے حضرات میں آپ کو بھی چند تماشے دکھاؤں۔''

نادر شاہ اپنے خیمے سے نکل کر سروں والے مینار کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ہم سب بھی اس ہیبت ناک مینارے کو دیکھنے لگے۔

نادر شاہ نے چند سروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''احمد خان کیا تو ان چہروں کو پہچان سکتا ہے؟''

میں نے بھی ان چہروں کو غور سے دیکھا اور فوراً ہی پہچان لیا۔ یہ ان کے سرتھے جنہیں شہزادے نے معاف کردیا تھا۔ دریائے آمدی کے آس پاس کے سرکشوں کے سر۔ احمد خان نے بھی انہیں پہچان لیا۔ اس نے کہا۔ ''ظلِ اللہ! یہ تو وہی لوگ ہیں جنہیں شہزادے نے معاف کردیا تھا اور

www.PakiBooks.Site

شہزادے نے انہی سے بیعت لی تھی اور آزاد کردیا تھا۔''

نادر شاہ نے کہا۔ ''رضا قلی مرزا یہ نہیں جانتا تھا کہ میرے ہاتھ غیر معمولی لمبے ہیں۔ میرے کان ہزاروں میل دور ہونے والی باتیں سن سکتے ہیں۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ میں خدا نہیں لیکن خدائی صفات ضرور رکھتا ہوں۔''

احمد خان نے دبی زبان میں پوچھا۔ ''اور حضور والا! شہزادہ ابھی تک نہیں آیا؟ کیوں؟''

نادر شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دیر تک ہمارے ساتھ اِدھر اُدھر چلتا پھرتا رہا، یہاں تک کہ وہ خیموں سے الگ ایک سیاہ رنگ کے خیمے میں داخل ہوا۔ یہ خیمہ بے ڈھنگا اور بے تکا سا لگ رہا تھا۔ نادر شاہ نے اس میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''شہزادہ مجھ سے کہاں بھاگ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تو یہی تھا کہ میری دسترس سے کہیں دور چلا جائے لیکن وہ اس میں ناکام رہا۔ احمد خان! میں اس دور میں بنی نوع انسان کے لیے قہر خداوندی بن کر آیا ہوں۔ میں نے فرار ہوتے ہوئے ولی عہد کو گرفتار کرلیا تھا۔ اس وقت شہزادہ رضا قلی مرزا میری قید میں ہے۔''

اس خیمے میں نادر شاہ کے لیے بہترین نشست گاہ بنی ہوئی تھی۔ وہ اس پر بیٹھ گیا۔ احمد خان کو اپنے سامنے بٹھایا اور ہم مؤدبانہ ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ یہاں نادر شاہ نے حکم دیا کہ شہزادہ رضا قلی مرزا کو حاضر کیا جائے۔

کچھ دیر بعد شہزادہ پابہ زنجیر بادشاہ کے سامنے کھڑا کردیا گیا۔ شہزادے کی نظریں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔

نادر شاہ شہزادے کو گھور رہا تھا۔ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ نادر شاہ کو شہزادے سے بڑی محبت تھی لیکن اس وقت وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا کھڑا تھا۔ احمد خان نے شہزادے کو دیکھ کر نادر شاہ سے کہا۔ ''حضور والا کیا شہزادہ ولی عہد نہیں رہا؟''

نادر شاہ نے جواب دیا۔ ''کیا رضا قلی مرزا اب بھی اس لائق ہے کہ اسے میرا ولی عہد مقرر کیا جائے؟''

احمد خان چپ رہا، اس کی خاموشی نادر شاہ کو بہت گراں گزر رہی تھی۔ اس نے احمد خان کو درشت لہجے میں مخاطب کیا۔ ''احمد خان! میں کیا پوچھ رہا ہوں کیا رضا قلی مرزا میرا ولی عہد ہوسکتا ہے؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''نہیں ہرگز نہیں۔''

اب نادر شاہ نے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔ ''رضا قلی مرزا! تو میرا بیٹا ہے میں نے تجھ کو اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا مگر تو نے میرے اعتماد، میری محبت اور میرے اعتبار کو خاک میں ملا دیا۔ بتا کیا تجھ کو یہ زیب دیتا تھا جو کچھ تو نے کیا؟''

شہزادہ بدستور نظریں جھکائے ہوئے تھا۔

نادر شاہ نے احمد خان سے کہا۔ ''میں شہزادے پر مقدمہ چلانا چاہتا ہوں اور اس مقدمے کا سب سے اہم، پہلا اور آخری گواہ تو ہے۔''

احمد خان نے بے چینی سے ایک بار پھر شہزادے کی طرف دیکھا لیکن شہزادہ بدستور گردن جھکائے ہوئے تھا۔

نادر شاہ نے شہزادے سے کہا۔ ''رضا قلی مرزا! بتا تو نے نادری غداروں اور سرکشوں کو کیوں چھوڑ دیا تھا اور یہ کہ تو نے ان سے کس قسم کی بیعت لی تھی؟''

شہزادہ بدستور خاموش رہا۔

نادر شاہ نے چیخ کر کہا۔ ''رضا قلی مرزا! تیری خاموشی تجھ کو مجرم قرار دے رہی ہے۔ میری باتوں کے جواب کیوں نہیں دیتا؟''

جب شہزادہ کسی طرح بھی جواب دینے پر تیار نہ ہوا تو نادر شاہ نے احمد خان سے کہا۔ ''احمد خان! اب میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ بتا ان قیدیوں سے شہزادے کی کیا باتیں ہوئی تھیں؟''

احمد خان نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور شہزادے کو مخاطب کر کے بطور خاص کہا۔ ''شہزادے! کیا میں نے آپ کو منع نہیں کیا تھا کہ آپ باغیوں اور سرکشوں کو معاف نہ کریں، کیا میں نے آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ شہزادے! آپ ان سے کس قسم کی بیعت لے رہے ہیں۔ آپ ایسا کوئی کام نہ کریں جس سے شکوک پیدا ہوں، شبہات گھر بنالیں۔ کیا میں نے آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ ظلِ اللہ کے ہاتھ بہت لمبے ہیں آپ ان سے بھاگ نہیں سکتے۔ کیا میں نے آپ کو نہیں سمجھایا تھا کہ آپ نادری فرمان کی تعمیل سے بھاگیں نہیں۔''

شہزادہ خاموش کھڑا تھا۔

نادر شاہ نے احمد خان سے کہا۔ ''احمد خان! تو نے شہزادے کی وہ بات نہیں بتائی جس میں شہزادے نے میرے کارناموں کو سفّاکی قرار دیا تھا اور میری شمشیر زنی اور شجاعت کو خون خرابے سے تعبیر کیا تھا۔ کیا شہزادے نے غداروں اور سرکشوں سے یہ نہیں کہا تھا کہ جب وہ برسرِ اقتدار آجائے گا تو دلوں پر محبت اور حسنِ سلوک سے حکومت

www.PakiBooks.Site

کرے گا۔ نفرت اور تلوار کو نیست و نابود کر دے گا۔''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''کہا تھا، ظل اللہ کہا تھا۔''

نادر شاہ نے بیٹے سے پوچھا۔ ''رضا قلی مرزا تجھ کو کچھ کہنا ہے؟''

شہزادے نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ''میں اپنی کوتاہیوں اور نادانیوں پر شرمندہ ہوں مجھے معاف کر دیا جائے گا۔''

نادر شاہ نے شہزادے کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا۔ ''رضا قلی مرزا! کیا تیرے جرائم ایسے ہیں کہ تجھے معاف کر دیا جائے؟''

شہزادے نے احمد خان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''معزز سردار! آپ میری سفارش کر دیں، شاید آپ کی سفارش پر مجھے معافی مل جائے۔''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں نے آپ کو بہت سمجھایا تھا۔ اب میں آپ کے والد کو نہیں سمجھا سکتا کیونکہ آپ کے والد ہم سب سے زیادہ سمجھ دار منصف اور عقیل و فہیم ہیں۔''

نادر شاہ نے دونوں کو درشت لہجے میں منع کیا۔ ''اب معاملات افہام و تفہیم سے گزر کر فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں، بس فیصلہ سنانا باقی ہے۔''

نادر شاہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ شہزادہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ نادر شاہ نے تالی بجائی ایک تنومند شخص اندر داخل ہو گیا نادر شاہ نے حکم دیا۔ ''قادر خان جلاد کو حاضر کیا جائے۔''

جب قادر خان جلاد آ گیا تو رضا قلی مرزا بلک بلک کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ ''باوا جان! رحم ایک بار معاف کر دیجیے۔''

نادر شاہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''رضا قلی مرزا کی دونوں آنکھیں نکال کر اس کے دونوں ہاتھوں پر رکھ دی جائیں اور اسے قید خانے میں ڈال دیا جائے۔''

شہزادے کی چیخ نکل گئی اور احمد خان روہانسا ہو گیا۔

قادر خان جلاد نے دو آدمیوں کی مدد سے شہزادے کو پکڑ لیا اور ایک دوسرے خیمے میں لے گیا۔

نادر شاہ نے احمد خان کو حکم دیا۔ ''احمد خان! یہ تیرا کام ہے کہ تو فیصلے پر بخیر و خوبی عمل کرائے اور یہ کہ اس سے مجھے مطلع کرے۔''

احمد خان اور اس کے پیچھے ہم لوگ قادر خان کے پاس پہنچے۔ شہزادہ ہاتھ جوڑ کر قادر خان سے معافی مانگ رہا تھا۔

قادر خان نے کہا۔ ''شہزادے! میں حکم کا غلام ہوں، میں آپ کو معاف نہیں کر سکتا۔''

شہزادے نے احمد خان کی طرف دیکھا۔ ''سردار احمد خان آپ ہی میری مدد کریں۔''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''شہزادے! میں بھی مجبور ہوں میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔''

شہزادے کے سامنے ہی دو سلاخیں آگ پر سرخ کی جا رہی تھیں۔ شہزادہ اس طرف دیکھتا اور خوف سے آنکھیں بند کر لیتا۔

جب دونوں سلاخیں گرم ہو گئیں تو قادر خان نے اسے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ شہزادے کو پچھاڑ دیا جائے دونوں تنومند آدمیوں نے شہزادے کو پچھاڑ دیا اور اس کے ہاتھوں کو دبا کر بیٹھ گئے۔ شہزادہ اب بھی روئے جا رہا تھا۔

قادر خان نے شہزادے کے منہ پر لاتیں رکھ دیں اور سرخ سلاخیں نہایت بے رحمی سے آنکھوں میں گھسیڑ دیں۔ شہزادے کی فلک شگاف چیخ دور دور تک سنی گئی ہو گی پھر شہزادہ بے ہوش ہو گیا۔

اس منظر نے میرا جو حال کیا وہ ناقابل بیان ہے۔ میں سوچ رہا تھا یہ نادر شاہ کیسا آدمی ہے جو اپنے چہیتے بیٹے سے ایسا سلوک کر گزرا۔

کچھ دیر بعد ہم لوگ پھر نادر شاہ کے دربار میں پہنچ گئے۔ اس وقت نادر شاہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ احمد خان کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا، احمد خان کام ہو گیا؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''جی بندہ پرور کام ہو گیا۔''

نادر شاہ اچانک رکا اور پھر پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پوچھا۔ ''احمد خان! جب اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھیری جانے والی تھیں، اس وقت وہ تجھ سے مدد تو مانگ ہی رہا ہو گا؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''جی بندہ پرور، وہ مجھ سے مدد مانگ رہا تھا لیکن میں اس کی کیا مدد کر سکتا تھا۔''

نادر شاہ نے کہا۔ ''احمد خان! وہ میرا بیٹا ہے اور میں نے اس کو اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا۔ پھر یہ تو اس کے ساتھ ''مانگ رہا تھا اور'' اس کی کیا مدد کر سکتا تھا جیسے کمتر درجے کے الفاظ کیوں استعمال کر رہا ہے۔''

www.PakiBooks.Site

احمد خان نے کہا۔ ''ظل اللہ غلطی ہوئی معافی کا خواستگار ہوں۔''

میں نے دیکھا۔ نادر شاہ اب نڈھال ہوتا جا رہا تھا، اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں اور کہا۔ ''احمد خان! میں نے جو کچھ کیا وہ اچھا ہے یا برا، کچھ تو ہی بتا، میری سمجھ میں تو کوئی بات آ نہیں رہی ہے۔''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''بندہ پرور! جو کچھ ہو چکا ہے اب اس کے بارے میں یہ سوچنا کہ اچھا ہوا یا برا، فضول ہے۔''

نادر شاہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا، اس نے احمد خان سے پوچھا۔ ''احمد خان! تو ہی بتا میں نے رضا قلی مرزا کو کتنا چاہا ہے، کتنی محبت کی ہے، میں نے اس کو ماں کا پیار دیا، باپ کی شفقت دی اور اس نے اس کا یہ صلہ دیا کہ میرے خلاف سازشیں کرنے لگا۔ اس کو ایسا نہیں کرنا تھا۔''

احمد خان خاموش کھڑا سنتا رہا۔

نادر شاہ کہتا رہا۔ ''اس نے بہت برا کیا احمد خان بہت برا کیا، اب کیے کی سزا زندگی بھر بھگتتا رہے گا۔''

احمد خان یہاں بول بھی کیا سکتا تھا۔ چپ چاپ کھڑا سن رہا تھا۔

کچھ دیر بعد نادر شاہ نے پوچھا۔ ''احمد خان تو نے سرکاری کاغذات میں اپنا کیا نام لکھوایا ہے؟''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''احمد خان ابدالی۔''

نادر شاہ نے کہا۔ ''لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں تو آئندہ میرے بعد اس خان کے بجائے احمد شاہ ہو جائے گا۔''

احمد خان کانپ رہا تھا، بولا۔ ''بندہ پرور! اگر آپ مجھے سزا دینا چاہتے ہیں تو دے دیجیے مگر ایسی بات نہ کیجیے جو میرے لیے نامناسب ہو اور آپ کے لیے وجہ رشک و حسد۔''

نادر شاہ نے کہا۔ ''احمد خان! پہلے میری بات سن لے اگر تو احمد شاہ ہو جائے تو میرے بیٹوں کا خیال رکھنا کیونکہ میرے بیٹے زیادہ چالاک اور باصلاحیت نہیں ہیں، میں ان کی طرف سے بے حد فکر مند رہتا ہوں۔''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''اور میں یہ دعا مانگ رہا ہوں کہ خدا ہمیشہ مجھے آپ کے زیر سایہ رکھے۔''

نادر شاہ باتیں کرتے کرتے مشتعل ہو گیا۔ ''اور یہ ایرانی، میں ان پر ذرا بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔ میں نے سنا ہے یہ لوگ میرے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔''

احمد خان نے محسوس کیا نادر شاہ بہک رہا ہے اور شاید اس کا دماغی توازن درست نہیں رہا۔ پوچھا۔ ''یہ آپ نے کس سے سنا کہ ایرانی آپ کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں؟''

نادر شاہ نے کہا۔ ''میں نے اپنے بیٹے کی آنکھیں نکلوا دیں۔ آخر کیوں؟ اس کے پیچھے بھی ایرانیوں کی سفارش کار فرما تھی۔''

احمد خان نے محسوس کیا کہ اب نادر شاہ کو اپنی سنگین غلطی کا شدید احساس ہو رہا ہے۔

نادر شاہ دیر تک بڑبڑاتا رہا وہ ایرانیوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

☆.....☆

میں احمد خان سے مل کر ''نادر شاہ کے سراپردے'' کی طرف جا رہا تھا کیونکہ مجھے یہیں تعینات کر دیا گیا تھا۔ مجھے محمد قلی خان کے ماتحت مصلحتاً لگایا گیا تھا۔ محمد قلی خان کے محافظ دستے کے سارے سپاہی اور عہدیدار ایرانی تھے۔ دوسری طرف احمد خان بھی چار ہزار افغانوں کے لشکر کا افسر اعلیٰ تھا اور یہ لوگ بھی نادر شاہ کے محافظ تھے۔ احمد خان نے مجھے اپنے پاس سے مصلحتاً الگ کر کے محمد قلی خان کے ایرانی لشکر میں اس لیے شامل کر دیا تھا کہ میں اندر کی خبریں احمد خان کو پہنچا دیا کروں۔

جب میں سراپردے کی پہرے داری کر رہا تھا تو مجھے ایک ایرانی سپاہی نے مطلع کیا کہ صالح خان تمہیں یاد کر رہا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہیں؟''

سپاہی نے جواب دیا۔ ''میرے پیچھے پیچھے چل، میں پہنچا دوں گا۔''

مجھے صالح خان کے پاس جانے میں تامل تھا کیونکہ نادر شاہ نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ میں صالح خان سے کبھی بھی نہ ملوں لیکن اس وقت میں مجبور تھا۔ میں ایرانی سپاہی کے ساتھ محافظ سپاہ کے افسر اعلیٰ محمد قلی خان کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ اس خیمے میں محافظ سپاہ کے کئی افسر یوں سر جوڑے بیٹھے تھے جیسے وہ کسی اہم مسئلے پر غور کر رہے ہوں۔ انہی میں صالح خان بھی شامل تھا۔ میں صالح خان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ صالح خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

www.PakiBooks.Site

''خواجک! مجھے یقین تھا کہ تو یہاں ضرور آئے گا حالانکہ اس ظالم اور سفاک درندے نے تجھے سختی سے منع کیا تھا کہ تو آیندہ مجھ سے نہیں ملے گا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''آپ نے مجھے بلایا تھا میں کیوں نہ آتا کیونکہ آپ میرے محسن ہیں۔ اس وقت جہاں میں نظر آرہا ہوں آپ ہی کی بدولت۔ میں مرنا گوارا کرلوں گا مگر آپ سے ملاقات کرنا نہیں چھوڑوں گا۔''

صالح خان نے دوسروں کی طرف فخریہ دیکھا اور کہا۔ ''مجھے تجھ سے یہی اُمید تھی اور اب میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنی بیٹی زرغونہ کو تجھ سے وابستہ کردوں اور محمد قلی خان سے کہہ کر تجھے کوئی اعلیٰ عہدہ دلوادوں۔''

اس وقت میں نے خیمے میں موجود لوگوں کی طرف دیکھا۔ میں ان میں سے صرف پانچ کو پہچانتا تھا۔ محمد قلی خان، صالح خان، محمد خان قاچار، موسیٰ بیگ افشار اور خواجہ بیگ یہ سارے ہی اعلیٰ عہدے دار تھے۔

صالح خان نے مجھ سے پوچھا۔ ''خواجک! ابدالی ہونے کی وجہ سے تو نے احمد خان کا زبردست اعتماد حاصل کرلیا ہے میں چاہتا ہوں کہ تو ادھر کی خاص باتیں مجھے ضرور بتادیا کر۔''

میں نے جواب دیا۔ ''بہتر ہے میں اس پر عمل کروں گا۔''

اچانک محمد قلی خان نے مجھ سے پوچھا۔ ''خواجک! شہزادہ رضا قلی مرزا کی آنکھوں میں آتشیں سلائیاں کیوں پھیردی گئیں؟''

میں نے جواب دینے کے بجائے صالح خان کی طرف دیکھا صالح خان نے جلدی جلدی کہا۔ ''خواجک! محمد قلی خان اور میں الگ الگ نہیں ایک ہیں، یہ جو کچھ پوچھ رہے ہیں اس کا صحیح صحیح جواب دے دے۔''

میں نے صالح خان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''شہزادے نے باغیوں اور سرکشوں کو چھوڑ کر غالباً بدترین غلطی کی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے انہی باغیوں اور سرکشوں سے کسی قسم کی بیعت بھی لی تھی، اس سے نادر شاہ کو یہ شبہ ہوا کہ شہزادہ اس کے خلاف سازشیں کررہا ہے اور نادر شاہ کو ہٹا کر اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے بس اسی بدگمانی میں شہزادے کو اندھا کردیا۔''

صالح خان نے دانت پیسے اور غصے میں کہا۔ ''اس ظالم اور درندے کو میں سزا دوں گا۔ قسم ہے پاک پروردگار کی جب تک میں اس خونی کو کیفرکردار تک نہ پہنچادوں مجھ پر خواب وخورش حرام ہے۔''

میں بہت خوفزدہ تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کی ساری باتیں کسی نہ کسی طرح نادر شاہ کو معلوم ضرور ہوجاتی تھیں مجھے اپنی موت آنکھوں کے سامنے رقصاں نظر آرہی تھی میں نے کہا۔ ''میں واپس جانا چاہتا ہوں۔''

محمد قلی خان نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ''خواجک! تو جاسکتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ تو نے یہاں جو کچھ دیکھا ہے کسی کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تو نے دوطرفہ کھیل کھیلنا چاہا تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ میں تجھے قتل کردوں گا۔''

صالح خان نے میری طرف داری کی۔ ''قلی خان! اس پر شک نہ کرو میں اس کا محسن ہوں اس کے علاوہ یہ میرا ہونے والا داماد بھی تو ہے۔''

میں وہاں سے چلا آیا لیکن اس وقت میرا حال ناگفتہ تھا۔ صالح خان اور محافظ سپاہ کے اعلیٰ عہدیدار نادر شاہ کے خلاف کس قسم کی سازشیں کررہے تھے، کچھ پتا نہ تھا۔ میں دیر تک اسی پر سر کھپاتا رہا مگر ناکام رہا، کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

نادر شاہ نے قاضی تو موخ سے یزد کا رخ کیا۔ وہ بہت غضبناک اور پاگل ہورہا تھا لیکن احمد خان اور اس کی سپاہ پر بہت زیادہ مہربان تھا۔ احمد خان کو یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ میں صالح خان کی خواہش پر اس سے ملنے گیا تھا اور یہ بات بھی اس کے علم میں آچکی تھی کہ میں صالح خان سے جس خیمے میں ملا تھا وہاں ایرانی محافظ دستے کے کئی اور عہدے دار بھی تھے، احمد خان نے مجھے متنبہ کیا۔ ''خواجک! اگر اس کا علم نادر شاہ کو ہوگیا تو وہ تجھے ہلاک کرادے گا۔ آیندہ احتیاط کرنا۔''

میں نے اپنے آس پاس دیکھ کر عرض کیا۔ ''سردار! مجھے کسی اور جگہ لگوادیجیے میں اس جگہ خود کو خطرے میں محسوس کررہا ہوں۔''

احمد خان نے کہا۔ ''وہاں تجھے کسی مقصد سے لگایا گیا ہے اگر تو ترقی چاہتا ہے تو تجھے اسی جگہ رہنا چاہیے اور وہاں جو کچھ ہورہا ہے ہمیں اس سے باخبر کرنا چاہیے۔''

میں نے عرض کیا۔ ''سردار! یہ کام بہت نازک اور خطرناک ہے۔ صالح خان اور محمد قلی خان بھی مجھ سے یہی چاہتے ہیں۔''

www.PakiBooks.Site

احمد خان نے کہا۔ ''یہ تو بڑی اچھی بات ہے انہیں تجھ پر اعتبار ہے۔ اب تجھے کسی طرح یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لوگ کس قسم کی سازش کررہے ہیں اور اس سازش سے ان کا مقصد کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بہرحال! یہ بات تو طے ہے کہ اس سازش کا روح رواں صالح خان ہے اور اس کے بعد ایرانی سپاہ کا افسر اعلیٰ محمد قلی خان ہے اور سازش نادر شاہ کے خلاف ہورہی ہے۔''

احمد خان نے کہا۔ ''بہرحال اس کا علاج کرلیا جائے اور میں خود نادر شاہ کو اس سے مطلع کردوں گا۔''

میں احمد خان اور صالح خان کا اپنے دل میں موازنہ کرنے لگا، اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ ان دونوں میں سے میرے لیے کون زیادہ مفید اور کارآمد ہے تو اس میں احمد خان کا نام نکلا۔ میرا دل پہلے بھی احمد خان ہی کے ساتھ تھا۔

یزد میں نادر شاہ نے اس شبے میں کہ اس کے خلاف کہیں کوئی سازش کی جارہی ہے۔ محافظ ایرانی سپاہ کے کئی ہزار آدمی قتل کرادیے اور ان کے سروں کا ایک مینارہ کھڑا کیا۔ اس کے بعد نادر شاہ نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ اس مینارے کو غور سے دیکھو اور عبرت پکڑو۔ جس کسی نے بھی اس کے خلاف کوئی سازش کی اسے اسی طرح قتل کردیا جائے گا۔

مجھے حکم دیا گیا کہ میں اندھے شہزادے کو اس مینارے کے چاروں طرف گھما پھرا کر یہ بتاؤں کہ مینارہ کتنا بلند ہے اور اس میں کتنے آدمیوں کے سر کاٹ کر لگائے گئے ہیں اور یہ بھی کہ ان میں عام سپاہیوں کے سر کتنے ہیں اور افسروں کے کتنے۔ میں نے اس حکم کی تعمیل کی اور شہزادہ رضا قلی مرزا کا ہاتھ پکڑ کے اس مینارے کی طرف لے چلا۔ شہزادے کی کورآنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور اس نے مجھے منع کیا، کہا۔ ''میں اس مینارے کی بابت کچھ بھی نہیں جاننا چاہتا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''شہزادے! میں مجبور ہوں، مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے، آپ انکار نہ کریں۔''

شہزادے نے کہا۔ ''تیرا نام کیا ہے؟ شاید خواجک۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جی شہزادے۔''

شہزادے نے کہا۔ ''خواجک! تو ابدالی سردار سے کہہ کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوچکا ہے کیا اس سے اس کی سیری نہیں ہوئی۔ وہ مجھے نادر شاہ سے کہہ کر قتل کیوں نہیں کرا دیتا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''شہزادے! آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ اس میں ابدالی سردار کا کوئی ہاتھ نہیں، آپ کو یہ غلط فہمی دور کردینی چاہیے۔''

شہزادہ اب نڈر ہوچکا تھا بولا۔ ''چلو یہی سہی تو تو میرے ظالم باپ نادر شاہ سے کہہ دے کہ وہ مجھے قتل کردے، میں اس مینارے کے آس پاس نہیں گھوموں گا۔''

میں نے خوشامد کی۔ ''شہزادے! آپ ضد نہ کریں، شاید آپ کو یہ نہیں معلوم کہ نادری حکم قضائے مبرم کی طرح ہے، آپ نے ماضی میں بھی اپنے باپ کو نہیں پہچانا تھا اور اب پھر وہی کررہے ہیں۔''

شہزادہ چیخنے لگا۔ ''اس ظلم کو تمہیں لوگوں نے پہچانا ہے میں کیوں پہچانوں گا اسے، حالانکہ وہ میرا باپ ہے، میں اس کا حکم نہیں مانوں گا اور وہ اس جرم میں زیادہ سے زیادہ یہی تو کرسکتا ہے کہ مجھے قتل کرادے چنانچہ میں زندگی سے بیزار چاہتا بھی یہی ہوں۔ میں خود ہی مرجانا چاہتا ہوں۔''

شہزادے کی چیخ پکار نے لوگوں کو اس کے پاس اکٹھا کردیا۔ میں نے ایک بار پھر شہزادے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''شہزادے! یہ آپ کا خام خیال ہے کہ اب آپ کو جو بری سزا دی جاسکتی ہے وہ موت ہے۔ میرے خیال میں موت آسان ترین سزا ہے، معمولی سزا۔ موت سے زیادہ خطرناک اور سنگین سزائیں بھی موجود ہیں۔ آپ ضد نہ کریں اور میرے ساتھ اس مینارے کے چاروں طرف گھومتے پھرتے رہیں۔''

شہزادے نے پوچھا۔ ''اس سے میرے ظالم باپ نادر شاہ کا مقصد کیا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''یہ کہ لوگ اس سروں کے مینارے اور آپ کو دیکھیں تو عبرت حاصل کریں اور شاہ کے خلاف سوچنا اور بغاوت کرنا چھوڑ دیں۔''

شہزادے نے کہا۔ ''تب پھر نادر شاہ یہ مقصد سروں کے اس مینارے سے حاصل کرے۔ میں اسے یہ مقصد نہیں حاصل کرنے دوں گا۔''

اس دوران جو لوگ وہاں اکٹھے ہوچکے تھے اور انہیں اصل واقعہ بھی معلوم ہوگیا تھا انہیں شہزادے سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ ان میں کچھ تو سپاہی تھے بقیہ یزد کے عوام۔ کسی شریر نے شہزادے سے ہمدردی ظاہر کی اور مجھ سے کہا۔

www.PakiBooks.Site

''ظالم انسان! کیوں پریشان کررہا ہے شہزادے کو؟ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔''

مجھ کو اس ہمدردی کا نتیجہ معلوم تھا، میں نے ہجوم سے کہا۔ ''آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں اور کسی معاملے میں دخل نہ دیں ورنہ آپ کا بھی اچھا انجام نہیں ہوگا۔''

اتنے میں نادر شاہ کے پاس سے میرے نام پر حکم آگیا کہ اگر شہزادہ بخوشی مینار کے آس پاس نہیں گھومتا تو اسے زبردستی گھسیٹ کر گھمایا پھرایا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام میں تنہا انجام نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے شہزادے کو مطلع کیا کہ شہزادے اب بھی وقت ہے ورنہ نادری حکم آچکا ہے کہ اگر آپ اپنی مرضی سے شاہی حکم پر عمل نہیں کرتے تو چند سپاہی آپ کو مینارے کے چاروں طرف گھسیٹتے پھریں گے۔

شاید شہزادے کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ تماشائیوں کے ہجوم میں اس کے خاصی حمایتی موجود ہیں۔ ان نادیدہ حمایتیوں کے بل بوتے پر وہ اور زیادہ اکڑ گیا۔ بولا۔ ''تم لوگ جو چاہو کرو مگر میں اپنی خوشی سے نادر شاہ کا منشا نہیں پورا ہونے دوں گا۔''

نادری سپاہ کے دو سپاہیوں نے شہزادے کو بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کردیا اور مجھے یہ حکم ملا کہ تماشائیوں کو شہزادے کی بابت یہ بتاتا رہوں کہ وہ اس حال کو کیوں پہنچا۔

میں نادری حکم سے مجبور تھا اور میں نے تماشائیوں کو مختصراً یہ بتادیا کہ یہ نابینا شخص شہزادہ ہے اعلیٰ حضرت نادر شاہ اعلیٰ مقامہ، کا فرزند، ولی عہد، لیکن اس کو اس کی غداری اور سازشی طبیعت نے اس حال کو پہنچا دیا اور بادشاہ سلامت ہر غدار اور سازشی کو ایسی ہی سزائیں دیتے ہیں۔

دونوں سپاہی نہایت بے رحمی سے شہزادے کو گھسیٹ رہے تھے اور شہزادہ چیخیں مار مار کر رو بھی رہا تھا اور اپنے آپ کو برا بھلا بھی کہہ رہا تھا۔ اس کے پنجے اور ایڑیاں لہولہان ہو گئیں۔

پھر اسے ایک جگہ کھڑا کردیا گیا اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں ان تماشائیوں کے سامنے اس کا تعارف کراؤں چنانچہ میں نے بولنا شروع کردیا۔

''صاحبان! یہ اندھا جوان شہزادہ رضا قلی مرزا اعلیٰ حضرت نادر شاہ اعلیٰ مقامہ کا بیٹا ہے، یہ ولی عہد بھی رہ چکا ہے پھر اس نے اپنی حد سے تجاوز کیا، غداروں اور سازشیوں کو معاف کیا، ان سے اپنے حق میں بیعت لی۔ اعلیٰ حضرت کو ظالم اور سفاک کہا اور کوشش کی کہ اعلیٰ حضرت کو ہلاک کر کے خود اقتدار سنبھال لے مگر اس سے پہلے ہی یہ پکڑا گیا اور کیفر کردار کو پہنچا۔''

تماشائیوں کو اب سپاہیوں کے مینارے سے زیادہ شہزادے سے دلچسپی ہوگئی تھی، انہوں نے ہمیں شہزادے سمیت چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میں نے محسوس کیا ہجوم کے ارادے اچھے نہیں۔

ایک نوجوان نے مجھے گالی دی اور کہا۔ ''او ضمیر فروش! خدا کے غضب سے ڈر۔ یہ کیا کرتا ہے؟''

تین چار جوانوں نے ان دونوں سپاہیوں پر حملہ کردیا جو شہزادے کو گھسیٹ رہے تھے اور بری طرح زدوکوب کرنے کے بعد دونوں سپاہیوں کو اسی طرح گھسیٹنا شروع کردیا جس طرح شہزادہ گھسیٹا جارہا تھا۔

ایک شخص نے مجھے جکڑ لیا اور سروں کے مینار کے نیچے لے جاکر کھڑا کردیا اور ہجوم سے میرا تعارف کرایا۔ ''صاحبان! یہ ہے وہ کتا جو اپنے سفاک اور درندے آقا کے چند جھوٹے نوالوں پر یہ ذلیل ترین خدمت انجام دے رہا ہے، اسے دیکھیے اور اس پر تھوکیے۔''

ہجوم نے مجھ پر تھوکنا شروع کردیا۔ میں نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ میری ہتھیلیوں کی پشت، سر اور کپڑے تھوک میں لت پت ہوگئے۔ میرا دم گھٹا جارہا تھا کہ ایک دم بھگدڑ سی مچ گئی اور لوگوں نے تھوکنا بند کردیا۔ اب میں نے اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے اور ہجوم کی طرف دیکھا جو بھاگنے میں مصروف تھا اور نادری سپاہ ان کا پیچھا کررہی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہر طرف خون ہی خون نظر آنے لگا۔ تماشائیوں کے لاشے میدان میں پھڑک رہے تھے۔

خود نادر شاہ ایک بلند مقام پر تلوار کو نیام سے باہر کیے ہوئے کھڑا تھا اور ایک منادی با آواز بلند اعلان کررہا تھا۔

''اعلیٰ حضرت نادر شاہ کا اپنی سپاہ کو یہ حکم ہے کہ یزد اور اس کے قرب و جوار کی بستیوں کو تہ تیغ کر کے آگ کے حوالے کردیا جائے اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ اعلیٰ حضرت اپنی تلوار کو نیام میں نہ کرلیں۔''

اس نادری حکم پر بڑی سفاکی سے عمل کیا گیا۔ چند گھنٹوں میں آبادیاں صاف ہوگئیں اور جب نادر شاہ کو یہ یقین ہوگیا کہ اب کچھ باقی نہیں رہا تو اس نے اپنی تلوار نیام

www.PakiBooks.Site

میں کرلی اور اس جگہ سروں کا ایک اور مینارہ تعمیر کردیا گیا۔

جب یہ دوسرا مینارہ تیار کیا جارہا تھا، اس وقت نادر شاہ نے ایک نیا حکم دیا، اس نے کہا۔ ''شہزادہ رضا قلی مرزا ان دونوں سپاہیوں کو جو شہزادے کو گھسیٹتے پھر رہے تھے اور مجھے حاضر کیا جائے۔''

چنانچہ ہم چاروں کو اسی وقت نادر شاہ کے روبرو پیش کردیا گیا۔

نادر شاہ نے سب سے پہلے اپنے بیٹے سے پوچھا۔ ''جب میں نے تجھے یہ حکم دیا تھا کہ تو سروں والے مینار کے چاروں طرف گھومے پھرے تو تو نے میرا حکم کیوں نہیں مانا، بول تو نے ایسا کیوں کیا؟''

شہزادے نے جواب دیا۔ ''نادر شاہ! تو میرا باپ ہے مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اب مجھ پر تیری اطاعت اور فرماں برداری فرض نہیں رہی کیونکہ تو نے مجھ سے لحاظ نہیں کیا اور مجھے شفقت نہیں دی، اس لیے میں نے تیرا حکم نہیں مانا۔''

نادر شاہ کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی وہ اشتعال سے پاگل ہوگیا تھا، اس نے جھک کر شہزادے کے زخمی پاؤں دیکھے اور ہمدردی ظاہر کی، بولا۔ ''یہ تو تجھ پر بہت ظلم ہوا شہزادے۔ کس نے یہ زخم پہنچائے ہیں تجھے؟''

پھر ان دونوں سپاہیوں کی طرف دیکھا پوچھا۔ ''کیا تم دونوں گھسیٹ رہے تھے شہزادے کو؟''

دونوں نے اثبات میں سر ہلا کر اقرار کیا۔ ایک نے کہا۔ ''ظل اللہ ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی۔''

نادر شاہ نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں نے تم دونوں کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ تم دونوں شہزادے کو گھسیٹ کر لہولہان کردو۔ تم نے شہزادے پر زیادتی کی اس لیے تمہیں بھی سزا ملنی چاہیے۔''

جب ان دونوں کو سزا سنائی جارہی تھی تو میرا بھی حال بہت برا تھا۔ نادر شاہ نے ان دونوں کو قتل کرادیا اور ان کی بے سر کی لاشیں ایک خندق میں دبادی گئیں۔

آخر میں نادر شاہ مجھ سے مخاطب ہوا اور پوچھا۔ ''کیا بات تھی خواجک! تم ڈھیلے کیوں پڑ گئے تھے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''حضور انور! آپ مجھے جھٹلانا چاہیں تب بھی اور نہ جھٹلانا چاہیں تب بھی یعنی ہر دو صورتوں میں حق اور سچائی آپ ہی کی طرف ہوگی میں نے جو کچھ کیا آپ کے حکم سے کیا لیکن یہ ممکن ہے کہ میں حکم کی بجا تعمیل نہ کرپایا ہوں۔''

نادر شاہ نے کہا۔ ''تو ابدالی ہے، میں نے تجھے معاف کیا۔''

شہزادے کو دوبارہ قید کردیا گیا۔

☆.....☆

شام کا وقت تھا، آسمان پر سرمئی بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ شفق پھول رہی تھی اور مغربی افق پر نارنجی سیاہی الٹی دولت کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ نادر شاہ اپنے خیمے کے باہر کرسی پر بیٹھا شفق کا نظارہ کررہا تھا۔ یہیں اس نے احمد خان کو طلب کرلیا۔ اس نے کہا۔ ''ابدالی سردار! معلوم نہیں کیوں میرا دل گھبراتا رہتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے کوئی شخص میرے کان میں کہہ رہا ہے کہ نادر ہوشیار، نادر ہوشیار، یہ کیا بات ہے؟''

ابدالی سردار نے جواب دیا۔ ''اس ناچیز کا خیال ہے کہ ان دنوں حضور کو اچھی طرح نیند نہیں آرہی ہے اور یہ خواب بے خوابی کے ہیں جنہیں انسان نیم غنودگی یا جھپکی میں دیکھ سکتا ہے۔''

نادر شاہ نے کہا۔ ''یزد اور اس کے آس پاس کی بستی والوں نے جو کچھ کیا، اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایرانی قابل اعتبار نہیں ہیں، کیوں تیرا کیا خیال ہے۔''

احمد خان نے جواب دیا۔ ''اگر میری بات مانی جائے تو میں حضور کو مشورہ دوں گا کہ آئندہ شہزادے کو لوگوں میں نہ گھمایا پھرایا جائے کیونکہ ہجوم کی نفسی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ وہ مظلوم سے ہمدردی کرنے لگتے ہیں۔''

وہ کسی سوچ میں پڑ گیا، کچھ دیر بعد بولا۔ ''بہرحال ایرانی قابل اعتبار نہیں رہے۔ میں اپنی قوم پر بھروسا نہیں کرسکتا۔''

احمد خان خاموش رہا۔ نادر شاہ بھی خاموش ہوگیا مگر کچھ دیر بعد پھر ایک سوال کردیا۔ ''ابدالی سردار! میں نے شہزادے کو اندھا کردیا۔ کیا میں نے اس طرح انصاف کے تقاضے پورے نہیں کردیے؟ انصاف کی زد میں شہزادہ آئے یا کوئی اور معمولی آدمی دونوں کے لیے یکساں جرم میں سزا تو ایک ہی دی جائے گی، تعزیر تو یکساں ہوگی۔''

ابدالی سردار نے کہا۔ ''حضور والا! اپنی اولاد کو سزا دینا بہت مشکل کام ہے اس طرح دل زخمی ہوجاتا ہے اور یہ گھاؤ شاید زندگی بھر مندمل نہیں ہوتا۔ پتا نہیں آپ اس سے اتفاق کریں، یا نہیں۔''

نادر شاہ کی آنکھیں بھیگ گئیں، بولا۔ ''بے شک دل

www.PakiBooks.Site

تو میرا بھی زخمی ہوگیا ہے لیکن میں مطمئن بھی ہوں کہ میں نے انصاف کیا ہے۔ میں نے اس کو وہی سزا دی ہے جو کسی دوسرے شخص کو دے سکتا تھا۔"

اس کے بعد نادر شاہ نے یزد کو چھوڑ دیا اور کرمان چلا گیا۔ کرمان میں بھی وہ زیادہ دیر نہیں رہ سکا۔ ابھی وہ کرمان میں ٹھہرا ہوا تھا کہ شاہی پرچہ نویس کے ہرکارے نے شاہ کو مطلع کیا۔

"حضور کے بھتیجے اور سیستان کے حاکم علی قلی خان نے آپ کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا ہے۔"

نادر شاہ نے غصے میں اعلان کردیا۔ "جرم جرم ہوتا ہے وہ بیٹا کرے یا بھتیجا۔ علی قلی خان نے جرم کیا ہے تو اس کی سزا بھی پائے گا۔ ابدالی سردار! مشہد کے لیے کوچ کرو۔"

نادری حکم پر بڑی تیزی سے عملدرآمد ہوا اور نادری سپاہ مشہد کی طرف کوچ کرگئی۔

☆.....☆

مشہد میں مجھے اپنے پچھلے دن یاد آنے لگے، میں نے ابدالی سردار سے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں صالح خان کے گھر ہو آؤں کیونکہ ان لوگوں نے مجھ پر بڑے احسان کیے ہیں۔"

ابدالی سردار نے جواب دیا۔ "میں تجھے اجازت دے تو دوں گا مگر ان دنوں بادشاہ کی دماغی حالت کچھ یوں ہی سی ہے وہ اگر کسی بات پر بدک گیا تو ہلاکت اور بربادی سے کوئی بھی تجھے نہیں بچا سکے گا۔"

میں صالح خان کے گھر چلا گیا۔ زرغونہ مجھے دیکھ کر اور مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ ماں نے بھی کچھ کم خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور میری پیشانی کو چوم کر کہا۔ "لڑکے! تو کتنا بے مروت نکلا پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔"

میں نے جواب دیا۔ "ماں! میں ابدالی سردار بننا چاہتا ہوں، میں صالح خان بننا چاہتا ہوں، میں محمد قلی خان بننا چاہتا ہوں۔"

کنیز کو میری باتوں پر ہنسی آگئی، بولی۔ "تم نادر شاہ تو نہیں بننا چاہتے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اللہ کی بندی اِدھر اُدھر دیکھ کر اور کچھ سوچ سمجھ کر زبان کھولا کر، کہیں نادر شاہ کے کانوں تک تیری یہ بات پہنچ گئی تو سروں کے مینارے میں تیرا سر بھی لگ جائے گا۔"

پھر مجھے خاص طور پر موقع دیا گیا کہ میں زرغونہ سے مل لوں۔ چند سالوں میں زرغونہ کچھ سے کچھ ہوگئی تھی، اس نے شرما کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "تم کچھ بھی بن جاؤ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے تو یہ بتاؤ کہ تم میرے کب بنو گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں کیونکہ میرے والدین ابھی زندہ ہیں۔ میں نے انہیں مشہد بلوایا ہے وہ جب چاہیں گے میں تیرا بن جاؤں گا۔"

زرغونہ گھبرا گئی، پوچھا۔ "کہیں انہوں نے کسی اور کو پسند نہ کرلیا ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "نہیں وہ ایسا نہیں کریں گے، وہ میری پسند کا احترام کریں گے۔" پھر میں نے پوچھا۔ "میرے بعد کیسی گزری؟"

اس نے جواب دیا۔ "گھٹیا نے ماں کو بہت ستایا۔ ایک بار جنون کا دورہ بھی پڑا تھا۔ اس جنون میں ایک نوجوان کو مار مار کر لہولہان کردیا، بڑا ہنگامہ برپا رہا۔"

میں نے کہا۔ "زرغونہ! ماں کو قابو میں رکھا کر۔ تجھے نادری مزاج کا علم نہیں ہے، تیرا باپ صالح خان ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے، اسی کے رعب میں تم لوگ باعزت زندگی گزار رہی ہو لیکن اگر خدانخواستہ کبھی ان پر زوال آگیا تو تم لوگ کیا کرو گی کیونکہ وہاں عروج و زوال تو دن رات کی طرح آتے جاتے رہتے ہیں۔"

جس دن میں زرغونہ کے پاس پہنچا تھا اسی رات کو صالح خان بھی پہنچ گیا۔ مجھے ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "مجھے جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ تو یہاں آیا ہے میں بھی چلا آیا، بتا نادر شاہ کے عزائم کیا ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "عمِ محترم! خدا کے لیے آپ اس چکر میں نہ پڑیں۔ نادر شاہ قہر خداوندی ہے اس قہر سے بچنے کی کوشش کیجیے۔"

صالح خان نے جواب دیا۔ "بھتیجے! تو فکر نہ کر وہ اگر قہر خداوندی ہے تو میں خدا کا غضب ہوں جو ان پر نازل ہونے والا ہے۔ اس نے مجھے ذلیل کیا، میں تجھ سے نظریں ملاتے ہوئے شرماتا ہوں، اس نے شہزادے کو اندھا کردیا، اس نے میری قوم کے لوگوں کا قتل عام کیا اور ان کے سروں کے مینارے بنائے تا کجے، یہ ظلم کب تک برداشت کیا جائے گا آخر تا کجے؟"

میں نے کہا۔ "تب پھر میں اسی وقت واپس چلا جاؤں گا کیونکہ آج کل نادر شاہ پر شکوک اور اوہام کے دورے

www.PakiBooks.Site

پڑتے رہتے ہیں۔ میں ان سازشوں میں پڑ کر خود کو تباہ و برباد کراؤں گا۔ افسوس کہ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

میری ان باتوں سے صالح خان کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اس نے کہا۔ "بھتیجے! خبردار جو احسان فراموشی کی۔ میں نے تجھ پر احسان بھی کیا ہے اور اعتماد بھی خبردار دھوکا نہ دینا۔"

میں نے جواب دیا۔ "میں نہ تو آپ کو دھوکا دوں گا اور نہ ہی آپ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں گا۔ بس میں چپ چاپ اس کھیل سے الگ ہو جاؤں گا۔"

صالح خان کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے اس سلسلے میں اپنی بیٹی زرغونہ کو سمجھایا۔ زرغونہ نے مجھ کو سمجھایا۔ "خواجک! دیکھو میرے باپ کی زندگی خطرے میں ہے اگر تم نے میرے باپ کو دھوکا دیا یا اس سے قطع تعلق کرلیا تو میں بھی یہی کروں گی۔"

میں نے جواب دیا۔ "بی بی زرغونہ! میں ایک باعزت نمایاں مقام حاصل کرنا چاہتا ہوں اس لیے میں تیرے باپ کی روش نہیں اختیار کروں گا۔"

زرغونہ نے کہا۔ "تم میرے باپ کی روش نہ اختیار کرو لیکن کوئی ایسا کام بھی نہ کرو جس سے میرے باپ کو نقصان پہنچ جائے۔"

میں نے جواب دیا۔ "یہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیرے باپ کو میں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

صالح خان نے انتہائی نرم رویہ اختیار کیا وہ مجھ سے میٹھی میٹھی پیار محبت کی باتیں کرنے لگا اور مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نہیں رکا اور لشکر میں واپس چلا گیا۔ میری وجہ سے صالح خان کو بھی واپس پہنچنا پڑا۔

ابدالی سردار نے مجھے دیکھا تو سمجھانے لگا۔ "خواجک! نادر شاہ کو شبہہ ہو چکا ہے کہ اس کے خلاف جو سازشیں کی جارہی ہیں اس میں تو بھی شامل ہوگیا ہے۔"

میرے پاؤں تلے کی زمین سرکنے لگی کیونکہ میں جانتا تھا کہ نادر شاہ کے شبہے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے میں نے جواب دیا۔ "ابدالی سردار! میں تو اللہ کا نمک کھا رہا ہوں اس لیے ان کے خلاف میں غداری نہیں کرسکتا۔"

ابدالی سردار کو غصہ آگیا، بولا۔ "اور یہ جو بادشاہ کے خلاف دوسرے لوگ سازشیں کررہے ہیں تو کیا انہوں نے بادشاہ کا نمک نہیں کھایا ہے؟"

میری اتنی بڑی حیثیت نہیں تھی کہ میں ابدالی سردار سے بحث کرنے لگتا۔ بہرحال میں خاموش ہوگیا اور ابدالی سردار نے مجھے متنبہ کردیا کہ "دیکھ خواجک! جس دن بھی نادر شاہ کو غصہ آگیا، تیری خیر نہیں۔"

میں نے واپس پہنچ کر ایک نمایاں تبدیلی یہ دیکھی کہ نادر شاہ نے اپنے سراپردہ کے دونوں دروازوں کو دو مختلف لشکروں کی نگرانی میں دے دیا تھا، ایک میں ایرانی تھے۔ دوسرے میں ابدالی افغان۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے نفور اور ناراض تھے اور جب ایرانیوں نے یہ دیکھا کہ نادر شاہ افغانوں پر زیادہ مہربان ہے تو ان کے دلوں میں آتش حسد جل اٹھی اور وہ نادر شاہ اور افغان سپاہ دونوں ہی کے دشمن ہو گئے لیکن انہوں نے حیرت انگیز طور پر منافقت اختیار کررکھی تھی۔ افغان اور نادر شاہ دونوں ہی ان کی منافقت کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔

احمد خان نے مجھے بھی شک و شبہے کی نظر سے دیکھنا شروع کردیا تھا، یہ بات میرے لیے بڑی اذیت ناک تھی۔ جب میں نے ابتدائی سردار سے اس کی شکایت کی تو اس نے نفرت سے جواب دیا۔ "خواجک! یہ ناممکن ہے کہ سازشوں کا جو دھواں میں دیکھ رہا ہوں۔ تو اس سے لاعلم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تو بھی کچھ نہ کچھ مجھ سے چھپا رہا ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "یہ آپ کا وہم ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

احمد خان نے کہا۔ "اچھا پھر اس کا کیا جواب ہے تیرے پاس کہ جب تو اپنے محسن صالح خان کے گھر پہنچا تو تیرے پیچھے پیچھے صالح خان بھی پہنچ گیا جب تم دونوں وہاں اکٹھے ہوئے تو کیا تو بتا سکتا ہے کہ تم دونوں کے درمیان کس قسم کی باتیں ہوئیں؟"

چونکہ میں زرغونہ سے یہ وعدہ کرچکا تھا کہ میری کسی بات سے بھی اس کے باپ صالح خان کو نقصان نہیں پہنچے گا اس لیے مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔ میں نے کہا۔ "ہم دونوں میں باتیں ہوئیں ضرور لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جو قابل ذکر ہو۔"

احمد خان نے کہا۔ "بس یہی جھوٹ ہے تیرا کم از کم میں تیری یہ بات نہیں مان سکتا۔"

ان باتوں کے بعد ذہنی الجھن میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ اس رات میں سو نہیں سکا، رات بھر جاگتا رہا۔ صبح اذان کے بعد میں نے نماز فجر ادا کی اور کچھ دیر کے لیے کھلے میدان میں ہوا خوری کرنے لگا اسی عالم میں، میں نے نادر

www.PakiBooks.Site

شاہ کو اپنے خیمے سے نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ خلاف توقع معلوم نہیں کیوں تنہا اپنے خیمے سے باہر نکلا تھا۔ میں نہایت احتیاط سے چھپتا چھپاتا، نادر شاہ کے پیچھے پہنچ گیا۔ میں نے وہاں ایک خیمے کے پیچھے چند آدمیوں کو کسی کی تاک میں کھڑے دیکھا تو میں گھبرا گیا۔ میں اور تو کچھ کر نہیں سکا چیختا ہوا نادر شاہ کی طرف بھاگا نادر شاہ نے مجھے اپنے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟'' نادر شاہ نے مجھے پہچان کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تجھے کون ستا رہا تھا؟''

میں نے نظریں نیچی کرلیں اور نادر شاہ کو یہ نہیں بتا سکا کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔

جو لوگ تاک میں چھپے کھڑے تھے وہ فرار ہو چکے تھے۔ نادر شاہ اسی جگہ سے واپس چلا گیا، اس کے ساتھ چار قدم پیچھے میں بھی تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں نادر شاہ سے پوچھتا کہ حضرت! آپ یہاں کیا لینے آئے تھے؟ اور نادر شاہ نے خود سے کچھ بتایا نہیں۔

خیمے کے باہر جو سپاہی پہرہ دے رہے تھے انہیں نادر شاہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔ ''اسے گرفتار کرلیا جائے۔''

میں گرفتار کرلیا گیا۔ میں حیران اور خوفزدہ تھا کہ آخر نادر شاہ کو ہو کیا گیا مجھے کیوں گرفتار کرادیا۔ میں جن سپاہیوں کی تحویل میں تھا یہ ابدالی تھے اور مجھ سے اچھی طرح واقف تھے لیکن وہ مجھ سے اس طرح پیش آرہے تھے گویا وہ مجھ سے ذرا بھی واقف نہیں۔

دوپہر تک مجھے بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ میرے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور میں سپاہیوں سے پانی مانگتا تو وہ مسکرا کر جواب دیتے ''یار! ذرا صبر کر، ذرا دیر بعد تجھے عالم بالا روانہ کردیا جائے گا وہاں شوق سے شرابا طہورا پینا پانی پی کر کیا کرے گا؟''

ظہر کی نماز کے بعد ابدالی سردار مجھ سے ملا اور کہا۔ ''وہی ہوا نا جس کا مجھے ڈر تھا۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن میں نے کیا کیا تھا ابدالی سردار؟ میری خطا کیا تھی میرا جرم کیا تھا؟ مجھ سے غلطی کیا ہوئی؟ کچھ تو معلوم ہو مجھے۔''

ابدالی سردار نے جواب دیا۔ ''کیا تو نے تنہا دیکھ کر نادر شاہ کو قتل نہیں کرنا چاہا تھا؟''

میرے خون میں سنسنی دوڑ گئی۔ میرا پورا وجود کانپ گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔ ''میں نے نادر شاہ کو قتل کرنا چاہا تھا۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں ابدالی سردار، کس نے الزام لگایا ہے مجھ پر؟''

ابدالی سردار نے جواب دیا۔ ''اگر کسی اور نے یہ الزام لگایا ہوتا تو اسے رد بھی کیا جاسکتا تھا مگر یہ بات خود نادر شاہ نے کہی ہے، نادر شاہ کو کون جھٹلائے گا؟''

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''اللہ! میرے خدا یہ مجھ پر تہمت ہے الزام ہے۔''

شاید میری باتوں نے ابدالی سردار کو متاثر کرلیا تھا اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا تو سچ کہہ رہا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ابدالی سردار! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ بیان دے رہا ہوں مجھے رات کو نیند نہیں آرہی تھی، میرا دل گھبرا رہا تھا اسی لیے میں باہر نکل گیا۔ میں نے اچانک نادر شاہ افشار کو تنہا ایک طرف جاتے جو دیکھا تو ازراہ نمک خواری اور وفاداری میں بادشاہ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میں نے ایک خیمہ کی آڑ میں چند آدمیوں کو تاک لگائے دیکھا تو میں اور تو کچھ کر نہیں سکا، چیخ مار کر بادشاہ کی طرف دوڑا بادشاہ نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور پوچھا کہ تجھے کون ستا رہا ہے، میں نے نظریں جھکالیں کوئی جواب نہیں دے سکا۔ یہ سارا واقعہ صبح فجر کے وقت پیش آیا۔ میں بادشاہ کو خیمے تک چھوڑنے آیا، تو بادشاہ کے اشارے پر مجھے گرفتار کرلیا گیا۔''

احمد خان کو میری باتوں پر کچھ کچھ یقین آگیا پوچھا۔ ''مگر وہ کون لوگ تھے جو بادشاہ کی تاک میں کھڑے تھے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں ہاں اس خیمے کی نشاندہی کرسکتا ہوں جہاں وہ آدمی کھڑے تھے۔''

ابدالی سردار نے کہا۔ ''چلو یہی سہی اس کے علاوہ کوئی ایسا ثبوت یا کوئی ایسی دلیل جو تجھے بے گناہ ثابت کردے۔''

میں نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ بھی میرے پاس ایک ایسی مضبوط دلیل موجود ہے جس کو بادشاہ چاہے بھی تو رد نہیں کرسکتا۔''

ابدالی سردار نے پوچھا۔ ''وہ کیا؟ وہ کون سی دلیل؟''

میں نے جواب دیا۔ ''بادشاہ نے مجھ پر یہی الزام لگایا ہے نا کہ میں نے اسے قتل کرنا چاہا تھا تو جب میں بادشاہ کو قتل ہی کرنا چاہتا تھا تو پھر میں نے ایسا کیوں نہیں کیا جب کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں بادشاہ کے سینے سے لگ گیا تھا۔ اس وقت تو میں بادشاہ کو ہلاک کرسکتا تھا اور پھر یہ کہ اگر میری نیت

www.PakiBooks.Site

بادشاہ کو قتل کردینے کی ہوتی تو میں خنجر، تلوار یا پیش قبض وغیرہ اپنے ساتھ رکھتا جب کہ میں نہتا تھا اور اس وقت بھی نہتا ہی ہوں۔''

ابدالی سردار کی آنکھیں کھل گئیں، اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''ارے تو تو بالکل ہی نہتا ہے واہ اس پر تو خود میں نے بھی غور نہیں کیا تھا۔''

وہ اسی وقت وہاں سے جانے لگا تو میں نے کہا۔ ''سردار! میں پیاسا ہوں مجھ پر کھانا پانی کیوں بند کردیا گیا؟''

احمد خان نے اسی وقت مجھے پانی پلایا اور کھانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

کئی گھنٹے بعد جب وہ واپس آیا تو میرا پروانہ رہائی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پہلے تو مجھے کھانا کھلایا اس کے بعد اس خیمے کے پاس لے گیا جہاں چند آدمی بادشاہ کی تاک میں کھڑے تھے۔ تحقیقات کے بعد پتا چلا یہ خیمہ ایک ایرانی افسر نوراللہ بیگ کا تھا۔ نوراللہ بیگ کو اسی وقت گرفتار کرلیا گیا۔

احمد خان نے مجھے بتایا کہ بادشاہ میرے دلائل سے خوش بھی ہوا اور مجھ پر دیر تک ہنستا رہا۔ اس نے افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ابدالی سردار یہ آج کل تجھے ہو کیا گیا ہے آخر؟

میں اپنی رہائی سے بے حد خوش تھا۔

اسی وقت نادر شاہ کی عدالت میں نوراللہ بیگ کا مقدمہ پیش کردیا گیا۔ بادشاہ نے نوراللہ بیگ کو قتل کی دھمکی دے کر کہا کہ اگر تیرے خیمے کی آڑ میں چند آدمی کھڑے تھے تو تجھے اس کا علم ہونا چاہیے اور اگر تو کسی وجہ سے نہیں بتانا چاہتا تو تو مرنے کے لیے تیار ہو جا۔''

نوراللہ بیگ نے دلیری سے جواب دیا۔ ''میں نے ان آدمیوں کو نہیں دیکھا اس لیے انہیں جانتا بھی نہیں۔ بادشاہ اگر مجھے میرے جرم بے گناہی پر قتل کرنا چاہتا ہے تو میں بھی خوشی یہ سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔''

بادشاہ نے دربار میں ایرانی افسران کو بطور خاص جمع کرلیا تھا۔ اس طرح وہ انہیں مرعوب اور خوفزدہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ بظاہر تو خوفزدہ نظر آتے تھے مگر ان کے دلوں میں نفرت کی آگ روشن تھی۔

نادر شاہ نے ایک بار اور نوراللہ بیگ سے پوچھا۔ ''میں تجھ سے آخری بار یہ پوچھ رہا ہوں کہ اس رات تیرے خیمے کی آڑ میں کون کون تھا؟''

نوراللہ بیگ نے سختی سے جواب دیا۔ ''مجھ سے اگر تو لاکھ بار بھی یہی سوال کرے گا تو وہ لاکھ بار میں یہی جواب دوں گا تو خوامخواہ اپنا اور ہمارا وقت ضائع کر رہا ہے؟''

نادر شاہ نے جیسے اپنا دماغی توازن ہی کھو دیا تھا اس نے حکم دیا۔ ''اس کا بایاں ہاتھ توڑ دیا جائے۔''

دو قوی الجثہ گرانڈیل پہلوانوں نے نوراللہ بیگ کا بایاں ہاتھ شانے سے توڑ کر بادشاہ کے قدموں میں ڈال دیا۔ نوراللہ کی دلدوز چیخوں سے پورا دربار گونج گیا لیکن نادر شاہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا وہی سوال دہرایا۔ ''بتا اس رات تیرے خیمے کی آڑ میں کون کون تھا؟''

اس بار نوراللہ بیگ کوئی جواب نہیں دے سکا۔

نادر شاہ نے حکم دیا۔ ''اس کا دوسرا ہاتھ بھی اکھاڑ کر اس کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔''

ماہرین نے ایک تحقیق کے بعد حیران کن انکشاف کیا ہے کہ موٹاپا دل کے دورے سے بچانے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ ماہرین کی تحقیق کے مطابق موٹے افراد کے دل کے دورے کی صورت میں کم وزن والے افراد کے مقابلے میں 30 فیصد تک زندہ رہنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ جب کہ موٹے افراد دل کے دورے کا شکار ہونے کے بعد مزید 3 سال تک زیادہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ ماہر امراضِ قلب کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کا وزن زیادہ ہوتا ہے ان میں دل کی بیماری کے امکانات بڑھ جاتے ہیں لیکن اس سے اچھے نتائج بھی سامنے آسکتے ہیں۔ یونی ساؤتھ ویسٹرین میڈیکل سینٹر میں اس حوالے سے کی گئی تحقیق میں 20 ہزار مریضوں کا ریکارڈ دیکھا گیا جن میں دل کے دورے کا شکار ہونے والے افراد بھی شامل تھے۔ تحقیق میں شامل ماہرین کا کہنا تھا کہ موٹے افراد کو دل کے دورے کے فوری بعد وزن کم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ تاہم ڈاکٹرز کا مشورہ ہے کہ دل کے دورے کے بعد مریض اپنا وزن مزید نہ بڑھنے دیں کیونکہ مزید وزن بڑھنے سے نہ صرف دل کے امراض بلکہ اور خطرناک بیماریوں کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ محققین نے مزید کہا ہے کہ موٹاپے کا تعلق سیدھا شوگر اور دل کی بیماریوں سے ہے۔ 2009 کی امریکن کالج آف کارڈیولوجی اور موجودہ تحقیق کی رپورٹ اس حوالے سے یکساں ہے۔

مرسلہ: ثمینہ وسیم۔ ملتان

www.PakiBooks.Site

دونوں پہلوانوں نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور نوراللہ بیگ سے آہستہ سے کہا۔ ''مفت میں اپنی جان کیوں گنواتا ہے، بتادے تاکہ تیرا ایک ہاتھ تو بچ جائے۔''

اچانک پانچ ایرانی سردار اپنی جگہ سے اٹھے اور کھڑے ہو کر بادشاہ کو بتایا۔ ''نوراللہ بیگ تو ایماندار آدمی ہے، وہ کبھی بھی یہ نہیں بتائے گا کہ اس کے خیمے کی آڑ میں کون کون اور کس نیت سے کھڑا تھا۔ اس کا علم ہمیں ہے وہ ہم پانچوں آدمی ہیں جو اس دن صبح تک کھڑے کھڑے اکڑ گئے تھے۔'' اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔

اچانک صالح خان نے بادشاہ سے درخواست کی۔ ''بادشاہ سلامت اب جب کہ اصل مجرم سامنے آچکے ہیں نوراللہ بیگ کو رہا کر دیا جائے۔''

نادر شاہ نے جواب دیا۔ ''معاف کرنا تو ہمارے بس ہی میں نہیں۔''

اس نے دونوں پہلوانوں کو ایک بار پھر گردن کا اشارہ کیا اور انہوں نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی اکھاڑ کر اس کے قدموں میں ڈال دیا۔

نادر شاہ نے ان پانچوں ایرانی سرداروں کو بھی گرفتار کر لیا۔

ایرانی افسروں میں بے چینی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ کمال تحمل کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

نادر شاہ نے کہا۔ ''میں ان پانچوں غداروں کو سزا دینے سے پہلے انہیں اور تم سب کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ میری باتیں غور سے سنو، تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کتنے ناشکرے اور بے وقوف ہو۔''

دربار میں سناٹا طاری تھا، نادر شاہ نے حاضرین پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور بولنا شروع کر دیا۔ ''میرے ہم وطنو! میری باتیں غور سے سنو اور ان پر غور کرو۔ ماضی میں چلے جاؤ تم میں تقریباً بائیس تیس سو سال پہلے سائرس اعظم پیدا ہوا تھا، اس نے ایک عظیم فاتح کی حیثیت سے وطن عزیز کی غربت اور عظمت کا سکہ دور دور تک بٹھا دیا تھا پھر ایران کو یونانیوں نے پامال کر ڈالا اور جب اسلامی دور آیا تو اسماعیل صفوی اور عباس صفوی نے ایران کا پرچم بلند کیا مگر ان میں سائرس اعظم کے علاوہ ایک بھی ایسا نہیں تھا جو شہرت، ناموری اور اپنی فتوحات کے اعتبار سے میرا مقابلہ کر سکے۔ چنگیز خان، ہلاکو خان اور تیمور لنگ کے بعد میں تنہا وہ حکمراں ہوں جس نے اپنے گرد و پیش کی دنیا کو لرزہ براندام کیے رکھا ہے۔ میں جدھر گیا، کامیاب اور کامران آیا۔ آج جہاں میرا نام لیا جاتا ہے میرے ساتھ ہی ایران کا نام بھی روشن ہو جاتا ہے، اے میرے ہم وطنو! میری قدر کرو، میری عزت کرو، میرا ساتھ دو اور میرے خون کے پیاسے نہ بن جاؤ۔ میں جس نے ہندوستان کو فتح کیا اور وہاں کے مغل فرمانروا کو اپنے قدموں میں بصد عجز و نیاز بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے افغانستان کو اپنے پاؤں تلے روند کے رکھ دیا۔ میں نے بحیرۂ خزر کے مغربی علاقوں کو فتح کر کے ایران میں شامل کر دیا۔ اے میرے ہم وطنو! میں نے اپنے وطن اور ہم وطنوں کے لیے جو کچھ کیا ہے اس پر غور کرو اور اس پر ناشکرے پن کا اظہار نہ کرو۔ اگر تم مجھے ہلاک کر دو گے تو میرے بعد مجھ جیسا مرد پورے ایران میں نہیں پاؤ گے اور پھر یہ کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم مجھے اتنی آسانی سے مار سکو گے؟ میں خدا کا عذاب ہوں، خدا کا قہر ہوں، کسی انسان میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ خدائی عذاب، خدائی قہر کو ٹال سکے۔''

پانچ گرفتار شدگان میں سے ایک نے نعرہ بلند کیا۔ ''ہم اس خدائی عذاب کو اپنے ملک اور قوم پر سے دفع کر کے رہیں گے۔''

نادر شاہ نے غیظ و غضب سے کانپتے ہوئے کہا۔ ''یعنی میری باتیں تمہاری سمجھ میں اب بھی نہیں آ رہیں، چلو کوئی بات نہیں۔ ٹالو خدا کے عذاب کو اپنے سروں پر سے۔ دیکھتا ہوں تم میرا کس طرح مقابلہ کرتے ہو۔''

اس کے بعد نادر شاہ نے ان پانچوں کو قتل کر دینے کا فرمان جاری کر دیا اور اس فرمان پر فوراً ہی عملدرآمد بھی ہو گیا۔

☆.....☆

میں نے لشکری ماحول میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ اور سکون محسوس کیا۔ طوفان آنے سے پہلے کا سا سناٹا اور سکون۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ یہ تنہا میرے ہی احساسات نہیں تھے، پورے لشکر کا یہی خیال تھا۔ میں کچھ کارہائے نمایاں انجام دینے کی غرض سے اپنے گھر سے نکلا تھا لیکن یہاں میں دلدل میں پھنس گیا تھا اور اس دلدل سے نکلنے کی کوشش میں اور زیادہ دھنستا چلا جا رہا تھا۔ نادر شاہ پر جنون کا دورہ پڑا ہوا تھا، وہ سفاکی پر اتر چکا تھا، بات بات پر قتل اور ذرا ذرا سے شبے پر خون خرابے کر رہا تھا۔ احمد خان اس کے مزاج میں بہت زیادہ رسوخ حاصل کر چکا تھا۔ یہ بات ہر شخص دیکھ رہا تھا کہ بادشاہ ایرانیوں کو نظر انداز اور افغانوں کو سر چڑھا رہا

www.PakiBooks.Site

تھا۔

ان حالات میں، میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ میں اس جگہ کو چھوڑ دوں اور کچھ دنوں کے لیے اپنے ماں باپ کے پاس بندرانزلی چلا جاؤں لیکن میں چونکہ نادری سپاہ کا ایک فرد تھا اس لیے اس کی اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میں ابدالی سردار کے پاس پہنچا اور اس سے کہا۔ ''ابدالی سردار! مجھے اپنے ماں باپ بہت یاد آ رہے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں۔''

ابدالی سردار نے مجھے اوپر سے نیچے تک گھورا۔ ''کیا عرض کرنا چاہتا ہے تو؟''

میں نے جواب دیا۔ ''سردار! میں اپنے والدین سے سالہا سال سے نہیں ملا۔ معلوم نہیں ان میں کون زندہ ہے اور کون مر گیا، اگر آپ اجازت دیں گے تو میں چند دنوں کے لیے چلا جاؤں گا۔''

ابدالی سردار نے اپنی پیشانی پکڑ لی اور کچھ دیر تک اسے سہلاتا رہا پھر بولا۔ ''اتنی جلدی کیا ہے پھر چلے جانا، نادر شاہ ہم افغانوں پر بے حد اعتماد کرتا ہے اور ایرانیوں کا اعتماد زائل ہو چکا ہے۔ اگر تو کچھ دن اور نہیں جائے گا تو مجھے یقین ہے کہ تجھے ترقی مل جائے گی اور تو غیر معمولی ترقی کر جائے گا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اس پر کس طرح یقین کروں کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں اس پر عمل بھی ہو گا۔''

احمد شاہ ابدالی نے کہا۔ ''میں تجھ کو یقین دلانے کو تیار ہوں، تو اس وقت کہیں جانے کا نام نہ لے۔''

میں نے ایک بار پھر جانے پر اصرار کیا، ابدالی سردار نے مجھے یہ کہہ کر روک لیا کہ اگر نادر شاہ اجازت دے دے تو میں چلا جاؤں۔

میں نے جواب دیا۔ ''تب پھر آپ بادشاہ سے معلوم کر لیں۔''

ابدالی سردار نے کہا۔ ''میں بادشاہ سے اس وقت بات کروں گا جب میں اس کو خوشگوار کیفیت میں دیکھوں گا۔''

کئی دن بعد ابدالی سردار نے مجھ سے کہا۔ ''افسوس کہ نادر شاہ نے تجھ کو چھٹی نہیں دی اور اس نے حکم دیا ہے کہ تو کل شام کو بادشاہ کے پاس موجود رہ تاکہ وہ وقت پڑنے پر تجھے طلب کر سکے۔''

میں عجیب مصیبت میں پھنس چکا تھا، میں نادر شاہ کی اجازت کے بغیر بھی جا سکتا تھا مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ بعد میں کہیں بھی پناہ نہیں حاصل کر سکوں گا۔ نادر شاہ مجھے قبر سے بھی کھود نکالے گا۔ میں مجبور ہو گیا اور اپنی تقدیر کے لکھے کا انتظار کرنے لگا۔

دوسرے دن شام کو میں ابدالی کے پاس بیٹھ گیا۔ مغرب کے بعد ہمیں طلب کر لیا گیا۔

بادشاہ کے خیمے میں سناٹا طاری تھا وہاں چاروں طرف فانوس روشن تھے ان کی روشنی میں ہم دن کی طرح ہر شخص کو دیکھ اور پہچان سکتے تھے۔ ہمیں کچھ دیر بادشاہ کا انتظار کرنا پڑا پھر جب وہ خیمے کے دائیں جانب سے خیمے میں داخل ہوا تو حاضرین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نادر شاہ نے تقریب میں حصہ لینے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بے چین طبیعت کے ہاتھوں بس یہ کہہ کر چلا گیا۔ ''لوگو! کل ہمیں مشہد چھوڑ دینا ہے کیونکہ میں یہاں خطرات محسوس کر رہا ہوں۔ ہمارا اگلا قیام چھ میل دور فتح آباد میں ہو گا پھر وہیں میں اپنے جاں نثاروں اور وفاداروں کو عہدے مراتب دوں گا اور اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے کروں گا۔''

مجھے بہت غصہ آیا کہ بس اتنی سی بات کہنے کے لیے بادشاہ نے ہم سب کو جمع کیا تھا۔ یہ بات تو کل بھی کہی جا سکتی تھی۔

رات ہی سے خیموں کا شہر اجڑنے سمٹنے لگا۔ خیموں کی طنابیں اور میخیں اکھیڑی جانے لگیں، ٹھکا ٹھک اور شاٹن کی آوازوں سے پورا مشہد گونج گیا۔ رات بھر لوگ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آتے جاتے رہے۔ صبح ہوتے ہی ہم سب سفر کرنے کے لائق ہو چکے تھے۔

ہم اسی دن مشہد سے چل کر چھ میل دور فتح آباد پہنچ گئے۔ 11 جمادی الثانی 1160ھ کا واقعہ ہے، بادشاہ اس دن بھی خاموش رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی خطرے کا انتظار کر رہا ہے۔ یہاں اس نے حکم دیا ایک گھوڑا زین کسا ہوا ہر وقت حرم سرا میں موجود رہے کیونکہ کچھ پتا نہ تھا کہ اسے کب راہ فرار اختیار کرنے کی ضرورت پیش آ جائے۔

اس موقع پر بادشاہ کے محافظوں کے افسر اعلیٰ محمد قلی خان نے بادشاہ سے شکایتاً کہا۔ ''حضور والا! آپ اس طرح کیوں سوچتے ہیں؟ کیا آپ کو اپنے محافظوں پر بھروسا نہیں رہا؟ جناب والا! ہم سب آپ کے جاں نثار اور وفادار ہیں اگر آپ پر خدانخواستہ کوئی وقت پڑے گا تو ہم لوگ آپ پر جانیں قربان کر دیں گے۔'' اس کے بعد اس نے پوچھا۔ ''حضور نے یہ خالی گھوڑا حرم سرا میں کیوں کھڑا کر رکھا ہے؟''

www.PakiBooks.Site

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''محض اس خیال سے کہ اگر اپنے ہی دھوکا کر جائیں تو میں اپنی جان بچا کے کہیں فرار ہو جاؤں۔''

محمد قلی خان نے کہا۔ ''بادشاہ سلامت! خدا کے لیے آپ فضول فکریں نہ کریں اور اپنے جاں نثاروں پر اعتماد کریں۔''

لیکن نادر شاہ نے ان پر بھی اعتماد نہیں کیا۔

آخر 19 اور 20 جون 1747ء کی درمیانی شب میں نادر شاہ نے ہمیں اپنی خفیہ مجلس میں طلب کیا۔ یہاں اس نے ہمیں عہدے اور مراتب عطا کیے، مجھے کسی اور سے کیا غرض، میں تو صرف اپنی بابت بتا سکتا ہوں۔ نادر شاہ نے مجھے اپنے روبرو طلب کیا اور پوچھا۔ ''کیوں رے خواجک! تو اپنے گھر کیوں جانا چاہتا ہے؟''

میں پریشان ہو گیا، میں نے جواب دیا۔ ''صرف اس لیے کہ میں نے ایک عرصے سے اپنے والدین کو دیکھا نہیں ہے، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں، میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں، میں ان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''یہ تو پوری دنیا داری ہے۔ بہر حال میں آج تجھے یہ بتا رہا ہوں کہ تیری وفاداریوں اور جاں نثاریوں کے پیشِ نظر میں نے تجھے اپنا میرِ سامان خاص مقرر کیا۔''

میں نے دونوں آنکھوں کو مسل کر بادشاہ کی طرف دیکھا اور اس کی بات دہرائی۔ ''ظلِ اللہ میرِ سامان خاص! کیا یہ منصب صالح خان......''

نادر شاہ نے میری بات کاٹ دی، بولا۔ ''اس کے بعد کیونکہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔''

پھر اس نے ایک دوسرے افغان کو پکارا اور اسے اپنی محافظ فوج کا افسرِ اعلیٰ مقرر کر دیا۔

اس شخص نے بھی میری طرح ہی حیرت کا اظہار کیا اور کہا۔ ''حضور والا! اس منصب پر تو محمد قلی خان فائز ہے۔''

بادشاہ نے اسے بھی میری ہی طرح جواب دیا۔ ''محمد قلی خان اس کے بعد۔ کیونکہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔''

غرض اس رات نادر شاہ نے ہم افغانوں کو بہت سارے اعزازات و مناصب عطا فرمائے۔ ابدالی سردار بہت خوش تھا۔ سب کے آخر میں نادر شاہ نے اپنی منصوبے کا اعلان کر دیا۔

''میرے وفادار ساتھیو! میں اپنے نگہبانوں سے مطمئن نہیں ہوں، ہاں تمہاری وفاداری اور دلیری کا میں مداح اور قدرشناس ہوں۔'' اس کے بعد اس نے احمد خان کو بطور خاص مخاطب کیا۔ ''احمد خان! میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ صبح صبح تم سب ایرانی افسروں کو گرفتار کر کے اپنے اپنے عہدے سنبھال لو۔ گرفتار ہونے والوں کو قید خانوں میں ڈال دو اگر کوئی مزاحمت کرے تو اسے فوراً ہی جہنم واصل کر دو کیونکہ یہ میری سلامتی اور تحفظ کا سوال ہے اور میں اپنی زندگی کے تحفظ اور سلامتی کے بارے میں جس پر اعتماد کر سکتا ہوں وہ تم اور صرف تم ہو۔''

ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اس اعلان سے میں بہت خوش ہوا۔ مجھے صالح خان کا اعلیٰ منصب مل رہا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میں نے سوچا اب اس لائق ہو جاؤں گا کہ اپنے والدین کو اپنی شکل دکھا سکوں۔ رہ گئی یہ بات کہ محسن کشی تو گوارا ہی کر رہا تھا۔ خود محسن کش نہیں بن رہا تھا۔ اگر میں اس منصب کو قبول نہ کرتا تو کوئی دوسرا قبول کر لیتا۔

احمد خان نے رات ہی سے تیاریاں شروع کر دیں۔ احمد خان نے مجھ سے کہا۔ ''خواجک! تو صالح خان وغیرہ کے پاس چلا جا اور یہ اندازہ لگا کہ ان کا کیا حال ہے اور آج کی رات وہ سب کچھ کیا سوچ رہے ہیں۔''

میں نصف شب سے پہلے ہی صالح خان کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے وہاں جو کچھ دیکھا تو اس سے تو میرے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ صالح نے مجھے گرفتار کر لینے کے انداز میں محمد قلی خان کے سامنے پیش کر دیا۔ محمد قلی خان بہت برہم تھا اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''خواجک! سچ سچ بتا، اس ذلیل اور سفاک انسان نے آج کی رات کیا فیصلہ کیا ہے؟''

میں ڈر تو بہت گیا تھا لیکن میں نے راز کی بات نہیں بتائی میں نے پوچھا۔ ''کیسا فیصلہ؟ کس بات کا فیصلہ؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

صالح خان نے محمد قلی خان سے کہا۔ ''قلی خان! جس آدمی نے ہمیں ساری خبریں پہنچائی ہیں وہ بالکل سچا نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے خواجک کے بارے میں اسے غلط فہمی ہو گئی ہو ورنہ اگر اس کی بات سچی ہوتی تو اس وقت خواجک یہاں نہ نظر آتا۔''

لیکن قلی خان ضرورت سے زیادہ حق پسند تھا بولا۔ ''صالح خان! تم اس پر اعتبار کر سکتے ہو لیکن میں نہیں کر سکتا

www.PakiBooks.Site

ان کو یقین ہے کہ یہ سب کچھ جانتا ہے اسے سب کچھ معلوم ہے۔''

صالح خان نے مجبور ہو کر ایک بار پھر مجھ سے پوچھا۔ ''خواجک! محمد قلی خان کو تجھ پر یہ شک ہے کہ تو نادر شاہ اور احمد خان سے ملا ہوا ہے اور نادر شاہ نے تجھے کوئی منصب بھی عطا فرمایا ہے۔''

میں نے چڑ کر جواب دیا۔ ''یہ آپ لوگوں کو آخر ہو کیا گیا ہے؟ مجھے خواہ مخواہ کیوں ذلیل کر رہے ہیں؟''

پھر میں رونے لگا، صالح خان کو مجھ پر رحم آ گیا۔ اس نے مجھے تسلیاں دیتے ہوئے کہا۔ ''خواجک! دنیا میں حاسدوں کی بھرمار ہے۔ ان سے بچتے رہنا یہ لوگ تو زندگیاں اجیرن کر دیتے ہیں۔''

قلی خان نے صالح خان سے کہا۔ ''خیر اس وقت میں بحث تو نہیں کروں گا مگر میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس شخص کو اپنے ساتھ ساتھ رکھو، اگر یہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو سمجھ لو ہمارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا، اس کو اپنے......''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''دوستو! جیسا تم کہہ رہے ہو، ویسا ہی ہوگا، میں تم سب کے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگنے دوں گا، بلکہ میں اس کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔''

کچھ دیر بعد ستر سربرآوردہ سرداران حکومت نادری نادر شاہ کے خیمے کی طرف بڑھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''یہ آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں اور مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟''

قلی خان نے مجھے ڈانٹا۔ ''خواجک! تو بالکل خاموش رہ کیونکہ تیرے کسی سوال کا بھی ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔''

راستے میں صالح خان نے مجھے بتا دیا۔ ''خواجک! آج ہم سب مل کر اس ظالم کا خاتمہ کر دیں گے جس نے ہماری زندگیاں اجیرن کر دی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''یعنی کیا مطلب؟ کیا آپ لوگ خدانخواستہ نادر شاہ کو......''

میں بات پوری نہیں کر سکا مگر صالح خان میری بات سمجھ گیا۔ بولا۔ ''ہاں میں اسی ظالم نادر شاہ کو دنیا سے نیست و نابود کر کے دم لوں گا۔ اس نے میری بے عزتی کی، ہزاروں بے گناہوں کو قتل کروا دیا۔ میں اسی نادر شاہ کی زندگی کا آخری ورق آج پلٹ دوں گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''مگر یہ تم لوگ مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟''

محمد قلی خان نے مجھے ڈانٹا۔ ''اب چپ بھی رہ، زیادہ کڑکڑ نہ کر۔''

میری جان نکلی جا رہی تھی کیوں کہ میں جانتا تھا کہ دوسری طرف احمد خان بھی تیاریاں کر چکا ہے مگر میں نے دیکھا۔ یہ لوگ نادر شاہ کے خیمے کی طرف اُدھر سے بڑھ رہے تھے جدھر انہیں تعینات کیا گیا تھا۔

نادر شاہ کے خیمے تک پہنچتے پہنچتے صرف تیرہ آدمی رہ گئے۔ ستاون آدمی خوف نادری کی وجہ سے اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔

جب یہ تیرہ نادر شاہ کے در پر پہنچے تو ان تیرہ میں سے بھی گیارہ کی ہمتیں جواب دے گئیں اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

صالح خان نے محمد قلی خان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''جناب والا! یہ منصوبہ ہمارا ہے، اس پر عمل بھی ہمیں ہی کرنا ہے۔ محمد قلی خان۔ ہمت کرو، آؤ میرے ساتھ۔ میں اس شخص کا کام تمام کروں گا۔''

محمد قلی خان اور صالح خان نے نادری خیمہ کو تلوار سے چاک کر دیا اور اندر داخل ہو گئے وہاں ہلکی ہلکی کافوری شمع روشنی دے رہی تھی۔ یہ دونوں ایڑیوں اور پنجوں کے بل چلتے ہوئے نادر شاہ کے بستر کے قریب پہنچ گئے۔ نادر شاہ ان کی آہٹ سے جاگ گیا۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا، پوچھا۔ ''کون؟''

صالح خان اپنی چم چم کرتی تلوار کو لہراتا ہوا بولا۔ ''او ظالم انسان! تیرا یوم حساب آ چکا ہے، سنبھل۔'' اور نادر شاہ کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے گئے۔

نادر شاہ نے کہا۔ ''صالح خان! یہ تم ہو میں نے تمہیں ایسا نہیں سمجھا تھا۔''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''تو نے جس جس طرح ایران اور اس کے مسلمانوں کو ذلیل اور خوار کیا ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔''

محمد قلی خان نے تلوار ہوا میں لہرائی اور کہا۔ ''صالح خان! اس فضول انسان سے باتیں نہ کر۔''

تلوار نادر شاہ کے حلق پر گری اور وہ سر کو تن سے جدا کرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

مجھ سے یہ منظر نہیں دیکھا گیا، مجھے نادر شاہ کے قتل نے بہت زیادہ افسردہ کر دیا۔ میں نے صالح خان سے کہا۔ ''اچھا

www.PakiBooks.Site

اب تو میں جاسکتا ہوں۔''

صالح خان نے جواب دیا۔ ''اب تو جائے گا کہاں؟''

اتنی دیر میں محمد قلی خان نے نادرشاہ کے سر کو پہرے پر موجود سپاہیوں کے درمیان پھینک دیا اور اس سر سے کچھ دیر تک گیند کی طرح کھیلا گیا۔

صبح ہوتے ہوتے احمد خان کو اس سانحے کی خبر ہوگئی۔ احمد خان نے اپنے چار ہزار سپاہیوں سے حملہ کر کے قلی خان کو پسپا کر دیا۔

مجھ پر نادرشاہ کے قتل کا اتنا اثر ہوا کہ میں اسی جگہ جم کر رہ گیا۔ جب احمد خان نادری دشمنوں کو مارتا کاٹتا نادرشاہ کے خیمے میں داخل ہوا تو مجھ کو یہاں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا مجھے دیکھتا رہا، پھر کہا۔ ''خواجک! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟''

میرے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا۔

احمد خان نے کہا۔ ''تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تو حقیقتاً صالح خان کا آدمی تھا اور تو نے ہی ہماری تجویز کو من وعن ہمارے دشمنوں تک پہنچا دیا؟''

میں نے اس بار زبان کھولی اور آہستہ سے کہا۔ ''ابدالی سردار! یہ محض اتفاق ہے اور میری بدقسمتی ہے جو آپ مجھے یہاں دیکھ رہے ہیں۔''

احمد خان نے کہا۔ ''مگر اب یہاں بیٹھنے کے لیے رہ ہی کیا گیا ہے سب کچھ ختم ہو چکا۔''

نادرشاہ کی لاش کو نویں دن مشہد کے خیابان اعلیٰ میں دفن کر دیا گیا کیونکہ مقتول نے یہیں دفن ہونے کی وصیت کی تھی۔

اب میرے لیے ایران میں کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ صالح خان مجھ کو اپنے گھر بھی لے گیا لیکن میرا گھر میں جی نہیں لگا، زرغونہ نے بڑی کوشش کی کہ میں رک جاؤں لیکن میں نہیں رکا، میرا مستقبل تباہ ہو چکا تھا۔

دوسری طرف افغانوں نے احمد خان کو اپنا امیر چن لیا تھا۔ چنانچہ اب بھی اگر میرا کہیں مستقبل تھا تو وہ احمد خان کے پاس تھا۔ میں نے زرغونہ اور ماں سے کہا۔ ''میرا مستقبل تباہ ہو چکا ہے، اب میں پھر کوشش کرتا ہوں کہ اسے دوبارہ بنا لوں۔ دوبارہ حاصل کرلوں۔''

میں ان سب کو چھوڑ چھاڑ کر احمد خان کے پاس جا پہنچا میری ساری چستی اور توانائی کافور ہو چکی تھی۔ پٹھانوں نے مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ سب مجھے غدار اور دھوکے باز سمجھ رہے تھے۔ مجھے اپنی قسمت پر سوچ سوچ کر رونا آرہا تھا کہ آخر خدا کو کیا منظور ہے۔

میں نے احمد خان کو سلام کیا۔ وہ اپنے سرداروں کے درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سلام کا جواب دے تو دیا مگر دوسرے سرداروں نے منہ بنا کر پوچھا۔ ''اب یہاں تو کیا لینے آیا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''سردارو! میں بے گناہ ہوں، میں وہ نہیں ہوں جو آپ لوگوں نے مجھے سمجھا ہے، میں ایک ایماندار اور دیانتدار انسان ہوں، میں نے کوئی غداری یا دھوکے بازی نہیں کی، وہ محض حالات اور بدقسمتی کا کرشمہ تھا۔''

ایک سردار نے کہا۔ ''بہرحال کچھ بھی سہی، اب ہمارا پیچھا چھوڑ۔''

لیکن احمد خان نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور کہا۔ ''دیکھ خواجک! ہم تو وہی کچھ سمجھیں گے جو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ ہماری نظر میں تو غدار ہے تو نے نادرشاہ کے منصوبے کو اس کے دشمنوں تک پہنچا دیا جس کے نتیجے میں نادرشاہ کو قتل کر دیا گیا اور ہم لوگ ایرانیوں میں محصور ہو کر رہ گئے۔ اب ہم کیا کریں گے۔ کچھ پتا نہیں لیکن عنقریب میں مہم جوئی اور طالع آزمائی کرنے والا ہوں۔ میری فوج دو حصوں پر مشتمل ہوگی، ایک منظم اور دوسری غیر منظم، اگر تو پسند کرے گا تو میں تجھے اپنی غیر منظم فوج میں داخل کرلوں گا۔''

میں نے درخواست کی۔ ''ابدالی سردار! مجھے آپ اپنی غیر منظم فوج میں کیوں ڈالیں گے منظم میں کیوں نہیں؟''

ابدالی سردار نے جواب دیا۔ ''غیر منظم میں اس لیے کہ تیری زندگی میں تنظیم تو کہیں ہے ہی نہیں، تو نے میری نظر میں خود کو ذلیل وخوار کرلیا ہے اب اعتماد کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے تجھے ایک بار پھر آگ کا دریا عبور کرنا ہوگا۔''

میرے سامنے اس کے سوا کوئی اور راہ نہ تھی کہ میں احمد خان کی بات مان لوں۔ میرا مستقبل نادرشاہ کے بعد اگر کہیں محفوظ ہو سکتا تھا تو وہ احمد خان ابدالی تھا۔ یہاں مجھے اپنے ماں باپ بہت شدت سے یاد آئے۔ میرے والدین جو بندرانزلی میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور خاص کر میری ماں جو مجھے ٹوکری دے کر پرندوں کی بیٹ اور انسانی فضلاء اٹھوایا کرتی تھی۔

www.PakiBooks.Site

شوقِ پرواز

اصغر عباس

تاریخ گواہ ہے کہ علم کی جو شمع مسلمانوں نے روشن کی تھی اسی سے یورپ و امریکا کے در و بام روشن ہوئے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یونانیوں نے تعلیمی مراکز کی بنیاد رکھی لیکن ان مراکز کی حد، حرف شناسی سے حکمت و دانائی تک محدود تھی لیکن مکمل جامعہ 841ء میں سالیمو (اٹلی) میں قائم ہوئی اور اسے قائم کیا تھا ایک مسلمان نے۔ اس نے جامعہ کے یونیفارم کوٹ مہذب عرب کے کپڑے (جبّہ) کو قرار دیا تھا جو آج یورپ و امریکا کی جامعات میں رائج ہے لیکن ہم نے بھلا دیا اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جبّہ بھی یورپ کا لباس ہے۔ اسی طرح آج اگر کسی بچے سے بھی پوچھیں کہ ہوائی جہاز کس کی ایجاد ہے تو رائٹ برادرز کا نام لے گا جب کہ ہوائی جہاز بنانے کی تیکنک پر مسلمانوں نے کام شروع کیا تھا۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک مختصر سی تحریر

اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہوگی کہ ہم مغرب کی پھیلائی کہانیوں کے اسیر ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر ہم آمنا صدقنا یقین کر لیتے ہیں اس لیے بھی کہ ہم نے تاریخ میں صرف بادشاہوں پر نظر رکھی۔ وہ کیا کھاتا تھا۔ وہ کیسی زندگی بسر کرتا تھا، کس کس نے سازشیں کیں، کتنی جنگیں ہوئیں، کس جنگ میں کتنے لوگ مارے گئے یہی کچھ رقم کیا، علم و دانش کی باتیں یکسر نظر انداز کیں، اس وجہ سے آنے والی نسلوں نے یہی سمجھا کہ بیان ملک گیری ہی اصل تاریخ ہے۔ جن محققین کے عالم و دانش وروں پر لکھا وہ زیادہ پھیلی نہیں اور علم و دانش کی باتیں وقت کی گرد میں دب گئیں۔ علم فلسفہ علم نباتات و معدنیات، علم

www.PakiBooks.Site

جغرافیہ، علم حساب اور ان کے ماہرین ذہن سے محو ہوتے چلے گئے۔ ماہرین علم جراحت اور ان کی ایجادات عقل مندوں نے اپنے نام کر لیے۔ مثلاً آج آپ کسی سے بھی پوچھیں کہ ہوائی جہاز کس کی ایجاد ہے تو وہ فوراً رائٹ برادران کا نام لے گا مگر یہ سچ نہیں ہے۔ رائٹ برادران سے کئی صدی قبل آسمان پر اڑنے کا تجربہ مسلمانوں نے حاصل کر لیا تھا۔ وہ مسلمان ایک پُرگو شاعر تھا۔ موسیقار تھا۔ فلکیات داں تھا اور انجینئر تھا۔ نام اس کا عباس ابن فرناس تھا اس نے اڑنے والی مشین بنانے کی کوشش کی تھی۔ 825ء میں عباس ابن فرناس نے اپنے جسم پر لکڑی اور کپڑے پر مشتمل لباس پہنا اور قرطبہ کی جامع مسجد کے مینار سے چھلانگ لگا دی اسے اُمید تھی کہ وہ پرندوں کی طرح ہوا میں تیرنے لگے گا لیکن وہ ناکام رہا البتہ اس کے لباس نے زمین پر گرنے کی رفتار ضرور کم کر دی نتیجتاً عباس کو معمولی چوٹیں آئیں لہٰذا وہ دنیا کا پہلا پیراشوٹ کہلایا۔

875ء میں 65 سال کی عمر ہو جانے کے باوجود عباس ابن فرناس نے اپنی اُڑن مشین کو بہتر بنانے کے لیے ایک اور کوشش کی اور اب کی بار اس نے ریشم اور عقاب کے پروں کا استعمال کیا اس بار اس نے اڑنے کے لیے ایک اونچے پہاڑ کا انتخاب کیا اور اللہ کا نام لے کر چھلانگ لگا دی۔ عباس ابن فرناس دس منٹ تک خاصی بلندی پر محوِ پرواز رہا لیکن ہوا کے تھپیڑوں کی وجہ سے وہ زمین پر آن گرا۔ قرین قیاس ہے کہ ابن فرناس کی اِس اڑن مشین میں دم نہ تھی ورنہ وہ اسے دوران پرواز قابو میں بھی رکھ لیتا تاہم اس کی یہی ایجاد دنیا کے لیے اوّلین گلائیڈر ثابت ہوئی۔

ابنِ فرناس جن کا پورا نام ابوالقاسم عباس ابن فرناس ابن وِرداس التکرینی تھا وہ ایک مؤجد، مہندس، طیار چی، حکیم، شاعر، موسیقار، ماہر طبیعات، ماہرِ فلکیات اور کیمیا دان تھے۔

وہ اندلس (مسلم اسپین) کے شہر اِلف رند۔ اوندا (Izf-Rand onda) میں 810ء میں پیدا ہوئے اور بعد میں قرطبہ میں رہائش اختیار کی۔ ابنِ فرناس بَربَر نژاد اور جنوبی اسپین کے ضلع تکرنہ کا باشندہ تھا اِسی لیے ابنِ فرناس کے نام کے ساتھ التکرینی ہے۔ اس نے اپنی تمام عمر قرطبہ میں بسر کی اور اپنے علم و حکمت کی بنا پر اس زمانے کا عظیم ترین سائنسدان کہلایا۔ اس کی ایجادات اور اختراعات بے شمار ہیں اور اگر اسے اپنے زمانے کا نابغہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

وہ علم ریاضی، شاعری، طبیعات، پُراسرا علوم کا ماہر اور پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں یکتا تھا اس نے پانی کی گھڑی ایجاد کی۔ کرسٹل بنانے کا فارمولا بنایا اور اپنی تجربہ گاہ میں اس نے شیشے اور مشینوں کی مدد سے ایک ایسا پلانیٹیریم بنایا جس میں لوگ بیٹھ کر ستارے، بادلوں کی حرکت اور ان کی گرج چمک کا مظاہرہ دیکھ سکتے تھے۔

اس کی ریاضی میں مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک دفعہ ایک تاجر بلادِ مشرق کے سفر سے واپسی پر مشہور مسلمان عالم خلیل بن احمد کی کتاب اپنے ساتھ لایا۔ خلیل ایک عالم، شاعر اور ماہر لسانیات تھا جو آٹھویں صدی میں بغداد میں گزرا تھا۔ اس کا ایک کارنامہ عربی کی پہلی لغت تیار کرنا ہے۔ اس نے شاعری میں علم عروض اور حسابی تقطیع کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہ کتاب اسپین میں بالکل نئی آئی تھی اور کوئی اس کے مندرجات سے واقف نہیں تھا اور نہ اس کی تشریح کرنے پر قادر تھا چنانچہ یہ کتاب ابنِ فرناس کے سپرد کی گئی۔ وہ اسے لے کر ایک گوشے میں چند ساعت کے لیے بیٹھ گیا اور اس کے بعد اس نے اس کتاب کی ریاضیاتی ترکیب اور مطالب بڑی وضاحت سے اپنے حاضرین کو بیان کیے جسے سن کر وہ اس کی مہارت اور یادداشت پر ششدر رہ گئے۔

822ء میں جب نیا خلیفہ عبدالرحمٰن دوئم تخت نشین ہوا تو اس نے دنیا سے تمام باصلاحیت افراد کو اکٹھا کرنا شروع کیا تو ان میں سے ایک ابنِ فرناس بھی تھے۔ خلیفہ عبدالرحمٰن دوئم کی زیرِ سرپرستی ایک بہادر شخص جس کا نام ارمن فرمن تھا اس نے پَروں کی طرح کی ایک بڑی سی چادر کے ذریعے قرطبہ کی ایک اونچی عمارت سے اڑنے کی کوشش کا مظاہرہ کیا۔ اس کے لیے لوگوں سے شرط بھی لگائی لیکن وہ فوراً ہی نیچے گر گیا اور اس کو معمولی سی چوٹیں آئیں۔ ارمن کسی حد تک اپنی شرط جیت گیا تھا۔ عباس ابنِ فرناس بھی یہ دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھے۔ اس کے بعد ابنِ فرناس نے بھی اڑان پر تجربات شروع کر دیئے اور تیئس سال بعد ان کا تجربہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ تاریخ میں پہلی انسانی پرواز ہے۔ وہ گھنٹوں پرندوں کو محوِ پرواز دیکھ کر انہی کی طرح اڑنے کا خواہش مند تھا۔ اس نے کئی برس پرندوں کی پرواز کی تکنیک یعنی ایروڈائنامیکس کا بغور مطالعہ کیا اور ایک دن یہ اعلان کیا کہ انسان بھی پرندوں کی طرح اڑ سکتا ہے۔ جب اس کے ناقدین نے اس کا مذاق اڑایا تو اس نے اپنی تھیوری کا عملی مظاہرہ بذاتِ خود کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس نے پرندوں کے سے دو پر، سائز میں اپنے وزن کے مطابق تیار کیے اور ان کے فریم ریشم کے کپڑے سے

www.PakiBooks.Site

منڈھ دیئے پھر قرطبہ سے دو میل دور شمال مغرب میں واقع امیر عبدالرحمٰن الراخل کے بنائے ہوئے محل رصافہ کے اوپر واقع ایک پہاڑی پر چڑھ گیا اور کئی سو تماش بینوں کی موجودگی میں چٹان کے اوپر کھڑا ہو کر دونوں پر اپنے جسم کے ساتھ باندھ لیے۔ تماشائی بڑی حیرت اور تعجب سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کوشش میں اس پاگل سائنس دان کی ہڈیاں تک سلامت نہیں بچیں گی۔

اپنی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد ابنِ فرناس نے تماشائیوں کی جانب ایک نظر دیکھا اور پھر پہاڑی سے چھلانگ لگا دی۔ وہ اپنے پَروں کی مدد سے ہوا میں کچھ دیر تیرتا رہا اور پہاڑ سے کچھ فاصلے پر واقع ایک میدان میں بحفاظت اتر گیا۔ اگرچہ اس کی کمر لینڈنگ کے دوران دباؤ کی وجہ سے تھوڑی بہت متاثر ہوئی۔ اس وقت اس کی عمر 65 یا 70 برس بیان کی جاتی ہے۔ یہ واقعہ نویں صدی کے دوسرے ربع میں پیش آیا اور اس طرح وہ انسانی تاریخ کا ہوا میں پہلا اڑنے والا انسان کہلایا۔

اس نے اپنا تجربہ اسی جگہ پر ارمان کی چھلانگ کے تقریباً تیئس برس بعد کیا۔ یہ جگہ ایسی پہاڑیوں پر مشتمل تھی جس کے نیچے ایک بہت بڑا ہموار قطع زمین واقع تھا۔ اس جگہ ہوا نیچے زمین سے ہو کر پہاڑیوں سے ٹکراتی تھی اور اس کے بعد بلندی کی جانب جاتی تھی۔ وہاں پرندے ہوا کی اس قوت کی وجہ سے دوران پرواز فضا میں معلق رہنے کا مزہ اٹھاتے تھے۔ ابنِ فرناس نے پچھلے تیئس برس ایروڈائنامیکس کا مطالعہ کرتے ہوئے گزارے تھے۔ مقررہ دن چھلانگ لگانے کے بعد ابنِ فرناس ہوا میں کچھ دیر پرواز کرتا رہا مگر لینڈنگ کے دوران زمین سے بری طرح ٹکرایا۔ اس کی کمر اور چند دوسری ہڈیاں متاثر ہوئیں جس کی وجہ سے وہ ایک عرصہ صاحب فراش رہا مگر کچھ مدت بعد اپنی اس معذوری اور بڑھاپے کے باوجود چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ یہ درد اور معذوری اس کی بقیہ عمر کے بارہ سال تک اس کے ساتھ رہی۔ قدامت پرست لوگوں کا کہنا تھا کہ خدا نے اس کو سزا دی ہے کیونکہ اس نے فانی انسان ہوتے ہوئے خدا کی دوسری مخلوق کی طرح بلندی پر جانا چاہا تھا۔ اس طرح کے طعنے وہ اپنی بقیہ عمر جب بھی عوام کے درمیان جاتا لوگوں سے سنتا رہا۔ اپنی جسمانی تکلیف کو کم کرنے کی خاطر وہ ادویات کا سہارا لیتا رہا۔ تاہم ان بقیہ سالوں میں اس نے اپنے پلانیٹیریم کو امیر اندلس کی فرمائش پر

ملاقات

ارسطو کی لکھی گئی بوطیقا (Poetics) تنقیدی ادب میں نظری و عملی لحاظ سے بائبل کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ اس میں ارسطو نے یونانی ڈرامے کو سماج سے جوڑا ہے اور اسی لیے ارسطو کے وضع کیے گئے تنقیدی اصول آج بھی کسی ادب پارے کو پرکھنے کے لیے اتنے ہی مددگار ہیں، جتنے کہ قدیم یونانی معاشرے میں تھے۔ ارسطو کے مطابق ''انسان ایک سماجی حیوان اس لیے ہے کہ معاشرے سے ہٹ کر یا تو دیوتا زندگی گزار سکتے ہیں یا پھر جانور۔''

اقتباس: یاور مہدی از عون عباس
مرسلہ: محمد شہزاد۔ کراچی

موبائل (متحرک) بنایا۔ ریت سے بلور بنانے کا کام جاری رکھا، پانی اور دوسری قسم کی گھڑیاں بنانا بھی جاری رکھا۔ اپنے فارغ وقت میں وہ اکثر غور کرتا کہ آخر پرواز کرنے والے سوٹ میں کیا خرابی تھی جس کی وجہ سے اسے چوٹ کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ پرندے اپنی پرواز اور لینڈنگ کے دوران اپنی دم کا استعمال کرتے ہیں اس نے پَر تو بنا لیے تھے مگر دم کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکا تھا۔ اسے اپنی اس غلطی کا احساس شاید آخری سانس تک رہا۔

ابنِ فرناس کے گزرنے کے کئی سال بعد تقریباً 1010ء میں ایک یورپی راہب ایلمر مالمسمری نے بھی عباس ابنِ فرناس کے بنائے ڈیزائن کے مطابق اڑن مشین بنائی اور اس کے مزید کچھ صدیوں بعد پندرہویں صدی میں لیونارڈو ڈاونچی نے اس میں دم کا اضافہ کیا۔

عباس ابن فرناس کی شہرت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ بغداد کا بین الاقوامی ہوائی اڈا، چاند پر موجود ایک گڑھے اور قرطبہ میں واقع دریا پر ایک پُل کا نام انہی سے منسوب ہے۔ اس عظیم سائنس دان کا انتقال 887ء میں قرطبہ میں ہوا۔

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

قسط نمبر: 21

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

PakiBooks

www.PakiBooks.Site

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہوگیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہوگئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہوجائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کررہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کررہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہورہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کررہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا مسیج آگیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹوٹل گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سنے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آگئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جارہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن یہ معاہدہ پارٹنر بیس پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کردیا۔ ان کے جانے کے بعد میں ستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ عارف مچھندر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کرکے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آگیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہوچکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلاور خان آرہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آکر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہوا تھا۔ فہیم کے تھپڑ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیر نظر آگیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلوخلاصی کرادی جس کے ٹرک نے زنیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملنے آگیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی اغواء کا سن کر پریشان ہوگیا پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آجائے۔ بھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گلشن حدید میں نہیں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا سچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کردیا۔ ساتھیوں سے نمٹ کر میں نے سیٹھ سے اگلوالیا کہ عاصمہ کو کہاں رکھا ہے اسے باحفاظت نکال لایا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی سہیلی کا فلیٹ تھا۔ ہم اس سے بات کررہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی پھر باہر سے آواز آئی۔ ''کیبل والا، بل لے کر آیا ہوں۔'' روزی نے دروازہ کھولا تو کیبل والے کو دھکا دے کر دو مسلح شخص اندر آگئے۔ اس سے نمٹ کر میں نے انسپکٹر کامران کو فون کرکے کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے بھیج دو پھر میں... کالیا کے ساتھ باہر آگیا۔ انسپکٹر کامران کی معرفت کئی ایک کو گرفتار کرایا اور زنیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کرکے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظر انداز کرتا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتر کر زنیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہوگیا اور بھاگتا ہوا زنیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہوگیا اور چھت کے ذریعے زنیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹھیک اسی وقت نیچے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ تب تک میں سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اندر سے زنیرہ پستول تھامنے دھمکی دیتی ہوئی نکلی۔ اس کے پیچھے خالہ نجو کھڑی چیخ رہی تھیں۔ میں نے زخمی پر قابو پا کر خالہ سے رسی لانے کو کہا۔ تبھی باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ محلے کے لوگ آگئے تھے کچھ دیر بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔ اسے پولیس کے حوالے کیا اور وہاں سے چل پڑا، ابھی گھر آیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسپتال سے بتایا گیا کہ فہیم مل گیا ہے۔ میں اسپتال پہنچا فہیم نے بتایا کہ کچھ لوگ اس پر بے پناہ تشدد کرتے تھے۔ اس کی ٹانگیں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ سیٹھ ستار الگ کالیا کو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ وہ مجھ کے قتل کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا۔ استاد بھابھا نے مشورہ دیا کہ خود کو چھپا کر رکھوں کیونکہ لیاری کا بچہ بچہ ٹی ٹی لے کر ہمیں ڈھونڈ رہا ہوگا ہم نے میک اپ کیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچے تو اندر دشمن موجود تھے۔ ہم نے ان پر قابو پایا پھر اگلے روز جب اڈے پر پہنچا تو انور شاہ نے بتایا کہ حاجی مہران آیا تھا اور دھمکیاں دے کر گیا ہے۔ میں اپنے دوست فرقان کے دفتر میں جو بندرگاہ میں واقع ہے وہاں پہنچا تو بن رائد سے سامنا ہوگیا۔ اس کا پیچھا کرتا ہوا میں کنٹینروں کے درمیان پہنچا تو کسی نے مجھے مارنے کے لیے کنٹینر گرایا۔ میں تو بچ گیا مگر ایک دوسرا شخص دب کر ہلاک ہوگیا۔ مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ یہاں کئی پارٹیاں ہیں جو ایک دوسرے سے الجھ رہی ہیں۔ میں بن رائد کے جہاز کو ڈھونڈنے میں ناکام ہوکر سائیں داد کے ساتھ ساحل پر آگیا تھا کہ

www.PakiBooks.Site

وہ مجھے نظر آگیا۔ میں اس کے تعاقب میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے احساس ہوگیا۔ اس نے پستول نکالنا چاہا تھا کہ میں نے اس پر جست لگا دی مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا، میں اور کالیا رانا بشیر کے ہاں پہنچے تو اسے شاہ میر کے آدمیوں نے کور کر رکھا تھا۔ ہم نے ان آدمیوں پر قابو پایا۔ رانا بشیر نے پولیس بلوالی۔ پولیس کے سامنے شاہ میر کے آدمیوں نے بیان دیا کہ وہ لوگ شاہ میر کو نہیں جانتے۔ ہم وہاں سے نکلے تو فوزیہ کا فون آگیا کہ کچھ کرو۔ میں نے چاچا انور سے بات کی۔ انہوں نے فکرمندی کا انداز اختیار کیا اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ انور شاہ ایسی کیا بات کرنا چاہتے ہیں پھر وہ مجھے ساتھ لے کر نکل پڑے راستے میں بولے کہ عطا محمد انکار کرسکتا ہے کیونکہ یہ لوگ برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے ہیں گھر پہنچ کر میں نے عاصمہ کو بتایا اسی وقت دستک ہوئی۔ باہر پولیس والے تھے۔ وہ بولے کہ تمہیں ثمیر کے اغواء کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ مجھے تھانے لایا گیا۔ وہاں انسپکٹر جب علی تھا۔ زنیرہ نے ضمانت کرائی کالیا کے ساتھ آرہا تھا کہ راکا نے مُڈبھیڑ ہوگئی۔ اس نے ہمیں گھیرنے کی کوشش، فائرنگ کی آواز پر بھیڑ جمع ہوگئی ہم کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ عاصمہ کی ضد پر اگلے دن رشتہ مانگنے عطا محمد کے گھر گئے لیکن اس نے انکار کردیا۔ ہم گھر آئے۔ اگلے دن کالیا پہنچا ہی تھا کہ جمی کا فون آگیا۔ اسے ہم نے ثمیر کی حفاظت کے لیے رکھا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو جمی نے بتایا ثمیر مر چکا ہے۔ شاہ میر کے بیٹے ثمیر کو اغوا کرکے کالیا نے جہاں رکھا تھا وہاں اس کی نگرانی کے لیے جمی کو بٹھایا گیا تھا اس نے فرار کی کوشش کرنے کی وجہ سے ثمیر کو گولی مار دی۔ اس حادثے پر ہم سب پریشان ہوا ٹھے تھے لیکن لاش کو چھپانا بھی ضروری تھا، اسے لے جاکر میں نے ہاکس بے پر پھینکا۔ ادھر رانا بشیر اپنی بیٹی کے لیے پریشان تھا کیونکہ وہ شاہ میر کے قبضے میں تھی۔ تھانے سے انسپکٹر دلشاد کا فون آگیا کہ فوراً آکر مجھ سے ملو۔ اس سے ملاقات ہوئی تو احساس ہوا کہ وہ بھی میرے دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ لاری اڈے کی نوکری ختم ہوچکی تھی۔ رانا بشیر نے مجھے اپنی کمپنی میں عہدہ دے کر بحرین بھیجنے کا کہا۔ بحرین پہنچتے ہی میرا ٹکراؤ راکا سے ہوگیا۔ وہاں سے نکلا تو بحرین میں میرا اکلوتا ہمدرد ہاشم بھی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ اب میری مددگار صرف شہزادی نیلم ہوسکتی تھی۔ شہزادی نیلم کی وادی کا پانی اس کے مخالفین نے بند کردیا تھا۔ کالیا بھی مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ ہم صرائفہ کی شہزادی سے رخصت ہوکر پہاڑی سلسلہ کو عبور کررہے تھے کہ ایک مسلح دستے نے ہمیں گھیر لیا، ان میں راکا بھی تھا۔۔

(اب آگے پڑھیں)

راکا کی خوں خوار نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے سرخ پڑتے چہرے کے تیور بتانے تھے کہ میری یا کالیا کی ایک ذرا سی بھی جنبش پر وہ فائر کھول سکتا تھا۔ اس جیسے خبیث انسان سے خیر کی کسی طور بھی اُمید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

کالیا اور میں نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کردیئے تھے۔ میری نظریں ہنوز راکا پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک دشمن دیرینہ کو اچانک سامنے دیکھے جانے کا غیظ اپنی جگہ مگر دل میں اس رزندے کے ہاتھوں مغلوبیت کی تشویش اس سے کہیں زیادہ تھی۔

میں اور کالیا گم صم سے ہوگئے، عادتاً کالیا کے منہ سے بہت ہلکے سے ''ابے لے.....'' ضرور برآمد ہوا تھا۔

تب ہی اچانک راکا پر عجیب وحشت انگیزی کا دورہ پڑا تھا کہ اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

''ہاہا.....ہاہاہا.....نومی! تمہاری موت میرے ہاتھوں انہی صحرائی ویرانوں میں لکھی ہوئی تھی۔'' اس نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

''زندگی اور موت کے کھیل کو میں وہیں چھوڑ آیا ہوں راکا.....! جہاں سے چلا تھا۔'' میں نے پورے اعتماد اور جرأت سے کہا۔ اس نے بھویں سکیڑلیں۔ کالیا دم بہ خود تھا، ممکن تھا کہ وہ سمجھ رہا ہو میں کیا چالاکی چلنے کی کوشش میں تھا۔

''یہاں میں خالصتاً کاروباری سلسلے میں آیا ہوں۔''

''مجھے جل دینے کی اب تمہاری ہر کوشش ناکام ہوجائے گی نومی!'' راکا دھاڑا۔ ''اب تم صرف اپنی موت کو سامنے دیکھو گے، جو لمحہ بہ لمحہ تمہارے تعاقب میں ہوگی۔''

''حیرت ہے! تم میری اور محمود الحسن کی ملاقات بھول گئے؟'' میں مایوس نہیں ہوا تھا۔ ''یا پھر لگتا ہے تم کافی عرصے سے اپنے باس شاہ میر سے رابطے میں نہیں رہے ہو ورنہ تمہیں معلوم ہوتا کہ رانا بشیر نے اس کی شرائط مان لی ہیں۔''

میں نے اپنے اب تک کے قیافوں اور ذاتی آبزرویشن کے مطابق اندھیرے میں تیر چلایا۔

''اگر ایسی بات ہوتی تو میرے علم میں بھی ضرور آتی، شاہ میر اور مسٹر بن رائد کا آپس میں ہر وقت رابطہ رہتا ہے۔'' راکا نے بھاری آواز میں کہا۔

''شاہ میر کے نزدیک ہر بات بتانے والی نہیں ہوتی۔ میرا خیال درست ہے کہ تم اصل میں شاہ میر کے نہیں بلکہ بن رائد کے آدمی ہو۔'' میں نے کہا۔

راکا جھلا گیا اور اسی انداز میں اپنے گرد مستعد کھڑے مسلح ساتھیوں سے تحکمانہ بولا۔ ''ان دونوں کی تلاشی لو اور لے چلو.....''

www.PakiBooks.Site

میری اس سے گفتگو کو طول دینے کا ایک مقصد تھا۔ اوّل تو یہ کہ راکا جیسا خونی اور سفاک درندہ پلک جھپکتے ہی ہمیں موت سے نہ ہمکنار کر ڈالے۔

یوں اسے میں نے الجھا دیا تھا، دوسرے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا میں..... کہ آیا بن رائد اور شاہ میر اس وقت کہاں ہو سکتے تھے مگر راکا بھی ایک کائیاں تھا۔ بڑی مکاری سے پہلو تہی کر گیا تھا۔

ہماری تلاشی لے کر سب سے پہلے تو ہمیں پستول سے محروم کر دیا گیا۔ اس کے ساتھی آتشیں ہتھیاروں کے زور پر وہ ہمیں اس عارضی کالونی کے وسط میں لے آئے۔

یہاں۔ میں نے اور بھی بہت سے مقامی مسلح افراد منڈلاتے ہوئے دیکھے۔

صاف نظر آتا تھا کہ کوہ جبل پر حدی والوں کا مکمل قبضہ تھا اور انہوں نے یزیدیت کی انتہا کرتے ہوئے صرائفہ والوں کا پانی بند کر رکھا تھا۔ میری نظروں کے سامنے صرائفہ کی شہزادی نیلم کا اداس، پریشان اور التجا کرتا متوحش چہرہ بار بار رقصاں ہوتا۔

یہاں گویا صحرا میں جنگل میں منگل کا سماں نظر آتا تھا۔ کوہ جبل کی سیاہ پہاڑیاں بھوتوں کے ہیولوں کی مانند ایستادہ نظر آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ باقاعدہ مورچے بنے ہوئے تھے اور ان میں مسلح افراد متعین کیے گئے تھے۔

میں اور کالیا اپنی نظروں سے ان کے ہاتھوں میں جدید اسلحہ دیکھ رہے تھے جو ہمارے اس خیال کی تصدیق کر رہے تھے کہ ہم نے شہزادی نیلم کو جو تجویز دی تھی وہ غلط نہ تھی۔ صرائفہ کے لوگ اگر یہاں حملہ کرتے تو بے گناہ مارے جاتے۔ ان کا قتل عام ہو جاتا۔

فکر اب ہمیں اپنی تھی۔ راکا جیسے خطرناک دشمن کے شکنجے میں یوں اچانک پھنس جانا کسی سنگین خطرے سے کم نہ تھا۔ اس کی تشویش اب یہاں کی ''تیاری'' دیکھ کر دھیرے دھیرے میرے اعصاب پر سوار ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن..... کالیا کے چہرے سے ایسا کچھ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

یہاں ہنڈے بھی روشن تھے اور مشعلیں بھی فروزاں تھیں۔ ایک مقام سے گزرتے ہوئے اچانک ہی میری نگاہ چند مٹی کے اونچے نیچے مگر مخصوص واضح کے تودوں پر پڑی جہاں سے کوہ جبل کی سنگلاخ ڈھلانوں سے قدرتی چشمے موٹی موٹی دھاروں کی صورت میں بہتے نیچے آ رہے تھے، ذہن کو یہ سمجھنے میں چنداں دشواری نہ تھی کہ حدی والوں نے یزیدیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہاں بند بنا کر صرائفہ والوں کا پانی بند کر رکھا تھا۔ جس سبب ان کی کاریزیں (قلج) سوکھی پڑ گئی تھیں۔

اسی سمت میں مجھے ایک چھوالداری بھی نظر آ گئی۔ وہاں سے میں نے چند افراد کو راکٹ لانچر سنبھالتے ہوئے نکلتے دیکھا۔ دوسرا تھیلا اٹھائے ہوئے تھا اور اس میں سے ایک ہینڈ گرنیڈ نکال کر اس کا معائنہ کر رہا تھا۔

''ایمونیشن ڈمپ'' میرے ذہن میں یہ لفظ ابھرا تھا اور ساتھ ہی مجھے حیرت ہوئی تھی کہ ایسی خطرناک چھوالداری انہوں نے اپنے اس صحرائی ''جنگی ٹھکانے'' کے بیچوں بیچ بنا رکھی تھی؟

یہ دو مناظر دیکھتے ہی میرے ذہن طباع میں برق جیسے ایک خیال کا کوندا چکا اور میں اندر ہی اندر ایک خطرناک منصوبہ بندی کی ''تک بندی'' میں لگ گیا۔ مزید کچھ اور سوچتے ہی میرے ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔

صرائفہ کے پانی کا مسئلہ ایک خطرناک رسک لیتے ہوئے چٹکیوں میں حل ہو سکتا تھا۔ یہ بند مجھے چند دنوں کی نہیں بلکہ کئی مہینوں کا رہین منت محسوس ہوئے۔ گویا صرائفہ والوں کے رفتہ رفتہ سوکھنے والے قلج کو ایک خفیہ سازش کے تحت ہمیشہ کے لیے بے دست و آب کیے جانے کا ناپاک منصوبہ میری آنکھوں کے سامنے طشت از بام ہو چکا تھا۔

بہرکیف..... یہ لوگ ہمیں دھکے دیتے ہوئے ایک خشک اور چٹانی زمین جیسے نسبتاً کھلی جگہ پہ لایا گیا پھر ایک خاکستری رنگت کی سنگلاخ دیوار کے ساتھ ہمیں لگ کر کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا۔

اب ہمارے عقب میں کوہ جبل کی سنگلاخ پہاڑیاں تھیں اور ان کے دامن سے گنگناتے ہوئے بہتے چشمے، دائیں جانب حدنگاہ صحرا اور سامنے یہ جنگی کیمپ کا نظارہ تھا۔

ہمیں جہاں لا کر کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا تھا، اس سے یہی لگتا تھا کہ ہمیں دس افراد کھڑے کھڑے گولیوں سے اڑا دیں گے ورنہ ہمیں کسی چھوالداری میں کیوں نہ لے جایا گیا تھا؟

راکا..... کھڑے کھڑے اپنے سیل فون سے کسی سے باتیں کرنے لگا اور اس کی سلگتی نظریں ہم دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ شاید ہمارے سلسلے میں بن رائد سے نئی ہدایت لینے میں مصروف تھا۔

www.PakiBooks.Site

راکا سے متعلق آج میں غور سے اور شاید پہلی بار میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا تھا کہ عرب کی سرزمین پر ایک ''گورے بدمعاش'' کو کیوں کر ''ہائر'' کیا گیا تھا؟ کیونکہ راکا ہمیشہ سے مجھے اپنے نام ہی سے نہیں بلکہ خدوخال اور رنگت و لہجے سے مغربی باشندہ محسوس ہوا تھا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، پہلے میں اسے شاہ میر کا آدمی سمجھا تھا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بن رائد کا مقرب خاص تھا۔

راکا سے متعلق پہلی بار یہ سب سوچتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

کیا واقعی راکا بن رائد کا نمک خوار تھا؟ یا پھر وہ کسی اور مقصد کے تحت یہاں لایا گیا تھا؟ یہ سوال میری چھٹی حس نے اٹھایا تھا۔

مجھے خود اپنے اس سوال پر حیرت ہوئی تھی کہ میں نے آخر کس برتے اور کون سے ذہن میں اچانک ابھرنے والے خیال کے تحت ایسا سوچا تھا؟ میں سردست اس کی توجیہہ پیش نہ کر سکا تھا کیونکہ اسی وقت راکا نے فون پر اپنی گفتگو ختم کی تھی اور اسی وقت ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

ایک تیز نسوانی چیخ کی آواز ابھری تھی اور کجا حیرت کہ اس چیخ کی آواز کو سن کر ماسوائے میرے اور کالیا کے وہاں موجود کوئی نہیں چونکا تھا۔

تب ہی اسی راستے، جہاں سے ہمیں لایا گیا تھا، ایک لمبا تڑنگا چغہ پوش عربی اور اس کے ہمراہ ایک کن بدست ساتھی نمودار ہوا۔ انہوں نے ایک جوان عورت کو دبوچ رکھا تھا۔ وہ ان کی گرفت میں بری طرح مچل رہی تھی۔

میں نے آنکھیں سکیڑ کر بہ غور اس کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی غیر ملکی حسینہ تھی۔ میں اسے دیکھ کر چونک گیا۔ وہ مجھے شناسا محسوس ہوئی تھی۔ میں خود مشکل میں تھا اور اپنی یادداشت میں اس کا چہرہ کھنگالنے کی کوشش کرنا پڑی، تو ایک جھماکا میرے ذہن میں ہوا۔

تھوڑا ہی عرصہ تو بیتا ہوگا میری اور اس کی مختصراً ملاقات کا، اس وقت یہ اپنے بوائے فرینڈ اوبرائے گرانٹ کے ساتھ تھی، جسے گلفوآئل کمپنی نے تیل کے کنوؤں کی کھدائی اور ان میں بھڑک جانے والی متوقع آگ کے سلسلے میں خصوصی طور پر اس کی خدمات لی تھیں۔

یہ لائیلا تھی، پاکستان سے بحرین آتے ہوئے میری اور اوبرائے گرانٹ سے طیارے میں ملاقات ہوئی تھی۔

اوبرائے گرانٹ نے اس غصیلے عرب کی میرے ہاتھوں ٹھکائی پر خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ اس نے ایک معصوم بچے پر ہاتھ اٹھایا تھا اور میں اس عرب (عالی جاہ) کے ظلم پر اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا تھا۔ لائیلا بھی اس وقت اوبرائے گرانٹ کے ساتھ بیٹھی تھی۔

بہرکیف، میں نے دیکھا زیادہ شور مچانے پر راکا نے غصے سے اس کے تھپڑ بھی رسید کر دیا۔ وہ بجائے خاموش اور خوفزدہ ہونے کے راکا کی طرف گھورتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں بولی۔ ''تم..... تم نہیں جانتے میں کون ہوں؟ گرانٹ کو پتا چل گیا تو وہ یہاں تباہی مچا دے گا۔ نہیں جانتے اس کو تم..... کیا شے ہے وہ؟ ایک جلتا ہوا انگارہ ہے وہ.....''

''شٹ اپ!'' راکا بھیڑیے جیسی آواز میں غرّا کر اس سے بولا۔ ''ایسے انگاروں کو میں اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر ان سے کھیلتا ہوں۔ باندھ دو اسے ان دونوں کے ساتھ۔''

وہ لائیلا کو اسی طرح بیدردی سے گھسیٹتے ہوئے ہماری طرف لانے لگے تو تب ہی اس کی نگاہ ہم پر پڑی، مجھے پہچانتے ہی اس کی نگاہوں میں اور چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ ایک لمحہ کے لیے تو جیسے گرد و پیش سے بھی بے خبر ہو گئی۔

''تت..... تم؟'' وہ جیسے مجھے پہچانتے ہی بولی۔

''ابھی خاموشی سے تماشا دیکھو اور ان سے مزاحمت مت کرو۔'' میں نے سرگوشی میں اس سے انگریزی میں ہی کہا۔

کالیا مجھے اس سے یوں شناسا سا انداز میں مخاطب ہوتے دیکھ کر حیران ہوا، مگر بولا کچھ نہیں۔ لائیلا کو ہمارے ساتھ لا کھڑا کر دیا۔

اسی وقت وہی چغہ پوش لمبے قد کا ہتھیار بدست عرب اس کی جانب بڑھا تھا۔ اس نے راکا سے کچھ کہا۔ راکا..... نے اپنا سر ہولے سے اثبات میں ہلایا اور پھر ہماری جانب انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے اسے کوئی ہدایت دی، وہ لمبا چغہ پوش عربی بھی ہماری طرف دیکھ کر تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگا۔

راکا اپنے تین چار مسلح ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ اب کمان اس چغہ پوش عربی کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کوئی حکم صادر کیا۔ دو افراد ہماری طرف بڑھے۔ انہوں

www.PakiBooks.Site

نے اپنے لباس سے ایک رسی نکال لی تھی۔ وہ ہمیں رسن بستہ کرنے کی نیت سے قریب آرہے تھے۔

''بندھے تو سمجھو گئے..... جگری!'' اچانک کالیا نے سرسراتی سرگوشی کی جسے سن کر میرے پورے وجود میں ایک جوش کی سی سنسنی دوڑ گئی۔ ایمونیشن ڈمپ کی وہ چھوالداری بار بار میرے چشم تصور میں کسی آتش فشاں کی مانند گھوم رہی تھی۔

پل کے پل میں نے وہاں موجود مسلح افراد کی گنتی کر ڈالی۔ راکا کے جانے کے بعد اس چغہ پوش سمیت تین چار ہی مسلح افراد وہاں باقی بچے تھے۔ اگرچہ اور ساتھی بھی ان کے تھے، مگر اس وقت وہ کہیں اور مصروف تھے۔

''اس نے کچھ کہا تم سے؟ یہ تمہارا ساتھی ہے؟'' کالیا کو مخصوص انداز میں ہولے سے بڑبڑاتے پا کر لائیلا مجھ سے بولی۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پھر ان بڑھتے ہوئے دو آدمیوں کو دھکانا شروع ہوگئی۔

''یاد رکھو! اوبرائے گرانٹ اکیلا تم سب پر بھاری ہے۔ اس کی دشمنی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔ یاد رکھو! وہ اب تک میری تلاش میں تم لوگوں کی راہ پر لگ چکا ہوگا۔''

''شاباش! بولتی رہو۔'' کالیا نے لائیلا سے سرگوشی میں کہا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا کالیا کسی حد تک انگریزی بول اور سمجھ لیتا تھا۔ ان حالات میں بھی اس کی زندہ دلی مجھے ایک عجیب طرح کا حوصلہ عطا کر رہی تھی۔

''تم نے کچھ کہا مجھ سے؟'' لائیلا نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''یس میم! تمہارے اوبرائے گرانٹ کا کردار میں ابھی تھوڑی دیر میں ادا کرنے والا ہوں۔ تم انہیں اسی طرح لگائے رکھو۔''

''واٹ نان سینس!'' وہ کالیا سے بگڑ کر بولی۔ کالیا کو نہیں پتا تھا کہ یہ کون تھی اور اوبرائے گرانٹ کون تھا۔

وہ دونوں ہمارے قریب آگئے۔ اب ان کے عقب میں چغہ پوش سمیت ان کے مسلح ساتھی تھے۔ ان کا ہم سے فاصلہ بہ مشکل پندرہ بیس گز کا ہوگا۔

ایک نے میری جانب بڑھنے کی کوشش چاہی کہ مجھے رسن بستہ کرے اور ساتھ ہی تحکمانہ انداز میں مجھے اپنے دونوں ہاتھ پشت کی جانب کرنے کا بھی کہا۔

میں نے بہ ظاہر ایسا ہی کیا۔ اسی وقت کالیا نے لائیلا سے کچھ کہا۔ وہ بھڑکی۔ دوسرے کا دھیان چوک گیا جو کالیا کی جانب بھی اسی ارادے سے بڑھا تھا۔

پلک جھپکتے ہی کالیا نے اس پر جھپٹا مارا۔ لائیلا نے بے مقصد چیخ ماری۔ عقدہ کھلا کہ کالیا نے بیک وقت ایک پیٹھ دو کاج نمٹائے تھے۔ ایک طرف اپنے مدمقابل کو دبوچا تھا تو دوسری جانب اس نے ہمارے درمیان میں کھڑی لائیلا کو بھی اپنے کندھے کی ٹھوکر رسید کی تھی۔ وہ چیختی ہوئی میرے مدمقابل سے ٹکرائی تھی، گویا میرے لیے کسی موقع کی راہ ہموار کی گئی تھی۔

میرے مدمقابل کا توازن بگڑا، میں نے اس پر حملہ کیا۔ پہلی کوشش میری یہی تھی کہ اس کی گن پر جھپٹا ماروں اور یہی کیا بھی میں نے کاندھے سے لگی اس کی گن کو میں نے اچک لیا اور ساتھ ہی اس کے پہلو میں لات بھی رسید کر ڈالی۔ وہ پرے جا گرا۔

کالیا مجھ سے دو ایک سیکنڈ پہلے یہ کام نمٹا چکا تھا، البتہ اس نے اپنے مدمقابل کی گن چھینتے ہی اسے بھی ایک ہاتھ سے دبوچ کر اپنی ڈھال بنا لیا تھا۔

چغہ پوش اور اس کے مسلح ساتھیوں نے ہم پر گنیں تان لیں۔ کالیا کی گن گرجی۔ گولیوں کی بوچھاڑ ان کے قدموں پر پڑی۔ وہ اچھلے اور بدک کر دائیں بائیں ہوگئے۔

''پیچھے دوڑو.....'' کالیا چیخا۔ اس نے اپنے مدمقابل کو دھکا دیا اور پلٹا۔

میں نے بھی اس کی تقلید ضروری سمجھتے ہوئے ایک عدد برسٹ فائر کیا اور لائیلا کے سامنے کالیا کا پیغام دہرا دیا۔

کالیا اس چٹانی دیوار کے اندر ہی کسی تنگ سی دراڑ کو پہلے ہی نظروں میں لیے ہوئے تھا۔ ہم اسی میں جا گھسے۔

ہمارے عقب میں بیک وقت کئی گنیں گرجیں، چٹانی ذرات کی بارش ہم پر پڑی، لیکن میں ہم اس تنگ دراڑ کی تاریکی میں گم ہو چکے تھے۔

لائیلا میرے ساتھ تھی۔ اس اندھیری دراڑ میں ایک ہی انسان سماتے ہوئے پیش قدمی کر سکتا تھا، اسی لیے ہم تینوں قطار میں اندر داخل ہوئے تھے، لائیلا ہمارے بیچ میں تھی اور میں سب سے آخر میں.....

مجھے عقب میں شور سنائی دیا۔

ہم آگے بڑھتے رہے۔ کالیا راستہ بھانپ رہا تھا، مگر شاید اسے نکاسی کی کوئی راہ نہیں مل رہی تھی، وہ ذرا رکا، میں نے کہا۔ آگے بڑھتے رہو کالیا! ورنہ کسی وقت بھی یہ دراڑ

www.PakiBooks.Site

ہمارے لیے مشترکہ قبر ثابت ہو سکتی ہے۔''

لائیلا نے کہا تھا۔ ''آگے سے دراڑ کی زمین گہرائی ہوتی جا رہی ہے لیکن اس کے پار مجھے ایک نکاسی کے راستے کی روشنی نظر آرہی ہے۔''

''چلو پھر..... اس وقت کوئی اور آپشن بھی نہیں ہے ہمارے پاس۔'' میں نے کہا۔

''ابے لے ..... جگری! آجا پھر.....'' کالیا بولا اور قدم آگے بڑھا دیا۔ لائیلا نے ٹارچ نکال لی۔ یہ ایک چھوٹی قلم ٹارچ تھی۔ گہرائی ناپنے اور اس کا اندازہ کرنے میں ہمیں مدد ملی۔

شکر تھا کہ گہرائی زیادہ نہ تھی۔ ہم نے وہ پار کر لی۔

''تم دونوں آپس میں انگریزی میں بات کرو تاکہ میں بھی کچھ سمجھ سکوں اور کوئی مشورہ دے سکوں۔'' لائیلا نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''اس وقت ہمیں تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں میم! چلتی رہو بس!'' کالیا نے اس سے کہا۔ وہ کچھ نہ بولی، البتہ اس نے برا سا منہ ضرور بنایا تھا۔

ہم روشنی والی جگہ پر پہنچے تو وہاں نکاسی کے دو راستے نظر آئے۔ ایک دائیں جانب انہی کے ٹھکانے کی طرف جاتا تھا جبکہ دوسرا عمودی ہو کر بائیں جانب کو..... ہم نے آخر الذکر راستے کو ترجیح دی۔ جبکہ لائیلا نے اوّل الذکر راستے کی جانب بڑھنے کا اشارہ کیا تھا، وہ سہل راستہ جان کر ایسا بولی تھی۔

ہم نے وہی کیا جو کالیا چاہتا تھا۔ عمودی راستے کی وجہ سے ہمیں اوپر اٹھنا پڑا۔ لائیلا اس تنگ سی دراڑ میں اوپر نہیں اٹھ پا رہی تھی، مجبوراً مجھے اس کے نرم و گداز جسم کو اچکنا پڑا۔ وہ تھوڑا کسمسائی اور پھر خود کو میرے رحم و کرم پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے اوّل الذکر راہ سے کسی نے کوئی شے اندر لڑھکائی ہو، میں نے لائیلا سے پینسل ٹارچ لے کر اس طرف پھینکی اور میری آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ہینڈ گرنیڈ تھا جس کی پن نکال کر اسے اندر لڑھکا دیا گیا تھا۔

''اندر دستی بم پھینکا گیا ہے۔'' میں چلایا۔ کالیا اوپری راستے سے نکل چکا تھا۔

میرے پاس اب دو ہی راستے تھے، یا تو لائیلا کے گناہ گار اور سنگین بوجھ کو نیچے چھوڑ دیتا اور خود سرے پر جا پہنچتا، لیکن میں جانتا تھا کہ لائیلا کا بعد میں کیا حشر ہوتا۔

''پپ..... پلیز! مجھے مت چھوڑنا.....'' دستی بم والے اعلان کی میری آواز وہی سن پائی تھی۔ سوچنے کا لمحہ تک نہ تھا، میں اوپر ہی چڑھتا رہا۔ کالیا کے دھیان میں بھی نہ ہوگا کہ میں اور لائیلا اس وقت بھڑ کنے والے تنور پر تھے۔

اسی وقت جب میں لائیلا کے بوجھ سمیت سرے پر پہنچا تھا کہ ساعت شکن دھماکا ہوا۔ لائیلا چیخی، دھماکے اور شاید گیس کے پریشر سے ہم دونوں ہی اچھل کر ایک طرف جا پڑے۔ ہمارے پیچھے سرے پر آگ کا سرخ گولہ نمودار ہوا۔

ہم دونوں کو چوٹیں آئیں جو قابل برداشت تھیں، کالیا ایک طرف سے ہماری جانب لپکا۔ ہمیں سہارا دے کر اٹھایا اور خیریت چاہی۔

''جگری! تو ٹھیک ہے ناں؟''

''شکر ہے اللہ کا، عین وقت پر بچا لیا۔'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ لائیلا بھی ہراساں تھی۔ اس کے حسین و نازک چہرے پر بھی خراشیں تھیں۔

''شاید سرے پر ہونے کے سبب، آگ اور بارود کے گیس پریشر نے ہمیں قبل از وقت اٹھا کر باہر پھینک دیا ورنہ تو گئے تھے۔''

''جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے.....'' کالیا جوش سے بولا۔ پھر ایک طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔

''اس طرف چلو، جلدی.....'' کہتے ہوئے آگے بڑھا۔ اب لائیلا خود کو سنبھال سکتی تھی، تاہم اس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا، وہ بری طرح ہراساں ہو رہی تھی۔ اسے بھی معجزاتی طور پر جان بچ جانے پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''ادھر رک جاؤ کالیا!'' میں نے ایک چٹانی آڑ کے قریب قدرے تاریکی میں رک کر اس سے کہا۔ لائیلا ہانپتی ہوئی میرے قریب ٹک کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے ایک جھکے ہوئے چٹانی چھجے کا سہارا لیا تھا۔ کالیا رک گیا۔

''وہ ہمیں اسی دراڑ میں مردہ سمجھ رہے ہوں گے۔'' میں نے اپنی بے ترتیب سانسیں بحال کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ''یہ موقع اچھا ہے۔ ان کا ایمونیشن ڈمپ قریب ہے، میں وہ تباہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ سب بکھر جائیں گے۔''

''ایمونیشن ڈمپ؟'' کالیا حیرت سے چونک کر بولا۔ ''کدھر ہے وہ؟''

''اس طرف.....'' میں نے ایک چٹانی آڑ سے ابھر

www.PakiBooks.Site

کر قدرے نیچے چھوالداریوں کی طرف اشارہ کیا جہاں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ وہاں مجھے وہی تکونی چھوالداری کی جھلک نظر آئی۔

''وہاں تک جائے گا کون اور کیسے؟'' کالیا چڑھی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا۔ ''اور کیا اسے تباہ کرنا ضروری ہے؟''

کالیا میرا مقصد سمجھنے سے قاصر رہا، یا پھر شاید جہاں میرا دھیان جاتا تھا، وہاں اس کا نہیں جاسکا تھا، اس لیے کہ اس چھوالداری کی حقیقت مجھ پر پہلے عیاں ہوئی تھی۔ وقت کم تھا اور کارروائی فوری نمٹانے کی متقاضی میں نے لائیلا کو اسی چٹانی جھجے کے پاس چھپے کھڑے رہنے کی ہدایت کی اور کالیا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، میرے عقب میں اس کی سوالیہ آواز ابھری تھی، وہ شاید مجھ سے کچھ استفسار کرنا چاہتا تھا مگر میں رکا نہیں اور مطلوبہ چھوالداری کے قدرے ''نشانے'' پر آتے ہی میں نے کالیا سے تحکمانہ کہا۔

''کالیا.....! اس چھوالداری پر بے دریغ گولیاں برساؤ جلدی چاہے سارا میگزین ہی کیوں نہ خالی کرنا پڑ جائے۔''

ایک جوش غیظ تلے یہ کہتے ہی میں نے اپنی گن کا رخ اس طرف کرتے ہی ٹرائیگر دبا دیا۔ کالیا نے بھی یہی کیا۔

گولیوں کی دو طرفہ بوچھاڑ چھوالداری پر پڑنے لگی، اس میں ان گنت سوراخ ہونے لگے مگر میں نے یا کالیا نے فائرنگ بند نہ کی، کوئی چند سیکنڈوں بعد..... چھوالداری میں ایک زبردست دھماکا ہوا اور دوسرے ہی لمحے چھوالداری کی جگہ سرخ گولے کی چھتری تنی ہوئی نظر آنے لگی۔

دھماکوں کے ساتھ ساتھ سنسناتے ہوئے زناٹوں اور شائیں..... شائیں کی آوازوں سے شعلے اور بارود کے لپکتے ہوئے ٹکڑے دائیں بائیں کسی گولہ باری کی طرح پڑنے لگے۔

میں نے فائرنگ بند کردی۔ کالیا کو بھی ہاتھ کے اشارے ...سے میں نے مزید فائرنگ سے روک دیا۔ کئی سلگتے ہوئے ٹکڑے ہمارے پاس آکر بھی گرے۔ کالیا حیران پریشان تھا، وہ ابھی تک میرے اس اندھا دھند فائرنگ کے مقاصد کو شاید پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہی تھا، اسی لیے مجھ سے چیخ کر بولا۔ ''ان کے اسلحہ خانے کا ڈھیر تمام ہوا جگری! اب یہاں سے دوڑ چلو۔''

''ٹھہر جاؤ، ابھی اصل نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔'' میں نے جواب میں ایک غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ وہ میرا یہ جوشیلا روپ دیکھ کر لمحے بھر کو ششدر ضرور رہ گیا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ اتنی بڑی کامیابی کو میں ایک بڑا اور خطرناک رسک لے کر، بس پانے ہی والا تھا اور وہی ہوا۔

تب پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے دھماکوں اور بارود کے آتشیں پھیلاؤ نے قریب باندھے بند کو اپنی زد میں لے لیا کیونکہ اسی وقت میری منتظر سماعتوں نے پانی کے زبردست اور ہیبت ناک ''شرائے'' کی آوازسنی پھر تو جیسے ہر طرف بھونچال آگیا۔''

بالآخر ہم ایمونیشن ڈمپ والی اس چھوالداری کے خوابیدہ بارود کو اپنی مسلسل فائرنگ سے تباہ کر چکے تھے اور اس کے مابعد اثرات کے خاطر خواہ نتائج بھی اب کالیا نے بھی دیکھ لیے تھے۔

یوں کالیا جیسا آدمی بھی میری اس ''کارروائی'' پر لمحہ بھر کو انگشت بدنداں رہ گیا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے کالیا نے میری طرف دیکھ کر فاتحانہ مسکراہٹ سے اپنے ایک ہاتھ کا انگوٹھا بلند کیا تھا۔

ہم واپس پلٹے اور لائیلا کی طرف آئے، وہ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ ہم وہاں اچھی خاصی تباہی اور افراتفری پھیلانے میں کامیاب رہے تھے۔

ہر طرف تیز تجلی نما روشنیاں اڈتی نظر آرہی تھیں۔ ان چمکتی آتشیں روشنیوں میں آگ، بارود اور دھواں بھی شامل تھا۔ عجیب سی بوپھیل گئی تھی فضا میں۔

''ابے لے جگری! یہ تو تو نے ان کی لٹیا ہی ڈبودی اور شاید تم نے ان کے پانی روکنے کا وہ نظام بھی ناکارہ کر ڈالا ہے جس کے سبب صرافہ والوں کا پانی بند کردیا گیا تھا۔'' وہ مجھ سے متاثر کن لہجے میں بولا۔ ''لیکن یار..... جگری! ان ساری باتوں کا تجھے اندازہ کیوں کر ہوا؟''

''میرا اصول ہے کہ دشمن کے ٹھکانے پر مغلوب ہونے کے باوجود اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے چاہئیں۔ اس طرح بہت سی کمزوریاں نظر آجاتی ہیں۔''

میں نے کہا تو کالیا نے مجھ سے آیندہ کا لائحہ عمل دریافت کرنا چاہا۔

''راکا کو گرفت میں لینا ہے اور راہ میں ان کا جو بھی سسٹم نظر آئے وہ تباہ کر ڈالو۔''

''اس کا کیا کریں؟'' کالیا نے لائیلا کی طرف اشارہ کیا۔ چوں کہ لائیلا کی سہولت اور اسی کے ایماء پر میں اور کالیا آپس میں انگریزی میں ہی باتیں کررہے تھے اسی لیے

www.PakiBooks.Site

میرے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی وہ بولی۔

''میرا کیا کرنا ہے بھلا؟ میں تم جیسے بہادر نوجوانوں کے ساتھ ہوں۔ تم لوگ تو میرے محسن ہو۔ پلیز، ابھی مجھے اپنے ساتھ ہی رکھو۔'' اس کا لہجہ ممنونانہ اور ملتجیانہ تھا۔

''ظاہر ہے تمہیں اکیلا ہم نہیں چھوڑ سکتے لیکن تم بھی ذرا ہشیار رہو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اگر تم نے راکا جیسے بدمعاش پر قابو پانا ہے تو میں اس کے ٹھکانے سے واقف ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں تباہی پھیلنے سے پہلے اس نے وہیں کا ہی رخ کیا ہوگا۔'' لائیلا اچانک انکشاف کرنے کے انداز میں بولی تو میں اور کالیا چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے۔

پھر اس سے پہلے کہ اس سے کچھ دریافت کرتے۔

ہمارے بائیں جانب چند مسلح ہیولے شور مچاتے ہوئے متحرک ہوئے۔ ہماری آپس کی باتوں کی مشغولیت میں وہ ہمارے قریب پہنچ گئے تھے، یہ مشکل پندرہ بیس گز کا فاصلہ ہوگا، شکر تھا کہ کچھ ان کی اپنی بھگدڑ اور تاریکی پھیلنے کے سبب وہ ہمیں نہ دیکھ پائے تھے، اگرچہ وہ یقیناً ہماری ہی تلاش میں اس طرف کو نکل چکے تھے۔ تاہم خوش قسمتی سے ہماری پہلے ان پر نگاہ پڑ گئی تھی۔

میں ان پر حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا، اسی لیے کالیا سے سرگوشی میں ایک چٹانی آڑ کے عقب میں جا چھپنے کا کہہ کر بڑھا تو بدقسمتی سے شاید ہمارے حرکت پذیر وجود ان میں سے کسی کو نظر آگئے۔

تب ہی ان میں کوئی زور سے چیخا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے چلا کر کچھ کہا تھا۔ یقیناً ہم اسے نظر آگئے تھے کیونکہ ان کا رخ ہماری جانب ہوا تھا اور بیک وقت کئی ہتھیاروں کے منہ کھلے تھے، گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ گونجی لیکن تب تک ہم اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔

''تم لوگ جوابی فائرنگ کیوں نہیں کررہے ہو؟'' ایک تنگ سی گھاٹی سے گزرتے ہوئے لائیلا نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ میں دونوں کو لیے کوہ جبل کے دامن سے جنوب مغربی سمت کی طرف بڑھا۔

دفعتاً ایک آواز پر میں ٹھٹک کر رکا اور اپنے ساتھیوں کو ایک چٹانی دیوار سے لگ کر چھپ جانے کا اشارہ کیا اور خود آواز کی سمت کا تعین کرنے لگا، یہ آواز میرے دائیں جانب سے آرہی تھی۔

میں نے لائیلا کو وہیں دیوار سے چپکے کھڑا رہنے کا اور کالیا کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا اور لپک کر اس طرف کو پہنچا۔

ایک چٹانی آڑ سے ذرا سر ابھار کر میں نے دیکھا تو چونک پڑا۔ تین مسلح افراد کسی شخص کو بری طرح زدوکوب کررہے تھے۔

مدھم روشنی میں مذکورہ تین افراد تو مجھے حدی قبیلے کے ہی لگے تھے جبکہ زدوکوب کیا ہوا شخص مجھے کوئی اور لگا لیکن دوسرے ہی لمحے غور سے دیکھنے پر میں چونک پڑا۔

''او برائے گرانٹ!'' میرے لبوں سے سرسراتی آواز ابھری۔ میری دھڑکتی نظریں ان پر جمی رہیں۔

ان تینوں مسلح قبائلیوں میں سے صرف ان کا ایک ساتھی شکستہ سی انگریزی میں او برائے گرانٹ سے مخاطب تھا، شاید صرف اسے ہی انگریزی آتی تھی، باقی دونوں قبائلی خاموش تھے۔

''میں تو خود اس کی تلاش میں آیا ہوں۔ مجھے کیا پتا وہ کن لوگوں کے ساتھ گئی ہے؟'' او برائے گرانٹ ان سے کہہ رہا تھا۔ اس کی حالت بہت طیش ناک ہورہی تھی۔

ان کی خطرناک گرفت کے باوجود وہ ذرا بھی خوف زدہ نظر نہیں آرہا تھا، اس کے برعکس وہ بڑی جی داری سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کررہا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ لوگ لائیلا سے متعلق ہی بات کررہے تھے۔

''تو پھر یقیناً وہ دونوں تمہارے ہمدرد اور ساتھی ہی ہوں گے۔'' ان تینوں میں سے ایک قبائلی نے درشت لہجے میں اس سے کہا۔

''کون دو؟ میرا کوئی ساتھی یا ہمدرد نہیں ہے۔ نہ ہی میں اپنے سوا کسی اور کو یہاں دوست بناتا ہوں۔ مجھے صرف اپنے اس کام سے غرض ہوتی ہے جس کے لیے میں بھیجا جاتا ہوں۔'' گرانٹ ان سے کہہ رہا تھا۔

اسی وقت دوسرے قبائلی نے اپنے پہلے والے ساتھی سے عربی میں کچھ کہا تھا۔ تب وہ پہلے والا گرانٹ سے بولا۔

''لیکن تمہیں ہمارا کام تو کرنا ہی پڑے گا، چلو اب..... تمہارا فیصلہ مسٹر راکا ہی کرے گا۔''

وہ اسے گن پوائنٹ پر لے جانے لگے، گرانٹ اڑ گیا، اپنا بازو ان سے چھڑاتے ہوئے بولا۔ ''پہلے میری ساتھی لائیلا کو تلاش کرو، وہ یقیناً تمہارے کسی مخالف گروپ

www.PakiBooks.Site

کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئی ہوگی، ایسے میں اس کی جان کو سخت خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔"

میں نے دیکھا گرانٹ اپنی گرل فرینڈ کے لیے کچھ زیادہ ہی متفکر اور تشویش زدہ نظر آرہا تھا مگر تینوں قبائلیوں نے اسے پھر زدوکوب کرنا شروع کردیا۔

ایک نے اس کی پہلے سے زخمی پیشانی پر اپنی رائفل کا کندا رسید کردیا، گرانٹ چیخ مار کے گرا۔ باقی دو لاتوں بکوں سے اس پر پل پڑے۔

"نف..... فار گاڈ سیک.....! اس کی مدد کرو، ورنہ یہ وحشی اسے مار ڈالیں گے۔" میں لائیلا کی آواز پر چونکا، کالیا کا بھی یہی حال ہوا، ہمیں پتا ہی نہ چلا تھا کہ وہ کب چپکے سے ہمارے قریب کھسک آئی تھی اور وہ بھی یہ سب دیکھ رہی تھی۔

"شش..... شی، خاموش رہو ذرا!" میں نے اسے چپ رہنے کی تلقین کی۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، اعصاب میرے تنے ہوئے تھے، تب پھر میں ان تینوں قبائلیوں پر حملہ کرنے کے لیے کالیا کو اشارہ کرنے ہی والا تھا کہ اچانک ان تینوں کے ہاتھوں بری طرح پٹتے ہوئے اوبرائے گرانٹ نے شاید ان سے کچھ کہا تھا، جو میں سننے سے قاصر رہا۔

کیونکہ ایک تو میرا دھیان بٹ سا گیا تھا، دوسرے گرانٹ، مار کھانے کے دوران ٹوٹے پھوٹے لہجے اور ہانپتی ہوئی کراہتی آواز میں ان سے وہ مختصر جملہ بولا تھا کہ اچانک جس سے وہ پہلے والے قبائلی سے انگریزی میں مخاطب تھا۔

ایک دم اس نے اپنے بھی ہاتھ روک کر اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی رکنے کا اشارہ کیا۔

تینوں گرانٹ کو مارتے مارتے ہانپنے لگے تھے اور یوں اچانک رک گئے تھے جیسے چابی بھرے کھلونے ہوں۔ نجانے گرانٹ نے ان سے ایسا کیا کہہ دیا تھا؟ میں آخر میں سوچتا ہی رہ گیا۔

پہلے والے قبائلی نے ٹوٹی پھوٹی سہی لیکن انگریزی آتی تھی..... گرانٹ سے میں نے اسے کہتے سنا۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"اتنی..... ببب..... بڑی اور اہم بات میں جھوٹ کیسے بول سکتا ہوں؟" گرانٹ ہانپتے ہوئے بولا۔

"تم نے پھر پہلے ہمیں کیوں نہیں بتایا؟"

"مجھے ڈر تھا کہ..... کہیں اتنی اہم بات کا راز افشا نہ ہوجائے۔" گرانٹ آستین سے اپنی ناک کا خون پونچھتے ہوئے کراہ کر بولا۔ "بلکہ مجھے تو اب بھی یہی ڈر ہے کہ کہیں....."

"بے وقوف ہو تم؟" تخاطب اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے سے اب پہلے والی طیش ناک درشتی پل کے پل عنقا ہونے لگی تھی لیکن پھر فوراً ہی وہ تشکیک بھرے لہجے میں گرانٹ سے مستفسر ہوا۔

"کہیں تم جھوٹ تو نہیں بول رہے؟"

"مم..... میں بھلا اتنی بڑی بات جھوٹ کیسے بول سکتا ہوں؟" گرانٹ کراہتے ہوئے بولا۔ "ایک ٹھوس ثبوت ہے میرے پاس اور تم بھی آسانی سے اس بات کا جھوٹ سچ جان سکتے ہو۔"

"ہم....." قبائلی نے ہنکارا بھرا۔ "چلو ہمارے ساتھ....." بالآخر اس نے تحکمانہ کہا اور اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ وہ اوبرائے گرانٹ کو اب سنبھالنے لگے۔

"ابے لے..... جگری! یہ اب کیا نئی کھچڑی پکنے لگی ہے؟" کالیا نے سرگوشی کی۔

"ی ی..... یہ وحشی اسے کہاں لے جارہے ہیں؟" لائیلا متوحش لہجے میں ہکلائی۔

"تم ذرا خاموش رہو اور ہمیں کچھ سوچنے دو پلیز!" میں نے قدرے جھلا کر اس سے کہا۔ میرا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا کہ آخر گرانٹ نے ان سے ایسا کیا کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ قدرے دوستانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے، یا پھر گرانٹ کوئی چکر چلا رہا تھا ان کے ساتھ؟ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان کا کوئی مطالبہ مان گیا ہو جس کے باعث وہ اس کے اور لائیلا کے دشمن بن گئے تھے۔

میں نے تیزی سے کام کرتے ذہن سے کچھ سوچا اور سوالیہ لہجے میں لائیلا سے مخاطب ہوا۔ "تم نے کہا تھا کہ تمہیں ان کے ٹھکانے کا علم ہے؟"

"ہاں! یہ بھی گرانٹ کو ضرور وہیں لے جارہے ہوں گے۔" وہ بولی۔ "وہ اسے مار ڈالیں گے، پلیز! گرانٹ کو ان کی گرفت سے چھڑانے کی جلد ہی کوئی تدبیر کرو۔"

"اس سالی کی سوئی گرانٹ پر اٹکی ہوئی ہے۔ سمجھ رہی ہے یہ سب آسان ہے اتنا۔" کالیا چڑ کر بولا۔ ظاہر ہے وہ یہ بات اردو میں ہی کہہ سکتا تھا، جس پر لائیلا اس کی طرف

www.PakiBooks.Site

ہونقوں کی طرح دیکھنے لگی۔

"کیا کہا تم نے؟" اس نے پوچھ ہی لیا کالیا سے۔

"ابے لے..... اب یہ بھی بتانا پڑے گا اسے....." وہ جھلایا۔

"وقت ضائع مت کرو۔" میں نے دانت پیس کر لائیلا سے کہا۔ وہ بے چاری میرے درشت رویے پر ذرا خفیف سی ہوگئی۔ "کیا پوچھا تھا میں نے؟"

"تمہاری مراد راکا سے ہے ناں.....؟" لائیلا نے پوچھا۔

"ہاں.....!"

"ان کا تعاقب کرو، یہ گرانٹ کو وہیں لے جارہے ہیں کیونکہ مجھے انہوں نے اغوا اسی لیے کیا تھا کہ انہیں گرانٹ کی تلاش تھی۔"

"انہیں گرانٹ کی تلاش کیوں تھی؟"

"خدا کے لیے یہ بعد میں بتادوں گی میں..... ان کے پیچھے تو چلو....." وہ پھر بے بسی سے بولی۔

"جب تمہیں ان کے ٹھکانے کا بھی علم ہے اور یہ... گرانٹ کو بھی یقیناً اسی جگہ لے جایا جارہا ہے تو فکر کیوں کرتی ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ گرانٹ یا تم سے راکا کی کیا دشمنی ہے؟"

مجھے کچھ شک پڑ گیا تھا کہ ایسا کیا معاملہ درمیان میں ان کے بیچ طے پا گیا تھا کہ گرانٹ کے معاملے میں ان تینوں نے اچانک نرمی برتنا شروع کردی تھی۔

"اب مجھے اتنا تو یقین نہیں ہے کہ وہ گرانٹ کو اپنے ٹھکانے کی طرف ہی لے جارہے ہیں۔"

اس کی بات میں وزن تھا۔ لہٰذا میں نے انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ان کے تعاقب میں اپنے قدم بڑھا دیئے۔ کالیا نے پھر لائیلا کے لیے کوئی جملہ کسنا چاہا تھا مگر میں نے ہولے سے کھنکھار کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

ہم ہنوز خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ یہ وقت چہلیں کرنے کا نہ تھا۔ کالیا کی تو خیر عادت تھی وہ ہر حال میں اسی طرح زندہ دل رہتا تھا۔ لائیلا البتہ پریشان اور متوحش تھی۔

ایک اور درّے سے راستہ پا کر ہم جھکی جھکی چٹانوں کے قریب سے گزرنے لگے۔ وہ چاروں ہم سے اب چند قدموں کے فاصلے پر جارہے تھے۔ ہمارے دائیں جانب اور عقب میں اِکّا دُکّا دھماکوں کی آواز آجاتی تھی۔

وہ سب تتر بتر ہو چکے تھے۔ ہماری تلاش بھی انہوں نے جاری رکھی ہوگی لیکن اب ہم کسی اور راستے سے اسی طرف کو آچکے تھے، یہاں سے ان کے پہاڑی ٹھکانے کا وہ حصہ کچھ دور ہوگیا تھا۔ جہاں میں نے تباہی پھیلائی تھی اور اپنا مشن پورا کیا تھا۔

اب وہاں دشمنوں کے لیے سوائے لکیر پیٹنے کے اور کچھ نہ رہا تھا اسی لیے میں نے اب ادھر کا رخ کرنا بے جا سمجھا تھا مگر لائیلا نے مشورہ دیا تھا کہ ہمیں یہاں سے راکا کے ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے کسی موٹر گاڑی کی ضرورت پڑ سکتی ہے جو ہمیں وہیں سے ہی چرانا تھی۔

اس کی بات غلط نہ تھی لیکن ہم نے اپنی اونٹنی اسی طرف ہی کھڑی کی تھی۔ میں اور کالیا اسی میں جانا چاہتے تھے۔ یوں بھی میں اب دوبارہ دشمنوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا اور بہتر بھی یہی تھا کہ نظروں میں آئے بغیر ہی اب دشمن کے ٹھکانے تک پہنچا جائے۔

تاہم اب یہاں ایک مسئلہ تھا کہ ہم اب تین تھے اور اونٹنی ایک۔

بہرکیف ہمارا اندازہ درست ثابت ہوا، وہاں ایک بغیر ہڈ والی جیپ کھڑی تھی لیکن ساتھ ہی ایک خوشگوار سی حیرت بھی ہوئی۔

وہاں قریب ایک کھجوروں کے جھنڈ کے پاس اونٹ بھی جگالی کرتا نظر آیا۔ میں یہی دعا مانگنے لگا کہ ان میں سے کوئی اونٹ میں نہ سوار ہو لیکن خوش قسمتی سے ایسا نہ ہوا، وہ چاروں اس جیپ میں سوار ہو کر روانہ گئے۔ شکر تھا کہ اس طرف سے ان کا رخ ذرا پرے تھا جہاں ہماری اونٹنی موجود تھی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ ہماری اونٹنی یہاں سے کتنے فاصلے پر ہوسکتی تھی۔

"فاصلہ زیادہ نہیں جگری!" کالیا نے جیسے میرا چہرہ پڑھ لیا۔ "ہم دوڑ کر اپنی اونٹنی تک پہنچ سکتے ہیں لیکن تم دونوں اس اونٹ پر سوار ہوجاؤ، میں پیدل ہی چلتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں ہم تینوں اس میں سوار ہوجائیں گے۔" میں نے کہا۔ "کوئی زیادہ دور تو نہیں جانا، اپنی اونٹنی تک پہنچ جائیں گے تو سواریاں بانٹ لیں گے۔"

جیپ حرکت میں آچکی تھی۔ ہم اس کی روانگی کا انتظار کرنے لگے۔ لائیلا بے چین تھی، میری گھر کی اور کالیا کے

www.PakiBooks.Site

تبصرے نے اسے گرانٹ سے متعلق دوبارہ بولنے سے منع کر رکھا تھا۔

ٹرک کی سمت اور اس کے ذرا دور جانے کا اندازہ کرتے ہی ہم تینوں اپنی جگہ سے نکلے اور اونٹ کی طرف لپکے۔ میں نے پہلے اسے ہشکارے دے کر مخصوص انداز میں پچکارا۔ اس کے قریب گیا اور اس کی گردن پیار سے تھپتھپائی، اونٹ نے اپنا بھدا تھوتھنا میری جانب گھما کر دیکھا اور پھر اسی اطمینان سے جگالی کرنے لگا۔

اس کے بعد میں کالیا اور لائیلا کو اس پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ کالیا تو جھٹ سے سوار ہو گیا البتہ لائیلا ہچکچانے لگی۔ وقت کم تھا، میں نے ہونٹ بھینچ کر لائیلا کا نرم و نازک بازو پکڑا اور کوہان کے پیچھے جہاں کالیا چپکا ہوا تھا، اسے بٹھا دیا اور خود آگے جا بیٹھا۔

اونٹ پر لگام کسی ہوئی تھی وہ میں نے ہاتھوں میں پکڑی اور اسے تھوڑا سا ٹٹکارا۔

دفعتاً اونٹ اپنی خوفناک سی آواز سے کینہ پرور انداز میں بغبغایا اور کھڑا ہو گیا۔ شکر تھا کہ اس نے نئے سواروں کے سامنے کوئی اڑی بازی نہیں کی تھی۔

اونٹ روانہ ہوا اور میں اسے دوڑاتا ہوا اس جگہ جا پہنچا جدھر ہماری اونٹنی کو ''اونٹ کٹارا'' کے پاس موجود ہونا چاہیے تھا۔ وہ وہیں موجود تھی اور جگالی میں مصروف تھی مگر یہاں ایک مسئلہ ہو گیا ہمارے ساتھ۔ اونٹنی کو دیکھ کر کم بخت اونٹ کسی اوباش کی طرح بغبغانے لگا اور بے چین بھی ہونے لگا۔

''لو بھئی..... میاں اونٹ نے مادہ کو دیکھ کر لوفرپن شروع کر دیا۔''

لائیلا بھی ہونقوں کی طرح یہ سب دیکھ رہی تھی۔ بہر طور میں جب کالیا کے ساتھ لائیلا کو اونٹنی میں بیٹھانے لگا تو کالیا نے ہاتھ جوڑ دیے۔ میں نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

کالیا چھلانگ مار کے اونٹ سے اترا اور اونٹنی پر جا سوار ہوا اور میری ہی طرح ٹیکنک آزمائی جو میں نے ہاشم سے ہی سیکھی تھی۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم جیپ کے تعاقب میں روانہ ہو چکے تھے۔

روانہ ہوتے وقت میں دل میں خدا سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ بند کی تباہی کے بعد صرائفہ والوں کی فلج پانی سے بھر گئی ہوں۔ مجھے پتا تھا شہزادی نیلم میری کس قدر مشکور ہوتی بلکہ وہی کہیں پورے صرائفہ کے باشندے بھی ہم اپنا محسن ہی سمجھتے لیکن ابھی میرا مشن پورا نہیں ہوا تھا نہ ہی یہ سفر ابھی تمام ہوا تھا۔

کالیا نے اگرچہ مجھے ایک مشورہ دیا تھا کہ ہمیں اس وقت صرائفہ کا رخ کرنا چاہیے اور بعد میں اس نئی مہم کے لیے نئی پلاننگ کے تحت حدی کا رخ کیا جاتا لیکن میرا دل نہیں مانا تھا، وجہ یہ تھی کہ میں اس اگلی مہم کو بھی اسی مہم کا حصہ سمجھ رہا تھا۔ راکا یا بن رائد کے ٹھکانے پر پہنچنا میرا اصل مقصد تھا اور مجھے لگتا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی فرحانہ کو وہیں قید میں رکھا گیا ہوگا۔ میرے انکار پر کالیا کچھ نہ بولا تھا۔

☆.....☆

رات اب شاید نصف سے زائد بیت چلی تھی۔ آسمان پر چمکتے تارے جیسے ٹنکے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ صحرا میں خنکی تھی۔ حدنگاہ جیسے ریت کا تاریک سمندر پھیلا ہوا تھا۔ کہیں سوکھے اور ٹنڈ منڈ سے درخت تھے اور ایک جانب اونچے نیچے ٹیلوں کے ہیولے عجیب منظر پیش کرتے تھے۔ ایک سوگواری اور یکسانیت طاری تھی ماحول پر، کوئی چپ سی خاموشی تھی جیسے وقت ٹھہر گیا ہو، جیسے اسے موت آ گئی ہو۔

ہمارا اونٹوں پر صحرا کا یہ ہزار کن سفر جاری تھا۔ ہم تاجر بہ کاری کے باعث اپنے اونٹوں کو دوڑا نہیں سکتے تھے۔ بس درمیانی رفتار سے سفر رواں دواں تھا۔

یہ سفر دشمنوں کے تعاقب کا بھی تھا اور ان کی کمین گاہ تک پہنچنے کا بھی۔ جیپ تو ان سے اب تک بہت دور نکل گئی تھی لیکن ہمیں اس کی پروا یوں بھی نہ تھی کہ لائیلا ہمارے ساتھ تھی اور وہ ان کے ٹھکانے تک درست نشاندہی کر رہی تھی کیونکہ ٹھنڈی ریت پر ہم میں سے کوئی کبھی کبھی اتر کر جیپ کے ٹائروں کے نشانات دیکھ کر تسلی کر لیتا تھا۔ منزل کی جانب یوں ہمارا سفر تسلی بخش تھا۔

یہ سفر تقریباً نصف گھنٹا بیتا ہوگا کہ لائیلا پر ایک بار پھر تشویش کا دورہ پڑا، اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ خونخوار قبائلی گرانٹ کوئی جانی نقصان نہ پہنچا دیں۔

''بے فکر رہو مس! اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے ازراہ تشفی اس سے کہا اور اس کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے مزید بولا۔ ''اس لیے کہ اگر انہوں نے گرانٹ کو جانی نقصان پہنچانا ہوتا تو وہ اسے وہیں سنگلاخ گھاٹیوں کے پاس ہی ختم کر ڈالتے۔''

''آخر گرانٹ نے انہیں کیسے رام کیا ہوگا؟'' وہ الجھے ہوئے انداز میں بڑبڑائی۔

''تم نے میرے منہ کا سوال چھین لیا مس لائیلا!'' میں نے کہا۔ ''میں خود حیران ہوں اب تک اس بات پر کہ آخر گرانٹ نے ان سے ایسا کیا کہا تھا کہ وہ ایک دم اپنا اشتعال بھلا کر اس کے ساتھ نرمی سے پیش آنے لگے تھے؟ افسوس میں گرانٹ کے منہ سے وہ الفاظ نہیں سن سکا تھا۔''

میں نے بھی گومگو سے انداز میں کہا۔

پھر چند ثانیے توقف کے بعد اس سے دوبارہ مستفسر ہوا۔

''تم اب تک گرانٹ کے ساتھ رہی ہو، کیا تمہیں کچھ اندازہ نہیں ہو رہا کہ گرانٹ نے ان سے ایسا کیا کہا ہوگا؟''

میرے سوال پر لائیلا سوچتی بن گئی۔ وہ اب میرے پیچھے بیٹھی تھی۔ کالیا اونٹنی پر ہمارے برابر ہی چل رہا تھا اور باتیں بھی ساری سن رہا تھا، میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ گرانٹ کے ساتھ ہوا کیا تھا۔

''اسے معلوم ہوگا بھی تو یہ نہیں بتائے گی ہمیں۔'' کالیا نے لائیلا کی تاکید بھلا کر انگریزی کی بجائے اردو میں مجھ سے کہا تھا۔ لائیلا کو اس بات پر کالیا سے بار بار خار محسوس ہوتی تھی کیونکہ وہ ہماری گفتگو سمجھنے سے اس طرح قاصر تھی اور اب مجھے لگتا تھا کہ وہ بھی جان بوجھ کر اسے تپانے لگا ہوا تھا۔

''مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے کچھ گڑبڑ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے زیادہ امکان یہی ہے کہ اوبرائے گرانٹ ان کے ساتھ ملاپ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' میں نے بات مکمل کی مگر کالیا کچھ نہ بولا۔

''تم دونوں اوبرائے گرانٹ کے بارے میں باتیں کر رہے ہو؟'' لائیلا نے بے چینی سے کہا۔ اردو کے بیچ گرانٹ کے نام نے ہی اسے چونکایا تھا۔ ''افوہ..... آخر تم آپس میں انگریزی میں باتیں کیوں نہیں کرتے؟ تاکہ میں کچھ سمجھ سکوں۔''

''تمہیں سمجھنے کی کیا ضرورت ہے میم صاحب!'' کالیا حسب سابق اس سے لاابالی پن سے بولا۔ ''اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا، اردو ہمیں آسان لگتی ہے، ہم انگریزی میں منہ اور جبڑا ٹیڑھا میڑھا کر کے نہیں بات کر سکتے۔''

مجھے ان حالات میں بھی کالیا کی بات پر ہنسی آ گئی۔ وہ جانے کیوں لائیلا کو زچ کرنے پر تلا ہوا تھا، شاید اس کی وجہ یہی رہی ہو کہ لائیلا خواہ مخواہ ہی ہمارے سر پر سوار ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس میں اس بے چاری کا بھی کوئی قصور نہ تھا لیکن اب راکا کی اور برائے گرانٹ سے دشمنی نے مجھے ایک عجیب سے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔

میں نے لائیلا سے دریافت کرنا چاہا۔ ''کیا تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ تمہارے بوائے فرینڈ اور راکا کی آپس میں کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟''

''ابے لے..... جگری!'' کالیا نے اچانک دوبارہ ٹانگ اڑائی۔ ''یہ سب راز بعد میں کھل جائیں گے، اس سے ابھی یہ پوچھ کہ ان کا ٹھکانا آبادی میں ہے یا اس سے ہٹ کر ہے، ورنہ ہمارا آبادی میں اس طرح داخل ہونا مشکوک ہو جائے گا، ہمیں اونٹوں کو چھوڑنا پڑے گا پھر.....''

''تو یہ سب تم لائیلا سے پوچھ لو ناں۔'' میں نے بھی اس سے چڑ کر کہا۔ ''میں کب تک تمہاری اور اس کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتا رہوں۔''

کالیا ہنس پڑا اور وہی سوال لائیلا سے شکستہ سی انگریزی میں کر ڈالا۔

''ان کا ٹھکانا آبادی کے وسط میں ایک عالیشان محل کے اندر ہے۔ جہاں بن رائد رہتا ہے۔'' لائیلا نے جواب میں بتایا۔ ''لیکن مجھے واقعی نہیں معلوم اور نہ ہی اندازہ ہے کہ وہ لوگ اوبرائے گرانٹ کے دشمن کیوں بن گئے تھے؟ حالانکہ بن رائد نے اپنے محل میں ہماری شان دار دعوت بھی کی تھی۔ راکا بھی اس وقت وہیں موجود تھا۔''

''آبادی کتنی دور رہ گئی ہے اب؟'' کالیا نے اگلا سوال داغا۔

''میرا خیال ہے چند کلومیٹر، یا دس سے بارہ کلومیٹر مزید۔'' وہ جواباً بولی۔

ہم اب خاموشی سے سفر کرتے رہے۔ جیپ کے ٹائروں کی نشاندہی بھی کیے جا رہے تھے۔ صحرا کے تاروں بھرے آسمان پر اب طباق چاند کا سنہرا مکھڑا عین وسط میں جگمگانے لگا تھا۔ ریت پر جیپ کے ٹائر اب واضح اور بل کھاتے جاتے صاف نظر آنے لگے تھے، اب ہم بار بار اونٹ سے اتر کر تصدیق کرنے میں وقت کا زیاں کرنے سے بچ گئے تھے۔

مزید نصف سے پون گھنٹے بعد بالآخر ذرا ہی دیر میں نخلستان کے آثار نظر آنے لگے اور پھر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کے عقب اور پیش گرد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جھگی

www.PakiBooks.Site

جھگی اور مخروطی چھتوں والے گھروں اور مکانوں کے ہیولے بھی نمودار ہوتے دکھائی دینے لگے تھے۔

کالیا کی ہدایت کے مطابق ہمیں اونٹوں کو خیر آباد کہنا پڑا مگر اس طرح کہ انہیں نخلستان کے دوسری جانب جدھر ایک قدرتی جھیل تھی وہاں کھجوروں کے ایک گھنے جھنڈ دار درختوں کے درمیان باندھ دیا۔

نر اونٹ جیسے اپنی ''مراد'' بر آنے پر ہولے سے بغبغایا۔ مادہ کو اس کے قریب ہی باندھا گیا تھا۔ مادہ نے تھوڑا نخرہ کیا اس کے بعد وہ بھی نر کے ساتھ ''اٹھکیلیوں'' میں مصروف ہوگئی۔ لائیلا نے اپنا چہرہ گھما لیا تو کالیا دانستہ معنی خیز انداز میں کھنکھار کر مجھ سے بولا۔ ''شرما تو ایسے رہی ہے جیسے......''

''اچھا تم اپنی بکواس بند کرو اور مت بھولو کہ ہم خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔'' میں نے اسے گھور کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ہم آگے بڑھنے لگے۔ کھجوروں کے درخت کی لمبی قطار کسی وسیع و عریض باغ کی دیوار کے ساتھ دور تک چلی گئی تھی۔ گھروں میں خاموشی اور رات کی آسیبی تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔ کسی کسی مکان کے صحن سے پھیکی پھیکی روشنی نظر آتی تھی۔

ہم اسی کی آڑ لیے محتاط روی سے آگے بڑھنے لگے۔ ابھی تھوڑی ہی دور چلے ہوں گے کہ ہمیں رکنا پڑا۔

سامنے ایک کھلا سا میدان تھا۔ وہاں ہمیں اچھی خاصی روشنی نظر آئی۔ کئی مسلح اور غیر مسلح افراد کا مجمع وہاں نظر آیا، وہ سب آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے اور ان کی باتوں کی بھنبھناہٹ پر سکوت تاریکی میں عجیب تاثر پیش کرتی تھی۔ کچھ موٹر گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ انہی میں وہی بغیر ہُڈ والی جیپ بھی کھڑی تھی۔ ہم ٹھیک جگہ پہنچے تھے۔

''محل یہاں سے کتنی دور ہے؟'' میں نے لائیلا سے پوچھا۔

''اس میدان کو پار کرتے ہی وہ دکھائی دے جائے گا ہمیں...... وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے بن رائد کا محل۔''

''مگر بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟'' کالیا بولا۔ ''ان کے درمیان سے کیسے گزریں گے؟''

''اس دیوار کو پھاند کر باغ والے راستے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' میں نے تجویز سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دوسری طرف باغ کا گیٹ ضرور ہوگا۔''

ہم نے دیوار کا جائزہ لیا۔ وہ صرف پانچ فٹ بلند تھی۔ میرا قد مقابلتاً دراز تھا اسی لیے پہلے میں نے ذرا اچھل کر گارے مٹی والی کچی دیوار کی منڈیروں پر اپنے دونوں ہاتھ جمائے اس کے بعد اپنا جسم اس پر ٹکا کر پہلے لائیلا کو ہاتھ سے کھینچ کر اوپر آنے میں مدد دی اس کے بعد کالیا بھی آ گیا۔

بغیر وقت ضائع کیے ہم دوسری جانب کود گئے۔ باغ میں اندرونی دیوار کے ساتھ ساتھ درخت ایستادہ تھے، وسط میں سبزی اور پھل کے درخت اور اسی طرح کے نباتات اگے ہوئے نظر آتے تھے۔

باغ میں اندھیرا تھا لیکن کہیں کافی فاصلوں سے چند بلب لگا کر روشنی کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔ اسی روشنی میں میری گردشی متلاشی نظروں نے دوسری جانب کا گیٹ دیکھ لیا، نہ بھی ہوتا تو ہم با آسانی سابقہ تیکنک استعمال کر کے دوسری جانب نکل سکتے تھے۔

ہم نے تیزی سے آگے قدم بڑھا دیے۔ ابھی گیٹ سے چند ہی فاصلے پر تھے کہ اچانک مجھے اپنے دائیں جانب سے کسی جانور کی خونخوار غراہٹ سنائی دی۔ ہم تینوں چلتے چلتے ٹھہر گئے۔

اندھیرے میں ہمیں دو آنکھیں چمکتی نظر آئیں، خدا جانے یہ کیا بلا تھی؟ مگر پردۂ ظلمت سے ظہور پذیر ہونے میں اس نے بھی دیر نہ لگائی، وہ بلا جب گرجتی ہوئی نمودار ہوئی تو عقدہ کھلا کہ وہ ایک غیر معمولی جسیم والا شکاری کتا تھا۔ رنگ اس کا کالا تھا۔ وہ شاید باغ کی چوکیداری پر متعین تھا۔ وہ زور سے بھونکا، جس کا مقصد جلد ہی ہمارے سامنے ظاہر ہوا۔ اس کے بھونکتے ہی باغ کے قریب مشرقی سمت سے بھی ایک اور کتا بھونکا اور تیسرے کتے کی بھی چوتھی سمت سے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ خدی میں ہمارے اس طرح چوروں کی طرح داخلے کا بھانڈا پھوٹنے ہی والا تھا۔

''گیٹ کی طرف بھاگو......'' میں نے کہا۔ میری آواز ہی نہیں لہجہ بھی مرتعش تھا۔

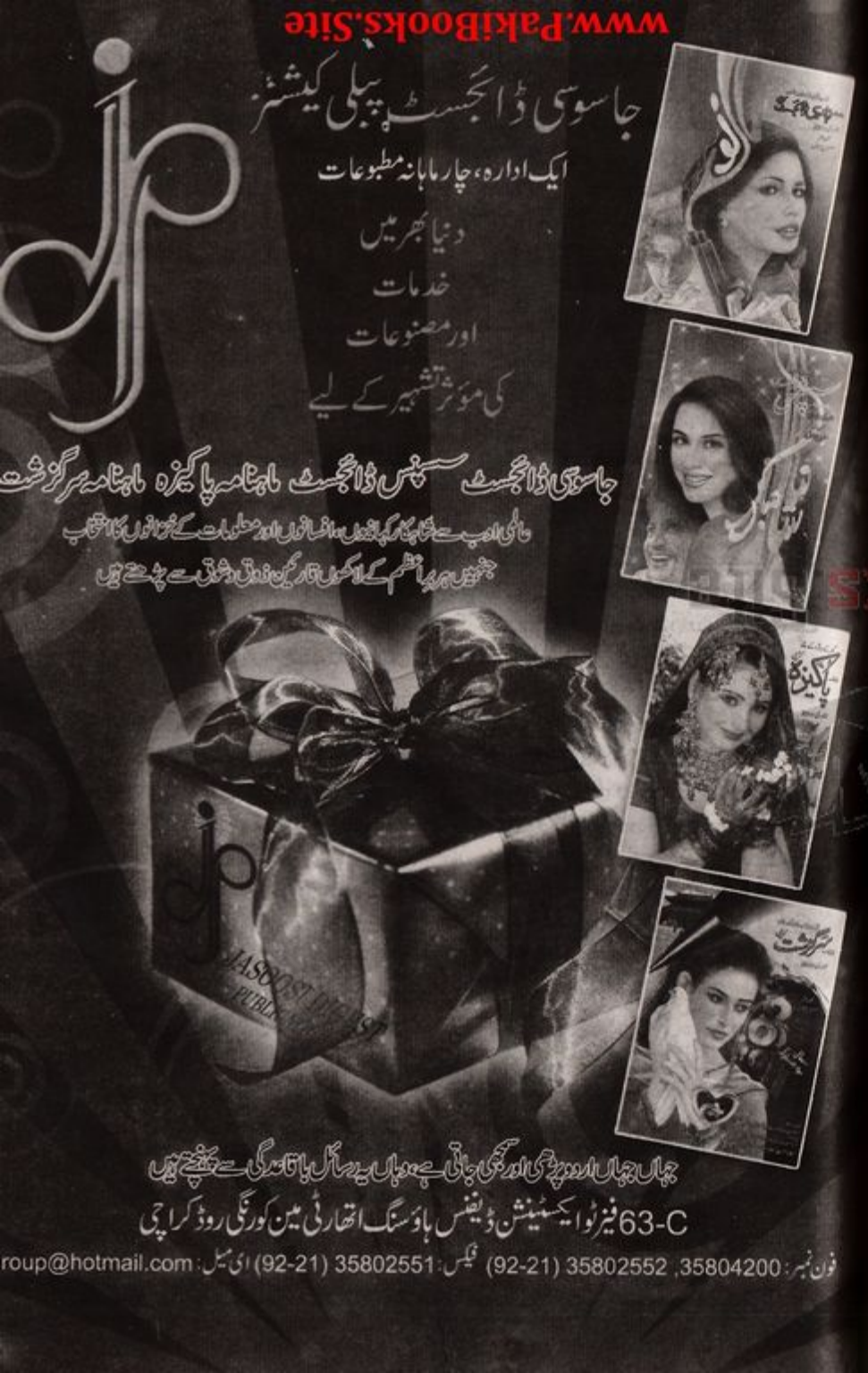

''یہ خطرناک غلطی بھول کر بھی مت کرنا جگری!'' کالیا نے اس قریب میں موجود کتے پر بدستور نظریں جمائے ہوئے منجمد سے لہجے میں کہا۔ ''یہ خطرناک شکاری کتے ہیں اور ہماری تکا بوٹی کر ڈالنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائیں گے۔ ہتھیار کا استعمال ناگزیر ہو گیا ہے۔''

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

ادھر کتوں کے بھونکنے اور غراہٹوں کی آوازیں عروج پر پہنچ گئی تھیں۔ ہم جس آفت سے بچ رہے تھے وہی گلے پڑ رہی تھی۔ ہماری موجودگی کا بھانڈا پھوٹ رہا تھا۔ پہلے والے کتے نے غرا کر مجھ پر حملہ کیا۔

میں اپنی گن کو سنگل شاٹ پر ایڈجسٹ کر چکا تھا۔ میں نے ٹرائیگر دبا دیا۔ کتے کو گولی لگتے ہی اس کے بھونکنے اور غرانے کی آواز ''کوں'' میں بدل اور وہ وہیں خاموش ہو کر پڑ گیا۔

باقی دو کتے بھی اپنی کمین گاہوں سے گولی کی طرح نکلے اور کالیا کی دونوں گولیوں کا شکار ہو گئے۔ باہر مذکورہ میدان میں مجمع کی بھنبھناہٹ یک دم شور میں بدل گئی۔ انہوں نے پہلے شاید کتوں کے بھونکنے کو اتنی فوقیت نہیں دی ہوگی مگر تین گولیاں چلنے کے دھماکوں کو بالکل بھی نظر انداز نہیں کیا ہوگا۔

''اب دوڑ گیٹ کی طرف..... جلدی۔'' کالیا چیخا۔

ہم نے دوڑ لگا دی۔

گیٹ تک پہنچنے تو ہمیں ٹھنک کر رکنا پڑا، وہاں پہلے ہی سے پانچ چھ مسلح قبائلی موجود تھے۔

''ان پر گولی مت چلانا۔ اس طرف دوڑو.....'' میں نے سرسراتی آواز میں کہا اور گیٹ کے بائیں جانب اشارہ کیا۔ ہم آگے دوڑے اور جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ تاریکی کی آڑ لیے بھاگتے چلے گئے۔

مسلح افراد باغ کے گیٹ کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ ابھی ان کی ہم پر نگاہ نہیں پڑ سکی تھی۔ تاہم وہ تین مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ میں نے پہلے انہیں جل دینے کا سوچا تھا، اس طرح کہ کسی کھجور کے درختوں کی آڑ میں ہو جاتے، پھر جب یہ لوگ متوقع طور پر اِدھر اُدھر ہو جاتے تو گیٹ سے ہی نکل لیا جاتا مگر یہاں معاملہ دو ایک افراد کا نہ تھا، پورا مجمع تھا، گیٹ پر بھی دو تین موجود ہو سکتے تھے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق جب ہم باغ کے ایک نسبتاً دور افتادہ کونے میں پہنچے تو بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ پہلے والی تیکنک اپلائی کرتے ہوئے دیوار پھاندنے کی کوشش چاہی، پہلے میں اچھل کر منڈیر پر آیا۔ دوسری جانب تاریک سناٹا تھا، راستہ صاف پا کر میں نے لائیلا کو ہاتھ دیا اس کے بعد کالیا کو..... میں منڈیر سے لائیلا سمیت نیچے کودا، اسی وقت گولی چلنے کا دھماکا ہوا، کالیا میرے قریب گرا، اس کے حلق سے کراہ خارج ہو گئی۔ لائیلا کی بھی غیر ارادی چیخ برآمد ہوئی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''کک..... کالیا! تت..... تو ٹھیک ہے نا''؟ میں نے دھک دھک کرتے دل سے اسے فوراً سنبھالتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ایک ہی نگاہ میں اس کا جائزہ بھی لیا۔

''بال بال بچ گیا۔ بھاگ چلو اب!'' وہ بولا اور میں نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر ہم ایک طرف کو دوڑے۔

باغ سے دوری ہماری ابھی بہ مشکل پچیس تیس گز کی تھی کہ ہمیں دور کسی نسبتاً بلند اور وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی عمارت کے خاکے پر نظر پڑی۔

ہم مکانوں کی بے ترتیب قطاروں کے درمیان بنی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے اس طرف پہنچے۔

باقیوں کو ہم اپنے عقب میں باغ کے اندر مصروف کر آئے تھے۔ تاہم زیادہ خوش فہمی ہمیں بھی نہیں تھی کہ کوئی ہمارے تعاقب میں نہیں آ سکتا تھا کیونکہ باغ کی دیوار سے دوسری جانب پھلانگتے ہوئے ہم دیکھ لیے گئے تھے، کیونکہ کالیا پر فائر ہونے کا یہی مطلب تھا۔

ہم نے کچھ گھروں کے دروازے بھی کھلتے دیکھے تھے۔ ایک خیال یہ بھی دل میں آیا کہ محل میں داخلے کا خیال چھوڑ کر صحرائی ویرانوں کی طرف نکل لیا جاتا اور پھر بعد میں اس مہم کو نمٹایا جاتا لیکن بہ قول کالیا کہ اب یہ بھی ممکن نہ رہا تھا۔ یعنی ہم ایک بند گلی میں گھر چکے تھے۔

گلی پار کی تو محل کی عمارت بہت قریب نظر آئی، اس طرف آس پاس جھاڑیوں اور درختوں کی بہتات دیکھ کر ہمارے ڈھتے ہوئے حوصلے پھر بلند ہو گئے، ہم نے بلا دیر اسی جانب رخ کیا۔

وہاں پہنچے تو ایک عقدہ کھلا، کھجوروں کے باغ کے دامن میں ہمیں ایک اور نسبتاً چھوٹی عمارت کی دیواروں کے ہیولے نظر آئے۔

وہاں ویرانی دیکھنے میں آتی تھی۔

''اس طرف بڑھو۔'' میں نے کسی خیال کے تحت کہا اور قدم بڑھا دیے۔

''لیکن وہ بن رائد کا ٹھکانا نہیں ہے، کمپنی کی عمارت ہے۔'' لائیلا نے اس طرف بڑھنے پر گویا اعتراض اٹھا دیا۔

''کمپنی کی عمارت سے کیا مراد ہے تمہاری؟'' میں اس کی بات پر چونک کر رکا اور سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ کالیا کی نظریں محل پر جمی ہوئی تھیں وہ کچھ

www.PakiBooks.Site

دیکھنے کی کوشش میں لگتا تھا۔

''گلفو آئل کمپنی کے دفتر کی ایک برانچ آفس یہاں بھی کھولی گئی ہے۔ بن رائد ادھر ہی بیٹھتا ہے۔'' لائیلا نے بتایا۔ ''گروپ منیجر اور اس کا ایک پاکستانی پارٹنر مسٹر شاہ میر، ایک امریکن آئل کمپنی ووڈ ورتھ کا نمائندہ ڈائریکٹر مسٹر تھیوڈر بروکس بھی یہاں ہوتا ہے۔''

لائیلا کی بات سنتے ہی میری کنپٹیوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ چند عنوان مرحلہ وار میرے ذہن رسا میں ایک ترتیب سے گردش کرتے چلے گئے۔

''بلیک ڈیول..... آئل پروڈکشن پلیٹ فارم..... آئل رگ..... اسلامی دنیا کی تباہی کا گریٹر مگر ناپاک منصوبہ..... یہودی نژاد امریکی مسٹر ڈی کارلو..... اور راکا اور او برائے گرانٹ..... تھیوڈر بروکس اور بلیک ڈیول۔'' جیسے کوئی حساب یا الجبرا کا سولوشن تھا جو ان اعداد کے مرکب کا بانڈ مکمل ہوتے ہی جواب از خود ظاہر ہو گیا تھا۔

میرے ذہن کے کمپیوٹر میں خیالات کا سرور از خود سرچ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ خیالات کی انگلیاں قیافہ شناسی کے کیلکولیٹر پر تیزی سے پنچنگ کرنے لگیں تو بالترتیب فہرست یوں بنی۔

''مسٹر ڈی کارلو۔ اہم دست راست تھا سات پردوں میں چھپے ہوئے بلیک ڈیول کا۔ تھیوڈر بروکس حسان بن رائد کا نمبر بعد میں آتا تھا، پھر راکا، شاہ میر اور آخر میں او برائے گرانٹ۔''

گویا یہ بلیک ڈیول کے ''فرنٹ لائن'' کارپردازوں کی ایک طویل فہرست تھی۔

یہ ساری اگرچہ میری اب تک کے حالات میں قیافہ شناسی تھی۔

''ابے لے..... جگری! تو کیا سوچنے لگ گیا؟'' کالیا نے مجھے ذرا دیر تک سوچتا پا کر کہا۔ میں نے اسے نظر انداز کیا اور لائیلا سے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''کیمپ تھری گلفو آئل کی سب سے بڑی دفتری اور رہائشی کالونی ہے پھر یہاں اس کی برانچ آفس کھولنے کی وجہ؟''

کالیا پھر نہیں بولا، وہ شاید میرے چہرے کی کھنڈی ہوئی متانت اور موضوع کی نزاکت بھانپ کر خاموش ہو رہا تھا۔

''اس کے بارے میں مجھے زیادہ معلوم نہیں، یہ تو وہی بتا سکتے ہیں اور تمہیں یہ سب معلوم نہیں؟ جبکہ تم نے تو ہم سے (او برائے گرانٹ کو ملا کر) کہا تھا کہ تم بھی انہی کے کام سے یہاں آئے ہو؟'' لائیلا نے جواب دیا اور آخر میں سوال بھی داغ دیا۔

''ہاں! لیکن شاید تمہیں اور گرانٹ کو اندر کے معاملات کا علم نہیں ہے۔''

وہ ایک الجھن آمیز خاموشی کا شکار ہو گئی۔ اچانک کہیں قریب دور سے کچھ لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کالیا نے جلدی سے کہا۔

''محل میں کسی خاص پہرے کا اندازہ نہیں ہوتا۔ کیا اندر بھی یہی صورتِ حال رہی ہوگی؟ میرا مطلب ہے وہ لوگ ہماری تلاش میں یہاں آ رہے ہیں، ہمیں محل میں نقب لگانی چاہیے۔''

''نہیں، اس عمارت کی طرف بڑھو۔'' میں نے فوراً کہا اور آگے قدم بڑھا دیے۔

کھجوروں کے باغ اور درختوں میں گھری اس مٹیالے رنگ کی دفتری عمارت میں ویرانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میرے نزدیک اس وقت چھپنے کے لیے یہ سب سے بہترین جگہ تھی۔ اس کی باؤنڈری وال بھی مختصر تھی۔ گیٹ، بس ایک سنگل پٹ کا پھاٹک ہی تھا۔ گرد و پیش کا تیزی سے جائزہ لینے کے دوران اس تسلی کے بعد کہ کوئی چوکیدار وغیرہ نہ تھا ہم پٹ کو دھکیلتے ہوئے عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔

شاید محل کے قرب میں واقع ہونے کے سبب یہاں چوکیداری کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔

عمارت کے در و دیواروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ میرے ٹھیک اندازے کے مطابق اس کا رقبہ ایک ہزار گز سے زیادہ نہ تھا۔ یہ قدرے مستطیل اور دوسرے زاویے سے مربع لگتی تھی۔ چھت پر دوفٹ کی ٹاپ وال تھی۔

عمارت ایک منزلہ تھی۔ اس میں نیلا اور سفید رنگ نمایاں تھا۔ کوریڈور میں قطار کی صورت میں چھوٹے بڑے کمرے نظر آ رہے تھے جن پر تالے پڑے تھے۔ کہیں کہیں اِکا دُکا بلب جلتے چھوڑے ہوئے تھے۔ دو زینے بھی اوپری منزل کو جاتے دکھائی دیے۔ ہم دبے پاؤں مگر تیزی سے زینے طے کرتے چلے گئے۔

یہاں بھی یہی کچھ تھا۔ عمارت خالی تھی مگر لگتا ایسا ہی

www.PakiBooks.Site

تھا کہ یہاں کام ہوتا تھا۔

ہم چھت پر آگئے، میں یہاں سے گردوپیش کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ہم سب چھت کی منڈیر سے سر ابھار کر عمارت کے اطراف میں دیکھنے لگے۔

محل تو صاف نظر آتا تھا بلکہ اس کا بیرونی گیٹ اور وسیع احاطہ بھی ظاہر ہوتا تھا جہاں چند چھوٹی بڑی گاڑیاں اور بہت سے لوگ جمع تھے، ان میں مسلح بھی تھے۔ وہ بھی جنہوں نے مجبور کے باغ سے ہمارا پیچھا کیا تھا۔

''لگتا ہے، ان لوگوں کا ہماری طرف دھیان نہیں گیا ہے۔'' کالیا نے خیال ظاہر کیا۔ ''ورنہ یہ لوگ ہماری تلاش میں اس عمارت کی طرف ضرور آتے۔''

''ہوسکتا ہے، ہمیں انہوں نے باغ کا چور سمجھا ہو۔'' میں نے کہا۔

لائیلا بولی۔ ''لیکن ہم زیادہ دیر اس ویران عمارت میں نہیں رہ سکتے۔''

''ہمارا یہاں بستر ڈالنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں۔'' کالیا نے کہا۔ ''مگر عارضی طور پر یہاں ٹھکانا بنانے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ ہم یہاں آرام سے بیٹھ کر آئندہ کا کوئی لائحہ عمل ترتیب دے سکتے ہیں۔''

''ہم......'' میں نے ہونٹ بھینچے ہوئے پُرسوچ ہنکاری خارج کی تھی۔ ''لیکن ہمیں اس خوش فہمی میں ہرگز نہیں پڑنا چاہیے کہ یہاں بھی کوئی نہیں آسکتا۔ صبح ہوتے ہی یہاں کے دفتری معمولات کی ابتداء ہوجائے گی۔ لوگوں کی آوک جاوک شروع ہوتے ہی ہم کسی کی بھی نظروں میں آسکتے ہیں۔''

''ابے لے...... جگری! تو کیا تمہارا یہاں مستقل ڈیرہ ڈالنے کا ارادہ ہے؟'' کالیا نے میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کم از کم ایک دو دن تو ضرور لگ ہی جائیں گے، کیونکہ اب موجودہ حالات کے سبب ہمارا مشن کچھ طویل ہوسکتا ہے۔''

''تم لوگوں کا مشن کیا ہے آخر؟'' لائیلا نے بالآخر پوچھ لیا۔ میں لائیلا کے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا اور فوری طور پر مجھے کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا مگر جلد ہی یہ مشکل کالیا نے حل کرڈالی۔ اس سے بولا۔ ''تمہارے بوائے فرینڈ کی آزادی۔''

''لیکن میں نہیں سمجھتی کہ وہ اب زیادہ خطرے میں ہے۔'' لائیلا نے اچانک پوری تسلی سے جواب دیا اور اس کے اس طمانیت بھرے انداز نے مجھے ہی نہیں کالیا کو بھی چونکا دیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے اسی لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم اپنے بوائے فرینڈ کے لیے اس قدر فکرمند ہورہی تھیں؟ اب یہ اچانک اس کی جانب سے تم مطمئن کیسے ہوگئیں؟''

مجھے اسی وقت شبہ ہوگیا تھا جب وہ تینوں گرانٹ کو ہلاک کرنے پر تلے ہوئے تھے مگر پھر اچانک گرانٹ نے نجانے ان سے کیا کہا تھا کہ ان کا رویّہ اس سے نرم ہوگیا تھا۔ میں نے لائیلا سے اس کی وجہ بھی پوچھنا چاہی تھی مگر وہ ٹال گئی تھی۔

تب ہی میری بھانپتی ہوئی نظروں نے دیکھا کہ لائیلا کچھ چور سی بن گئی تھی۔ ''ہم...... میرا ابھی پوری طرح سے نہیں خیال کہ وہ گرانٹ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، وہ تو ابھی تک خطرہ میں گھرا ہوا ہے، جب تک وہ ان کے درمیان میں موجود ہے۔ ہاں، البتہ جان کے فوری خطرے کے پیش نظر وہ بچ گیا ہے۔'' اس نے بڑی عیاری سے بات گھمادی تھی۔ کچھ ایسا تھا جو لائیلا بھی جانتی تھی مگر بتانے سے ہچکچا رہی تھی۔

''جگری! دال میں کچھ کالا لگتا ہے، اس سے دوٹوک بات کرو۔'' اچانک کالیا نے مجھ سے اردو میں کہا۔ وہ اب لائیلا کی ہدایت کی پروا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر، ہم یونہی اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں تمہاری خاطر...... تم خود ہی پھر چلی جاؤ بن رائد کے محل میں اور اپنے بوائے فرینڈ کی تسلی کرلو۔ اب تو ان کے بیچ معاملہ داری بھی ہوچکی ہوگی۔''

میں نے اندھیرے میں ایک تیر پھینکا پھر اس وقت میری حیرت انتہا کو چھوگئی، کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ گھبرا کے اصل بات میرے سامنے اگل دے گی لیکن اس کے برعکس اس نے کندھے اچکا دیے اور بولی۔ ''ٹھیک ہے! جیسے تمہاری مرضی، مجھے کوئی اعتراض نہیں، میرے سامنے ہی تو بن رائد کا محل ہے، میں ابھی چلی جاتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر پلٹ کر زینے کی طرف چلی تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

کالیا کے منہ سے بھی ہولے سے گومگوانداز میں ''ابے لے......'' برآمد ہوا تھا۔

''ٹھہرو......!'' میں نے اسے پکارا، مگر دوسرے ہی

لمحے عجیب واقعہ پیش آیا، میرے دیکھتے ہی دیکھتے لائیلا نے دوڑ لگادی۔

''ابے لے...... جگری! پکڑ اسے...... جانے نہ پائے۔'' پھر ہم دونوں اس کی طرف دوڑے۔ لائیلا غیر معمولی طور پر پھرتیلی اور چالاک ثابت ہوئی تھی۔ میری آواز سنتے ہی وہ اس تیزی سے دوڑتی چلی گئی تھی کہ زینے پر جا کر غائب ہوگئی۔

''کمینی! ہمارا سارا منصوبہ فیل کردے گی جگری!'' کالیا ہانپتے ہوئے بولا۔ ہم دونوں اس وقت تک دوڑتے ہوئے زینے تک آپہنچے تھے۔ وہ نیچے جاچکی تھی۔

اسی طرح دوڑنے کے دوران کالیا کے تبصرے جاری تھے۔ ''محل میں پہنچتے ہی یہ سب سے پہلے ہمارا بھانڈا پھوڑے گی۔''

میرا پورا دھیان اس وقت لائیلا کی طرف تھا۔ اس کے تبصرے فضول تھے، اس لیے کہ ان سب خدشات کا لامحالہ درست ہونا یقینی تھا۔ ہم نیچے آئے تو میرا پاؤں رپٹ گیا۔ میں گرا اور کوریڈور کے چکنے فرش پر پھسلتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا، میرے پیچھے کالیا اندھادھند دوڑا آرہا تھا، وہ مجھ سے ٹکرا گیا اور گرتے وقت اس کے حلق سے غیرارادی چیخ کے بجائے ''ابے لے......'' برآمد ہوا تھا۔

ہم دونوں جب تک سنبھل کر اٹھے، لائیلا یہ جا وہ جا۔ ہم پھاٹک تک گئے اور رک کر بری طرح ہانپنے لگے۔ وہ کھجوروں کے تاریک باغ کے اندر غائب ہوچکی تھی۔ یہاں سے محل تک راستہ جاتا تھا جو زیادہ دور نہ تھا۔

''اب نکل چل یہاں سے جگری!'' کالیا نے بے ترتیب سانسوں کے درمیان مجھے مشورہ دیا۔ ''وہ کمینی سب سے پہلے ہمارے بارے میں بن رائد کو مطلع کرے گی۔ اس کا دھاکڑ بوائے فرینڈ ان لوگوں سے کوئی اندرونی معاملہ داری کرچکا ہے اور اس کی چڑیلی گرل فرینڈ ہمیں غچہ......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی، اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑابڑی کی آواز ابھری تھی اور دل خراش نسوانی چیخ نے پیش گرد کے ماحول کا سکوت غارت کردیا۔ ہم دونوں بری طرح ٹھٹھک گئے۔

''ابے لے...... گئی سالی......!'' کالیا کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا۔ ایک ہی قدم پر کالیا نے مجھے روک لیا۔

''کیا کرتا ہے جگری؟ آگے خطرہ ہے، اب واپس پلٹ۔'' میں گم صم سا تھا لیکن پھر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے پلٹا۔

ہم دوبارہ عمارت کے اندر زینے طے کرتے ہوئے اوپری منزل پر آگئے۔

یہاں منڈیر سے سر ذرا ابھار کر باغ کی سمت دیکھنے لگے۔ وہاں کچھ روشنیاں نظر آنے لگیں۔

''اب یہاں عمارت میں ہمیں فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں۔'' کالیا بولا۔ ''وہ نہیں بچی ہوگی۔ اس نے یوں اندھادھند دوڑنے کی بڑی بھیانک سزا بھگتی ہے۔ وہ اب ہمارے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتا پائے گی۔''

''وہ آخری سانسوں میں بھی بھانڈا پھوڑ سکتی ہے ہمارا۔'' میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔

''میرا نہیں خیال کہ اس قدر گولیوں کی تیز بوچھاڑ میں وہ زندہ رہی ہوگی۔'' کالیا نے جاندار تبصرہ کیا۔

مجھے لائیلا کے اس اچانک اور غیر متوقع عبرت ناک انجام کا بہرحال افسوس تھا۔ مجھے چپ سی لگ گئی تھی۔

''کیا ہوا جگری؟ لگتا ہے تجھے افسوس ہے اس کے مرنے کا؟'' کالیا نے کہا۔

''ہاں۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''وہ بہت کچھ جانتی تھی مگر......''

''ابے لے......! ہماری اس میں کوئی غلطی نہیں تھی، یہ اس کی اپنی بے وقوفی تھی۔'' کالیا بولا۔

''اسے پتا ہونا چاہیے تھا کہ وہ جبل پر خدی والوں کے بندی ہمارے ہاتھوں تباہی کے بعد بن رائد کے کتے دانت نکوسے ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور بیرونی باغ کے اندر بھی انہیں ہماری موجودگی کا احساس ہوگیا تھا۔ ایسے میں لائیلا...... کیا وہ خونی ہرکارے ہر نظر آنے والی مشکوک شے کو ہمارے مغالطے میں گولی مار سکتے تھے۔''

''اسے یہ زعم تھا کہ وہ ان کے ساتھ مل کر گرانٹ سے اپنے تعلق کا بتادے گی اور وہ اسے اپنی ساتھی کی حیثیت سے محل میں پہنچادیں گے۔''

''یہی تو اس کی بھول تھی۔ بن رائد کے ہرکارے نہ صرف خونی ہیں بلکہ جاہل بھی ہیں۔'' کالیا نے کہا۔ پھر وہ باغ سے نظریں ہٹا کر چھت کا جائزہ لینے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ اچانک اس کی نظریں چھت کے مشرقی کونے پر پڑیں۔

''تم ادھر باغ اور پھاٹک پر نظریں لگائے رکھو میں

www.PakiBooks.Site

ابھی وہاں کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مذکورہ سمت کی طرف جھکے جھکے انداز میں بڑھ گیا۔ میں الجھ سا گیا۔ بہ ظاہر میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

میں نے دوبارہ باغ کی سمت نظریں گاڑ دیں، اسی رخ سے عمارت کا پھاٹک بھی نظر آتا تھا۔ اچانک میں چونکا۔ میں نے باغ سے کئی مسلح افراد کو نمودار ہوتے دیکھا، ان کے ہاتھوں میں ہنٹرے اور ٹارچیں تھیں۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا اور اعصاب تن گئے۔

مجھے خدشہ ہوا کہیں لائیلا نے دم مرگ انہیں ہمارے بارے میں تو نہیں بتا دیا ہوگا؟

میں نے پلٹ کر کالیا کو دیکھا، وہ اس سمت کا جائزہ لینے کے بعد جھکا جھکا ہوا میری طرف ہی آ رہا تھا۔

''وہاں دیکھو، وہ لوگ آ رہے ہیں۔'' میں نے اس سے کہا۔ کالیا نے آنکھیں سکیڑ کر اس طرف دیکھا۔ میری بھی نظریں وہیں گڑی ہوئی تھیں۔ وہ لوگ پانچ چھ کی تعداد میں تھے۔

''اب تو ہم عمارت سے باہر بھی نہیں جا سکتے۔'' میں نے کالیا کے کان میں ہولے سے سرگوشی کی۔

''فکر نہ کر جگری!'' کالیا تشفی آمیز لہجے میں بولا۔

''میں چھت سے فرار کا بندوبست کر آیا ہوں۔''

وہ لوگ پھاٹک کی طرف بڑھ رہے تھے، پھر سب اندر داخل ہوئے۔ اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر دیکھتے رہے اور ٹھہر گئے۔ اب وہ عمارت کی چھت پر بھی نظریں دوڑانے لگے۔ ہم نے اپنے سر ذرا نیچے کر لیے۔ ان کی باتوں کی آوازیں ابھریں اور پھر یوں لگا جیسے وہ سب کے سب ایک دم دوڑ پڑے ہوں۔

میں نے دھڑکتے دل سے ذرا سر ابھارا تو یکلخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔

''کیا ہوا؟'' کالیا نے دریافت کیا۔ اس نے اپنا سر منڈیر سے نیچے کیے رکھا تھا۔

''وہ لوگ دونوں طرف کے زینوں کی طرف بڑھ گئے ہیں۔ اوپر ہی آ رہے ہیں۔''

''ابے لے......! جلدی آ جاؤ جگری! اس طرف......'' کالیا یہ کہتے ہی پلٹا۔

ہم اگر چاہتے تو اپنے ہتھیار ان پر استعمال کر سکتے تھے لیکن اس طرح انہیں یہاں ہماری موجودی کا پتا چل جاتا کیونکہ ہم زیادہ سے زیادہ کتنوں کا ہلاک کر سکتے تھے؟ تاہم میں بلاوجہ خون خرابے کے خلاف بھی تھا۔ جب تک جان پر نہ بنی ہو میں گولی چلانے کا قائل نہیں تھا۔

بہرکیف...... میں نے دیکھا، اسی سمت کو دوڑا، جہاں تھوڑی دیر پہلے گیا تھا، پتا چلا وہاں نظر آنے والے کھجوروں کے جھنڈ درحقیقت درخت تھے۔ ہم بہت احتیاط کے ساتھ ان کی شاخوں میں جھول گئے، یہاں ہمیں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ شاخیں بہت سخت اور چبھن والی تھیں۔ ان کی نوکیں اور سرے بلیڈ کی طرح لگ رہے تھے، بہ مشکل تنے تک رسائی حاصل کی اور اس کے کھردرے پن سے فائدہ اٹھا کر نیچے اترنے لگے۔

اس جفاکشی میں ہمارے جسموں پر خراشیں بھی آئیں، کیونکہ کھجور کے درخت پر جسم کے گرد جھولا نما رسی باندھ کے ایک خاص تکنیک سے چڑھا اترا جاتا ہے ورنہ جسم چھل جاتا ہے۔ ہم.... بڑی دشواری اور احتیاط کے ساتھ اس کی سخت کانٹے دار چھال سے چپک کر نیچے اترے۔

باغ سے آگے جنگل تھا، دائیں جانب مختصر سا میدان، جہاں خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ یہ راہ بھی بن رائد کے محل تک جاتی تھی۔ میں نے اسی طرف کا رخ کیا تو کالیا بولا۔ ''ابے لے جگری! کیا ان خطرناک حالات میں جبکہ بن رائد کے بھیڑیا نما ہرکارے.... ہماری تلاش......''

''ہم نے بن رائد کے محل میں داخل ہونا ہے کالیا! اور بس......!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

''جو حکم جگری سرکار کا......'' کالیا نے سینے پر ہاتھ رکھ دیا اور میں ہنس پڑا۔

ہم دونوں اس نصف قد آدم جھاڑیوں کا یہ مختصر میدان لیٹ کر اور سینے اور کہنیوں کے بل پر طے کرنے لگے۔

ہمارے بائیں رخ پر گلفو آئل کی دفتری شاخ کی جنوبی دیوار تھی اور اوپر منڈیروں سے روشنیاں نیچے پھینکی جا رہی تھیں۔

گو خطرہ ہنوز سر پر منڈلا رہا تھا، ہنڈوں کی روشنی تو نیچے نہیں پڑ رہی تھی مگر کچھ ہرکاروں کے پاس طاقت ور ٹارچیں تھیں۔ ان کے ہالے بھی وسیع تھے، ہماری ایک ذرا سی جھلک بھی ان آتشیں ہتھیاروں کے منہ ہم پر کھول سکتی تھی۔

www.PakiBooks.Site

اچانک روشنی کا ایک متحرک ہالہ ہمارے قریب سرکتا ہوا آنے لگا۔

''رک جاؤ'' میں نے سرسراتی سرگوشی کی۔ ہم وہیں جامد ہو گئے، پھر اس وقت تو میں نے اپنی سانسیں بھی روک لیں جب وہ ہالہ تھر کتا سرکتا ہمارے اوپر پڑا اور یک دم رک گیا۔

یہ میری زندگی کا ایک ایسا لمحہ تھا کہ بس خدا یاد آ گیا...... میری سانسیں پہلے ہی اٹکی ہوئی تھیں اور اب تو جیسے دل نے بھی دھڑکنا چھوڑ دیا تھا۔ موت...... یقینی موت گویا لمحہ بھر کی دوری پر تھی۔ ہالے کے ہم پر ''ٹھہرنے'' کا مطلب یہی تھا کہ ہم دیکھ لیے گئے ہیں یا پھر انہیں کوئی شبہ ہوا ہے۔

میری سانسیں اس وقت تک اٹکی رہی تھیں جب تک کہ ہالہ ہم پر ہٹا نہیں، اس کے ہم پر سے سرکتے ہی بے اختیار میرے سینے کا پھولا ہوا بوجھ ہٹ گیا۔

ہم نے پھر حرکت شروع کی اور اسی طرح رینگتے ہوئے بالآخر جھاڑیوں والا میدان پار کر گئے اور محل کی ایک عقبی اور غیر معمولی تجاوز کرتی دیوار کی آڑ میں آ گئے۔

دفتری عمارت کی چھت یہاں سے بھی صاف نظر آتی تھی، وہاں اب مجھے منڈیر پر کسی کا سر نظر نہیں آیا، جس کا مطلب تھا کہ وہ وہاں سے واپسی کے لیے پلٹ چکے تھے۔

میں نے اس طرف سے اب اپنی توجہ ہٹا کر محل پر مرکوز کر دی۔ جہاں سپاٹ اور سیلن زدہ دیوار کے اور کچھ نہ تھا۔ اس طرف نمی اور کائی زدہ گھاس تھی جو دیوار کی جڑ سے ہوتی ہوئی اس کے کنارے کنارے دوسری طرف چلی گئی تھی۔

میں اور کالیا اسی جگہ ذرا ٹھہر کر عمارت کا جائزہ لینے لگے۔

''نقب کی کوئی جگہ دیکھنے میں نہیں آ رہی جگری! بالکل سپاٹ دیوار ہے اس طرف تو......'' کالیا بولا۔ ''اس کے دائیں جانب کی دیوار کا جائزہ لینا پڑے گا۔''

''مجھے ایک کھڑکی نظر آ رہی ہے۔'' میں نے دیوار کے اس رخ کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ شاید کسی اسٹور نما کمرے کی لگتی ہے یا پھر کسی دور افتادہ گوشے کی۔'' میری بات سن کر کالیا نے اس طرف دیکھا اور فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔ بولا۔ ''اس پر زنگ آلود گرل کا پورا فریم نصب ہے۔ بے حد خستہ

علی گڑھ یونی ورسٹی

وفد کی لاہور آمد

مسلمانوں نے علی گڑھ کالج کو ایسی یونیورسٹی بنانے کی کوشش کی جسے ہندوستان کے مختلف کالجوں کے الحاق کا حق حاصل ہو۔ ابتداء میں حقِ الحاق کا کوئی واضح فیصلہ نہیں ہوا، تاہم علی گڑھ کو اس شرط پر یونیورسٹی کا درجہ دینے کا فیصلہ ہوا کہ مسلمان اس کے لیے کم از کم تیس لاکھ روپے جمع کریں۔ کالج کے ارباب بسط و کشاد نے سر آغا خان کی سرکردگی میں یہ کام شروع کیا۔ اس زمانے میں نواب وقار الملک کالج کے سیکریٹری تھے۔ یقیناً اس مہم کو انجام تک پہنچانے کے لیے وہ موزوں ترین تھے۔ نواب محسن الملک ممکن تھا کہ وقار الملک سے زیادہ باتدبیر ہوں لیکن قوم کو وقار الملک پر جیسا اعتماد تھا، وہ کسی اور پر نہ تھا۔ ان کا اخلاص اور حب اسلامیت میں پایہ بہت بلند تھا۔ سر آغا خاں نے (اپنی کمیونٹی آغا خانی کے تمام کام روک کر) طول و عرض ہند میں یونیورسٹی کے لیے دورہ کیا۔ وہ ایک وفد کے ساتھ لاہور بھی آئے۔ لاہور اسٹیشن پر ان کا شان دار استقبال کیا گیا۔ انہیں کھلی گاڑی میں بٹھا کر اسٹیشن سے دہلی دروازے تک اس گاڑی کو اسلامیہ کالج کے طلبہ نے کھینچا۔ اس وقت میرے اندازے کے مطابق طلبہ کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہ تھی۔ گاڑی کے ساتھ لمبے رسے باندھے گئے اور طلبہ قطار در قطار کھینچتے ہوئے دہلی دروازے تک لے گئے جس کے بعد سر آغا خاں اور ان کے ساتھی سواریوں پر ایک جلوس کی شکل میں شہر میں پھرے۔ سر آغا خان کے اعزاز میں مختلف تقاریب ہوئیں۔ ایک مشاعرہ حضرت علامہ اقبال کی صدارت میں برکت علی محمڈن ہال میں ہوا۔

اقتباس: مہر بیتی از محمد حمزہ فاروقی

مرسلہ: نعمان بشیر۔ لاڑکانہ

www.PakiBooks.Site

اور بوسیدہ سہی مگر پورا جنگلہ اتارنا ناممکن ہی ہوگا۔ پٹ بھی بند نظر آرہے ہیں۔''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن کوشش کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس سے پہلے مذکورہ سمت کی دیوار دیکھ لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے پھر.....'' کالیا نے اسی لہجے میں کہا اور میں ہولے سے مسکرا دیا۔ بولا۔ ''چلو پھر آگے بڑھو۔''

ہم چھپتے چھپاتے اس طرف آگئے۔ یہاں ایک پرانا ٹرک آدھا بھربھری زمین میں دھنسا نظر آیا۔ اس کے پہیوں کی ہوا نکلی ہوئی نظر آتی تھی۔ ایک طرف تو ٹائر ہی نہیں تھا۔

ٹرک چھوٹا تھا اور اس کی باڈی سالخوردہ ہو کر ٹین ڈبے کا منظر پیش کرتی تھی۔ کچھ ریتا پھیلا ہوا تھا۔ دیوار میں البتہ ایک مختصر سنگی زینے کے اختتام پر سنگل پٹ کا دروازہ تھا۔ وہ بند تھا۔ تین کھڑکیاں تھیں۔ دو پر آہنی گرلوں کے جنگلے نصب تھے اور تیسری کا کھڑا ہوا تھا۔ میری آنکھیں چمک اٹھیں۔

''حرکت میں برکت اسی کو کہتے ہیں جگری! اس کھڑکی کو آزمائش کی چکی میں پیسا جاسکتا ہے۔'' کالیا ہولے سے بولا۔ یہ اس کی عادت تھی یا پھر فطرت ثانیہ کہ مہم جو حالات چاہے جتنے خطرناک ہوں اس کی زندہ دلی اور شوخی قائم رہتی تھی، جبکہ مجھ پر تو جیسے سنجیدگی کا پہاڑ آگرتا تھا۔

''میرا خیال ہے یہ کام ہم میں سے ایک کو انجام دینا ہوگا، دوسرا اگر دو پیش پر کڑی نگاہ رکھے۔'' میں نے کہا۔

''ہرگز نہیں، یہ عمل جلدی کر ڈالنے اور حرکت پذیری کا ہے۔'' کالیا بولا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کھڑکی پر زیادہ زور آزمائی نہیں کرنا پڑے گی۔ اس کے کھلتے ہی ہمیں اندر گھس جانا ہوگا۔''

ہم گردو پیش پر نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ مطلوبہ کھڑکی کے پاس پہنچ کر رکے، کالیا کان لگا کر اندر کی سن گن لینے لگا جبکہ میری گردشی نظریں اطراف میں لگی ہوئی تھیں۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ۔۔ کالیا نے بڑی مہارت کے ساتھ کھڑکی کا ایک پٹ کھول لیا۔ اندر تاریکی تھی۔ اس نے دوسرے پر زور آزمائی کی، وہ بھی تھوڑی کوشش سے کھل گیا۔

اس کا قیافہ درست ثابت ہوا تھا، کھڑکی کے دونوں سالخوردہ سے پٹ کھلتے ہی کمرے میں روشنی کی کرنیں پھوٹی پڑتی نظر آنے لگیں۔ جو کسی اور طرف سے اس کے اندرونی گوشے میں کھلنے والے بند دروازے سے اندر آرہی تھیں اور اب کھڑکی کھلنے سے وہ باہر بھی اپنی چمک دکھاتی تھیں۔

کھڑکی آدم گزار تھی۔ ہم دونوں باری باری اندر داخل ہوگئے۔ کمرا سردست خالی ہی دکھائی دیتا تھا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ بند ہوتے ہی کمرا کچھ روشن ہوا۔ یوں باقی ماندہ کرنیں بھی اندر پڑنے لگیں۔ یہاں ریتا اور جانے کیا کیا الا بلا بکھرا اور پھیلا پڑا تھا۔ کمرا دس بائی بارہ کا تھا جس کی چھت خاصی اونچی تھی۔

ہم حسن بن رائد کی راجدھانی اور اب اس کی کچھار میں بھی گھس آئے تھے۔

حالات بتاتے تھے کہ ہم اپنے مشن کے قریب تر تھے۔

ہم بے آواز دروازے کی طرف بڑھے۔ روشنی باہر کہیں سے آرہی تھی۔ کمرا خالی تھا۔ بن رائد کی محل میں داخلے کا مطلب خود کو خونخوار بھیڑیوں کی کچھار میں دھکیلنا تھا، تاہم یہ معرکہ بھی کم نہ تھا۔ اگر اسی محتاط روی کے ساتھ یہ سب جاری رہتا تو ہم بن رائد کی شہ رگ تک پہنچ سکتے تھے۔ یوں اب بھی ہم اس کی ناک کے نیچے تو آہی چکے تھے۔

میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا جس کی جھریوں سے روشنی کی کرنیں اندر پڑ رہی تھیں۔ وہاں ایک آنکھ چپکا کر دیکھا، سامنے ایک راہداری کا خلا تھا اور جس کے دوسری جانب کسی ہال کمرے کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا، عقدہ کھلا کہ روشنی راہداری سے نہیں بلکہ اسی ہال کمرے سے پہلے راہداری اور بعد میں ہمارے کمرے تک پہنچ رہی تھی۔

میں دم روکے دیکھنے لگا۔ سامنے والے کمرے میں کافی لوگ نظر آرہے تھے۔ وہاں کرسیوں اور فرشی نشستوں، گاؤ تکیوں کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔ اب تک کوئی شناسا فرد دکھائی نہیں دیا تھا۔ باتیں کرنے کی کچھ بلند آوازیں ضرور آرہی تھیں جو ظاہر ہے میرے پلے کہاں پڑ سکتی تھیں۔

اچانک راہداری میں دو آدمی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے نمودار ہوئے اور سیدھا اسی کمرے میں گھستے چلے گئے۔ کچھ لوگوں نے ان کی طرف دیکھا۔ میں ایک ہی آنکھ سے دروازے کی متوازی جھری سے باہر اور کمرے کے اندر تک کا مقدور بھر منظر ہی دیکھ پا رہا تھا، کوشش یہی تھی میری کہ وہاں موجود لوگوں میں کوئی شناسا چہرہ دکھائی دے

www.PakiBooks.Site

جائے لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکا تھا، البتہ جب مذکورہ افراد تیزی سے اندر داخل ہوئے اور انہوں نے اندر جا کر بتانے کیا کہا کہ مجھے کسی کے زور سے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

''کیا دیکھ رہا ہے جگری! مجھے بھی تو بتاؤ؟'' کالیا بولا خاصی دیر سے میرے قریب خاموش کھڑا تھا، بول پڑا۔

''دھشی.....! دیکھ سکتے ہو تو دیکھ لو جھک کر..... مگر خاموشی سے۔'' میں نے کہا۔

وہ ایک دراز قامت اور تنومند شخص تھا جو غیر ملکی لگتا تھا۔ چیخ اسی نے ماری تھی۔ قریب آنے پر میں چونکا۔ وہ ادریس گرانٹ تھا، بدنصیب لائیلا کا بوائے فرینڈ۔ (ابھی تک میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ بھی تھی یا فائرنگ سے ہلاک ہو چکی تھی)

گرانٹ بپھرا ہوا اور غم زدہ نظر آرہا تھا۔ ہاتھ ہلا ہلا کر وہ انہی کی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا، انداز اس کا غصیلہ مگر احتجاج کرنے جیسا تھا۔

میں نے دیکھا کسی کی بلند اور رعب دار آواز بھی گونج رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا مجھے اس کی آواز شناسا معلوم ہوئی توقع تو یہی تھی کہ یہ آواز بن رائد کی ہی ہو سکتی ہے، کیونکہ کافی عرصے سے میرا اور اس کا سامنا نہیں ہو سکا تھا۔

پھر ایک سفید عبا میں ملبوس شخص اٹھا اور گرانٹ سے کچھ کہنے لگا مگر گرانٹ نے طیش میں آکر اسے تھپڑ رسید کر دیا اور باہر کو لپکا تھا کہ دو تین سفید عباؤں میں ملبوس ہتھیار بدست افراد نے اسے دبوچ لیا، مگر گرانٹ آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

اس نے لڑنے کے لیے جیسے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا لیے۔ میں حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ آخر گرانٹ ان سے کسی ''نامعلوم'' سی ساز باز کے بعد اچانک ان پر برہم کیونکر ہو گیا تھا، تب ہی میں چونکا، کہیں اسے اپنی خوبصورت گرل فرینڈ کی موت کا تو نہیں پتا چل گیا ہے؟ اور یہ بھی کہ وہ انہی کے ہاتھوں ہلاک (متوقع طور پر) ہو چکی ہے؟

گرانٹ نے دوسرے عربی کو سینے میں لات رسید کر ڈالی۔ تیسرے نے اس کے سر پر اپنی رائفل کا کندا مارنے کی کوشش کرنی چاہی تھی کہ گرانٹ خود کو اس ضرب سے بچا گیا مگر پھر بھی کندا اس کے کندھے پر پڑا، گرانٹ کے حلق سے چیخ خارج ہوئی مگر بلا کا سخت جان وہ بھی تھا، اس نے

امریکی ریاست نیو ہیمپشائر میں ایک محفل موسیقی میں انگلیوں اور کلائی سے معذور ایک بچی نے کہنی سے اس مہارت کے ساتھ پیانو بجایا کہ دیکھنے اور سننے والے حیران رہ گئے۔ بیلا اسٹیکر نامی 16 سالہ لڑکی کو آٹھ سال کی عمر میں ایک خطرناک بیماری ہوگئی تھی جس کے باعث اسے اپنی دونوں کلائیوں اور پیروں سے محروم ہونا پڑا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور وہ کر دکھایا جو بظاہر ناممکن تھا۔ صرف پیانو ہی نہیں بلکہ بیلا پینٹنگ بھی بہت زبردست کرتی ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ بیلا کے والد نے اپنی بیٹی کی معذوری کو اس کی کمزوری نہیں بننے دیا اور اس کی مسلسل حوصلہ افزائی کرتے رہے جس کے باعث آج بیلا اپنی معذوری کو اپنی طاقت میں تبدیل کر چکی ہے اور باصلاحیت پیانوسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین تصاویر بھی تخلیق کرتی ہیں۔

برازیل سے تعلق رکھنے والے داسلوا خاندان کے چودہ افراد کی پیدائش ہاتھ اور پاؤں کی بارہ انگلیوں کے ساتھ ہوئی تھی جو اس وقت معمول کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس خاندان میں شامل تمام مرد و خواتین کے ہاتھ اور پاؤں کی بارہ بارہ انگلیاں ہیں اور اس خاندان کی یہی انفرادیت اسے برازیل سمیت دنیا بھر میں مشہور کرنے کی وجہ بن چکی ہے۔

☆☆☆

یوں تو کتے اپنی وفاداری کی وجہ سے مشہور ہیں لیکن روس میں لیمن نامی ایک کتے نے تو اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر سب کو اپنا دیوانہ بنا ڈالا۔ 51 سالہ الیگزینڈر نامی کسان کے پالتو کتے نے اپنے مالک کی مدد کی غرض سے کھیتوں میں کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ نہ صرف مہارت سے کھیتوں میں ہل چلاتا ہے بلکہ ہینڈ پمپ چلا کر پانی کی بالٹی بھی بھر لیتا ہے اور کھیتوں کو سیراب بھی کرتا ہے۔ ایک کتے کی انسان سے دوستی، محبت، کام کرنے کی لگن اور صلاحیتوں کی ایسی مثال شاید ہی کہیں ملے۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مئے۔ لڈن

www.PakiBooks.Site

اول الذکر عربی کے جبڑے پر گھونسا رسید کر دیا، وہاں بھگدڑ مچ گئی تھی۔

گرانٹ تو غیظ میں تھا اور وہاں بہت سے لوگ مسلح موجود تھے۔ وہ کب تک اور کتنوں کو مارتا، بالآخر نرغے میں آ گیا۔

لگتا ایسا ہی تھا کہ اس کے اچانک طیش دکھانے کے باجود اس سے کچھ ''رعایت'' برتی جا رہی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد گرانٹ کو نڈھال اور نیم بے ہوشی کی حالت میں دو افراد اٹھائے ہال کمرے سے باہر نکلے اور راہداری میں دائیں جانب مڑ گئے۔ ہال کا دروازہ بھی بند کر دیا گیا۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے اندر کوئی اہم نشست ہو رہی تھی۔

میں فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا، میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں اور میں نے دروازے کو آہستگی سے دھکیلا مگر وہ باہر سے بند تھا، میں بے چین ہو گیا، کالیا میری مضطربانہ بیقراری کو فوراً بھانپ گیا اور سمجھ گیا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں پھر اس نے بھی دروازے کو تھوڑا دھکیل کر کچھ اندازہ لگایا، وہ دروازہ باہر سے تو بند تھا مگر اس کے ہلتے ہوئے پٹ کچھ چرچرا سے رہے تھے، تب ہی کالیا نے تھوڑا اور زور لگایا تو دونوں پٹوں کے درمیان ''گیپ'' بن گیا، جیسا عموماً پرانے دروازوں میں بن جایا کرتے ہیں، کالیا نے اس چوڑے خلا سے اپنا ایک ہاتھ باہر نکالنے کی کوشش چاہی اور ہتھیلی سے کچھ کلائی تک ہاتھ باہر نکال کر اس کی کنڈی کھول دی۔

بلاشبہ یہ ایک خطرناک اور ''رسکی'' عمل تھا مگر جلد کرنے کا متقاضی بھی، کیونکہ اب سامنے والے ہال کمرے سے تو کسی کا خطرہ نہ رہا تھا ابھی، لیکن کالیا کی اس اندھی کوشش کو راہداری میں اگر کوئی کھڑا ہوتا تو ضرور دیکھ سکتا تھا، اس نے بس اللہ پر توکل کر کے ہی یہ کارروائی انجام دے ڈالی تھی۔

دروازہ کھلتے ہی کالیا نے ہولے سے باہر جھانکا اور اندر ہو کر سرگوشی میں بولا۔ ''جگری! راستہ صاف ہے۔ جلدی بول کدھر لپکنا ہے؟''

''دائیں جانب۔'' میں نے کہا۔ ''اس طرف گرانٹ کو زخمی کرنے والے دو افراد گھسیٹتے ہوئے لے کر گئے ہیں۔''

پھر ذرا ہی دیر بعد ہم کمرے سے باہر راہداری میں تھے۔ صرف آٹھ دس قدموں کے بعد آگے جا کر راہداری بائیں طرف مڑتی تھی۔ میں دبے پاؤں اسی طرف ہی بڑھا۔ کالیا میرے پیچھے تھا۔

بہت خطرناک عمل تھا یہ۔ کسی بھی وقت کسی کی بھی نظر ہم پر پڑ سکتی تھی۔ ہتھیار ہم نے بھی اٹھا رکھے تھے لیکن بہرحال نازک گھڑیاں تھیں۔ جنگ و جدال کی صورت میں ہمارے بھی مارے جانے کے امکانات واضح تھے۔

کالیا عقب میں نظریں جمائے ہوئے تھا اور میں سامنے۔ موڑ والی دیوار کی آڑ کے قریب پہنچتے ہی میں نے دھڑکتے دل سے سر ابھار کر دیکھا۔

وہی دونوں جوادھ موئے گرانٹ کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے تھے، ان میں سے ایک کو میں نے راہداری کے بائیں جانب بنے ایک کمرے سے نمودار ہوتے دیکھا، ممکن تھا اس کے پیچھے یا بعد میں اس کا دوسرا مسلح ساتھی بھی ظاہر ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا، اول الذکر کے باہر نکلتے ہی میرا قوی خیال یہی تھا کہ وہ دوبارہ اسی طرف کا رخ کرے گا جہاں سے چلا تھا، کیونکہ اسی رخ پر وہ ہال کمرا تھا اور ہم بھی کھڑے تھے، تاہم میں نے بھی مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ جیسے ہی ہمارے قریب آئے گا ہم اس پر قابو پانے کی کوشش کریں گے، کیونکہ ہم اس کے راستے پر ہی تھے اور پلٹ نہیں سکتے تھے، نیز اپنے پیچھے بھی ہمیں کسی کے اچانک نمودار ہونے کا خدشہ لگا ہوا تھا۔

خوش قسمتی رہی ہے کہ وہ آدمی بجائے سابقہ راستہ اپنانے کے آگے نکلتا چلا گیا پھر چند قدموں بعد وہ ایک طرف کو مڑ گیا، اب اللہ جانے وہاں کوئی اور خلاء تھا یا موڑیا پھر کوئی اور کمرا، بہرحال راستہ صاف تھا، میں نے جلدی سے حرکت کی اور میرے پیچھے کالیا نے بھی۔

ہم گربہ قدمی مگر تیزی کے ساتھ اول الذکر کمرے کی طرف لپکے، اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ اندر اس کا ایک ہتھیار بدست ساتھی موجود تھا، مگر اب ہم زیادہ دیر راہداری میں ٹھہرنے کے مجاز نہیں تھے لیکن جیسے ہی میں دروازے پر پہنچا، پہلا والا ہتھیار بدست بھی اسی وقت اچانک اندر سے باہر نکلا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

ایک لمحہ کے لیے تو ہم ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ کر ہی ہکا بکا سے رہ گئے، بلکہ مجھ سے زیادہ حیرت و تشویش تلے مدمقابل کی حالت غیری ہونے لگی تھی، کیونکہ میں اس کی توقع کے برخلاف تھا مگر وہ نہیں، اسی لیے سب

www.PakiBooks.Site

سے پہلے میں نے ہی اپنے ہوش ٹھکانے کیے اور اس کی حیرت اور تشویش کے اس لمحاتی وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی پیشانی پر اپنی رائفل کا بٹ رسید کر دیا۔

وہ اپنے حلق سے ''اوغ'' جیسی کراہ نما آواز برآمد کرتا ہوا دو قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا مگر سخت جانی کے سبب اس نے جلد ہی خود کو سنبھالا دینے کی کوشش چاہی تھی اور گرتے گرتے بھی اس نے اپنی گن مجھ پر تانی، پھر اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا، کالیا نے مجھ سے زیادہ پھرتی اور چابک دستی کا مظاہرہ کیا۔

اس نے میری مدد میں پہلے ہی حصہ ڈال دیا اور چوکنا چیتے جیسی ایک ہی جست میں اس سے درمیانہ وار ٹکرا گیا، کالیا کا یہ عمل جی داری کی اعلیٰ مثال تھا، اس دوران اسے اگر ایک لمحاتی بھی تاخیر ہو جاتی تو ہر کارہ ٹرائیگر دبا دیتا اور گولی کالیا کا کام تمام کر سکتی تھی، کفن تو ہم نے یوں بھی سر سے باندھے ہوئے تھے، مگر ہم خود بھی تو گویا آتش فشاں کے دہانے پر کھڑے تھے۔

کالیا نے اسے رگیدتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ نہایت پھرتی کے ساتھ اسے گن سے محروم کر دیا۔ تب تک میں بھی اپنے ہونٹ بھینچے اس کے سر پر پہنچ گیا تھا اور اپنی رائفل کا کندا اس کی کنپٹی پر بڑے زور سے رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔

افراتفری میں ہمارا اس طرف دھیان نہ جا سکا کہ وہ اذیت کے مارے جان بوجھ کر اپنی چیخ کو بلند کر سکتا تھا۔ ایک تو درد کا احساس کم کرنے کے لیے دوسرے..... اپنے ساتھیوں کو ''گڑبڑ'' سے مطلع کرنے کے لیے۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے، وہ پوری طرح بے ہوش نہیں ہوا تھا، کم بخت کچھ زیادہ ہی سخت جان ثابت ہوا تھا۔

وہ چیخ مار چکا تھا اور ہمارے پاس اب اتنا وقت نہ تھا کہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے کہ وہ کہاں تک پہنچی ہو گی؟ لیکن کم از کم اس کے دوسرے ساتھی نے تو ضرور سن ہی لی ہو گی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے... کہیں قریب ہی ایک طرف کو مڑ کر غائب ہو گیا تھا۔

میں تیزی سے اس پر جھکا اور اس کی ہنسلی کی ہڈی کے قریب اس کی رگ حساس مسل ڈالی۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔

ایک کونے میں فرش پر نڈھال سے پڑے گرانٹ نے یہ کارروائی کمرے میں جلتے ایک بلب کی روشنی میں نیم بازی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اسی وقت قریب ہی راہداری کے فرش پر کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ میں ٹھٹکا۔ یہ ضرور اس کا وہی دوسرا ساتھی ہی ہو سکتا تھا۔ کالیا نے مجھے مخصوص اشارہ کیا۔

میں سمجھ گیا وہ اکیلا ہی آنے والے کو قابو کرنا چاہتا تھا۔ اشارہ کرتے ہی فوراً حرکت پذیر ہوا اور گن سیدھی کیے ہوئے وہ دروازے کے ایک طرف کو چپک کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی دوسری جانب سے یہی تقلید کی۔

وہ آدمی جوش اور ..... اپنی ہی جھونک میں اندر داخل ہوا، تب ہی ہم اس پر بیک وقت پل پڑے.....

ذرا ہی دیر میں اس کا بھی پہلے والے ساتھی جیسا حشر کرنے کے بعد ہم نے دروازہ بند کر دیا۔

گرانٹ آنکھیں پھاڑے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا اور ہلکا سا دوستانہ اشارہ کیا۔

اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ چہرے پر سرخ لکیریں تھیں، پیشانی ایک جانب سے پھٹی ہوئی، جہاں سے خون رس رہا تھا، ایک ہونٹ متورم تھا اور دائیں آنکھ کے پاس ذرا نیچے نیل پڑا ہوا تھا۔ وہ ابھی رسن بستہ حالت میں نہیں تھا۔ فرش پر پہلو کے بل پڑا کراہ رہا تھا۔

میں اپنے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ لیے اس کے قریب پہنچا اور پھر اچانک ایک غیر متوقع اور عجیب واقع رونما ہوا۔ گرانٹ نے عجیب سی غراہٹ اپنے حلق سے خارج کرتے ہوئے میری گن پر جھپٹا مارا تھا۔

''ابے لے.....'' میری سماعتوں میں کالیا کی متحیرانہ آواز ٹکرائی۔ گرانٹ لیٹے لیٹے پہلو کے بل پر میرے ہاتھ سے جھپٹی ہوئی رائفل کو مجھ پر ہی تان چکا تھا۔ چوں کہ اس کی یہ حرکت میرے لیے اچانک اور سربہ سر غیر متوقع تھی اسی لیے میں مار کھا گیا تھا۔ تاہم میں نے دیکھا، اس وقت اس کا خون آلود چہرہ واقعی خونخوار ہو رہا تھا اور میری جانب گھورتی ہوئی آنکھوں سے بھی اس کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ میں جیسے خود کو پل کے پل بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔

اور برائے گرانٹ کی انگلی ٹرائیگر پر متحرک ہوئی۔ فائر کا دھماکا ہوا تھا۔

(جاری ہے)

www.PakiBooks.Site

بیت بازی

قارئین

(نزہت احمد ملیر کراچی کا جواب)

سدرہ بانو ناگوری..........کراچی

بیٹی کو شر جاننے والوں رب سے پناہ مانگنے والو
اس کا رب رحمٰن نہیں ہے، کیا عورت انسان نہیں ہے

(عطیہ زہرا پشاور کا جواب)

قاضی شرف حمیدی..........کراچی

وقت خود ہی بتائے گا کہ میں زندہ ہوں
کب وہ مرتا ہے جو زندہ رہے کردار کے ساتھ

حکیم سید محمد رضا نقوی..........نورنگہ

موج در موج کناروں کو سزا ملتی ہے
کوئی ڈوبے تو سہاروں کو سزا ملتی ہے

ناہید سلطان..........لاہور

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

شرف الدین..........جمالی گوٹھ

مجھ کو گونگا سمجھ رہے ہیں لوگ
اب تو کچھ بولنا ضروری ہے

اشرف علی..........کراچی

مت پوچھ کہ میرے صبر کی وسعت کہاں تک ہے
تو آزما کے دیکھ لے تیری طاقت کہاں تک ہے

(ناصر چنگیزی کوئٹہ کا جواب)

امیر حمزہ اشرف..........کوٹ رب نواز

قیمتی چادریں مزار پر
زندگی بے لباس پھرتی ہے

(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)

عبدالحکیم شمر..........کراچی

راستہ کاٹ کے جانے کی یہ زحمت کیسی
میں تیری راہ کا پتھر ہوں ہٹا دے مجھ کو

(نزابت افشاں فتح جنگ کا جواب)

سدرہ بانو ناگوری..........کراچی

نکالا ہم کو جنت سے فریبِ زندگی دے کر
دیا پھر شوق جنت کیوں یہ حیرانی نہیں جاتی

(شہوار اکبر کراچی کا جواب)

حنیف ادیب..........لاہور

گلشن کے پتے پتے پر تشنہ لبی کا رنگ
جانے کدھر کا رخ ہے پھر ابرِ بہار کا

(عبدالستار ساہیوال کا جواب)

ذیشان احمد..........مظفر گڑھ

ناروا کو روا نہیں کہتے
غیر کو آشنا نہیں کہتے

نیر حسین زیدی..........سیالکوٹ

نصیب جن کو تیرے رخ کی دید ہوتی ہے
وہ خوش نصیب ہیں خوب ان کی عید ہوتی ہے

ذیشان تبسم..........پنڈی گھیب

نہ کوئی وعدہ و پیماں کی شام ہے نہ سحر
نہ شوق کی ہے کوئی داستاں جو کہنی ہو

(غضنفر عباس مرزا اسلام آباد کا جواب)

معیز احمد..........راولپنڈی

اس کی قدرت کے خزانوں میں نہیں ہرگز کمی
جس نے جو مانگا وہی اس نے مہیا کر دیا

نادر شاہ..........چکوال

اسیر پنجۂ عہدِ شباب کر کے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

(امیر حمزہ اشرف ملتان کا جواب)

نزابت افشاں..........میہورہ فتح جنگ

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا
جانے کیوں آج تیرے نام پہ رونا آیا

حمید اللہ سواتی..........کراچی

ایک ہی شے تھی با اندازِ دگر مانگی تھی
میں نے بینائی نہیں تجھ سے نظر مانگی تھی

(نواب علی کراچی کا جواب)

نسیم نیازی..........سرگودھا

یہ دل کش دل کش بہاروں کا ساتھ
کسی کے مہکتے اشاروں کا ساتھ

www.PakiBooks.Site

(نازنین مجید اسلام آباد کا جواب)

...یان، ماہا ایمان..........فورٹ عباس

...وں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
...نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

(زاہد خان کراچی کا جواب)

...سعید..........شیخوپورہ

...فرشتہ کہنے سے میری تحقیر ہوتی ہے
...ود ملائک ہوں مجھے انسان رہنے دو

...نین اکبر..........کراچی

...نام ہے جس کا وہ ایسی قید ہے یارو
...عمریں بیت جاتی ہیں سزا پوری نہیں ہوتی

(...یہ ایمان، ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

...روز اقبال..........لاہور

...جو دھوپ سے بچ کر کوئی سایہ ڈھونڈیں
...اب ابھرنے نہیں پاتے ہیں کہ جھک جاتے ہیں

...بانو..........ملتان

...پوچھو عہد الفت بس اک خواب پریشاں تھا
...دل کو راہ پہ لائے نہ دل کا مدعا سمجھے

...یس اقبال..........سیالکوٹ

...پھیر کر تیرا غیروں سے ملنا
...ے ہوئے دل کو تڑپا رہا ہے

...وار حسین..........ملتان

...جانے کس کا ڈوبا ہے سفینہ
...ت آب دریا میں بپا ہے

(راشد لطیف کا جواب)

...احمد حسن..........حیدرآباد

...شہر کے تن پہ لباس باقی ہے
...شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

...مریم بنت کاشف..........حیدرآباد

...کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
...زندگی میتوں پہ روتی ہے

(عباس انصاری مظفر گڑھ کا جواب)

مظفر عباس..........لاہور

...اس کی دیوار پہ حیران کھڑا ہے کب سے
...چاند بھی میری طرح حسن شناسا نکلا

ذوالفقار حسین..........کراچی

اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

نزابت افشاں..........میہورہ فتح جنگ

اشک مژگاں پہ اٹک سا گیا ہے
نوک سی چبھ گئی چھالے میں

بیت بازی کا اصول ہے، جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے)

114

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

www.PakiBooks.Site

داغِ ندامت

محترمہ عذرا رسول

سلام تہنیت!

یہ سرگزشت مبشر کی ہے۔ مبشر ایک سیدھا سادہ بندہ تھا۔ ایک رحم دل ڈاکٹر اس نے خدمت انسانیت کے لیے ایک دور افتادہ علاقہ کو چنا تھا ایک ایسے علاقے کو جہاں میڈیکل ٹریٹمنٹ کے نام پر ایک خستہ حال اسپتال بنا ہوا تھا۔ اس نے لوگوں کی دعا سمیٹنے کے لیے اسپتال جوائن کیا تھا لیکن میڈیکل ٹریٹمنٹ نے ہی اسے ایک ایسے گرداب میں پھنسا دیا کہ وہ تاعمر آنسو بہاتا رہا۔ اس کی اکلوتی بیٹی بھی اس گرداب کی نذر ہو گئی۔ اس کتھا میں تمام نام و مقام بدل دیئے ہیں۔

فضہ عادل

(بری پور، ہزارہ)

وہ اتوار کا دن تھا۔ اسپتال سے میرا آف تھا۔ روزانہ فجر کی نماز کے بعد میں پارک میں جاگنگ کے لیے جایا کرتا تھا مگر اس دن نہ جانے کیوں میری طبیعت میں عجیب سی سنسنی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنے بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹا رہا۔ دل میں بھی عجیب سا اضطراب برپا تھا۔ لیٹے لیٹے صبح کے سات بج گئے۔ شائستہ نے ناشتا تیار کیا اور کمرے میں لے آئی۔

''کیا بات ہے مبشر آج آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ آپ جاگنگ کے لیے بھی نہیں گئے؟'' ناشتے کی ٹرالی بیڈ کے قریب کھڑی کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ہاں..... بس طبیعت بوجھل سی ہو رہی ہے۔ تم بس جوس ڈال دو میں صرف وہی لوں گا۔'' میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مبشر، میرا دل بھی بہت اداس ہے۔ صبح سے کئی بار پلوشہ کا نمبر ملا چکی ہوں مگر مسلسل بند مل رہا ہے۔ پتا نہیں کیوں رہ رہ کر اسی کا خیال آ رہا ہے۔'' اس نے جوس کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہو گی وہ، تم پریشان نہ ہو۔ اس کے امتحان ہونے والے ہیں اس لیے نمبر بند رکھا ہو گا اس نے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے میڈیکل کی پڑھائی کتنی ٹف ہے، ٹائم دینا ہی پڑتا ہے۔ ڈسٹرب نہ کرو اسے۔'' میں نے کہتے ہوئے گلاس لبوں سے لگایا مگر میرے اپنے دل میں بھی پلوشہ کو لے کر ایک کھٹکا سا لگا۔

''پتا نہیں کیوں مبشر مجھے سکون نہیں مل رہا۔ پلیز مجھے آپ اس کے ہاسٹل لے چلیں..... میں جب تک اسے دیکھ نہ لوں گی مجھے سکون نہیں آئے گا۔'' وہ ماں تھی۔ اور ماں کا دل اگر اولاد کی طرف سے فکرمند ہو تو یہ اللہ کی طرف سے ملنے والا ایک اشارہ ہوتا ہے۔ ماں بلاوجہ اپنی اولاد کے لیے نہیں تڑپتی۔ اگرچہ وہ اس سے میلوں دور ہوتی ہے مگر اس کی بے قرار مامتا ہر لمحہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اتنا تو مجھے پتا تھا۔ میں چند ساعتیں سوچنے کے بعد بولا۔

''ٹھیک ہے تم تیاری کرو۔ میں بھی تیار ہوتا ہوں، پھر نکلتے ہیں دونوں۔ میرا بھی دل کر رہا ہے اسے دیکھنے کو کافی دنوں سے نہیں دیکھا نا شاید اسی لیے اداسی ہو رہی ہے۔'' میں نے جوس کا گلاس ٹرالی پر رکھا۔ بظاہر میں خود کو شائستہ کے سامنے نارمل ظاہر کر رہا تھا مگر میرا دل شدت سے بے چین تھا۔ وہ یہ سنتے ہی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور برتن سمیٹ کر کچن میں چلی گئی۔ میں نے بھی فریش ہونے کے لیے باتھ روم کا رخ کیا۔ ابھی صرف قمیص ہی اتاری تھی کہ میرا موبائل فون بجنے لگا۔ اگر شائستہ کمرے میں ہوتی تو خود کال ریسیو کرتی یا مجھے آواز دے کر بتاتی کہ فلاں نمبر سے کال ہے مگر وہ ابھی تک کمرے میں واپس نہیں آئی تھی۔ موبائل فون ہنوز بج رہا تھا۔ میں قمیص دوبارہ پہنتا ہوا باتھ روم سے باہر نکل آیا اور کال ریسیو کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔

''السلام علیکم۔ ڈاکٹر مبشر اسپیکنگ۔'' میں نے انجان نمبر دیکھ کر ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے اپنا تعارف کروایا۔

''جی ڈاکٹر مبشر، میں انسپکٹر جبران بات کر رہا ہوں۔'' انسپکٹر جبران اس علاقے کا ایک مشہور اور قابل جوان تھا۔ جس کی ایمانداری، دلیری اور بہادری کے چرچے دور دور تک تھے۔ میں تین چار بار اس سے مل چکا تھا۔ اچھی جان پہچان تھی مگر اس وقت میرے پرسنل نمبر پر اس کی کال کرنے کا مدعا میں نہ سمجھ پایا سو میں نے فوراً پوچھا۔

''جی بولیں جبران صاحب! خیریت؟''

''سوری ٹو سے مبشر صاحب۔ خیریت نہیں ہے۔'' اس کی آواز میں افسوس جھلک رہا تھا۔

''کک۔ کیا مطلب۔ جلدی بتائیں!'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''دراصل۔ آپ کی بیٹی پلوشہ۔ ہمیں آج صبح چھ بجے کے قریب کچرہ کنڈی کے مقام سے بے ہوش حالت میں ملی ہے ہم اسے اسپتال لے آئے ہیں۔ حالت بہت تشویش ناک ہے۔ کائنڈلی آپ جلدی پہنچیں۔'' اس نے روانی سے کہا۔

میرے سر پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ٹانگوں سے جان نکل گئی اور میں قریب ہی بیڈ پہ جا گرا۔ تب تک شائستہ بھی کمرے میں آ چکی تھی۔ مجھے بے حال دیکھ کر تیزی سے میری طرف لپکی۔

''مبشر، مبشر کیا ہوا۔''

میں نے نہ اسے کوئی جواب دیا اور نہ انسپکٹر کو۔ میری آنکھوں کے سامنے اس وقت بس اپنی بچی کا ہنستا مسکراتا چہرہ گردش کرنے لگا۔ شائستہ نے میرے ہاتھ سے موبائل لیا۔

''کون..... کک..... کیا بات ہے؟'' وہ بھی گھبرا چکی تھی۔ اگلی ساعت دوسری جانب سے ملنے والی خبر اس کے کانوں میں پہنچ چکی تھی۔

''او کے..... او..... او کے ہم پہنچتے ہیں۔'' اس نے روانی میں کہتے ہوئے رابطہ منقطع کیا اور میری طرف پلٹی۔

''مبشر! خدا کے لیے سنبھالیں خود کو..... اللہ سب بہتر کرے گا۔ اس وقت ہمیں اپنی..... اپنی بچی کے پاس پہنچنا ہے۔'' گو کہ اس کے بھی حواس باختہ تھے مگر وہ روتے ہوئے مجھے سہارا دے کر کھڑا کرنے لگی پھر مجھے بمشکل گاڑی تک لائی اور بٹھانے کے بعد ڈرائیور کو تاکید کرتی خود بھی میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

میں اس وقت ڈاکٹر مبشر نہ تھا جو لوگوں کی زندگی کو

www.PakiBooks.Site

موت اور موت کو زندگی کے حوالے کرتا تھا۔ بلکہ میں اس وقت پلوشہ کا باپ تھا۔ میری اکلوتی بیٹی پلوشہ جس میں میری جان تھی اور اس وقت اس کی تکلیف کا سوچ کر میری اپنی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔

''مبشر، یہ وقت ہمت اور حوصلے سے کام لینے کا ہے، پلیز سنبھالیں خود کو۔ اگر ہم ہمت ہار دیں گے تو پلوشہ کا کیا ہوگا..... پلیز مبشر حوصلہ کریں، اسے ہماری ضرورت ہے۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میں نے چپ چاپ آنکھیں موندلیں۔

ایک گھنٹے کا سفر نہ جانے کیسے تمام ہوا۔ ہماری گاڑی اسپتال کے پارکنگ ایریا میں جا کر رکی تھی۔ مجھے اس وقت کچھ ہوش نہ تھا اور جب میں نے گاڑی سے نیچے قدم رکھا تو باقی کا ہوش میڈیا والوں نے اڑا دیا۔

''سر..... پلیز آپ بتائیں گے ایسا کیوں ہوا؟''

''سر آپ کی کسی کے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی تو نہ تھی؟''

''سر آپ اپنی بیٹی کی اس حالت کا ذمہ دار کس کو ٹھہرائیں گے؟''

ایک کے بعد ایک سوال دماغ پر ہتھوڑا بن کے برس رہا تھا۔ میں بغیر کوئی جواب دیے بس چپ چاپ ان سب کو دیکھ رہا تھا۔

''خدا کے لیے بس کریں، ہٹیں سامنے سے..... آپ لوگوں کا اور کوئی کام نہیں تماشا بنانے کے علاوہ، ہٹیں ہمیں اپنی بچی کے پاس جانے دیں۔'' شائستہ غصے سے ان پر چلائی اور مجھے بازو سے پکڑ کر آگے بڑھنے لگی۔ البتہ سوالات کی بوچھاڑ نے ہمارا اندر تک تعاقب کیا تھا۔

وینٹی لیٹر پر میری بچی موت سے لڑ رہی تھی اور میں باہر بیٹھا ہر گزرتے لمحے کے بعد آنے والے لمحے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ میں ایک پروفیشنل ڈاکٹر ہونے کے باعث اس بات سے باخوبی آگاہ تھا کہ جس طرح کے اسے زخم لگے ہیں۔ اب اس کا بچنا ناممکن ہے پھر بھی ایک باپ ہونے کے سبب کسی معجزے کے انتظار میں تھا۔ ہاں اسی معجزے کے انتظار میں جس کی دعا کے لیے میں مریض کے لواحقین سے کہا کرتا تھا جن کی آخری سانسیں حلق میں اٹکی ہوتی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا تھا وقت کی اس بے رحمی کا جو نہ دعاؤں کا پاس رکھتی ہے نہ آنسوؤں پہ بندھ۔ جو ایک ایک لمحہ روح میں سوئی کی مانند چبھتی ہے۔ جو نہ سانس نکلنے دیتی ہے نہ اندر اترنے دیتی ہے۔

ہاں میں آج بے رحم وقت کی اس گرفت میں تھا جس پر کبھی میں نے بھی رحم نہ کیا تھا۔ آج وہ بدلہ لینے آگیا تھا اس گناہ کا بدلہ جو میں بھولا تو کبھی نہیں تھا مگر یہ بھی نہ سوچا تھا کہ وقت ایسے خود کو دہرائے گا۔ وقت ایسے میرے سامنے آکر سینہ تان کر کھڑا ہو جائے گا۔

میری بیٹی اندر کس حال میں ہے، یہ میں جان چکا تھا۔ اس کا یہ حال کیا کس نے، مجھے اس بات کی بھی پروا نہ تھی۔ ''اس کا یہ حال ہوا کیوں؟'' سوالیہ نشان اس نقطے پہ آکر اٹک چکا تھا۔ ''کیا یہ آزمائش تھی۔'' میں نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔

''نہیں! یہ پکڑ ہے۔ خدا کی پکڑ۔ تو خدا کی پکڑ میں ہے مبشر۔ آغاز ہو گیا ہے۔ اب انجام کی فکر کر۔'' دل نے سفاکی سے جواب دیا اور میں جھرجھری لے کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شائستہ مصلے پر بیٹھی اس کی زندگی کے لیے رب سے گڑگڑا گڑگڑا کے دعائیں مانگ رہی تھی۔ وہ پولیس آفیسر جس نے مجھے کال کر کے اطلاع دی تھی وہ بھی کب سے اندر کبھی باہر چکر کاٹ رہا تھا۔ اسے پلوشہ کا بیان چاہیے تھا جس کے مطابق مجرموں کا سراغ لگانا تھا۔ دو تین نیوز چینلز کے نمائندے بھی وہاں کافی دیر سے محوِ انتظار تھے کہ کب آئی سی یو کا دروازہ کھلے ان کو کوئی خبر ملے اور وہ اس سے اپنے چینل کی سرخ پٹی کو سجا سکیں۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ پھر دائیں بائیں ٹہلنے لگا۔ میرا دماغ اس وقت ماؤف سا ہو چکا تھا۔ میرے ذہن میں ایک دھندلی سی تصویر رقص کرنے لگی۔ میں پھر سے بیٹھ گیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سختی سے آنکھیں موندلیں۔

☆.....☆

وہ سردیوں کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا مریضوں کی فائلیں چیک کر رہا تھا۔ سردیوں میں عام طور پر درجہ حرارت ویسے بھی کم ہی ہوتا تھا مگر جس علاقے میں، میں ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ وہاں اکثر درجہ حرارت منفی چھ ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی نیچے چلا جاتا تھا۔

مسلسل گردن جھکانے سے مجھے تھکن کا احساس ہوا۔ میں نے ایک ہاتھ سے گردن دباتے ہوئے سر اوپر اٹھایا اور دائیں بائیں جنبش دی۔ مسلسل بیٹھے بیٹھے میرا سارا جسم تھک چکا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شیشے سے باہر کا منظر دیکھنے لگا کھڑکی کے دوسری جانب ہلکی ہلکی برف باری اندھیری رات کے اس حسین منظر کو مزید دلکش بنا رہی

www.PakiBooks.Site

تھی۔ مجھے شدت سے چائے کی طلب ہوئی۔ اس سے پہلے میں مشتاق کو آواز لگاتا اور اس کو چائے کے لیے کہتا وہ تیزی سے دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

''ڈاکٹر صاحب! ایمرجنسی ہے۔ جلدی چلو۔''

ایمرجنسی کا سنتے ہی میرا سارا موڈ غارت ہو گیا اور میں بی پی اپرنس تھامے باہر کی جانب بڑھا۔

اس پورے علاقے میں صرف ایک ہی اسپتال تھا۔ جس میں میل نرس مبین، چپڑاسی مشتاق چوکیدار ریاض اور میرے علاوہ پانچواں کوئی نہ تھا۔ اس وقت مبین بھی اپنے کوارٹر میں سونے چلا گیا تھا۔ لہٰذا مجھے ایمرجنسی سے اکیلے ہی نمٹنا تھا۔

میں جیسے ہی اپنے کمرے سے باہر نکلا برآمدے میں پان کی چارپائی پر بے حس و حرکت وجود دیکھ کر میں نے اپنے قدموں کی رفتار مزید تیز کر دی۔ قریب پہنچ کر میں نے ایک سرسری نگاہ سب پر ڈالی۔ وہ تین مرد اور ان کے ساتھ ایک عورت تھی البتہ مجھے ابھی تک یہ پتا نہ تھا کہ چارپائی پر مرد ہے یا عورت۔

اس سے پہلے میں اس کو ہاتھ لگاتا یا اس کی نبض ٹٹول کر چیک کرتا کہ زندہ ہے یا مر گیا۔ ایک بوڑھے شخص نے مجھے سختی سے بازو سے پکڑ لیا۔

''کون ہو تم؟ یہاں کوئی عورت ڈاکٹر نی نہیں ہے؟''

مجھے اس سے ایسے ہی سوال کی توقع تھی۔ میں تین سال سے یہاں ڈیوٹی پر تھا۔ ان سوالات کا اچھی طرح سے عادی ہو چکا تھا۔ میں نے نرمی سے اس کی مضبوط گرفت سے اپنا بازو چھڑایا۔ ''نہیں لالہ میرے علاوہ کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے لالہ ڈاکٹر عورت ہو یا مرد۔ ڈاکٹر تو ڈاکٹر ہوتا ہے۔'' میرے لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی۔ اس کے باوجود وہ شخص میری کسی بات پر قائل نہ ہوا اور قریب کھڑے دونوں لڑکوں پر دھاڑا۔

''اٹھاؤ چارپائی!! ہمیں نہیں کروانا ایک نامحرم سے علاج۔''

ان دونوں نے حکم کی فوراً تعمیل کی اور چارپائی اٹھا لی۔ اس سے پہلے وہ قدم آگے بڑھاتے ان کے قریب کھڑی ادھیڑ عمر عورت جس نے سر تا پا اپنے آپ کو شٹل کاک برقع میں ڈھانپ رکھا تھا، وہ لپک کر اس شخص کے پیروں میں جا گری۔

''خان..... نہیں خان۔ خدا کے لیے خان۔ پشمینے مرجائے گی۔ خدا کے لیے میری بچی کے حال پر رحم کرو خان۔''

وہ گڑگڑاتے ہوئے اس سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی لیکن وہ آدمی ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔ البتہ اس کے چہرے پر پھیلے غصے کے رنگ مزید نمایاں ہونے لگے تھے۔

''ڈاکٹر..... ڈاکٹر خدا کے لیے میری پشمینے کو بچا لو..... خدا کے لیے ڈاکٹر۔'' وہ کوئی جواب نہ ملنے پر اس کے قدموں سے اٹھ کر میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑانے لگی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ اس کی ماں ہے۔ اس سے پہلے میں یا پھر وہ خان کچھ کہتا پشمینے کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ ان لڑکوں نے گھبراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ عورت ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے آہ و فریاد کرنے لگی۔ ان لڑکوں نے گھبرا کر چارپائی پھر سے نیچے اتار دی۔ ہم سب اس شخص کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے کیونکہ مریضہ کے معائنے اور علاج معالجے کا سارا کا سارا انحصار اب اس شخص کی ایک ہاں پہ تھا۔ بالآخر وہ بول پڑا۔

''ٹھیک ہے۔ جلدی دیکھو..... علاج کرنا مگر خیال رکھنا۔'' حکم دیتے ہی اس نے منہ پھیر لیا۔

مجھے شروع شروع میں ان باتوں پر ڈر لگتا تھا۔ حیرت بھی ہوتی تھی کہ کس قسم کے لوگ ہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ میں عادی ہو چکا تھا۔ یہ ان کے روز کا معمول تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن ہی کوئی نہ کوئی ایسا مریض ضرور آجایا کرتا تھا۔ جس کے لیے میں پہلے تو نامحرم قرار دے کر رد کر دیا جاتا پھر مریض کی حالت دیکھتے ہوئے خود ہی اجازت دے دیتے۔ میں ان کی جاہلانہ باتیں سنی ان سنی کرتے ہمیشہ کی طرح اجازت ملتے ہی مریض کی طرف بڑھ جاتا۔ اس رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

اجازت ملتے ہی مشتاق نے ان لڑکوں کو چارپائی وارڈ کے اندر لے جانے کا کہا۔ انھوں نے اسے اٹھایا اور وارڈ کے اندر لے گئے۔ وارڈ زنانہ تھا۔ وہاں دو مریضہ پہلے سے داخل تھیں۔ ان لڑکوں نے چارپائی اتاری اور وارڈ سے خود ہی باہر نکل گئے۔ وہ عورت میرے ساتھ ہی وارڈ کے اندر چلی آئی اور بے چینی سے ہتھیلیاں..... مسلنے لگی۔ میں نے فوراً اسے آکسیجن ماسک لگا دیا۔ آکسیجن لگتے ہی اس کی سانسیں بحال ہو گئیں۔ میں نے مزید چیک اپ شروع کر دیا۔ بہت جلد ہی مجھے اس کا مرض سمجھ آگیا۔ اسے شدید نمونیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کے پپوٹے کھولے

www.PakiBooks.Site

تو نیلی آنکھیں خلا میں منجمد تھیں۔ وہ بے ہوش تھی۔ میں اس کے چہرے پر نظریں ٹکائے اسے بغور دیکھنے لگا۔

وہ بہت خوبصورت تھی، کسی کوہ قاف کی پری جیسی۔ دودھ جیسی گوری رنگت، گلابی گال، صراحی ایسی گردن، اور اس کی نیلی آنکھوں پہ لمبی گھنی پلکوں کی جھالر..... میں نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ لمحے اس جادوئی حصار میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔

ایسا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ وارڈ میں جب میں نے اس کے چہرے سے چادر ہٹا کر اسے آکسیجن ماسک لگایا تھا، تبھی دل عجیب دھن میں مچلا تھا۔

دل کے تار بے سبب الجھے تھے۔ وہ حسین تھی مگر لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتے وہ حسین پل میرے دل کی دھڑکنوں میں عجیب سی دھن بکھیرتے چلے جا رہے تھے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مجھے ہو کیا رہا ہے۔ اس کا معائنہ کرنے کے دوران نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار جھکتی اٹھتی نظریں اس کے حسین رخسار پر ٹھہری جاتیں۔ میں نظریں ہٹاتا، اپنا دھیان بٹانے کی ناکام کوشش کرتا مگر پھر سے الجھنے لگتا۔

''نہیں!! میں ڈاکٹر ہوں۔'' میں اس وقت دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ مجھے خود کو یہ باور کرانا پڑا کہ میں ڈاکٹر ہوں اور میں نے وہاں سے ہٹ جانے میں ہی بہتری سمجھی۔

تینوں مرد اس وقت باہر پہرہ دے رہے تھے۔ وہ عورت ابھی بھی اس کے سرہانے کھڑی رو رہی تھی۔ گویا اسے اُمید نہ تھی اپنی بچی کے بچنے کی۔

''اماں جی..... آپ۔ وہاں بیٹھ جائیں..... نمونیا بگڑنے کی وجہ سے حالت غیر ہوگئی ہے۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔'' میں نے ایک نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی اور پشتو میں اماں کو دلاسہ دیتا وارڈ سے نکل کر اسٹور کی جانب چل پڑا۔

علاقے کے اس چھوٹے سے اسپتال میں دوائیوں کا اسٹور تھا مگر نہ اسٹور کیپر تھا اور نہ ہی مطلوبہ ادویات آسانی سے ملتی تھیں۔ یہ کام بھی خود ہی کرنا تھا۔ مطلوبہ دوائیں لینے کے بعد میں واپس وارڈ میں آیا۔ میں نے ڈرپ میں انجیکشن ڈالے اور باہر نکل آیا۔ وہ شخص جا چکا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ آئے لڑکوں کو اس کے مرض کے بارے میں آگاہ کیا۔ مرض کا سن کر انھوں نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔ البتہ جب میں نے یہ کہا کہ ابھی کچھ ٹیسٹ ہوں گے۔ اسے تین چار دن یہاں ہی رکھنا ہے تو وہ دونوں غصے سے مجھے ایسے گھورنے لگے جیسے میں نے کوئی گالی دی ہو۔

میرے ساتھ مشتاق تھا۔ وہ اسی گاؤں کا رہائشی تھا۔ ان لوگوں کے تیور اور رویے اچھی طرح سے سمجھتا تھا۔ وہ اپنے انداز میں انھیں سمجھانے لگا۔ اکثر ضرورت پڑنے پر یہ کام وہ ہی کیا کرتا تھا۔ اب بھی وہ کافی حد تک ان کو قائل کر چکا تھا۔ وہ علاج کروانے کے لیے رضامند تو ہو گئے مگر پھر دونوں وارڈ کے باہر ہی بینچ رکھ کر بیٹھ گئے۔

☆.....☆

رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا مگر آج مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کے سارے پہر تھم چکے ہیں۔ دل عجیب ڈگر پہ دوڑ رہا تھا۔ بے چینی عروج پر تھی۔ دھڑکنیں مچلتی، سنبھلتی اور پھر سے مچلنے لگتیں۔ کافی دیر میں کھڑکی میں کھڑا دوسری جانب روئی کی طرح ہولے ہولے زمین پر گرتی برف کو تکتا رہا۔ دل میں مچلتی دھڑکنوں کے اتار چڑھاؤ محسوس کرتا رہا۔

''پشمینے۔'' میرے دل نے اچانک اسے پکارا۔ ہاں پشمینے کے ماتھے کے لمس نے چند لمحوں کی قربت نے مجھے اندر تک ان دیکھی آگ میں دھکیل دیا تھا۔

''یہ میں کیا کر رہا ہوں۔'' میں نے اپنے ماتھے پر آیا پسینا ہاتھ سے پونچھا۔ عینک اتاری اور واپس مڑ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''نہیں!! مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے..... میں..... میں کیوں ایک انجان لڑکی کے بارے میں اتنا سوچ رہا ہوں، ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا، پھر آج کیوں؟'' میں نے خود کو باز رکھنے کی کوشش کی اور سر جھٹک کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ مگر عشق کی چنگاری جب آگ پکڑتی ہے تو انسان چاہے جتنی آنکھیں پھیر لے۔ جیسے مرضی نظریں چرائے وہ پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بلکہ آتش فشاں کی طرح پھٹتی ہے۔ بے قابو ہوتی چلی جاتی ہے۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند کر لینے کے بعد تو وہ پری چہرہ مزید صاف دکھائی دینے لگا۔

رات ڈھلے جب صبح کی روشن کرنوں نے کھڑکی کی اوٹ سے باری باری جھانکنا شروع کیا تو میں نے خوابوں کی وادی سے باہر قدم نکالا۔ رات جس چنگاری کو بجھانے کے لیے میں نے آنکھیں بند کی تھیں وہ چنگاری اب آتش فشاں بن چکی تھی۔ دل کے اضطراب میں شدت سے اضافہ ہوا۔ میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بی پی اپریٹس اٹھا کر وارڈ کی جانب چل پڑا۔

www.PakiBooks.Site

وارڈ کے باہر وہ دونوں لڑکے بینچ پر اسی حالت میں براجمان تھے جیسے میں رات کو چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا۔ ان دونوں نے چونک کر اوپر دیکھا۔

''ہاں ڈاکٹر..... بولو کیا بات ہے!'' ان میں سے ایک اپنی بندوق سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''معائنہ کرنا ہے، یہاں لیٹے رہنے سے تو مریض ٹھیک نہیں ہو جائے گا نا۔'' مجھے نہ جانے کیوں اس کا یہ انداز برا لگا تھا۔ میں نے بھی اسی ٹون میں جواب دے ڈالا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے، کر لو معائنہ۔'' وہ مزید سخت لہجے میں بولا۔ میں کوئی جواب دیئے بغیر اندر داخل ہو گیا۔

اماں سو رہی تھیں۔ رات بھر جاگنے کے بعد شاید ابھی ہی ان کی آنکھ لگی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر مریضہ نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ایک نامحرم کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ وہ گھبرا گئی تھی۔

''کو..... کون ہو تم.....؟'' پشمینے کی آواز میں لرزش تھی۔ مجھے اس پر بے ساختہ پیار آنے لگا۔ محبوب کی ہر ادا دل کو بھاتی ہے۔ مجھے بھی یہ سب بہت بھلا لگ رہا تھا۔

''گھبراؤ نہیں..... میں ڈاکٹر ہوں۔ میں آپ کا علاج کر رہا ہوں۔'' میں یہ کہتے ہوئے اس کے قریب جا رکا۔ ''اب کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟ طبیعت کچھ بہتر ہوئی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ہمیشہ کی طرح میرے لہجے میں نرمی اور اپنائیت واضح تھی مگر آج تو نرمی کے ساتھ ساتھ بے لوث محبت بھی دل میں انگڑائیاں لے لے کر جاگ رہی تھی۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ ابھی بھی یقینی اور بے یقینی کی کیفیت میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری جھکتی اٹھتی نظریں اس کے گداز رخسار پہ جا کر رک سی جاتیں۔ بارہا خود کو قابو رکھنے کے باوجود بھی تین نینوں سے جا ٹکرائے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھا۔ بخار کی شدت اب پہلے سے کم تھی مگر میرے اندر جلنے والی آگ کی شدت طول پکڑتی جا رہی تھی۔

نینوں کے الجھاؤ نے اس کے چہرے کا رنگ بھی بدل ڈالا۔ وہ بھی ان لمحوں کے دلگداز احساس میں ڈوب چکی تھی۔ نہ جانے کتنا ہی وقت ایسے بیت گیا۔ جب بڑی بی نے یہ خاموشی کا بندھن توڑا۔

''ڈاکٹر صاحب..... کیسی ہے میری بچی؟'' میں نے چونک کر ادھر دیکھا اور پشمینے نے آنکھیں موند لیں۔

''رپورٹ آنے تک کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی فی الحال اسے یہاں ہی رکھنا پڑے گا۔'' میں نے اس کا کوئی ٹیسٹ نہیں کیا تھا جس کی رپورٹ آتی۔ میں نے جھوٹ بول دیا تھا۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور جو تھا۔ میں اس پری چہرہ کو اپنی آنکھوں میں سمونا چاہتا تھا۔ ان خوبصورت لمحوں کو کچھ اور طویل کرنا چاہتا تھا۔ میں کیسے اتنی جلدی اس کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کر سکتا تھا۔ مجھے زندگی اب حسین لگ رہی تھی تو کیسے ان حسین لمحوں کو ہاتھ سے جانے دیتا؟ سو یہ جھوٹ میں نے بلا جھجک بول دیا۔ بڑی بی سر ہلاتی بڑبڑاتی پھر سے بینچ پہ بیٹھ گئیں۔ میں نے آگے بڑھ اس کی کینولا میں انجکشن ڈالا اور اگلی مریضہ کی جانب بڑھ گیا۔

☆.....☆

میں اب بہانے بہانے سے اس کے کمرے میں آنے لگا تھا۔ وقت تھا کہ کٹتا ہی نہ تھا، وہ ان خوب صورت لمحوں کی قید میں آ گیا تھا۔ ہر گزرتی گھڑی مجھے پشمینے کے قریب کرتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار زندگی کو محسوس کیا تھا۔

میں بچپن ہی سے محبتوں کا ترسا ہوا شخص تھا۔ جس دن آنکھ کھولی تو اسی دن ماں دنیا سے کوچ کر گئی۔ باپ نے دوسری شادی کر لی اور اپنی زندگی میں مگن ہو گیا۔ اس کے بعد میں ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے ہاسٹل میں اپنے دن رات یتیموں کی طرح کاٹتا رہا۔ باپ ایک کامیاب بزنس مین تھا اس لیے میرے چھوٹے موٹے اخراجات اسکول اور ہاسٹل کی فیسیں وہ سال کے شروع میں ہی بھر دیتا تھا۔ میں تنہا پلا اور تنہا بڑھا۔ میڈیکل سے مجھے خاص لگاؤ تھا۔ میں نے بابا کا بزنس سنبھالنے کی بجائے ڈاکٹر بننے کو ترجیح دی۔ میری سوتیلی ماں اس حق میں بھی نہیں تھی کہ میں کاروبار میں دخل اندازی کروں۔ لہٰذا میں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ وقت بہت ظالم تھا مگر بہت ہی تیزی سے گزرتا چلا گیا۔ پتا ہی نہ چلا کب میں ایک لائق اور قابل ڈاکٹر بن گیا۔ میں نے شہر کے اسپتالوں میں کچھ عرصہ نوکری کی مگر دل کچھ مطمئن نہ تھا۔ میں نے دیہی علاقوں کا رخ کیا اور کراچی سے گھومتا پھرتا مالاکنڈ آ پہنچا۔ پھر وہاں سے مزید آگے بڑھتے ہوئے اس چھوٹے سے گاؤں کشمالہ آ پہنچا یہاں صرف ایک ہی اسپتال تھا جہاں ڈاکٹر بہت کم عرصے کے لیے رکتے۔ لوگوں کے سخت رویوں اور حالات سے آگاہ ہوتے تو واپسی کا رخ کر لیتے۔ میں

www.PakiBooks.Site

نے ایسا کچھ نہ کیا کیونکہ یہاں کے لوگوں کو میری شدید ضرورت تھی چنانچہ میں نے مستقل یہاں ہی رہنے کی ٹھان لی۔ بابا سے پہلے بھی رابطہ کم ہی تھا مگر یہاں آنے کے بعد مکمل ہی ختم ہو گیا۔ میں بظاہر ایک کامیاب ڈاکٹر تھا مگر اندر سے اتنا ہی ناکام اور دھتکارا ہوا شخص۔ جس نے قدم قدم پہ ٹھوکریں ہی کھائی تھیں لیکن پشمینہ کو دیکھتے ہی دل میں ہلچل مچ گئی تھی اور زندگی پہلی بار اتنی حسین لگنے لگی تھی۔

اب میں بہانے بہانے سے وارڈ کے چکر لگاتا اور محسوس ہوتا کہ وہ بھی اپنی منتظر نگاہیں وارڈ کے دروازے پر جمائے لیٹی ہے۔

اسے اسپتال میں آئے دوسرا دن تھا۔ وہ اب پہلے سے بہتر تھی مگر میں نے جان بوجھ کر دو تین ٹمیسٹ کرنے کا سوچا۔ ٹمیسٹ کی وجہ سے کچھ دن اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھنے کا بہانہ مل جاتا۔ نہ جانے کیوں، میں لاابالی لڑکوں والی حرکتیں کر رہا تھا۔

میں نے اس دن اس کے خون کا سیمپل لے کر شہر کی لیبارٹری بھجوا دیا۔ دو دن بعد رپورٹس آئی تھیں۔ میں نے اس کی ماں اور لڑکوں کو ٹمیسٹ کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ اگلی شام وہ بوڑھا شخص میرے دفتر میں آیا۔ میری اس سے بہت تفصیلی بات ہوئی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ غصے کا اظہار کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پشمینے کو اپنے ساتھ لے جائے مگر اس نے بہت اطمینان سے میری بات سنی۔ میرے ساتھ تعاون کیا اور اس کے علاج میں خصوصی توجہ برتنے کی تلقین بھی کی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اس کے دل میں پشمینے کے لیے نرم گوشہ ہے۔

میں پوری دلجمعی کے ساتھ اس کا علاج کرنے لگا۔ رپورٹس آئیں تو میرا شبہ ٹھیک نکلا۔ وہ نمونیا کے ساتھ ساتھ ٹائیفائیڈ کا شکار تھی۔ میں اس کا علاج کرنے لگا۔

اسے یہاں آئے پانچ دن ہو گئے تھے۔ میں مسلسل اس کے اردگرد رہنے لگا۔ ہمارے درمیان جھجک ختم ہو چکی تھی۔ ہم کافی بے تکلف ہو گئے تھے۔ وارڈ کے اندر اس کے پاس صرف مورے (ماں) ہوتی تھیں۔ وہ اردو نہیں سمجھتی تھیں۔ ہمیشہ مقامی زبان میں بات کرتی تھیں۔ میرے اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو کو وہ نہ سمجھ پاتی تھیں۔ اسی بات کا فائدہ اس نے بھی اٹھایا اور میں نے بھی۔ ان چار دنوں میں ہی ڈاکٹر اور مریض کے مقدس رشتے میں کھوٹ آ گیا۔ میں اب اسے مریض سے زیادہ محبوب سمجھ کر ٹریٹ کر رہا تھا۔ وہ بھی مجھے بظاہر تو صاحب کہتی تھی مگر اس کے چہرے پر پھیلے دھنک رنگ اس کے اندر کی حالت کا بخوبی پتا دیتے تھے۔ آٹھ دن ایسے ہی گزر گئے۔ محبت کا کھیل کب شروع ہوا میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں دن میں کئی کئی چکر وارڈ کے لگاتا تھا۔ دن میں اکثر مورے اس کو اکیلا چھوڑ کر گھر بھی چلی جایا کرتی تھیں۔ اس دوران ہم دونوں بالکل تنہا ہوتے تھے۔ پھر وہ تیسری مریضہ جو ٹی بی جیسے موذی مرض کے آخری اسٹیج پر اپنی زندگی اور موت کے دن گن رہی تھی۔ بظاہر جاگ رہی ہوتی تھی مگر نیم غنودگی اس پر ہر وقت طاری رہتی تھی۔ اس کا وارڈ میں ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اسی طرح ایک ساتھ وقت گزارتے گزارتے ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنا قریب ہو گئے کہ ہمیں خود سمجھ نہ آئی اور ایک رات میں بالآخر وہ کر بیٹھا جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

☆......☆

رات کا پہلا پہر شروع ہو چکا تھا جب میں زنانہ وارڈ میں پشمینے کے سرہانے کھڑا ڈرپ میں انجکشن ڈال رہا تھا۔ ڈرپ سے نظریں ہٹا کر میں نے بیڈ پر لیٹی پشمینے پر نگاہ ڈالی۔ وہ مسلسل مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' میں پوچھ بیٹھا۔

''کچھ نہیں صاحب...... سنا تھا مسیحا لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ بس وہ ہی دیکھ رہی تھی۔'' اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

''اچھا تو کیا میں تمہیں اچھا لگتا ہوں؟'' میں مسکرایا۔

''ہاں صاحب...... آپ بہت اچھے ہیں...... یا شاید مجھے اچھے لگتے ہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''صاحب مجھے اب رات کو نیند نہیں آتی...... ڈر لگتا ہے۔'' وہ پھر سے بولی۔

''ڈر...... کیسا ڈر؟'' میں نے پوچھا۔

''خان لالہ واپس آ جائے گا۔ مجھے لے جائے گا یہاں سے۔'' میں سمجھ رہا تھا وہ کس خان لالہ کی بات کر رہی ہے۔ اس کے جانے کا سوچ کر میرا دل اداس سا ہونے لگا۔

''تو تم نہیں جانا چاہتی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں صاحب...... میں...... میں گھر نہیں جانا چاہتی۔'' اس نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں...... کیوں نہیں جانا چاہتی اپنے گھر؟'' میں نے وجہ پوچھی۔ مگر وہ چپ چاپ مجھے دیکھنے لگی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پا رہی تھی۔ اتنے میں مورے بول پڑی۔

www.PakiBooks.Site

''بچے...... کیا کہتا ہے ڈاکٹر؟'' مورے ہمیشہ مقامی زبان میں بات کرتی تھیں۔ ان کو اردو نہیں آتی تھی اس لیے میرے اور پشمینے کے درمیان ہونے والی کسی بھی بات کو وہ سمجھ نہیں پاتی تھیں۔

''کچھ نہیں مورے...... کہتا ہے ایک دو دن تک تم گھر چلی جاؤ گی۔'' اس نے مورے کو جواب دیا۔

''میں رات کو آؤں گا۔ انتظار کرنا۔'' میں جاننا چاہتا تھا۔ ایسی کیا بات ہے جو وہ گھر نہیں جانا چاہتی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں دوسری مریضہ کی جانب بڑھ گیا۔

میں باہر نکلا تو وارڈ کے باہر بیٹھے لڑکوں میں سے اب ایک ہی تھا۔ میں نے اردگرد نظریں گھما کر دوسرے کو بھی ڈھونڈنا چاہا مگر شاید وہ جا چکا تھا۔ میں مردانہ وارڈ کا ایک چکر لگا کر اپنے دفتر میں واپس آ گیا۔

موسم آج بھی ہمیشہ کی طرح سہانا تھا۔ بادلوں کے جھنڈ میں ڈوبے چاند کی مدھم پھیکی لو میں بجھتے ٹمٹماتے تارے انتہائی دلکش لگ رہے تھے۔ برف باری تھم چکی تھی۔ البتہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ابھی بھی ہو رہی تھی۔ میں کچھ لمحے کھڑکی میں کھڑا رہا پھر مشتاق کو آواز دے کر چائے کا کہا۔ وہ چائے بنانے چلا گیا۔ میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے مریضوں کی فائلیں چیک کرنے لگا۔ مشتاق چائے اور بسکٹ لے آیا۔

''ٹھیک ہے یار تم جا کر کوارٹر میں آرام کرو۔ میں فی الحال یہاں پر ہی ہوں۔ باقی میں سب خود دیکھ لوں گا۔'' مجھے رات کو پشمینے سے ملنے جانا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مشتاق مجھے وہاں جاتا دیکھے کیونکہ اگر وہ جاگ رہا ہوتا تو ساری رات چل پھر کے گزارتا تھا۔

''ٹھیک ہے سر جی، میری ضرورت پڑے تو بلا لینا۔'' وہ کہہ کر چلا گیا۔ میں کافی دیر ایسے ہی بے سبب فائلیں ٹٹولتا رہا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ جیسے ہی گھڑی کی سوئیاں پورے دو پر جا کر رکیں میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے سے باہر نکل کر میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی اور وارڈ کی جانب چل پڑا۔

وہ لڑکا باہر رکھے بینچ پر سو رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اردگرد نگاہ دوڑائی اور دھیرے سے دروازہ کھولا۔ میں ڈاکٹر تھا۔ اگر وہ جاگ بھی جاتا تو میں کوئی بہانا کر دیتا مگر وہ ہنوز سویا رہا۔

وارڈ میں نیم اندھیرا تھا۔ وہ تینوں عورتیں سو رہی تھیں مگر مجھے یقین تھا کہ پشمینے جاگ رہی ہوگی۔ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں نے اس کے قریب جا کر دھیرے سے اسے پکارا۔

''پشمینے۔'' اور ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

''گھبراؤ مت۔'' میں نے اس کے کان کے قریب جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ اس نے گردن گھما کر ساتھ والے بیڈ پر لیٹی مورے کو دیکھا۔ وہ سو رہی تھیں۔ میں نے بھی کن انکھیوں سے دوسری مریضہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سو رہی تھی۔

میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ پر رکھا۔ نہ جانے کیوں رات کے اس پہر دل پہلی بار بے ایمانی پر اترنے لگا تھا۔ حالانکہ یہاں اکثر ایسے مریض آتے رہتے تھے مگر پشمینے...... پشمینے نے تو مجھے ہی مریض بنا ڈالا تھا۔ اپنا مریض اپنی ان طلسمی نظروں کا مریض...... ان جادوئی لمحوں کا مریض یا پھر دل کا مریض۔

میں نے ایک بار پھر گردن گھما کر ان تینوں عورتوں کو دیکھا اور پھر میں اس کے چہرے پر جھک گیا۔

''صاحب۔'' اس نے دھیرے سے پکارا۔ میں نے اس کی آواز میں چھپی تڑپ بخوبی محسوس کی تھی۔ تاہم میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''پشمینے۔'' میں اس کی نم آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ اب اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

اگر میں اس وقت جل رہا تھا تو آگ اس کے اندر بھی سلگ رہی تھی۔ اگر دل میرا بے ایمانی پر تلا تھا تو ہمت اس نے بھی میری بندھائی تھی۔ میں چند قدم کے فاصلے پر لگی ساکٹ کی طرف بڑھا اور وہ مدھم روشنی بھی بٹن دبا کر بجھا دی۔ اب کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں دبے پاؤں پھر سے اس کے بیڈ کے قریب آیا۔

''پشمینے۔'' میں نے اس کے کان کے قریب جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔ میں اس وقت اس کے بہت قریب تھا۔

ہاں اتنا قریب کہ اس کی سانسوں کی تپش مجھے اندر تک جھلسانے لگی۔ تڑپانے لگی۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوا یا نفس نے دھوکا دے ڈالا۔ میں دیوانوں کی طرح اسے پیار کرنے لگا اور پھر اس کے ہاتھ کو کھینچ کر نیچے اترنے کا

www.PakiBooks.Site

اشارہ دیا۔ وہ بھی تو پگلی تھی۔ ہاں پیار کی پگلی تھی۔ پیار کی پیاسی تھی۔ وہ بھی میرا ساتھ دینے لگی۔ میں اسے کھینچتے ہوئے باتھ روم تک لے آیا اور پھر میں ہار گیا۔ وہ ہار گئی۔

کچھ ہی دیر میں ہم دونوں اس حصار سے باہر نکل آئے۔ وہ جادوئی لمحات گزر گئے۔ سارا طلسم چھٹ گیا۔ اچانک ہی میں ہوش میں آ گیا۔ اس نے بھی خود کو راس کیا۔ میں نے واپس آ کر بتی جلا دی۔ وہ تینوں عورتیں ابھی بھی سو رہی تھیں۔

پشمینے بیڈ پر بیٹھ کر چپ چاپ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک پُرسکون مسکراہٹ تھی اس کے چہرے پر۔ جیسے میں نے اس کے سارے دکھ سارے درد سمیٹ لیے ہوں۔

اندھیرے کے بعد روشنی ہوئی تو ضمیر نے ملامت کر ڈالی۔ ''واہ مبشر واہ..... ہار گیا نا نفس سے تو!'' میں نے ماتھے پر آیا پسینا پونچھا۔ وہ ابھی بھی مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے نظریں جھکا لیں پھر بھاری قدم لیے وہاں سے باہر نکل آیا۔

پشمینے کے ساتھ آیا وہ رکھوالا ابھی بھی سو رہا تھا۔ مجھے اس پر بھی افسوس ہوا۔ اگر وہ جاگ رہا ہوتا تو میں شاید اس حد تک نہ گرتا۔ میں چپ چاپ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے دفتر کی جانب چل پڑا۔ اس رات میں صبح تک جاگتا رہا۔ میں کھڑکی میں کھڑا آسمان سے گرتی روئی کی مانند برف کو تکتا رہا۔ خود کو مسلسل لعنت ملامت کرتا رہا۔

''یہ میں نے کیا کیا؟ کیا کر آیا میں؟ کیوں کیا میں نے؟'' مجھے اپنے آپ پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ سارے وجود میں اضطراب برپا تھا۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

صبح ہوئی تو آنکھوں کو پھر ایک بار دیدار کی طلب ستانے لگی۔ دل مضطرب شدت سے مچلنے لگا تھا۔ میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بی پی اپریس اٹھایا مگر قدم آگے نہ بڑھا پایا تھا۔ میں وہیں کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ مجھ میں اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں مشتاق چائے لے آیا۔

''کیا بات ہے صاحب آج آپ کوارٹر میں نہیں گئے۔ ایمرجنسی بھی کوئی نہیں تھی پھر بھی؟'' اس نے کیتلی سے چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

میں کوئی جواب دیئے بغیر چپ چاپ اسے دیکھنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد میں بولا۔ ''بس ایسے ہی'' میں نے آگے بڑھ کر چائے کا کپ اٹھایا اور پینے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیتلی ایک طرف رکھ کر وہ دفتر کی صفائی کرنے لگا۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ میرے دماغ میں اس وقت کیا چل رہا تھا میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس سے پہلے میں اس سے کوئی بات کرتا وہ خود ہی بولنے لگا۔

''صاحب..... پشمینے بچی کب تک ڈسچارج ہو جائے گی؟'' میں اپنے خیالوں میں گم تھا جب اس نے یہ سوال کیا۔ یہ سن کر بھی میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''صاحب!! پشمینے کب تک ڈسچارج ہو گی؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں..... وہ..... وہ ایک دو دن تک۔'' اس کے اس سوال پر اب میرے اندر کا چور بوکھلا گیا۔

''بڑی بے ضرر بچی ہے پشمینے..... رشتوں اور محبتوں کی ٹھکرائی ہوئی۔ کبھی کبھی میرا بڑا دل اداس ہوتا ہے صاحب.....'' وہ کچھ پل رکا پھر افسوس سے بولا۔

''مگر میں بے بس ہوں، روایات کے آگے، بہت بے بس ہوں صاحب اس لیے میں نے شادی بھی نہیں کی کہ میری بیٹی ہو گئی تو انہی روایات کی بھینٹ چڑھے گی۔''

''کیا مطلب؟'' مجھے اس کی باتیں متجسس کرنے لگیں۔ ''کون سی روایات؟ پشمینے کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

مشتاق اسی علاقے کا رہائشی تھا۔ کافی عرصے سے اسپتال میں ملازمت کر رہا تھا۔ وہ علاقے کے سب لوگوں کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اکثر اسی طرح باتوں باتوں میں وہ ان لوگوں کے بہت سے قصے سنا دیا کرتا تھا۔ جو ظلم زیادتیوں قتل و غارت پر مبنی ہوا کرتے تھے۔ مجھے شک ہونے لگا کہ پشمینے کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی تھی..... مگر کیا؟ یہ میں جاننا چاہتا تھا۔ میرے پوچھنے پر وہ کرسی سیدھی کر کے بیٹھ گیا اور بولنے لگا۔ ''کیا بتاؤں صاحب یہ گاؤں کی پہلی لڑکی نہیں ہے جو فرسودہ روایات اور ظلم و ستم کا نشانہ بنی مگر پشمینے..... پشمینے نے تو قدم قدم پر آبلے اور خار ہی دیکھے ہیں۔''

''کک..... کیا مطلب؟''

''صاحب اس کا باپ اس کی پیدائش سے دو ماہ پہلے ہی خاندانی دشمنی کی نذر ہو گیا تھا۔'' وہ بتا رہا تھا مگر میں نے دشمنی اور قتل کی وجہ اور تفصیل نہ جانی تھی کیونکہ اتنا تو مجھے بھی علم تھا کہ یہاں دشمنی کے لیے کسی ٹھوس وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ معمولی بات پر ہونے والے جھگڑے قتل و غارت اور ظلم و فسادات کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ نسل در نسل

www.PakiBooks.Site

چلتے رہتے تھے۔

''اوہ..... پھر کیا ہوا تھا؟''

''پھر اس کی ماں کی شادی اس کے تایا دلاور خان سے ہو گئی۔''

''تایا کون؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی صاحب..... جو اس کے ساتھ آیا تھا۔''

''اچھا وہ خان لالہ تایا ہے اس کا؟''

''ہاں صاحب..... تایا تھا مگر پھر تایا سے سوتیلا باپ بن گیا اور وہ پہلے سے شادی شدہ بھی تھا۔ چھ بچوں کا باپ تھا مگر اس نے اس نکاح کو ثواب کا نام دے کر فوراً شادی کر لی۔ شادی تو ہو گئی مگر پھر وہ تایا سے ایک ظالم سفاک سوتیلا باپ ثابت ہوا۔''

''وہ لڑکے کون ہیں؟ بھائی ہیں پشمینے کے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں صاحب، باپ سے سوتیلے اور ماں سے سگے بھائی ہیں اس کے۔''

''اوہ..... اچھا۔''

''ہاں صاحب..... جب وہ بڑی ہوئی تو اس کے تایا کے بیٹے نے اس سے شادی کا ارادہ کیا۔ سننے میں آیا ہے کہ خان لالہ اس رشتے کے خلاف تھا۔''

''کیوں..... خلاف کیوں تھا؟''

''صاحب یہاں لڑکی کی شادی پر لڑکے والوں سے بیعانہ لیتے ہیں۔ مطلب پیسے..... پچاس ہزار۔ ایک لاکھ ڈیڑھ لاکھ۔ شاید ایسا ہی کوئی مسئلہ تھا کیونکہ اپنے بیٹے سے شادی کرنے پر اسے کچھ نہ ملتا اس لیے اس نے بیٹے کو شادی کا وعدہ دے کر کابل بھیجا کام کے سلسلے میں اور پیچھے سے پشمینے کی شادی اپنے ایک دوست سے کروا دی جو کہ پشمینے سے بھی دگنی عمر کا بندہ تھا۔''

''پھر؟ پھر کیا ہوا۔'' میں نے بے چینی سے استفسار کیا۔

''پھر صاحب..... پشمینے کے تایا بہرام خان کا بیٹا شہر سے واپس آیا۔ اس کو اس کے نکاح کی خبر ملی تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ بہرام خان نے یقیناً اس کو سمجھانے کی کوشش کی ہو گی مگر اس کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ گھر سے اسلحہ لے کر پشمینے کے گھر جا پہنچا۔ وہاں زبردستی کرنے لگا۔ یہ تماشا پورے گاؤں نے دیکھا تھا۔ وہاں تین لاشیں گری تھیں صاحب۔'' میں اس کی بات بہت توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ کچھ لمحے رکا۔ ایک لمبی آہ بھرنے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ''ایک پشمینے کے شوہر کی لاش تھی۔ ایک اس کے شوہر کے پہلے بیٹے کی اور ایک بہرام خان کے اسی بیٹے کی جس نے دونوں کو قتل کیا تھا۔''

''پھر..... پھر کیا ہوا تھا؟'' میں مسلسل متجسس تھا۔

''پھر پنچایت بیٹھی۔ ان کے دو قتل ہوئے تھے ان کا ایک۔ یہاں قتل کا بدلہ قتل ہوتا ہے صاحب۔ ان کو دوسرے قتل کا بدلہ بھی چاہیے تھا مگر بہرام خان پشمینے کی وجہ سے ایک اور بیٹے کو موت کے گھاٹ نہیں اتارنے دے سکتا تھا اس لیے اس نے ایک بار پھر پشمینے کو ان کے حوالے کر دیا۔''

''کک..... کیا مطلب؟'' میری حلق سے دبی دبی آواز نکلی۔ میرے سارے وجود میں اس وقت سوئیاں چبھنے لگی تھیں۔ دماغ چکرانے لگا تھا۔ سوچوں میں بند پڑ چکے تھے۔ بس ایک ہی نقطے پر آ کر دماغ اٹک گیا۔ کیا میرا بھی شمار ان درندہ صفت انسانوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے بس کھیل ہی کھیلا اس معصوم کی زندگی سے، اس کی خوشیوں سے، اس کے جذبات سے۔ مجھے اس وقت ان میں اور اپنے آپ میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ ان سے زیادہ اپنا وجود برا لگ رہا تھا۔

''پھر کیا صاحب کمسن لڑکی دیکھ کر مقتول کے بڑے بھائی شہباز خان کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے قتل کے بدلے اس سے نکاح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''

''واقعی!'' میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

''ہاں صاحب..... پشمینے کی عدت ختم ہو چکی ہے۔ ان دنوں شہباز خان ملک سے باہر ہے۔ وہ جیسے ہی واپس آئے گا۔ اسی دن نکاح کر کے اس کے ساتھ رخصت کر دیں گے۔'' وہ بات جاری رکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ صاحب، یہ مرتے مرجاتی مگر دلاور خان کبھی بھی علاج کے لیے اس کو اسپتال میں داخل نہ کرواتا مگر اس وقت وہ اس کی زندگی کو خطرے میں ڈال کر رسک نہیں لے گا۔ کیونکہ یہ اب اس کے گھر میں امانت ہے شہباز خان کی۔'' وہ برتن اٹھانے لگا۔

میں اس کی بات سن رہا تھا مگر میری سوچوں میں اس وقت کوئی اور ہی خیال ابھر رہا تھا۔

''کیا بات ہے صاحب؟ کیا سوچ رہے ہیں؟'' اس نے مجھے خاموش پا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں سوچ رہا ہوں دنیا کتنی ظالم ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

www.PakiBooks.Site

''ہاں وہ تو ہے۔بس اللہ ہی محفوظ رکھے سب کو۔''اس نے میری بات کے جواب میں افسوس سے کہا اور خالی برتن اٹھا کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''شہباز خان۔''میرے دماغ میں شہباز خان کا نام گردش کرنے لگا۔

''کچھ بھی ہو میں اسے اس دلدل سے نکال کر دم لوں گا۔میں اپنی پشمینے کو ان درندوں کے حوالے ہرگز نہیں کروں گا۔''میں زیرلب بڑبڑایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔میں کمرے سے نکل کر لانبے لانبے ڈگ بھرتا وارڈ میں چلا گیا۔جیسے ہی دروازے سے اندر قدم رکھا وہ میری منتظر تھی۔وہ بے تابی سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری؟''میں نے اس کے بیڈ کے قریب کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔''وہ میرے چہرے پر نظر ٹکائے لیٹی تھی۔

''نہیں بالکل ٹھیک نہیں ہو؟''میں نے اس کی کلائی تھامتے ہوئے نبض ٹٹولی۔

''اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔''اس نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔اس کے گداز گالوں کی لالی مزید رنگ پکڑنے لگی۔

''یہ کب تک گھر جائے گی۔''مورے نے مجھ سے پوچھا۔

''کل ان شاء اللہ آپ اس کو لے جانا۔''میں نے جواب دیا۔

''کل.....مگر میں تو اب نہیں جانا چاہتی۔''وہ کل کا سن کر گھبرانے لگی۔

''یہاں سے جانا تو ہے تمہیں.....مگر میں تمہیں جلد لینے آؤں گا۔انتظار کرو۔۔گی نا میرا؟''میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

''میں یہاں سے چلی گئی تو آپ کبھی مجھے نہیں لے جا پاؤ گے۔''اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔آواز میں بھی خوف واضح تھا۔

''میں تمہارے بارے میں سب جان گیا ہوں۔تم بے فکر رہو۔میں تمہیں ان درندوں کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گا۔میں بہت جلد تمہیں لینے آؤں گا۔بس تم میرا انتظار کرنا۔''میرے لہجے میں یقین تھا اور مجھے اپنے آپ پر بھی پورا بھروسا تھا۔مجھے بس صرف بندوبست کرنا تھا۔اسے اس گاؤں سے نکالنے کا بندوبست۔اگر یہ سب ضروری نہ ہوتا تو میں اسے ایک پل بھی یہاں نہ رکنے دیتا۔مگر فی الوقت مجبوری تھی کیونکہ بنا کسی بندوبست کے اسے اس طرح یہاں سے لے جانا کسی بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔

''کیا کہہ رہا ہے ڈاکٹر؟''مورے بہت دیر سے پاس کھڑی سن رہی تھی ان کے پلے کچھ نہ پڑا تو انہوں نے بے چینی سے استفسار کیا۔

''سمجھا رہا ہے کہتا ہے دوائی وقت پر کھانا۔پرہیزی کھانا کھانا پھر تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ گی۔''اس نے مورے کو فوراً جواب دیا۔

''ڈاکٹر تم ہی سمجھاؤ اسے۔میری تو یہ کوئی بات نہیں سنتی۔''مورے اب مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''جی اب یہ آیندہ احتیاط کریں گی۔اب بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔''میں نے انہیں تسلی دی۔وہ قریب رکھے بینچ پر پھر سے بیٹھ گئیں۔

''کوئی فون استعمال کر سکتی ہو؟''میں اپنا نمبر کاغذ پر لکھ کر لایا تھا۔میں نے اس کے ہاتھ کی مٹھی میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں داوڑ ھے کے گھر ہے فون۔وہ اس سے اپنے میاں کے ساتھ بات کرتی ہے۔وہ کابل جانے سے پہلے اس کو فون لگوا کر دے گیا تھا۔''اس نے مٹھی بھینچتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

''داوڑ ھے کون؟''میں نے پوچھا۔

''وہ میری دوست ہے۔ہمارے گھر کے ساتھ رہتی ہے۔''وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

''کیا وہ تمہیں فون استعمال کرنے دے گی؟''

''ہاں.....وہ میری پکی سہیلی ہے۔میں اس سے ہر بات کرتی ہوں۔وہ بہت اچھی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔تمہیں کوئی بھی مسئلہ ہو یا کوئی خطرہ محسوس ہو تو مجھے فوراً اس نمبر پر کال کر کے آگاہ کرنا۔''میں نے اس کی ڈرپ میں نیروبیان کا انجکشن ڈالتے ہوئے کہا۔ایک سرسری نگاہ اس کے سراپے پر ڈالتے ہوئے میں دوسری مریضہ کی جانب بڑھ گیا۔

وارڈ کے راؤنڈ سے فارغ ہو کر میں اپنے دفتر میں واپس آیا۔آرام کرسی پر بیٹھا میں پشمینے کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔مجھے اسے یہاں سے نکالنا تھا۔نکال کر بہت دور لے جانا تھا۔جہاں اس کے اور میرے درمیان تیسرا کوئی نہ ہو۔جہاں اسے خوشیاں ملیں، وہ سب ملے جو وہ چاہتی تھی۔نہ کہ وہ یہاں رہ کر پہلے دلاور خان اور پھر شہباز خان

www.PakiBooks.Site

کے مظالم کا تا حیات نشانہ بنتی رہے۔

میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔میں اب اس کو یہاں سے نکالنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

''میں اسے یہاں سے کراچی لے جاؤں گا۔نکاح کروں گا۔باعزت طریقے سے اس کو اپنی زندگی میں شریک کر کے اپنی باقی کی زندگی کراچی میں ہی گزاروں گا۔''میں نے دل ہی دل سوچا اور آنکھیں موندے آرام کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر لیٹ گیا۔البتہ اس وقت میرا سر شدید درد سے پھٹ رہا تھا۔دماغ بہت سی سوچوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔یا پھر یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ذہنی اور قلبی سکون کہیں روٹھ گیا تھا مجھ سے.....ہاں مجھ سے کھو گیا تھا سکون۔

☆.....☆

''صاحب دلاور خان آیا ہے۔وہ پشمینے کو لے جانے آیا ہے۔''مشتاق کی آواز پر میں نے فوراً آنکھیں کھولیں اور کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کیا؟.....دلاور خان!!مگر.....مگر وہ ابھی اسے کیسے لے جا سکتا ہے؟میں دیکھتا ہوں۔''میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''صاحب اسے جانے دیں۔اس سے زیادہ بحث مت کریں۔یہ شخص بہت سر پھرا ہے فضول میں بحث کرے گا۔''

میں نے کچھ پل رک کر اس کی بات سنی اور پھر کمرے سے نکل کر وارڈ کی جانب چلا گیا۔میں وہاں پہنچا تو وہ پہلے سے شٹل کاک برقع اوڑھے کھڑی تھی۔جس میں سے عورت کا ایک بال بھی نظر نہیں آتا مگر مجھے اس کے اندر سے بھی اس کی نظریں اپنے وجود میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔اس کا وقت رخصت آ پہنچا تھا۔میرا دل تڑپنے لگا۔میں نے بہت مشکل سے اپنے آپ پہ ضبط کیا۔

''یہ اب ٹیک (ٹھیک) ہے۔ادھر بیڈ پر اس کو لیٹنا ہے تو گھر لیٹ جائے گی۔تم اس کی دوائی لکھ دو ڈاکٹر صیب۔ہم گھر میں دے دے گا۔''مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً بولا۔اس کے سپاٹ لہجے سے بیزاری بھی جھلک رہی تھی۔

''ایک دو دن اور مزید رک جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔''میں نے اپنائیت اور لہجے میں نرماہٹ برقرار رکھی۔جو مجھے میرے پیشے سے ورثے میں ملی تھی۔

''کیوں؟ایک دو دن اور یہاں رکے گی تو تم اس پر دم پڑھ کے پھونکو گے!جو دوا یہاں دینی ہے وہ لکھ کر دے دو ہم گھر پر بھی دے سکتے ہیں۔ویسے بھی ہمارے گھر کی عورتیں گھر سے باہر نہیں رہتیں۔اتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں یہاں آئے ہوئے۔اتنا تو سمجھ گئے ہو گے۔''اس نے بیزاری اور غصے سے بات کی۔مجھے مشتاق کی کہی بات یاد آ گئی۔میں نے مزید بحث نہ کی۔میں نے چپ چاپ دوائی لکھ دی۔پھر پشتو میں پشمینے کی ماں کو دوائی کے اوقات اور طریقہ کار سمجھانے لگا۔

''اب چلو یا مستقل یہاں ہی رہنے کا ارادہ ہے؟''وہ پشمینے پر دھاڑا۔وہ گم صم کھڑی تھی اس کے کہتے ہی کسی ریموٹ کی طرح اس کے پیچھے چل پڑی۔مورے نے بھی میری بات پوری نہ سنی۔ہاتھ سے دعاؤں کا نسخہ جھپٹ کر وہ ان کے پیچھے تیزی سے بھاگی۔

میں چپ چاپ اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔وہ دلاور خان اور مورے کے ساتھ چلتی جا رہی تھی۔کچھ دور جا کر اس نے گردن موڑی۔اس نے آخری بار مجھے دیکھا۔میرا دل زور سے مچلا۔میں دو قدم آگے بڑھا۔دل چاہا کہ بھاگ کے جاؤں اور اسے بچا لوں۔ان جاہل اور بھیڑیا صفت انسانوں سے مگر میں وہیں رک گیا۔وہ گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی اور کچھ ہی پل میں گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ آئی.....مجھے اپنے پیار میں رنگ کے.....میری محبت کے چندرنگ اپنے وجود میں لپیٹ کے پتا ہی نہ چلا اور چلی بھی گئی۔

اس وقت میری آنکھوں میں آنسو تھے۔میں بھاری قدم سے واپس اپنے دفتر میں آ گیا۔میں کافی دیر اس کے بارے میں سوچتا رہا۔میں خود سے بیگانہ ہو چکا تھا۔مجھے ارد گرد کا ہوش نہ تھا مگر مشتاق نے میری حالت کو بغور دیکھا تھا۔جائزہ لیا تھا۔وہ سب سمجھ چکا تھا۔

''صاحب!''میں اس وقت کھڑکی کے نزدیک کھڑا تھا جب مشتاق نے مجھے پکارا۔میں نے چونک کر اسے دیکھا۔میری آنکھوں میں اس وقت بھی نمی تھی۔میں نے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے۔

''ہاں.....بولو مشتاق.....کیا بات ہے؟''میری آواز میں عجیب سی بے بسی تھی ایک تھکان جو میں خود بھی محسوس کر رہا تھا۔

''چائے.....چائے لایا ہوں میں۔''اس نے ٹرے میز پر رکھی۔وہ مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے رکھ دو۔''میں نے سرسری انداز میں کہا

www.PakiBooks.Site

اور پھر واپس کھڑکی کی جانب مڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''صاحب ایک بات پوچھوں، برا تو نہیں مانو گے؟'' وہ ابھی بھی وہیں کھڑا تھا۔

''ہاں پوچھو۔'' میں اسی طرح سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ۔'' وہ کہتے کہتے رکا۔ شاید گھبرا رہا تھا۔

''صاحب آپ پسینے کی وجہ سے پریشان ہیں؟'' اس نے ذہن میں چلنے والے سوالات کو لفظوں کا جامہ پہنا دیا۔ اسے مجھ سے یہ سوال کرتے ہوئے جھجک ضرور محسوس ہوئی تھی مگر ڈر نہیں تھا اس کے لفظوں میں۔ شاید اسی وجہ سے کہ ایک ساتھ رہتے رہتے، مالک اور نوکر والا رشتہ ختم ہو چکا تھا یا شاید میں نے ہمیشہ اس کو ملازم نہ سمجھا تھا۔ بہت کم ایسی باتیں تھیں جو میں اس سے نہ کہتا تھا ورنہ فارغ اوقات میں یا کبھی بھی ضرورت پڑنے پر میں ہر طرح کی بات اس سے کہہ لیا کرتا تھا۔ مشتاق کے علاوہ مبین بھی ہوتا تھا یہاں۔ چوکیدار بھی تھا مگر جو انسیت میری مشتاق سے تھی وہ کسی اور سے نہ تھی۔ وہ بھی ایسا ہی تھا بہت خوش اخلاق اور دردِ دل رکھنے والا انسان۔

اس وقت یہ سوال خلاف توقع تو نہیں تھا۔ وہ مجھے پریشان دیکھ کر ہمیشہ وجہ جانا کرتا تھا مگر یہ توقع بھی نہ تھی کہ وہ سیدھا پسینے کا نام لے کر سوال کر ڈالے گا۔

میں نے گردن کو ہلکا سا ترچھا کیا اور پیچھے دیکھا۔ وہ ہاتھ باندھے وہیں کھڑا تھا۔

''میں..... پسینے کی ہی وجہ سے پریشان ہوں۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی پھر ہاتھ سے اس کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''صاحب۔ وہ اب جا چکی ہے۔ اب آگے اللہ جانے اس کے ساتھ کیا ہوگا مگر آپ تو پریشان مت ہو۔ یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا تھا۔''

میں اس کی بات پر کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''میں اس کی..... میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔'' معلوم نہیں یہ الفاظ اس وقت میری زبان پر کیسے آئے ورنہ میں اس قدر پریشان تھا کہ میں کچھ بھی کہہ دیتا۔

''مدد!! صاب کبھی بھول کر بھی مدد کا مت سوچنا۔ آپ کی زبان سے اگر کسی نے پسینے کا نام بھی سن لیا تو وہ لمحہ بھی نہیں لگائیں گے آپ کو ضائع کرنے میں۔'' اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

میں اس کی بات سن رہا تھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر چائے کا کپ اٹھایا۔ ایک گھونٹ..... دو گھونٹ..... تین گھونٹ میں نے بہت جلد وہ گرم چائے اپنے اندر انڈیل لی۔ میرے وجود میں اس وقت ایسی آگ بھڑک رہی تھی کہ اس چائے کی گرماہٹ کا میں اندازہ ہی نہ کر سکا۔ مشتاق ابھی تک سامنے والی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ چائے کا کپ میز پر رکھ کر میں نے گلا کھنکھارا۔ وہ پھر سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''مشتاق، میں ان کے سامنے جا کر نام نہیں لے رہا ہوں۔ یہ سب تو میں بھی جانتا ہوں کہ ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ میں اپنے طریقے سے کچھ کرنا چاہتا ہوں یار۔ کچھ ایسا کہ نہ صرف پسینے بلکہ اس علاقے کی ہر لڑکی ان فرسودہ رسومات سے چھٹکارا پا سکے۔''

میں کھلے لفظوں میں اس وقت کچھ بھی نہیں کہہ سکا نہ ہی کہنا چاہتا تھا۔ یہ کہہ دینا بہتر ہوگا کہ میں بات گھما کے اس وقت مشتاق کی بس تھوڑی بہت مدد چاہتا تھا ورنہ سچ تو یہ تھا کہ نہ مجھے پہلے کبھی ان رسموں کی پروا تھی نہ اب۔ پروا تھی تو صرف پسینے کی مگر میں ایسی کوئی بات مشتاق سے نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے اس کو میرے یا پسینے کے کردار پر شک ہو۔

''مگر صاحب ایسا بہت مشکل ہے کیونکہ یہاں کے لوگ آواز نہیں اٹھاتے۔ چند امیر قبائل کے خان چھوٹے قبیلوں پر سانپ کی طرح پھن مار کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی کو بولنے نہیں دیتا۔ اگر کوئی اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائے یا احتجاج کرنے کی کوشش کرے تو یہ اس کی پہلی اور آخری کوشش ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس کا نام و نشان ہی سرے سے مٹ جاتا ہے۔'' مشتاق نے مجھے سمجھانے والے انداز میں آگاہ کیا۔

''وہ کوئی کرتا ہوگا۔ میں نہ تو کوئی ہوں نہ ہی ان میں سے کسی کے قبیلے کا ہوں۔ میں ڈاکٹر مبشر ہوں۔ میں اگر یہاں بھیجا گیا ہوں تو کسی مقصد ہی کے تحت بھیجا گیا ہوں۔ میں نے تین سال سے زائد عرصہ یہاں پر گزار دیا۔ آنکھیں کھلی ہیں میری، کان بھی مگر میں جان بوجھ کر مزید بند کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔ اب میرا..... اب میرا ضمیر نہیں مانتا۔'' میں کہتے ہوئے بے چینی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ لفظ ''ضمیر'' پر میری آواز بھاری پڑ گئی تھی۔

''ضمیر..... اب تو ضمیر مان بھی کیسے سکتا ہے۔ ضمیر اب ان باتوں یا اپنے اس جرم کے عوض جان دے دے گا یا

www.PakiBooks.Site

پھر اس معصوم کو رہائی دلوا کے دم لے گا مگر اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک وہ اس گناہ کا پنڈورا باکس بند نہ کر لے..... بالکل نہیں بیٹھے گا!'' میں نے دل ہی دل میں سوچا البتہ ایسی کوئی بھی بات مشتاق سے نہ کی تھی۔

''آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' کچھ پل سوچنے کے بعد اس نے مختصراً پوچھا۔

''میں..... میں شہر جا رہا ہوں۔ میرے بہت سے جاننے والے ہیں۔ بہت سے سورسز ہیں۔ میں انہیں استعمال میں لانا چاہتا ہوں۔''

''کیا یہ سب آسان ہوگا؟''

''آسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا مگر ناممکن بھی نہیں ہوتا۔'' میں کمرے میں ٹہلتے ہوئے بولا۔

''صاحب..... تو پھر ٹھیک ہیں۔ اگر ایسا ممکن ہے تو کوشش کر کے دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔'' اسے اُمید کی کرن نظر آئی۔ بظاہر وہ بھی ایک کمزور اور بے بس انسان تھا جو یہاں کے حالات سے تھک چکا تھا مگر بندھے ہاتھوں کی وجہ سے بے بس تھا۔

''مجھے تمہاری مدد چاہیے مشتاق۔ میں یہ سب تمہیں بتائے بغیر بھی کر سکتا تھا مگر تمہیں بتانے کا مقصد ہی تمہاری مدد ہے جو اس وقت میرے لیے بہت ضروری ہے۔'' میں اب اس کی طرف مڑا۔

''میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے آپ بتا دیں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ مجھ سے جو بن پایا میں کروں گا۔''

''ابھی تو رات ہو چکی ہے بہت۔ میں صبح سویرے کراچی کے لیے نکلوں گا، تمہیں روزینلی فون کے ذریعہ مجھے یہاں کے حالات کی خبر دینی ہے۔ میں جلد از جلد کراچی پہنچ کر اس مسئلہ پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں شہباز خان کے واپس آنے سے پہلے کچھ کروں۔'' میں کہتے کہتے رکا۔ معلوم نہیں وہ میری باتوں یا میرے احساسات سے کچھ سمجھا تھا یا نہیں مگر اس کے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں جانتا تھا اگر وہ کچھ سمجھ بھی گیا تو میرے خلاف کبھی بھی کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گا۔

''ٹھیک ہے..... میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں میں آپ کو خبر دے دیا کروں گا۔'' اس نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

اس سے بات کر کے مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ نہ جانے پسینے کا مجھ سے رابطہ ہو نہ ہو مگر مشتاق کا مجھ سے رابطے میں رہنا ضروری تھا۔

میں وارڈ کا ایک راؤنڈ لینے کے بعد کوارٹر میں آ گیا۔ جلدی جلدی پیکنگ کرنے لگا۔ میں جانتا تھا یہ میری آخری رات تھی اس کوارٹر میں۔ مگر یہ نہ جانتا تھا اس علاقے میں بھی آخری ہی ہے۔ میں نے اس رات سونے کی کوشش کی تھی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اب تک میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی نشہ نہ کیا تھا۔ ڈاکٹروں کو نشے زیب بھی نہیں دیتے مگر کچھ دنوں سے میں نے سگریٹ پینا شروع کر دی تھی۔ وہ پوری رات میں نے ایک کے بعد ایک سگریٹ پھونکتے گزاری۔ صبح ہوتے ہی میں مشتاق سے ملا ضروری ہدایات دیں۔ کمپاؤڈر مبین کو اپنی غیر موجودگی میں اسپتال واپس آنے کے لیے کال کی اور پھر واپسی کے لیے نکل پڑا۔ شومئی قسمت اس روز میری جیپ کا انجن بھی مسلسل برف باری اور ٹھنڈ کے سبب جام ہو چکا تھا۔ میں اس وقت مکینک بلوا کر ٹھیک کروانے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ میں پیدل ہی وہاں سے چل نکلا۔ مسلسل دو گھنٹے سفر کرنے اور نظریں سڑک پر بار بار دوڑانے کے بعد مجھے دور سے ایک ٹرک آتا نظر آیا۔ اس کے قریب پہنچنے کا انتظار کرنے سے پہلے ہی میں نے ہاتھ بلند کر کے لہرانا شروع کر دیے۔ بالآخر وہ قریب آ کر رک گیا۔ مسلسل تین گھنٹے اس یخ موسم اور برف باری میں چلنا کسی نارمل انسان کا کام نہیں تھا۔ میں بھی اس وقت ابنارمل ہو چکا تھا۔ ہر وہ انسان جو محبت جیسے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ پھر نارمل رہتا ہی کہاں ہے۔ اسے اپنا ہوش رہتا ہے نہ اردگرد کی خبر..... نہ ہی موسم کی پروا رہتی ہے۔ اس کے اندر تو بس ایک ہی موسم چل رہا ہوتا ہے، پیار کا موسم۔ جس میں وہ اس قدر مگن ہو جاتا ہے کہ چاہے گرمی ہو یا سرد طوفانی رات..... اسے اردگرد کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ کچھ خبر نہیں ہوتی۔ مجھے بھی کچھ خبر نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ میرے ذہن کی دیواروں پر بس ایک چہرہ نقش ہو چکا تھا۔ جس کے سوا مجھے کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی دیتا تھا۔ مجھے بس اس کی آزادی چاہیے تھی۔ مجھے پسینے چاہیے تھی۔ میں جلد از جلد اسے حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ پھر موسم کیا، راستے کیا، فاصلے کیا۔ میرا تو گمان ہی ان سوچوں سے خالی ہو چکا تھا۔

کئی گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد ہم اس علاقے سے باہر نکل آئے۔ میں نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا پھر شہر کے

www.PakiBooks.Site

ایک مقام پر اترا۔ وہاں سے میں نے اسلام آباد کی بس پکڑی اور پھر اسلام آباد سے بائے ایئر کراچی کے لیے روانہ ہوگیا۔

کراچی پہنچ کر مجھے سب سے پہلے خاور سے ملنا تھا۔ خاور میرا اسکول کے زمانے سے دوست تھا۔ اس وقت وہ کراچی کے تھانہ میں ایس ایچ او کی پوسٹ پر تھا۔ میرے سوچے گئے منصوبے کی پہلی کڑی خاور ہی تھا۔ مجھے اُمید سے زیادہ یقین تھا کہ پشمینے کو وہاں سے نکالنے میں وہ میری ہر ممکن مدد کرے گا۔ میں ٹیکسی لے کر سیدھا اس کے فلیٹ پہ پہنچا۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ میرا خیال تھا وہ اس وقت گھر پر ہی ہوگا مگر وہاں پہنچ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ گھر پر نہ تھا۔ تین روز پہلے ہی اپنی والدہ کے ہمراہ عمرہ کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔ اس کی واپسی پندرہ روز بعد کی تھی۔

کوئی اور وقت ہوتا تو مجھے بہت خوشی ہوتی کہ میرے جگری یار کو اپنی والدہ کے ہمراہ عمرے کی سعادت نصیب ہوئی ہے مگر اس لمحے انتہائی افسوس سا ہوا۔ میں نے تاسف سے سوچا۔ ''میری جان پر بنی ہے اور اسے بھی عمرے کے لیے اب ہی روانہ ہونا تھا۔'' بہرحال میں دل پر پتھر رکھ کر گھر کے اندر چلا گیا۔

خاور کی پھپھو گھر پر ہی تھیں۔ وہ بیوہ تھیں اور یہاں خاور کے ساتھ اس کے گھر میں ہی رہتی تھیں۔ میں جب بھی اسپتال سے چھٹی پر آتا تو ان سے ملنے ضرور آتا۔ اکثر خاور اور پھپھو کے اصرار پر رات بھی وہیں گزارتا تھا۔

میرے اور خاور میں پھپھو نے کبھی فرق نہ کیا تھا۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ جانتی تھیں میں نے بھی زندگی ماں کے بغیر گزاری ہے۔ باپ ہے مگر وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ پھپھو مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ مجھے ان کی محبت میں ماں جیسی مامتا کا احساس ہوتا اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ میں خاور کے گیٹ تک آتا اور پھپھو سے نہ ملتا۔

مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئیں۔ میں نے انہیں اپنے یوں اچانک آنے کی وجہ تو نہ بتائی، مگر یہ ضرور بتا دیا کہ ''جب تک خاور واپس نہیں آجاتا ہے میں کراچی میں ہی ہوں۔ اس سے مل کر واپس جاؤں گا۔'' وہ یہ بات سن کر بہت خوش ہوئیں۔ بس پھر کیا تھا انہوں نے مجھے اس وقت تک اپنے پاس ہی رہنے پر مجبور کرلیا جب تک خاور اور آنٹی کی واپسی نہیں ہوجاتی۔ ان کے جانے سے وہ بھی بہت اکیلی ہوگئی تھیں پھر میرے ہوٹل میں تنہا دن کاٹنے سے بہتر تھا میں خاور کے گھر ہی رہ کر اس کا انتظار کرلوں۔ اس سے نہ صرف ان کی تنہائی کٹ جائے گی، بلکہ میرا بھی بے قرار وقت تھوڑا بہتر گزر جائے گا، کیونکہ میں اس وقت تک اگلا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا جب تک میرے ساتھ خاور نہ کھڑا ہوتا۔

☆.....☆

وقت گزرتا رہا۔ میں بظاہر ٹھیک ٹھاک ہوتے ہوئے بھی اندر ہی اندر پشمینے کے تیز بخار میں مبتلا تھا۔ دن جیسے تیسے کٹ جاتا، مگر رات..... رات آنکھوں پر گراں گزرتی۔ کسی کسی رات تو یادوں سے فراغت کے لیے نیند کی گولی کھا کر سو جاتا تھا مگر کبھی دل چاہتا جاگ کر اس کو یاد کروں، اسے سوچوں۔ پھر میں ایک کے بعد ایک سگریٹ پھونکتے ہوئے یا جلے پیروں کی بلی کی طرح لان میں سیاہ رات کی چادر تلے وہ وقت ٹہلتے ٹہلتے گزار دیتا۔

ان سارے دنوں میں، میں مشتاق سے بھی رابطے میں رہا۔ گاؤں میں اب تک سب خیر تھی۔ میں پھر بھی صبح شام اسپتال کے نمبر پر کال کرتا رہا۔ مشتاق سے جب تک بات کر کے تسلی نہ کرلیتا کہ پشمینے کی طرف سب ٹھیک ہے، باشہباز خان اب تک واپس نہیں آیا تو میری جان تب تک سولی پر ٹنگی رہتی۔

پھر بالآخر وہ پندرہ دن کٹ گئے۔ خاور اور اس کی والدہ عمرہ کر کے لوٹ آئے۔ یہ دن سب کے لیے بہت بڑا دن تھا۔ خوشیوں اور مسرتوں بھرا دن۔ مگر میرے اندر تو ایک اور ہی خوشی چل رہی تھی۔ عمرہ سے کہیں زیادہ اس کے واپس لوٹ کر آنے کی خوشی۔

اس نے بھی مجھے گھر پر پایا تو اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ ہم دونوں پُرجوش انداز میں بغل گیر ہوئے۔ البتہ اس کے اور میرے جوش میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

رات دیر تک لوگ مبارکباد دینے آتے رہے۔ میرے لیے وہ اک اک لمحہ بہت قیمتی تھا۔ میں بس اسی انتظار میں تھا کہ کب لوگوں کا رش ختم ہو اور کب میں اس کو اپنی پریشانی بتاؤں۔ وہ رات آٹھ بجے تک فارغ ہوگیا۔ ہم سب نے مل کر اکٹھے کھانا کھایا۔ آنٹی سفر کی وجہ سے تھک چکی تھیں۔ وہ آرام کرنے چلی گئیں۔ پھپھو بھی نو بجے تک سو جاتی تھیں۔ میں اور خاور تنہا ہوئے تو میں نے شکر کی سانس لی۔ خاور نے بھی میری حالت کا بغور جائزہ لیا۔

''کیا بات ہے مبشر، تم مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ پندرہ روز سے یہاں ہو۔ کیوں کوئی بات ہے کیا؟'' وہ میری حالت سمجھ چکا تھا۔ اس کے پوچھتے ہی میں نے اسے

www.PakiBooks.Site

ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ پہلے تو وہ چند ثانیے خاموش رہا۔ یہ کراچی کے اندر یا پھر اردگرد کے کسی علاقے کا کام ہوتا تو وہ اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا مگر بات آزاد علاقے کی تھی۔

''اس کام میں بہت بڑا رسک ہے مبشر، تمہاری جان بھی جاسکتی ہے۔ یہ لوگ بہت سخت مزاج ہوتے ہیں۔ جان دے دیتے ہیں مگر اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دیتے۔'' وہ مجھے سمجھا رہا تھا مگر میں اس وقت سمجھنے سمجھانے کی پوزیشن میں ہی کب تھا۔

''مجھے اب جان کی پروا نہیں، مجھے وہ چاہیے ہر حال میں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''میرا ایک دوست ہے ارحم، اس کا کزن مالاکنڈ ڈویژن یا کسی آس پاس کے علاقے میں ہوتا ہے، شاید پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہی ہے۔ میں پتا کرتا ہوں اس سے۔'' بہت دیر سوچنے کے بعد خاور مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر اس کے پاس آبیٹھا۔

''ہاں..... اگر ایسا ہے تو کرو بات اس سے۔ تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا مجھ پر یار۔'' مجھے اُمید کی کرن نظر آئی۔

''چائے ٹھنڈی ہورہی ہے۔ چائے لو میں کرتا ہوں کچھ۔''

''ٹھیک ہے۔'' میری روح کو تھوڑا سا قرار آیا۔ میں نے آگے بڑھ کے چائے کا کپ اٹھالیا۔ خاور نے چائے ختم کرتے ہی اپنے دوست کا نمبر ملایا اور پھر اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے دوبارہ رابطہ کرنے کا کہہ کر کال منقطع کردی۔

''کیا کہتا ہے وہ..... ہو جائے گا کام؟'' میں نے بے چینی سے استفسار کیا۔

''یار اس نے بھی یہی بات کی ہے کہ یہاں کے لوگوں سے دشمنی نہ مول لی جائے تو بہتر ہے۔ بہرکیف اپنے کزن سے بات کر کے ہمیں آدھے گھنٹے تک آگاہ کرتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، اگر تم سے کچھ نہ ہوسکا تو میں خود راستہ تلاش کروں گا۔'' میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

''مطلب تمہاری سمجھ میں میری بات نہیں آئی؟'' وہ پھر سے گویا ہوا۔

''کیسی بات؟'' میں نے اسی کے انداز میں پوچھا۔

''یہی بات کہ تم جو کرنے جارہے ہو وہ تمہارے حق میں ٹھیک نہیں۔ تم اپنے آپ کو تو خطرے میں ڈال ہی رہے ہو لڑکی کی زندگی بھی داؤ پہ لگانا چاہتے ہو۔''

''اب ٹھیک ہے یا غلط مجھے اس بات کی پروا نہیں۔'' کہتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی میں کھڑے ہوکر دور افق پر چمکتے ستاروں کو دیکھنے لگا۔ رات کی سیاہی میری روح میں مزید اضطراب برپا کررہی تھی۔

''دیکھو مبشر، معاملہ کچھ اور ہے۔ تمہارے اندر کیا چل رہا ہے مجھے وہ بتاؤ۔'' اسے مجھ پر شک ہونے لگا۔ آخر کو وہ میرا گہرا دوست تھا، سمجھتا تھا مجھے۔

''کچھ نہیں یار کوئی معاملہ نہیں، بس میں اتنا آگے تک چلا گیا ہوں اس سفر میں کہ اب واپسی ناممکن ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میں اسے وہاں مرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا۔''

وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے میرا حوصلہ بڑھانے لگا۔ ''پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہوگا۔ تمہیں تمہاری محبت ضرور ملے گی، میں تمہارا ہر حد تک ساتھ دوں گا میرے یار۔''

وہ سمجھا شاید میں عشق کی آگ میں جل رہا ہوں مگر میرے اندر محبت کی جمع تلافی کا کھیل چل رہا تھا۔ محبت تو شاید میں اس اندھیری رات کے حوالے کر آیا تھا۔ اب تو بس تلافی تھی، اپنے اس داغ ندامت کو مٹانے کی ایک چھوٹی سی تلافی۔

کچھ دیر بعد موبائل پر رنگ ٹون بجی۔ انسپکٹر خاور نے کال ریسیو کی تو میں جو کافی دیر سے کھڑکی میں کھڑا ٹمٹماتے تاروں کو گھور رہا تھا، تیزی سے اس کے قریبی صوفے پر جا بیٹھا۔

خاور سن رہا تھا اس کی باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ دوسری جانب ارحم ہے اس نے بہت تفصیل سے بات کی تھی۔ کال بند ہوئی تو میں کچھ پوچھتا کہ خاور خود ہی بول پڑا۔

''مبارک ہو..... تمہارا آدھا مسئلہ تو حل ہوگیا ہے۔ ارحم کا کزن ارباز اسی علاقے کے قریبی شہر میں ہے۔ ایس ایچ او کی پوسٹ پہ تعینات ہے اور اس کی دوستی پولیٹیکل ایجنٹ سے بھی ہے۔''

''واقعی؟'' مجھے سن کر خوشی ہوئی۔

''ہاں..... اور اب اگر تمہیں کوئی اور انتظام کرنا ہے تو کرلو ہم۔ اگلے ہفتے نکلیں گے۔ وہاں جا کر اس سے ملاقات کریں گے۔ پھر آگے کے معاملات وہ خود طے کردے گا۔ تم پھر آرام سے بھابی کو وہاں سے نکال کر یہاں لے آنا۔ انشاء اللہ بہت دھوم دھام سے ولیمہ کریں گے یہاں۔'' وہ اپنی

www.PakiBooks.Site

دھن میں بولتا جا رہا تھا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میری سوئی اب اگلے ہفتے پر اٹک چکی تھی۔ میں پہلے بھی یہاں بیس دن گزار چکا تھا ایک ہفتہ مزید یہاں رکنا تھا۔ میرا دل نہیں مان رہا تھا۔

''کیا بات ہے..... اب کیا پریشانی ہے؟'' وہ مجھے گم صم پا کر دوبارہ بولا۔

''یار اگلا ہفتہ تو بہت دور ہے۔ میں مزید یہاں نہیں رک سکتا۔ میں نے اب تک بہت مشکل سے یہ وقت گزارا ہے۔'' میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''دیکھو۔ میں ابھی ایک ماہ کی چھٹی گزار کر واپس آیا ہوں۔ میری ڈیوٹی کا تمہیں اندازہ ہے۔ میں اب آگے چھٹی نہیں کر سکتا۔ میرے بہت ضروری ایک دو کام ہیں، وہ نمٹ جائیں پھر نکلتے ہیں یار..... ایسی بھی کیا جلدی ہے؟'' وہ مجھے سمجھانے لگا۔

''یار، اگر شہباز خان واپس آ گیا تو سب دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں اس کے واپس آنے سے پہلے سب کام ہو جائے۔''

''شہباز خان اب تک نہیں آیا نا..... اب بھی نہیں آئے گا۔ بس تم اللہ پر بھروسا رکھو۔ جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں ایک ہفتہ اور کر لو۔''

''ٹھیک ہے..... مگر کوشش کرو جلدی نکلیں۔'' میں اس کی مجبوری سمجھ رہا تھا۔ میں نے اللہ پر آسرا کر کے مزید ہفتہ انتظار کی نذر کر دیا۔

☆.....☆

پانچ دن مزید گزر گئے۔ میں نے یہ دن زندگی میں پہلی بار سڑکوں کی خاک چھانتے گزارے تھے۔ خاور بھی میری وجہ سے پریشان تھا مگر اس کی ان دنوں ڈیوٹی ایسی تھی کہ کوشش کے باوجود بھی اسے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ میں مشتاق سے مسلسل رابطے میں تھا۔ وہ ہر روز مجھے گاؤں کے حالات کے بارے میں ہر چھوٹی، بڑی خبر دیتا رہا تھا۔ دل اس جانب سے مطمئن تھا کہ درم خان کی فی الحال واپسی نہیں ہوئی ہے۔ ان سارے دنوں میں، میں پشمینے کی کال کا انتظار بھی کرتا رہا۔ میں اس کو نمبر دے کر آیا تھا مگر شاید کسی مجبوری کے تحت وہ اب تک مجھ سے رابطہ نہ کر پائی تھی اس لیے اب میں نے اُمید بھی چھوڑ دی تھی کہ اس سے شاید ہی رابطہ ہو۔

اس رات میں دیر تک جاگتا رہا۔ خاور بھی گھر واپس نہ آیا تھا۔ میں رات دیر تک سگریٹ پھونکتا رہا۔ کبھی ٹیرس پر کھڑے ہو کر تارے گنتا تو کبھی بیڈ پر چت لیٹ کر چھت کو گھورتا۔ دل میں عجیب سی بے چینی تھی۔ بالآخر صبح چھ بجے کے قریب میری آنکھ لگ گئی۔ میں جب جاگا تو نو بج رہے تھے۔ دل اب بھی بہت مضطرب تھا۔ میں نے کروٹ بدلی۔ اس لمحے شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی پشمینے کا معصوم چہرہ آنکھوں کے گرد گھوما۔ نہ جانے کیوں، میں نہیں جانتا مگر آنکھیں بھیگنے لگیں۔ میں نے آنسو پونچھے پھر اٹھ کر باتھ روم کا رخ کیا۔ آئینے کے سامنے بے سبب تقریباً دس منٹ تک کھڑا رہا۔ اپنا چہرہ تکتا رہا۔ جہاں بہت کچھ تھا جو کبھی نمایاں تو کبھی پوشیدہ ہونے لگتا۔

کیا گناہ ارادتاً ہوتے ہیں؟ کیوں شیطان ہمیں اس قدر اندھا کر دیتا ہے؟ ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آتا؟ کیا میں اتنا کمزور انسان ہوں؟ جس نے حسن اور جذبات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ جس نے اپنا آپ کھو دیا؟ کیا میرے اس گناہ کی کوئی معافی یا ازالہ ممکن ہے۔ محض پشمینے مل جانے پر میں اس بوجھ سے آزاد ہو جاؤں گا؟ ایسا بوجھ جیسے میرے کندھوں پہ سارے کا سارا جہنم رکھا ہو؟ کیا پشمینے نہ ملی تو میں اس گناہ کا بوجھ مسلسل کندھوں پر اٹھائے زندہ رہ بھی پاؤں گا؟ نہیں!! وہ مجھے ضرور ملے گی۔ ضرور ملے گی مجھے!'' میں آئینے میں اپنا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔ میں خود سے بے تحاشا سوال جواب کر چکا تھا۔ میں نے آخری سوال پر بے چینی سے نل کھولا پھر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے میرا چہرہ بھگونے لگے۔ میں بہت دیر تک اپنے چہرے پہ پانی کے چھینٹے مارتا رہا، یہاں تک کہ میرے کپڑے بھی بھیگ گئے۔ میں نے تھک کر نل بند کر دیا پھر کپڑے اتارنے لگا۔ دس منٹ بعد نہا دھو کر میں باتھ کوٹ پہن کر باہر نکل آیا۔ الماری سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔ اتنے میں موبائل فون پر بیل ہونے لگی۔ میں نے الماری بند کر دی۔ واپس پلٹ کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا۔ انجان نمبر تھا۔ میں نے فوراً کال ریسیو کرتے ہی موبائل فون کان سے لگایا۔ اس سے پہلے میں کچھ بولتا پشمینے کی آواز میری کانوں میں پڑی۔ یوں جیسے کسی نے زندگی پھونک دی ہو۔

''صاحب..... صاحب میں پشمینے۔'' میں اس کی آواز پہچاننے میں دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ اس آواز کو محض ایک بار سننے کے لیے بھی میں اتنے دنوں سے تڑپ رہا تھا۔ اب تو اُمید بھی ختم ہو گئی تھی۔ مگر اس وقت..... اس وقت یوں لگا جیسے کسی نے میری مردہ زندگی میں سانس بھر دی ہو۔

خوشی میرے چہرے پر قوس قزح کی مانند لہرائی۔ دل کی دھڑکنیں ڈگڈگی بن گئیں۔ یوں جیسے مداری بندر کو نچانے کے لیے ڈگڈگی بجا رہا ہو۔ اس لمحے میرا دل بھی پشمینے کی ڈگڈگی پہ ناچنے لگا۔

''ہاں بولو پشمینے..... کیسی ہو تم..... کہاں تھیں۔ میں کتنے دنوں سے انتظار کر رہا تھا۔'' میں بے چینی سے دو قدم آگے بڑھ گیا۔

''صاحب..... میں تمہارے.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''ہاں بولو پشمینے..... بولو۔'' میں نے بے چینی سے کہا۔

''صاحب۔ میں آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ خدا کے لیے مجھے بچا لو۔'' وہ کہتے ہی رونے لگی۔ میری آواز حلق میں ہی دب گئی۔ قوس قزح کے رنگوں نے پل بھر میں تاریکی اوڑھ لی۔

''صاحب..... میں نے بہت مشکل سے آپ سے رابطہ کیا ہے۔ مورے مجھے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیتی۔ مورے کو مجھ پر شک ہو گیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جمعے کو میرا نکاح ہے شہباز خان سے۔ وہ کل پرسوں تک آ جائے گا صاحب۔ مجھے بچا لو۔ میں کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔ خدا کے لیے واپس آ کر لے جاؤ مجھے.....'' وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ میں سن رہا تھا۔ میں سن ہو چکا تھا۔ ''صاحب..... آپ سن رہے ہو نا؟'' اس نے روتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں..... ہاں میں سن رہا ہوں۔ تم پریشان نہ ہو۔ میں آ رہا ہوں۔''

میرے حلق سے دبی دبی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ ایک ساتھ دو تین آنسو میری آنکھوں سے نکل کر گالوں پر پھسل گئے۔ میں جس کی آواز سننے کو اتنے دنوں سے بے قرار تھا۔ اس نے پکارا بھی تھا تو کس حال میں۔ اس سے پہلے وہ یا میں کچھ اور بولتے..... ایک زوردار چیخ کی آواز سنائی دی۔ پھر دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

''ہیلو..... ہیلو پشمینے..... ہیلو!'' میں پاگلوں کی طرح موبائل کان سے لگا کر کمرے میں تیز تیز چلانے لگا مگر دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

جس نمبر پر پشمینے کی کال آئی تھی۔ میں اس نمبر کو بار بار ملانے لگا۔ مگر ہر بار ''آپ کے ملائے ہوئے نمبر سے رابطہ ممکن نہیں۔'' کا ریکارڈر بجتا اور بند ہو جاتا۔ میں باتھ روم سے صرف باتھ کوٹ پہن کر باہر نکلا تھا۔ مجھے علم نہیں تھا میرے یوں اوسان خطا ہو جائیں گے۔ میں اسی حالت میں باہر بھاگا۔

''مبشر، بچے کہاں جا رہے ہو؟ کپڑے تو پہن کے جاؤ۔'' پھپھو نے پیچھے سے آواز دی۔

''ہاں..... کیا..... کپڑے!'' میں نے رک کر اپنی حالت پر نگاہ ڈالی۔ پھر تیزی سے اندر پہنچ کر کپڑے بدلنے لگا۔

''مبشر بیٹا..... کیا بات ہے۔ کوئی پریشانی ہے۔''

میں باہر نکلا تو وہ برآمدے میں کھڑی تھیں۔

''جی پھپھو۔ بس وہ مجھے ابھی نکلنا ہے۔ ایک ایمرجنسی ہے۔ خاور آئے تو اس کو بتا دیجیے گا۔'' میں یہ کہتے ہوئے رکا۔ پھپھو کے چہرے پہ نگاہ ٹھہری تو مجھے ماں کی شدت سے یاد آئی۔ ماں ہوتی تو میرے حق میں ضرور دعا کرتی لیکن ماں ہی نہ تھی اسی لیے تو میں زندگی کی گھنی خار دار جھاڑیوں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ شاید اس کی دعاؤں کا سہارا ہوتا تو میں آج یہاں نہ کھڑا ہوتا۔ میرے سینے سے گہری سانس خارج ہو گئی۔ ''پھپھو..... میرے لیے دعا کریں۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔'' میرے حلق سے شدت غم سے بوجھل آواز نکلی۔ میں نہیں جانتا میری آنکھ میں آنسو کیسے آ گئے۔ میں نے نظریں جھکا لیں اور تیزی سے باہر کی جانب بڑھ گیا۔

''خاور کو آ جانے دو بیٹا.....'' انہوں نے پیچھے سے آواز لگائی مگر میں رکنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس سے پہلے میں گیٹ پار کرتا خاور کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ میں گاڑی دیکھ کر وہیں رک گیا۔ وہ انجن بند کر کے تیزی سے نیچے اترا۔

''کیا بات ہے مبشر..... کہاں جا رہے ہو؟ تمہاری کالز آ رہی تھیں۔ کیا ہوا؟'' میرے قریب آتے ہی اس نے جلدی سے پوچھا۔

''یار وہ..... پشمینے کی کال آئی تھی۔ شہباز خان واپس آ گیا ہے۔ پشمینے نے اس سے نکاح کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتی ہے اگر جمعہ سے پہلے پہلے میں وہاں نہ پہنچا تو کچھ بھی ہو جائے گا۔'' میں نے ایک ہی سانس میں، بنا رکے سب کہہ دیا۔

''جمعہ..... آج تو بدھ ہے نا۔ ہمیں کل نکلنا تھا۔ تم صبر تو کرو۔ ہوائی جہاز پہ جلدی پہنچ جائیں گے۔''

''نہیں! مجھے آج ابھی اسی وقت نکلنا ہے۔'' میری آواز کے ساتھ ساتھ وجود میں بھی لرزش تھی۔

www.PakiBooks.Site

''اچھا میرے یار..... آج ہی نکلتے ہیں۔ تم حوصلہ کرو۔ صبر سے کام لو۔ میں ائیر پورٹ کال کر کے فلائٹ کا پتا کرتا ہوں۔ انسپکٹر ارحم سے بھی رابطہ کرتے ہیں۔ تم ایسے کیسے وہاں اکیلے جاؤ گے۔ اندر چلو۔ حوصلے سے کام لو۔ دونوں نکلتے ہیں۔'' اس نے آگے بڑھ کے مجھے کندھے سے تھاما اور اندر لے گیا۔ پھپھو گلاس میں پانی لے آئیں مجھے پلانے لگیں۔ خاور نے پہلے ایئر پورٹ کال کر کے اسلام آباد کے لیے فلائٹ کا پتا کیا۔ شام پانچ بجے کی ایک پرواز تھی۔ سیٹس کنفرم کر لینے کے بعد اس نے اسی وقت ارحم کا نمبر ملایا اور اسے شام کو پہنچنے کی اطلاع دی۔

میں نے کلائی پر موجود گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ایک بج رہا تھا۔ تین گھنٹے میرے لیے وبال جان بن گئے تھے۔ حتی کہ سانس لینا بھی دشوار لگ رہا تھا۔ مگر میں پھر بھی سانس لیتا رہا۔ ہاں مجھے لینا تھی سانس۔ اگر سانس رک جاتی تو پشمینے تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔

ٹھیک پانچ بجے ہم اسلام آباد کے لیے نکل پڑے۔ اسلام آباد پہنچ کر خاور نے رینٹ پہ جیپ بک کروائی پھر ہم دونوں آگے کے سفر پر نکل پڑے۔ جہاز سے اترنے کے بعد میں وقفے وقفے سے اس نمبر کو ملاتا رہا جس سے مجھے پشمینے نے کال کی تھی مگر ہر بار رابطہ ممکن نہ ہونے کا ریکارڈ بجتا اور بند ہو جاتا۔ میں بار ہا اسپتال کے نمبر پر بھی کال کر چکا تھا مگر مشتاق کل سے میری کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ مجھے اس پہ بھی غصہ آنے لگا کہ اتنے دن تو وہ رابطے میں رہا اور عین وقت پہ وہ بھی غائب ہو گیا۔

خاور نے ڈی ایس پی ارباز سکندر کو اطلاع کر دی تھی۔ ہمارے رابطہ نمبر بھی دے دیئے تھے۔ ہم ان سے بھی مستقل رابطے میں تھے۔ جمعرات کے دن ہم دونوں آزاد علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔

برف باری اور ٹھنڈ کے سبب ہمیں یہاں تک پہنچنے میں کافی دقت ہوئی مگر اس کے باوجود ابھی تک سب کچھ ویسا ہی ہو رہا تھا جیسا میں چاہتا تھا۔

اندازہ تھا کہ کل صبح ہونے سے پہلے پہلے ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ آگے کا سارا کام پولیس نفری کی موجودگی میں ہو جائے گا۔ نکاح رک جائے گا پھر موقع دیکھتے ہی پشمینے کو لے کر وہاں سے کسی بھی طرح نکل پڑوں گا مگر بعض اوقات انسان جیسا سوچتا ہے، ویسا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے پھر وہی ہوا جو خدا نے میری قسمت میں لکھ دیا تھا۔

میں ابھی بھی وقفے وقفے سے اس نمبر پر کال ملاتا رہا۔ میں بار ہا اسپتال کے نمبر پر بھی کال کر چکا تھا مگر مشتاق سے کوئی رابطہ نہ ہو سکا تھا۔

پھر ہماری جیپ کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ جیپ کی ڈگی میں ایک اضافی ٹائر اور آلات موجود تھے۔ خاور ٹائر بدلنے لگا..... میں بھی گاڑی سے نیچے اتر گیا اور اس کی مدد کرنے لگا تاکہ جلد از جلد یہ مصیبت ٹل جائے۔ اس وقت مجھے حد سے زیادہ مایوسی ہوئی تھی۔ خاور نے دو تین بار مجھے کہا بھی میں گاڑی میں بیٹھ جاؤں کچھ دیر میں ٹھیک ہوتا ہے تو نکلتے ہیں مگر اس وقت عجیب سا اضطراب طاری تھا مجھ پر۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ غلط ہونے والا ہے۔ کچھ بہت ہی غلط..... میں نے اسے انکار کر دیا۔ جب تک وہ کام کرتا رہا میں اس کے قریب ہی کھڑا رہا۔

ٹائر بدلتے ہی ہم دونوں پھر سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔

ابھی کشمالہ گاؤں سے تقریباً بیس کلومیٹر دور تھے۔ مسلسل نمبر ملا ملا کے میں تھک چکا تھا۔ بار بار کی کوشش انسان کو مایوس کر دیتی ہے۔ میں بھی مایوس ہو چکا تھا کہ شاید ہی اب اس نمبر پر کسی سے رابطہ ہو۔ میں نے موبائل ہاتھ سے رکھ دیا اور اپنے اردگرد پہاڑوں کی سفید چوٹیوں کو تکنے لگا۔ دماغ میں عجیب سی یاسیت طاری تھی۔ میں خیالوں ہی خیالوں میں اسے جیت جاتا تو کبھی خیالوں ہی خیالوں میں وہ مجھے ہارتی ہوئی نظر آتی۔

اتنے میں موبائل فون پر بیل ہونے لگی۔ میں نے چونک کر موبائل کو دیکھا اور جھپٹ کر اٹھایا۔ نامعلوم نمبر سے کال تھی۔ میں نے فوراً سے پہلے ریسیو کرتے ہی موبائل کان سے لگایا۔ اس سے پہلے میں کچھ کہتا۔ مشتاق کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''صاحب..... تم جہاں کہیں بھی ہو وہیں رک جاؤ تمھاری جان کو خطرہ ہے۔''

''مم..... مشتاق۔ تم تم بول رہے ہو۔ کہاں تھے تم۔ یہ نمبر کس کا ہے؟'' میں فوراً سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ خاور نے گاڑی کی رفتار کم کر دی اور میری جانب متوجہ ہوا۔

''جی صاحب میں..... میں مالاکنڈ میں ہوں۔ بہت مشکل سے یہاں پہنچا ہوں۔ اسپتال میں بہرام خان کے آدمیوں نے پہرہ لگا رکھا ہے۔ وہ آپ کو ہر جگہ تلاش

www.PakiBooks.Site

کر رہے ہیں۔ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ آپ یہاں مت آنا یہاں اب کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ ایک ہی سانس میں سب بول رہا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ آیا کچھ نہ آیا۔

''پشمینے..... وہ تو ٹھیک ہے نا؟'' میرے حلق سے دبی ہوئی آواز نکلی۔

''صاحب..... پشمینے کو ظالموں نے کل مار مار کے مار دیا۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم!! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں..... میں آ رہا ہوں۔ میں مرنے نہیں دوں گا اس کو۔'' میں چلایا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے گلے میں پھندا ڈال کر زور سے کھینچا ہو۔ وہ چیخ جو حلق سے نکلی وہ آخری چیخ ہو۔ مگر وہ آخری نہ تھی۔ میں زندہ تھا۔ میں گلے میں پھنسی رہی سمیت خلا میں معلق تھا۔ میری سانس جہاں اٹکی تھی وہیں اٹکی رہ گئی۔ نہ آ رہی تھی نہ نکل رہی تھی۔

''صاحب میں بہت مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں صرف آپ کو یہ بتانے کے لیے کہ یہاں اب مت آنا۔ یہ ظالم آپ کو موت کی گھاٹ اتارنے میں لمحہ نہیں گنوائیں گے۔'' وہ بول رہا تھا۔ میں سن رہا تھا۔ اس نے کال بند کر دی۔

خاور نے گاڑی کو بریک لگا دی تھی۔ وہ میری جانب متوجہ ہوا۔ ''کیا ہوا مبشر۔ بولو؟'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کو پوچھا۔

خاور نے ایک بار پھر مجھے بازو سے جھنجوڑا۔ ''کیا ہوا ہے مبشر..... کون تھا۔ بولو پلیز۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ میں دیوانوں کی طرح اسے بغیر کوئی جواب دیئے تکنے لگا۔

''پشمینے۔ مشتاق.....''

''کیا کہہ رہے ہو..... یار ہوش میں آؤ۔'' اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے زور سے ہلایا۔

''مشتاق تھا۔ یار تم کھڑے کیوں ہو۔ جلدی چلو ہمیں پہنچنا ہے وہاں پر۔'' اس وقت میرا سارا وجود لرز رہا تھا۔ ہاتھ پیر پھول چکے تھے۔ میں اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔

''وہ کہتا ہے پشمینے مر گئی ہے..... پشمینے کیسے مر سکتی ہے..... وہ ایسے کیسے مر سکتی ہے یار۔ وہ نہیں مر سکتی۔ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی وہ ایسے کیسے مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہے۔'' میں ہسٹریائی انداز میں چلایا۔ میری آنکھوں سے آنسو بارش کی طرح بہنے لگے۔

''تمہارا بچہ.....؟'' ارحم نے میرے کندھے پر سے ہاتھ ہٹایا۔ ''تمہارا بچہ کہاں سے آ گیا۔ وہ تمہاری بیوی تو نہ تھی۔'' ارحم نے حیرت زدہ کیفیت میں میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے مارے شرم کے نظریں جھکا لیں۔

''بولو مبشر..... یہ تم نے کیا کر دیا۔ کیوں کیا تم نے مبشر؟ تم نے ایک معصوم کی جان لے لی۔ کیوں کیا تم نے یار؟ تم تو مسیحا تھے۔ لوگوں کی زندگیاں بچانے آئے تھے یہاں، پھر تم ایسے کیسے کر سکتے ہو یار؟ کیسے ایک معصوم کی زندگی کے ساتھ کھیل سکتے ہو؟'' وہ کہہ رہا تھا۔ میں چپ چاپ نظریں جھکائے سن رہا تھا۔ ضمیر کی عدالت تو مجھے ہر روز ملامت کرتی ہی تھی اب میں خاور کے سامنے بھی مجرم بنا بیٹھا تھا۔ وہ کچھ لمحے مجھے غصے سے گھورتا رہا، گاڑی پھر سے اسٹارٹ کرنے لگا۔ میں نے نظریں گود سے ہٹا کر ارد گرد دیکھا۔ وہ گاڑی ریورس کر رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم! مجھے واپس نہیں جانا مجھے پشمینے کے پاس جانا ہے۔ وہ انتظار کر رہی ہے میرا۔ روکو گاڑی.....''

''وہ تمہارا انتظار نہیں کر رہی..... مر چکی ہے وہ۔ اور اب میں تمہیں وہاں مرنے کے لیے نہیں لے کر جاؤں گا۔ سمجھے تم۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں مجھے جواب دیا۔ میں بغیر کچھ کہے ایک جھٹکے میں گاڑی سے نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

''نہیں..... وہ نہیں مر سکتی۔ وہ ایسے کیسے کر سکتی ہے۔ میں نے کہا تھا اسے وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ میں لے کر جاؤں گا اسے۔ وہ نہیں مر سکتی۔'' میں نے کہا۔ اس وقت میری حالت اس بچے جیسی تھی جس سے اس کا کھلونا ٹوٹ یا چھن جائے تو وہ تڑپنے لگتا ہے۔ میں بھی بلک رہا تھا۔ اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے۔ میری آنکھوں سے دریا بہنے لگا۔

شرمندگی، ندامت، تلافی... اور وہ محبت بھی جو ہوئی تھی اور ہوتے کے ساتھ ہی اس نے ہوس کا لبادہ بھی اوڑھ لیا تھا۔ چند کمزور لمحے میری زندگی برباد کر گئے تھے۔

خاور پہلے چپ چاپ مجھے دیکھتا رہا۔ میرا وہ واحد دوست تھا جسے میں نے کبھی حال دل سنایا نہ تھا وہ خود سمجھ جایا کرتا تھا۔ اب ایسا کیسے ممکن تھا اس حال میں وہ میرا تماشا دیکھتا۔ ہاں وہ تڑپ ہی تو گیا تھا میری حالت پہ۔ وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔ مجھے ایسے بہلانے لگا جیسے کوئی ننھے بچے کو بہلاتا ہے۔

''مبشر..... وہ مر چکی ہے میرے یار، اب وہاں

www.PakiBooks.Site

جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دیکھ میرے دوست ہم واپس چلتے ہیں، آگے خطرہ ہے۔ وہ لوگ تیری تاک میں بیٹھے ہیں۔ چل بیٹھ گاڑی میں پلیز۔''

''نہیں..... نہیں..... نہیں..... وہ نہیں مرسکتی یار۔ وہ کیسے مرسکتی ہے۔'' میں ابھی بھی اپنے وہی الفاظ دہرا رہا تھا۔ خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ میرا دماغ اس وقت کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔ دل کا حال ایسے تھا جیسے کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا ہو۔ ایسے ہی بلکتے ہوئے میری آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا۔ میں مکمل حواس کھو بیٹھا۔

☆.....☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال کے کمرے میں تھا۔ یقیناً خاور ہی مجھے یہاں لے کر آیا تھا۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ مجھے پہلے تو یوں محسوس ہوا جیسے میں اس دنیا میں ہی نہیں ہوں۔ یہ کوئی اور جہان ہے مگر دوسرے لمحے میں نے اپنے قریب خاور کو کھڑے پایا۔

''میں زندہ ہوں.....؟'' میں نے جیسے تصدیق چاہی۔

''ہاں..... کیسا محسوس کررہے ہو اب تم؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''میں کیوں زندہ ہوں..... مجھ جیسے انسان کو جینے کا کوئی حق نہیں۔'' میری آواز بھرائی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''دیکھو..... تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ جو ہوگیا اس پہ صبر کرو۔ اب تسلیم کرلو اس حقیقت کو اور خدا کے لیے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرو۔''

''کیسے بھول جاؤں؟ کیسے کروں قابو اپنے آپ پہ..... مجھ سے..... مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوگئی؟'' میں نے روتے ہوئے کہا..... خاور نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے چپ ہونے کو کہا۔ میں خاموش ہوگیا۔ آنکھوں سے آنسو مسلسل رواں تھے۔

''دیکھو مبشر..... تمہارا ایک نام ہے..... ایک پہچان ہے۔ تم ایک قابل ڈاکٹر ہو۔ دنیا جانتی ہے تمہیں، مانتی ہے..... عزت کرتی ہے تمہاری..... دیکھو میرے یار..... جو ہوگیا تم اسے بھلا تو نہیں سکتے۔ مگر غلطی تھی۔ غلطی کو ساتھ لے کر عمر بھر کے لیے پھرنا چاہتے ہو؟ چاہتے ہو تمہارا تماشا بنے..... لوگ تھو تھو کریں تم پر.....؟ بولو اب ایسا ہی چاہتے ہو تم؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ایسا نہیں چاہیے تو خدا کے لیے اپنا منہ بند رکھو۔ یہ سب تمہاری قسمت میں تھا۔ ہوگیا یار مگر..... سنبھالو خود کو..... اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو لحہ بھی نہیں لگے گا۔ ساری دنیا دیکھے گی تماشا۔'' وہ مجھے سمجھا رہا تھا۔ میں ایک عزت دار، شریف، قابل ڈاکٹر، کبھی بھی اپنا تماشا نہیں بنانا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں اس کی بات سمجھ گیا۔ میں خاموش ہوگیا۔ بالکل خاموش۔

پھر ہم کراچی واپس آگئے۔

میں سمجھ نہیں پایا تھا۔ آخر انہوں نے پشمینے کو کیوں مار ڈالا۔ بہت سے سوالات میرے دماغ میں گردش کرتے رہتے۔ اس کے بعد میرا مشتاق سے بھی کوئی رابطہ نہ ہوا تھا۔ ایک روز میں نے پشمینے کی دوست کے نمبر پہ کال ملا دی۔ کچھ دیر بیل جاتی رہی۔ پھر کال ریسیو ہوگئی۔

جب میں نے اسے بتایا میں ڈاکٹر مبشر درانی بات کر رہا ہوں تو وہ رونے لگی۔ پھر مجھے دھڑا دھڑ بددعائیں دینے لگی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔

وہ روتی رہی..... کہتی رہی۔ اس نے سب بتا دیا۔ آخر میں وجہ جان گیا۔ پشمینے گھر سے چھپ کر مجھ سے بات کرنے اپنی دوست کے گھر تک آئی تھی۔ مورے کو اس کی حالت پہ شک ہوگیا تھا۔ اس نے گھر سے چھپ کر نکلنے کا رسک مجھے صرف یہ بتانے کے لیے لیا تھا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ مگر بدقسمتی سے اسے اس کے سوتیلے بھائی نے وہاں آتا دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کا تعاقب کرتا اس کے پیچھے چلا آیا۔ اس نے میرے اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی سن لی۔ وہ آخری چیخ جو میں نے کال پہ سنی تھی وہ پشمینے کی ہی تھی۔ جب وہ مجھ سے بات کررہی تھی تو اس کے بھائی نے اس کی کمر پہ لات ماری تھی۔ پھر اسے وہاں سے گھسیٹتے ہوئے گھر لے گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے خان لالہ کو سب بتا دیا۔ ظالموں نے اس کو اس دن بہت مارا۔ مورے بچاتی رہ گئیں مگر وہ اسے اس طرح پیٹتے رہے جیسے سامنے گوشت پوست کا انسان نہ ہو روئی کی گٹھڑی ہو۔ جب وہ بے حال ہوگئی تو انہوں نے اسے کمرے میں بند کردیا پھر شہباز خان سے اس کا نکاح جمعہ کی بجائے جمعرات کو کر دینے کا اعلان کردیا۔

وہ جلد از جلد اب مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ حقیقت شہباز خان تک پہنچے اور وہ بدلے میں کوئی اور قدم اٹھائے۔

وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے یہ بات گاؤں والوں کو پتا چلے اور وہ ان پر تھو تھو کریں۔ ان کی بدنامی ہو مگر جب

www.PakiBooks.Site

پشمینے کو نکاح کے لیے جمعرات کی صبح تیار کیا گیا تو اس نے عین وقت پر انکار کردیا۔

جب اسے یقین ہوگیا کہ موت اس کے سر پر کھڑی ہے۔ اسے بچانے اور یہاں سے نکال کر لے جانے والا اب کبھی یہاں نہیں آئے گا تو اس نے چیخ چیخ کر سب کو بتا دیا کہ وہ حاملہ ہے۔ وہ ڈاکٹر مبشر کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ وہ شہباز خان سے شادی نہیں کرسکتی۔ بس پھر کیا تھا۔

اس کی عبرتناک موت کا تماشا سارے گاؤں نے دیکھا تھا۔ اس پہ مٹی کا تیل چھڑک کر ظالموں نے اسے زندہ جلایا تھا پھر اس کی لاش کئی گھنٹوں تک کھلے میدان میں پڑی رہی۔ جس پر گاؤں کا ہر فرد پتھر پھینکتا اور گزر جاتا۔

لوگوں نے اپنے گھروں کی عورتوں کو اس کی مثالیں دینا شروع کردیں کہ اگر ایسی کوئی بھی حرکت کروگی تو پشمینے کی طرح نشان عبرت بنانے میں دیر نہ لگائیں گے۔ انہوں نے مجھے بہت ڈھونڈا۔ اسپتال میں پہرے لگا دیئے۔ کچھ لوگ کراچی میں بھی مجھے ڈھونڈنے کے لیے بھجوا دیئے۔ اسپتال میں مبین اور مشتاق پر بھی تشدد کیا گیا پھر اسپتال کو ہمیشہ کے لیے تالا لگا دیا۔ مشتاق اس دن بہت مشکل سے شہر پہنچا تھا۔ اگر وہ پہنچ کر وقت پر مجھے اطلاع نہ کرتا تو میری زندگی کا وہ دن پشمینے کے ساتھ ہی آخری دن ہونا تھا مگر میری قسمت نے ابھی مجھے بہت کچھ دکھانا تھا۔ مجھے زندہ رہ کر پل پل مرنا تھا۔ مجھے الٹے پیروں خاور وہاں سے واپس لے آیا۔

پشمینے کی ماں پاگل ہوگئی تھی۔ پشمینے کی لاوارث لاش کو دفنا دیا تھا اور میں..... مکھن سے بال کی طرح نکل کر ایک طرف ہو چکا تھا۔

میں اس کی موت کا تصور کرتا تو روح تک کانپ جاتی ہے۔ میں ان کو تو بھیڑیئے کہتا ہوں مگر جب میں اپنا اور ان کا موازنہ کرتا ہوں تو مجھے ان میں اور اپنے آپ میں رتی برابر بھی فرق نظر نہیں آتا۔ بلکہ ان سے کئی گنا زیادہ بدتر مجھے اپنا وجود لگتا تھا۔

دو سال ایسے ہی گزر گئے۔ میں نے کراچی کے ایک اسپتال میں جاب شروع کردی۔ خاور کی شادی ہوگئی۔ اس کے بعد پھپھو نے ماں ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے ہر لحہ مجھے شادی کے لیے رضامند کرنا شروع کردیا۔ میں ان کی بات سے انکار نہ کرسکا۔ انہوں نے اپنے ایک جاننے والی کی بیٹی شائستہ جلیل سے میری شادی کروا دی۔ شائستہ نیوٹریشنسٹ تھی۔ ایک پڑھی لکھی سلجھی ہوئی سلیقہ مند لڑکی پھر وہ جب میری زندگی میں شامل ہوئی تو جو خلا میرے وجود میں تھا۔ وہ بھر تو نہ سکا مگر زندگی رفتہ رفتہ بہتری کی طرف بڑھنے لگی۔ مجھے ایک سال بعد رب نے چاندنی بیٹی عطا کی۔ اس ننھی پری نے میری دنیا ہی بدل دی۔ وہ میری جان تھی۔ میری صبح کا ستارہ میری اداس ویران راتوں میں چاندنی جیسی..... میری پیاری سی پلوشہ مبشر۔ اس کے بعد ہم نے بہت کوشش کی کہ اللہ ہمیں ایک اور اولاد عطا کردے۔ مگر پلوشہ کے بعد اس کا کوئی بہن بھائی نہ ہوا۔ میں تو اس پہ بھی خوش تھا۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ میری تو زندگی بدل گئی تھی۔ وہ مبشر جس کی زندگی میں سب کچھ ہونے کے باوجود بھی سکون یا خوشی کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔ پلوشہ کے آجانے کے بعد اس مبشر کی زندگی دنیا میں ہی جنت کا گوشہ بن چکی تھی۔

میری بیٹی بہت ذہین تھی۔ شائستہ کا اور میرا مشترکہ خواب تھا کہ وہ ڈاکٹر ہی بنے۔ اس نے بھی اپنے ممی بابا کا خواب پورا کرنے کی ٹھانی۔ میڈیکل کالج میں اس کا داخلہ میرٹ بیس پر بہت آسانی سے ہوا تھا۔ اس کا میڈیکل کا دوسرا سال تھا۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میری بیٹی میری پلوشہ مبشر کو کبھی کوئی میلی آنکھ سے بھی دیکھے گا۔ میری قابل ہونہار باوقار سلجھی ہوئی بیٹی۔ پلوشہ مبشر یوں اچانک ایک دن پولیس موبائل کو کچرا کنڈی جیسی غلیظ ترین جگہ سے ایسی حالت میں ملے گی..... میں تصور کر بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ میری بیٹی تھی۔ ڈاکٹر مبشر درانی کی بیٹی۔ جسے دنیا نے صرف عزت دی تھی، بے شمار عزت۔ مگر عزت دینے والا اور عزت لینا والا انسان ہوتا کون ہے۔ یہ تو اس رب کی ذات ہے۔ میں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا۔

''مریضہ کے ساتھ کون ہے؟ اندر جلدی چلیں پلیز۔''

نرس کی آواز نے مجھے سوچوں کی یلغار سے باہر نکالا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ میں اسپتال میں تھا۔ میں ماضی کو جھٹک کر حال میں آیا اور کپکپاتی ٹانگوں پر زور ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا۔ شائستہ نے جلدی سے جاء نماز اٹھی کی۔ ہم دونوں آگے پیچھے آئی سی یو میں داخل ہوئے۔ ہمارے پیچھے انسپکٹر جبران بھی اندر داخل ہوا تھا۔

''پلوشہ.....'' میں نے تڑپتے دل سے صدا لگائی۔ اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''پلوشہ..... میری بچی۔'' شائستہ کا کلیجہ بھی پھٹا جارہا تھا۔

پلوشہ نے اشارے سے آکسیجن ماسک اتارنے کو کہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر نے فوراً اتار دیا۔

www.PakiBooks.Site

پولیس کا تفتیشی افسر بھی بیان ریکارڈ کرنے لگا۔ میری بچی کا سر میری گود میں تھا۔ اس کا خون سے لت پت زخمی وجود بمشکل اپنی آخری سانسوں پہ چل رہا تھا۔

''بولو بیٹا..... تم..... تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی میری جان۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' میری آنکھوں سے آنسو مسلسل رواں تھے۔ شائستہ نے اپنی ہچکیاں بند کرنے کے لیے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''پلوشہ مبشر..... کیا آپ جانتی ہیں آپ کو اس حال تک پہنچانے والے کون لوگ تھے۔ پلیز بتائیے ہم آپ کے مجرموں کو قانونی طور پر کڑی سے کڑی سزا دیں گے۔'' انسپکٹر اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔

''خدا کے لیے انسپکٹر صاحب۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے..... ڈاکٹر صاحب خدا کے لیے میری بچی کو دیکھیں۔'' شائستہ نے منہ سے ہاتھ ہٹاتے ہی دونوں ہاتھ باندھے۔ وہ اپنی ہتھیلیاں مسلنے لگی۔

اس سے پہلے ڈاکٹر آگے بڑھتا پلوشہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ پھر وہ ٹوٹے ہوئے لفظوں میں بولنے لگی۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر ساکن ہوگئیں۔ شائستہ نے اپنے دونوں ہاتھ پھر سے منہ پر رکھے وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ پلوشہ ٹوٹے بکھرے لفظوں اور اکھڑی اکھڑی سانسوں میں اپنے ساتھ ہونے والی اجتماعی زیادتی اور تشدد کا بتانے لگی۔ محرر لکھنے لگا۔ شائستہ کی ٹانگیں بیجان ہوئیں۔ وہ اسی دیوار کے سہارے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ انسپکٹر خاموش..... ڈاکٹر خاموش..... نرسیں خاموش۔ اس لمحے آئی سی یو کی ہر شے خاموش مگر اتنی خاموشی کے باوجود بھی مجھے دبی دبی آواز میں اپنے اوپر ہنستی دکھائی دی۔

وہ ابھی بھی بول رہی تھی۔ سب یکسوئی سے سن رہے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے چپ رہنے کے لیے اس کے منہ پر ہاتھ نہ رکھا۔ اس نے سب کہہ دینے کے بعد آخری ہچکی لی پھر وہ خود ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ بالکل ایسے ہی جیسے میرا مردہ ضمیر کچھ سال پہلے خاموش ہوا تھا۔

شائستہ آہ وفغاں کرنے لگی۔ اس کے بے جان وجود کو ہلا ہلا کر جگانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ اس کی آنکھیں ابھی بھی کھلی تھیں۔ وہ کھلی آنکھیں مجھ سے شکوہ کناں تھیں۔ میں چپ چاپ اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ بس سوچتا رہا۔ انصاف ہو چکا تھا۔ میں نظریں اس کے چہرے پہ جمائے ہر بات سے بے پروا بس حیران تھا تو انصاف پہ۔

چند سال پہلے اپنے گناہ کو چھپانے کے لیے میں خاموش ہوگیا تھا۔ مجھے جب خبر ملی تھی کہ پشمینے کے مجرم گرفتار ہوگئے تو دل اس خبر پہ قطعی مطمئن نہ تھا کیونکہ اس کے اصل مجرم وہ نہ تھے..... اتنا سب سن لینے کے بعد بھی میرا دل مطمئن نہ ہوا تھا کیونکہ وہ انصاف نہ تھا۔ انصاف تو تب ہوتا جب مجھے سزا دی جاتی۔

میں تب تو خاموش ہوگیا تھا مگر اکثر مجھے ضمیر کی عدالت اس انصاف کے لیے اندر ہی اندر چلانے پر مجبور کردیتی تھی۔ میں اکثر خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوکر اپنی غلطی کی معافی مانگتا۔ میری بے سکون اور بے چین روح ہر لمحہ خود کو پشمینے کا مجرم سمجھتی تھی۔ میں مجرم تھا اس کا۔

میں تب خاموش ہوگیا تھا۔ خاور نے اس راز کو ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں دفن کرلیا تھا۔ مگر انصاف..... انصاف نہ ہوا تھا۔ اور بالآخر پشمینے کے ساتھ کی گئی زیادتی کا انصاف آج میرے سامنے تھا۔

میں..... ڈاکٹر مبشر درانی..... جس نے اپنے ہاتھوں میں اپنی بچی کی آخری سانسیں گنی تھیں۔

اس نے ان دو لڑکوں کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ کئی ماہ سے اس کو ہراساں کررہے تھے۔

اس دن انہیں موقع مل گیا۔ انہوں نے اس کو جسمانی ذہنی اور اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے مردہ ضمیر کو کسی نے لات ماری ہو۔

پولیس نے بیان ریکارڈ کروانے کے بعد جلد ہی ان لڑکوں کو گرفتار کرلیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ دونوں پشمینہ کے دو بھائیوں کے بیٹے تھے۔ بعد میں انہوں نے قبول کیا تھا کہ وہ انتقام کی خاطر یہاں آئے تھے اور عرصہ سے پلوشہ کی ریکی کررہے تھے پھر انہیں موقع ملا تو وہ سب کر گئے جس کا ہم میں سے کسی کو اندازہ تک نہ تھا۔ انہوں نے من مانی کرنے کے بعد اسے مار کر کچرا کنڈی پر یہ سوچ کر پھینک گئے تھے کہ اس کی موت کے ساتھ ہی ان کے کالے کرتوت بھی دفن ہوجائیں گے مگر ایسا نہ ہوا تھا..... وہ مری نہ تھی۔ وہ زندہ رہی مگر صرف اس وقت تک کہ وہ ان کے کرتوت کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کا بھیانک چہرہ بھی دیکھ لے۔ اس کی آنکھوں میں لکھی تحریر میں نے خود پڑھی تھی۔ جو وہ تو نہ جانتی تھی مگر میں جان گیا تھا۔

www.PakiBooks.Site

وہ دکان بازار سے ذرا ہٹ کر ایک ایسی گلی کے کونے میں تھی جس کے سامنے ایک پارک تھا۔ میں عام طور پر اس پارک میں جا کر بیٹھ جایا کرتا اور اس شخص کو دیکھا کرتا جس نے وہ دکان کھولی تھی۔

وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ یعنی مجھ سے دو تین سال ہی چھوٹا ہوگا۔ میں بھی تو اس عمر کو پہنچ چکا تھا۔

اس کی دکان بچوں کے لیے بسکٹ، چاکلیٹ یا اس قسم کی چیزوں سے بھری ہوئی تھی۔ عام طور پر اس قسم کی دکانوں کی زیادہ آمدنی نہیں ہوتی لیکن اس کی دکان خوب چلتی تھی۔

ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کی دکان پارک کے ٹھیک سامنے تھی۔ تفریح کے لیے آنے والے بچے اس کے پاس چاکلیٹ وغیرہ خریدنے کے لیے جایا کرتے اور دوسری وجہ

ٹوٹکا

محترم مدیر
السلام علیکم
آپ نے ہزاروں قسم کے ٹوٹکے سنیں ہوں گے۔ ایک ٹوٹکا مجھے میرے دوست انوار علی نے بھی سنایا تھا۔ میں نے اسے لفظوں کی مالا پہنا کر آپ کی خدمت میں پیش کردیا ہے اگر آپ کو پسند آجائے تو اسے قارئین تک پہنچانے کے لیے سرگزشت میں جگہ ضرور دے دیں، شکر گزار رہوں گا اور لوگ سبق بھی حاصل کرلیں گے۔
رئوف اسلم آرائیں
(کراچی)

www.PakiBooks.Site

یہ تھی کہ بچوں کے ساتھ اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔

وہ ہر ایک کے ساتھ ہنس ہنس کر پیار سے باتیں کیا کرتا اور کسی نے کہا کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں تو اس کو یوں ہی کچھ دے دیا۔ ان سب باتوں نے اس کی دکان کو چلتی ہوئی دکان بنا دیا تھا۔

ایک دن میرے جی میں کیا آئی کہ میں بھی اپنے پوتوں کے لیے چاکلیٹ لینے اس کی دکان پر چلا گیا۔ اس دن میری جیب میں کچھ پیسے تھے۔ میں نے اس دن اپنی دوائی کم لی تھی۔

دکاندار مجھے دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں نے اسے سلام کیا تو اس نے بڑی گرم جوشی سے میرے سلام کا جواب دیا۔ ''آئیں جناب آجائیں، میں تو آپ کو جانتا ہوں۔''

''مجھے جانتے ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ کس طرح۔''

''اس لیے کہ میں آپ کو روزانہ شام کے وقت اس پارک میں دیکھا کرتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''بس اس کو جان پہچان سمجھ لیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' میں ہنس دیا۔ ''ویسے میرا نام انوار علی ہے۔'' میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

''میرا گھر یہاں سے قریب ہے اور میں ریٹائر بھی ہو چکا ہوں اس لیے وقت گزارنے کے لیے یہاں آکر بیٹھ جاتا ہوں۔''

''اور میں ندیم خان ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔ ''پہلے واپڈا میں ملازم تھا۔ میں بھی ریٹائر ہو چکا ہوں۔''

''چلیں خوب گزرے گی جو دو ریٹائرمل بیٹھیں گے۔'' میں نے کہا۔

اس دوران ایک گاڑی دکان کے پاس آکر رک گئی۔ اس میں سے ایک مرد اور ایک عورت اتر کر دکان کی طرف آگئے۔

دونوں جوان اور خوب صورت تھے۔

''بابا آپ کا موبائل کیوں بند جا رہا ہے۔'' اس آدمی نے ندیم خان سے پوچھا۔

''بیٹا! موبائل آج میں گھر بھول آیا ہوں۔'' ندیم خان نے بتایا۔

''بابا! ہم تو پریشان ہو گئے تھے پھر دل نہیں مانا تو آپ کو دیکھنے کے لیے چلے آئے۔'' اس عورت نے کہا۔

''آج ذرا جلدی گھر آجائیں۔ میں نے آپ کی پسند کی چائنیز بنائی ہیں۔ ٹھنڈے ہونے پر مزہ نہیں آتا۔''

''او کے۔'' ندیم خوش دلی سے بولا۔ ''پھر تو جلدی آجاؤں گا۔''

وہ دونوں چلے گئے۔ میں وہیں کھڑا ان سب کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد ندیم خان نے میری طرف دیکھا۔ ''میرا بیٹا اور میری بہو تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے جس کی شادی کر دی ہے۔ وہ اپنے گھر کی ہو گئی ہے۔''

''ماشاء اللہ بیٹے اور بہو کو تو آپ سے بہت پیار معلوم ہوتا ہے۔''

''بہت زیادہ، بے پناہ احترام اور پیار کا رشتہ ہے اور یہی حال بقیہ دونوں بیٹوں کا ہے۔ حالانکہ وہ... اب بڑے ہو چکے ہیں۔''

''میرے دو بیٹے ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''ایک کی شادی ہو چکی ہے۔ دوسرا ابھی پڑھ رہا ہے۔ آخری سال ہے اس کا۔''

''اور بیٹی۔''

''ایک ہے۔ وہ شوہر کے ساتھ ملک سے باہر ہے۔'' میں نے بتایا۔

''چلیں جی خدا سب کو خوش رکھے۔''

اس دوران دو چار بچے کچھ لینے آگئے۔ ندیم خان ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ راستے میں یاد آیا کہ آج مجھے اپنے ایک دوست سلمان کے پاس جانا تھا۔ وہ بے چارہ واش روم میں گر پڑا تھا۔ اس کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ڈاکٹرز نے راڈ لگا دی تھی۔ تکلیف کی حالت میں تھا۔ میں تو دیکھنے اسپتال بھی گیا تھا لیکن جب سے وہ گھر آیا تھا میں اس کی عیادت کو نہیں جا سکا تھا۔

تو بجائے اپنے گھر جانے کے میں سلمان کے گھر کی طرف چل پڑا جو وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ بے چارہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ میں بہت دیر تک اس کو حوصلہ دینے کے لیے اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ جب گھر پہنچا تو سب ٹی وی کے گرد جمع تھے۔ سب کی پسند کا کوئی پروگرام چل رہا تھا۔

''ابا آپ وقت پر گھر آجایا کریں۔'' بہو کی تیز آواز گونجی۔ ''میں بار بار کھانا تو گرم نہیں کر سکتی۔''

www.PakiBooks.Site

میں نے اپنے بیٹے راحیل کی طرف دیکھا۔ اس نے اس انداز سے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا جیسے اس نے اپنی بیوی کی بات ہی نہیں سنی ہو جب کہ دوسرا شرجیل ٹی وی کی طرف متوجہ تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں خوش دلی سے بولا۔ ''مجھے ٹھنڈا کھانا کھانے کی عادت پڑ چکی ہے۔ تم گرم کرنے کی فکر مت کیا کرو۔ میں خود ہی نکال کر کھا لوں گا۔''

میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ان میں سے کسی نے مجھے بلانے یا آواز دینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

وقت کی بے رحمی بھی کیسے کیسے تماشے دکھایا کرتی تھی۔

کل تک سب کچھ بہت ٹھیک تھا۔ بہت خوش گوار تھا۔ زندگی کسی پُرسکون ندی کی طرح دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

راحیل بارہ برس کا تھا۔ شرجیل نو برس کا اور سارہ سات برس کی تھی۔ میری بیوی کا نام نزہت تھا۔ وہ ایک وفا شعار عورت تھی۔ خوش قسمتی سے ہمارے یہاں کی زیادہ تر عورتیں وفا شعار ہی ہوا کرتی ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہیں۔ دکھ سکھ کی ساتھی ہوا کرتی ہیں۔ نزہت بھی ایسی ہی تھی۔ میں اس زمانے میں ایک پرائیویٹ فرم میں کام کر رہا تھا۔

اچھی پوسٹ تھی میرے پاس، اچھی سیلری تھی، کمپنی نے ایک گاڑی بھی دے رکھی تھی۔ میں نے اس زمانے میں سب سے بڑی عقل مندی یہ کی تھی کہ ایک فلیٹ بک کرا لیا تھا۔ اچھا خاصا بڑا پروجیکٹ تھا لیکن سیلری اتنی تھی کہ میں بہ آسانی ہر مہینے اس کی قسطیں ادا کرتا جا رہا تھا۔

دو سال بعد وہ فلیٹ مکمل ہو کر ہمارے پاس آگیا تھا۔ اب تو اس دور کی صرف یادیں رہ گئی ہیں۔ یہ بچے تب میرے آنے کا انتظار کیا کرتے تھے اور ہم تیار ہو کر آؤٹنگ پر نکل جایا کرتے تھے۔

مجھے یاد نہیں کہ ہم اس زمانے میں کتنی بار باہر کھانا کھایا کرتے تھے۔

نزہت کبھی کبھی مجھ سے کہا کرتی۔ ''دیکھیں اب آپ یہ فضول خرچی بند کر دیں۔ اب بہت ہو گئی۔''

''وہ کیوں!''

''اس لیے کہ آپ جتنے پیسے ہوٹلنگ وغیرہ پر خرچ کرتے ہیں ان کی اگر بچت کی جائے تو اچھا ہے۔''

جون ایلیا (1931-2002)

14 دسمبر 1931ء کو سید جون اصغر نقوی امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شفیق حسین ایلیا عربی، فارسی، سنسکرت کے عالم تھے۔ انہوں نے اپنے اسلاف کی روایت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اخلاق کو تحصیل علم پر ہمہ وقت فوقیت دی۔ جون ایلیا نے اپنے بڑے بھائیوں سید محمد مہدی رئیس امروہہ اور سید محمد تقی فلسفی، سابق ایڈیٹر روزنامہ جنگ کراچی کے شانہ بشانہ فلسفہ، منطق، فقہ اور مشرقی علوم پر کماحقہ دسترس حاصل کی۔ امروہی سے فارغ التحصیل ہو کر مدرسہ میں درس و تدریس کی پھر پاکستان چلے آئے۔ جون ایلیا سرتاپا شاعرانہ حلیہ میں مجنونانہ حرکتیں کرتے ہوئے شعر سناتے تھے۔ اپنے امروہوی ہونے پر نازاں ہے دیگر شاعروں کو نہ شاعر گردانتے تھے نہ ان کی عزت و توقیر کرتے بلکہ اور مان مانیاں کرتے۔ کثرت مے نوشی نے ان کو صحت مند نہ رہنے دیا۔ ادارۂ ذہن جدید کے توسط سے انشاء ڈائجسٹ نکالا جسے ان کے بھائی سید محمد عباس اور زاہدہ حنا نے چلایا۔ انشا ڈائجسٹ کے ڈیکریشن پر ''عالمی ڈائجسٹ'' نکلا۔ جون نے بیس کتابیں مرتب کیں۔ شعری مجموعہ ''شاید'' سلیم جعفری کی کوششوں سے چھپا۔ اس کے بعد یعنی، گمان اور گمکن نامی مجموعے بھی تواتر سے چھپے۔ 8 نومبر 2002ء کو یہ شاعر زندگی کی آخری سانسیں لے کر نئی حسن قبرستان میں اپنے بھائیوں کے احاطے میں سپرد خاک ہو گیا۔ ہمارے اہل قلم میں ولادت 14 دسمبر 1935 تحریر ہے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

حفیظ ہوشیارپوری (1912-1973)

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

فریدہ خانم اور دیگر گلوکاروں کی تواتر سے گائی گئی اس غزل کے شاعر کا نام حفیظ ہوشیاری پوری ہے۔ شیخ عبدالحفیظ سلیم کو حفیظ ہوشیار پوری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شیخ فضل محمد خان کے بیٹے 5 جنوری 1912 کو دیوان پور ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے۔ اردو ادیب و شاعر، تاریخ گوئی کے ماہر ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے ڈائریکٹر اور ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدوں سے سبکدوش ہوئے۔ ''مقام غزل'' ان کا شعری مجموعہ ہے۔ 10 جنوری 1973 کو کراچی میں وفات پانے والے حفیظ ہوشیار پوری کی قبر سوسائٹی قبرستان کراچی میں ہے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

www.PakiBooks.Site

''نزہت! اس سلسلے میں میرا فارمولا ذرا مختلف ہے۔'' میں کہا کرتا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے تینوں بچے بہت اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کررہے ہیں اور تینوں اپنی اپنی جگہ ذہین بھی ہیں۔ مجھے خدا کی ذات سے امید ہے کہ یہ تینوں آگے چل کر بہت اچھی زندگی گزاریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اپنا ایک بڑا فلیٹ ہے۔ گاڑی ہے۔ بیٹی کی شادی کے لیے ہم نے پیسے الگ رکھ لیے ہیں۔ تو پھر یہ کھانے خدا نے جو نعمتیں دی ہیں ان سے لطف اندوز ہوا جائے۔''

نزہت خاموش ہوجاتی۔ اس کی سوچ بھی اپنی جگہ ٹھیک تھی اور میری سوچ یہ تھی کہ بچوں پر دل کھول کر خرچ کردیا جائے تاکہ زندگی کے کسی بھی مرحلے پر انہیں کسی قسم کی محرومی کا احساس نہ ہو۔

☆.....☆

دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔ میں ماضی سے حال میں واپس آگیا۔

میری بہو دروازے پر تھی۔ وہ میرے کمرے میں کچھ لینے آئی تھی اور اس وقت یاد آیا کہ میں نے اپنے دونوں پوتوں کے لیے ندیم خان سے چاکلیٹ خریدے تھے جو جیب ہی میں رہ گئے تھے۔

''بہو یہ لو۔'' میں نے چاکلیٹ نکال کر بہو کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ میں ذیشان اور کاشان کے لیے لایا ہوں۔''

''ابا! آپ کو تو معلوم ہے کہ میں بچوں کو برانڈڈ چاکلیٹ دیا کرتی ہوں۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''یہ آپ کیا اٹھا کر لے آئے ہیں۔''

''بیٹا! یہ بھی کوئی خراب چاکلیٹ نہیں ہے۔'' میں نے کہا لیکن اس وقت میری آواز بہت دھیمی اور شکستہ ہورہی تھی۔

''رہنے دیں، خود ہی کھا لیں۔'' اس نے وہ چاکلیٹ بستر پر پھینک دیئے۔

میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ ایک بار پھر پرانی یادیں ذہن پر دستک دینے لگی تھیں۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ جب دونوں پوتے بہت چھوٹے تھے۔ اس وقت میں کچھ بھی لاکر دے دیتا تھا بہو خوش ہوجاتی تھی اور اب تو سب کچھ بدلتا جارہا تھا۔ بہت تیزی کے ساتھ۔

دوسری صبح پھر ایک بات ہوئی۔

میں اپنی دوائی ایک ڈبے میں رکھتا ہوں۔ میرا بلڈ پریشر بھی ہائی رہتا ہے۔ کولیسٹرول بھی ہے اور سب سے بڑھ کر شوگر بھی ہے۔ ان سب امراض نے مجھے نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ورنہ اب سے دس پندرہ برس پہلے تک میری صحت بہت اچھی ہوا کرتی تھی لیکن اب لاغر ہوکر رہ گیا تھا۔

میرے لیے مہینے میں تین چار ہزار کی دوائی آیا کرتی ہیں۔ اچھی خاصی رقم ہوا کرتی ہے لیکن یہ سب میرا بیٹا راحیل کردیا کرتا تھا۔

مجھے افسوس بھی ہوتا کہ خوامخواہ اس کے اتنے پیسے اس چکر میں جارہے ہیں لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹرز نے سختی کے ساتھ بلاناغہ دوا استعمال کرنے کی تاکید کی تھی۔

بہرحال اس صبح جب میں نے دواؤں کا ڈبہ کھولا تو یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ میری دوائی ختم ہوچکی تھیں اور میں ایک دن پہلے راحیل کو بتانا بھول گیا تھا۔

میں تیزی سے لاؤنج کی طرف آیا۔ راحیل دفتر جانے ہی والا تھا۔ اس کی بیوی راحیلہ اس کے پاس کھڑی تھی۔

''راحیل!'' میں نے راحیل کو آواز دی۔

''جی ابو۔''

''بیٹا! میری دوائی ختم ہوگئی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''بس آج تک کی خوراک ہے۔ کل کچھ نہیں ہوگا۔''

''ابو میں ایک بات کہوں۔'' راحیلہ کی آواز گونجی۔

''ہاں بیٹا کہو۔''

''ابو! راحیل پر آپ کی دواؤں کا بہت بوجھ پڑنے لگا ہے۔ اب انہوں نے نئی گاڑی بھی لی ہے تو اس کی بھی قسط جارہی ہے۔''

میں دنگ رہ گیا۔ راحیل میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ اتنی بڑی بات راحیلہ نے یوں ہی نہیں کہہ دی ہوگی، اس میں راحیل کی مرضی بھی شامل ہوگی۔

''بیٹا! تم جانتی ہو کہ میرے لیے یہ دوائی کتنی ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔

''ابو آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے۔'' اس بار راحیل بول پڑا تھا۔

''ہاں بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''ابو یہاں بہت سے فلاحی کام کرنے والے

www.PakiBooks.Site

ادارے ہیں۔'' راحیل نے کہا۔ ''اور.....''

''میں سمجھ گیا بیٹا سمجھ گیا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''یعنی خیراتی اداروں سے جا کر دوائی لیا کروں۔ ٹھیک ہے بیٹا بہت اچھا۔''

میں بہت دل شکستہ سا اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے ایسی ہزاروں کہانیاں سنی تھیں، پڑھی تھیں لیکن یہ اُمید نہیں تھی کہ خود میرے ساتھ بھی ایک دن ایسا ہی ہونے والا ہے۔ کتنا مان تھا مجھے اپنی اولاد پر۔ یہ جان کر کتنی خوشی ہوتی تھی کہ وہ ترقی کے منازل طے کرتے جارہے ہیں ان کا مستقبل روشن تھا اور جب باپ کا مستقبل بہتر ہوجائے تو بچوں کا بھی ہو جاتا ہے۔ میرے دونوں بچے یقیناً ایک اچھی زندگی گزارنے والے تھے۔

وہ پورا دن کوفت اور اداسی میں گزر گیا۔

دل اور ذہن پر ایک بہت بڑا بوجھ آپڑا تھا۔ میں نے راحیل اور شرجیل کے لیے کیا نہیں کیا، اپنی بساط سے بڑھ کر کیا، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ میں ایک باپ ہوں اور ہمارے معاشرے میں باپ کا جو کردار ہوتا ہے وہ سب جانتے ہیں۔

سوچتا رہا کہ آخر ایسا کیا ہوگیا۔ کیا میری تربیت میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ اس دن مرحومہ نزہت بہت یاد آئی رہی، اگر وہ زندہ ہوتی اور اس کے سامنے میرے ساتھ اس قسم کی کوئی پچویشن ہوتی تو اس کا کیا حال ہوجاتا۔

وہ میری دواؤں کا کتنا خیال رکھتی تھی۔

اس وقت یہ دوا لینی ہے، اس وقت وہ دوا لینی ہے۔ رات کو سوتے وقت دودھ بہت ضروری ہے اور یہ مٹھائی وغیرہ تو میں آپ کو کھانے نہیں دوں گی، وغیرہ وغیرہ۔

میں کبھی کبھی اس کی محبت کے بوجھ تلے دب سا جاتا۔ شرمندگی سی محسوس کرنے لگتا اور اس کا ازالہ اس طرح ہوتا کہ میں اس کے لیے کوئی تحفہ لے آیا کرتا۔ میں نے ہمیشہ اس کی سالگرہ کا خیال رکھا تھا جب کہ وہ بھی اس تاریخ کو ہمیشہ یاد رکھتی تھی۔ پھول کا تحفہ تو بہت ضروری تھا۔

لیکن اس کے جانے کے بعد ایک ویرانی سی ہوگئی تھی۔ جاڑ، سونا پن، مقدر میں رہ گئی۔ تم ہی نہیں رہے تو کیا گھر میں رہ گیا۔

اس شام میں جب ندیم خان کی دکان پر پہنچا تو وہ مجھے دیکھتے ہی بھانپ گیا کہ میں کچھ پریشان ہوں۔

''انور صاحب خیریت تو ہے آج آپ کچھ اداس دکھائی دے رہے ہیں۔''

''اب اس قسم کی باتیں تو مقدر کا حصہ بن چکی ہیں ندیم صاحب۔''

''بات کیا ہوئی؟''

''کیا بتاؤں!'' میں نے گہری سانس لی۔ ''میں شوگر اور کولیسٹرول کا مریض ہوں لیکن صاحبزادے کے پاس میری دواؤں کے پیسے بھی نہیں ہیں۔'' میرے لہجے میں بے پناہ تلخی تھی۔ ''پیار اور احترام تو بہت دور کی بات ہے۔ اس نے تو نظر انداز کرنا شروع کردیا ہے۔''

''افسوس ہوا یہ سن کر۔'' ندیم خان نے کہا۔

''ندیم صاحب سچ تو یہ ہے کہ مجھے آپ کے بیٹے اور بہو کو دیکھ کر رشک سا آگیا۔ دل سے دعا نکلی کہ خدا سب کو ایسی اولاد دے۔''

''انور بھائی! میرے پاس ایک ایسا ٹوٹکا ہے جس سے کام لے کر آپ دوبارہ اس گھر میں اپنا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔'' ندیم خان کچھ سوچ کر بولا۔

''کیوں مذاق کررہے ہیں ندیم صاحب اب میں ٹوٹکوں وغیرہ کے چکر میں پڑوں گا۔''

''آپ میری بات مان کر تو دیکھیں۔ آپ کے حالات بدل جائیں گے۔ میں اس کی گارنٹی لیتا ہوں۔''

''کمال ہے تو بتائیں کیا ہے وہ ٹوٹکا۔''

''آپ کل تین بجے میرے پاس آجائیں۔'' اس نے کہا۔ ''شام کو مت آیئے گا۔ اس وقت بچوں کا رش ہو جاتا ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''کہاں؟''

''اب یہ سب آپ کو کل پتا چلے گا۔ آپ مجھ پر بھروسا رکھیں۔''

''جی ہاں بھروسا تو ہے۔''

''تو بس کل آجائیں۔''

میں ندیم خان سے اجازت لے کر کچھ دیر کے لیے پارک میں آکر بیٹھ گیا۔ سوچتا رہا کہ آخر ندیم خان کے پاس ایسا کون سا ٹوٹکا ہے کہ جس پر عمل کرنے کے بعد میرے بچے میرا احترام کرنے لگیں گے۔ میری بہو میرا خیال رکھنے لگے گی۔ مجھے دواؤں کے پیسوں کے لیے ان کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑے گا بلکہ وہ وقت سے پہلے خود ہی لاکر

www.PakiBooks.Site

دے دیا کریں گے۔

کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔ ندیم خان نے یوں ہی نہیں کہا ہوگا۔ وہ ایک سمجھدار آدمی ہے لیکن ٹوٹکا، چلو چل کر دیکھ لیتے ہیں۔

دوپہر کے وقت اگرچہ میں اپنے کمرے میں سویا کرتا ہوں لیکن اس دن میں ٹھیک تین بجے ندیم خان کے پاس پہنچ گیا۔

اس کا کیبن بند تھا لیکن وہ کیبن کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔ ندیم خان نے اس کا تعارف مراد بھائی کہہ کر کرایا تھا۔

''یہ میرے مراد بھائی آفس میں میرے ساتھ ہی ہوتے تھے۔'' ندیم خان نے بتایا۔ ''بہت مہربان قسم کے انسان ہیں اور میں نے جس ٹوٹکے کی بات کی تھی۔ وہ ٹوٹکا نہیں بتائیں گے۔ بس آپ کو کچھ دور چلنا پڑے گا۔ شہزادہ پارک کی طرف۔''

شہزادہ پارک وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ پیدل کا راستہ تھا۔

''چلیں بسم اللہ۔'' مراد نے کہا۔

اس وقت تک میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ بہرحال میں ان دونوں کے ساتھ چل پڑا۔

شہزادہ پارک ہمارے والے پارک سے زیادہ بڑا تھا۔ میں ایک دوبار پوتوں کو لے کر یہاں آچکا ہوں۔ یہاں بہت رونق رہتی تھی۔

پارک کے مرکزی گیٹ کے سامنے ایک بڑا سا کیبن تھا۔ اس کے ساتھ ایک چوڑی گلی اندر آبادی کی طرف جاتی تھی۔ تقریباً ویسی ہی سچویشن تھی جیسی ندیم خان کے کیبن کی تھا۔

''اندر جاؤ یہ رہا آپ کا ٹوٹکا۔'' ندیم خان نے اس کیبن کی طرف اشارہ کیا۔

''میں نہیں سمجھا۔''

''یہ کیبن مراد بھائی کا ہے۔ اس میں بھی وہی سب کچھ ہے جو میرے کیبن میں ہے بلکہ اس میں کچھ زیادہ ہی آئٹم ہیں مراد بھائی مستقل طور پر لاہور جا رہے ہیں۔ وہ اس کیبن کو سامان کے ساتھ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ میرے پاس مشورہ کے لیے آئے تھے۔ یہ پرسوں کی بات ہے۔ اتفاق سے آپ کل اپنی پرابلم لے کر آگئے۔ بس تو میں نے فوراً یہ فیصلہ کرلیا کہ یہ کیبن آپ کا ہوگا۔ آپ اس کے مالک ہوں گے۔''

''ندیم صاحب! یہ سب کیسے ہوسکتا ہے۔ میں یہ کیسے کرسکتا ہوں۔ میرے پاس نہ تو پیسے ہیں اور نہ ہی ایسے کام کا کوئی تجربہ ہے۔''

''تجربہ تو میرے پاس بھی نہیں تھا۔'' ندیم خان نے کہا۔ ''لیکن اب میں اپنا کیبن کامیابی سے چلا رہا ہوں اور جہاں تک پیسوں کی بات ہے تو سامان کے ساتھ اس کی قیمت ہے پچاس ہزار روپے اور یہ رقم بھی آپ ایک ساتھ نہیں دیں گے۔ مراد بھائی نے میری بات مان لی ہے۔ آپ کو ہر مہینے صرف پانچ ہزار دینے ہوں گے، انور صاحب۔'' مراد نے میری طرف دیکھا۔ ''اس کیبن سے پانچ ہزار نکالنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ میں ہر مہینے پچیس سے تیس ہزار کمالیتا ہوں۔''

''انور بھائی! یہی ہے وہ ٹوٹکا۔'' ندیم خان نے کہا۔ ''اولاد کی نگاہوں میں باپ کی عزت اور احترام اس لیے ختم ہو جاتی ہے کہ باپ ان کو بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ پیار قائم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ خود اپنی کمائی کریں، اولاد کے محتاج نہ ہوں، اپنے گھر پر دس پندرہ ہزار روپے مہینا دے دیا کریں، پھر دیکھیں آپ کی وہی عزت ہوتی ہے یا نہیں کیونکہ پھر آپ بوجھ نہیں ہوں گے۔ ایک راز کی بات بتا دوں۔ آپ نے میرے بیٹے اور بچوں کا رویہ میرے ساتھ دیکھا ہوگا ایسا اس لیے نہیں ہے کہ ان کے دلوں میں والدین کا بہت احترام ہے بلکہ یہ رویہ اس لیے ہے کہ میں ان پر بوجھ نہیں ہوں۔ الٹا کبھی کبھی میں ہی ان کی مدد کردیا کرتا ہوں۔''

''ندیم بھائی!'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ، تم نے مجھے عزت نفس کا راستہ دکھا دیا ہے۔''

اس بات کو ایک برس ہو چکا ہے۔ اب گھر میں سب ٹھیک ہے۔ میرے کھانے پینے کا بھی خیال رکھا جاتا ہے اور مجھے وہ اہمیت بھی دی جاتی ہے جو پہلے نہیں مل رہی تھی۔

اپنی اس تحریر کے ذریعے میں ہر پڑھنے والے کو یہ کہتا ہوں کہ وہ بھی اگر اس قسم کے مسئلے سے دوچار ہوں تو یہ ٹوٹکا ضرور آزمائیں۔

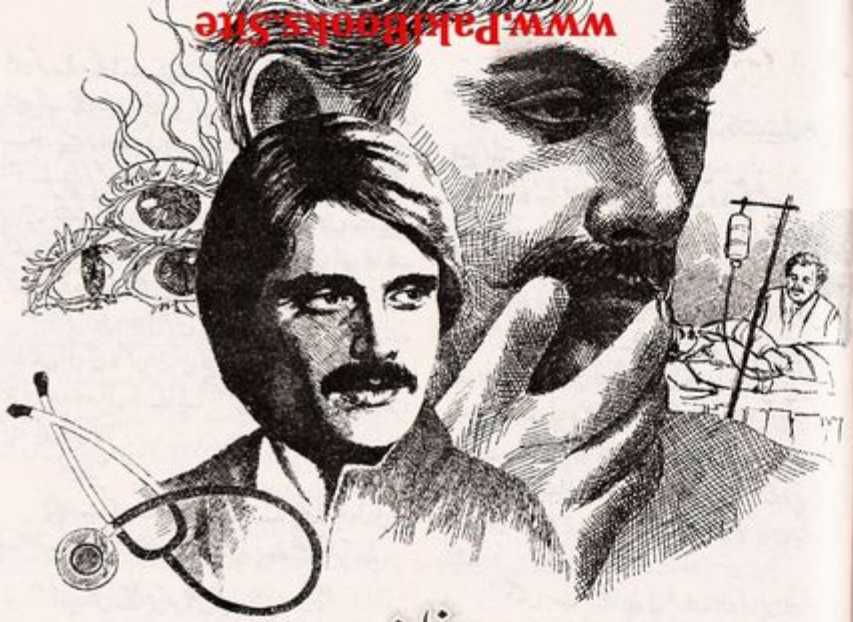

خلش

مکرمی مدیر اعلیٰ

السلام علیکم!

یہ روداد میرے ایک سینئر ڈاکٹر نے سنائی اور میں اب تک اس کے سحر سے باہر نکل نہیں پایا ہوں۔ لوگ زندگی کو کھیل سمجھ لیتے ہیں۔ اس نے بھی یہی سمجھ لیا تھا، پرائی کے راستے دل لبھانے والے ہوتے ہیں لیکن انجام؟ سبق حاصل کرنے کے لیے اس سچ بیانی کو ضرور پڑھیں۔

عاقب اشعر

(ایوب میڈیکل کالج۔ ایبٹ آباد)

اس کی آنکھیں بہت عجیب سی تھیں۔ بیک وقت ان میں بہت سارے جذبات گڈمڈ نظر آتے تھے۔

اداسی اور یاس کو اگر مجسم روپ دیا جاتا تو اس کی آنکھیں بنتیں۔

میں ایک ڈاکٹر ہوں زندگی کی پچپن بہاریں دیکھ چکا ہوں۔ دس برس باہر گوروں کے دیس بھی کام کیا پھر برسوں اپنے لوگوں کی مسیحائی کی۔ ڈاکٹر کا تو کام ہی پبلک ڈیلنگ ہے، آئے روز رنگ رنگ کے مریضوں سے واسطہ پڑتا ہے، ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ مریض بن کر آتے ہیں۔ اسپتالوں کی ان راہداریوں میں کتنی ہی ماؤں کو اپنے نوخیز جگر گوشوں کی لاشوں پر

www.PakiBooks.Site

بین کرتے دیکھا ہے۔ اپنے کسی عزیز کے آپریشن کے لیے اپنا زیور تک بیچ دینے والی سہاگن کی آنکھیں بھی دیکھی ہیں میں نے اور پیسے نہ ہونے کی وجہ سے موت کے منہ میں جاتے اپنے اکلوتے بچے کو مجبوراً ڈسچارج کرانے والے باپ کی آنکھیں بھی یاد ہیں مجھے مگر غم واندوہ کا ایسا لاوہ کسی اور کی آنکھوں سے پھوٹتا نہیں دیکھا۔ جب پہلی بار اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو بدن میں پھریری سی دوڑ گئی۔

"فائنل ایئر ہسٹری کون لے گا اس پیشنٹ کی؟" میں نے وارڈ میں آئی نئی فائنل ایئر کی کلاس سے مخاطب ہو کر کہا تو نئے استری شدہ اوور آل والے ایک چشمش اسٹوڈنٹ نے ہاتھ کھڑا کیا۔ "میں لوں گا؟"

"ٹھیک۔"

پیچھے سے کسی نے آواز کسی، میں نے پیچھے نظر دوڑائی تو ایک حضرت مصنوعی ارتکاز سے نوٹ پیڈ پر کچھ لکھتے نظر آئے۔

"آپ لیں گے اس مریض کی ہسٹری......؟"

"میں سر؟" اب کے آواز پھنس کے نکلی تھی۔

"جی بالکل آپ ہی محترم، ہم آپ کی ہسٹری ٹیکنگ اسکلز سے مستفید ہونا چاہیں گے۔"

تھوڑی دیر پہلے تک فقرے چست کرنے والے صاحب کی شوخی ہوا ہو چکی تھی۔ ہاتھوں میں واضح لرزش کو چھپاتے وہ بستر کی طرف بڑھا۔

"آپ کا نام...... نام کیا ہے؟" پریشانی میں وہ لفظ دہرا رہا تھا۔

"ریلیکس مسٹر۔ کوئی نہیں کھا رہا آپ کو۔ ایزی ہو کے ہسٹری لیں اور ذرا جلدی کر لیں، پورا دن ایک ہی بیڈ پہ تو نہیں گزارنا اور مریض بھی انتظار کر رہے ہیں۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی ذرا ڈھارس بندھی تو پھر مریض کی طرف متوجہ ہوا۔ "جی آپ کا نام؟" اب کے ذرا اعتماد سے پوچھا گیا تھا۔

"منیر حسین۔" سپاٹ سے لہجے میں جواب آیا۔

مریض بستر پر چوکڑی مار کے بیٹھا تھا۔ سر ایک طرف ڈالے وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے آپ کو؟" سب ہمہ تن گوش تھے پر جواب ندارد۔

"جی آپ کو مسئلہ کیا ہے؟" ذرا بلند آواز میں پوچھا گیا۔

اس نے نظریں اٹھائیں۔ "اُف۔" وہ نظریں گویا بدن کے آر پار ہو رہی تھیں۔

"میں نے خود کو گولی ماری ہے۔" بڑے نارمل انداز میں بتایا گیا۔

میں نے فضا میں پھیلتے ہراس کو واضح محسوس کیا۔ چھنی کی ایک لہر سی اٹھی اور سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر کھسر پھسر کی آوازیں بلند ہوئیں اور کئی نازک طبع لوگ پچھلی صفوں کو کھسکے۔ ہسٹری لینے والے حضرت کی سٹی گم ہو گئی۔ ہونقوں کی طرح بس مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ قصور ان بچوں کا بھی نہ تھا پہلی دفعہ وہ خودکشی کی کوشش کرنے والے مریض کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے لیے یہ صورت حال نئی اور پریشان کن تھی۔ ظاہر ہے میں نے ایسے کئی کیسز دیکھ رکھے تھے لیکن عموماً مریض بے ہوش ہوتا ہے اگر ہوش میں بھی ہو تو دواؤں کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس طرح کا تجربہ میرے لیے بھی نیا ہی تھا کہاں یہ کل کے بچے۔

"چلیں سب اگلے بیڈ کی طرف موو کریں اور تھوڑی ہمت کا مظاہرہ کیا کریں، آپ کو ایسے کتنے ہی نت نئے کیسز کا آئے روز سامنا کرنا پڑے گا۔" میں نے صورت حال کو کچھ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اور آپ ذرا میرے دفتر کا چکر لگائیے گا، کیس کے حوالے سے کچھ بات کرنی تھی۔" میرا مخاطب مریض کے ساتھ آیا ادھیڑ عمر شخص تھا۔

"جی جی آیئے۔ تشریف رکھیں۔" میں نے آنے والے شخص کو سامنے پڑی کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"یہ وہی صبح وارڈ والے مریض کا اٹینڈنٹ تھا۔" میرے سامنے اسی مریض کی فائل کھلی پڑی تھی۔ سب سے اوپر موٹا موٹا لکھا تھا۔ "سائکیٹرک پیشنٹ" جیسے کسی ایٹمی پلانٹ کے باہر تابکاری سے بچنے کے وارننگ سائنز آویزاں ہوتے ہیں ایسے ہی ہمارے ہاں کچھ مریضوں کے ساتھ بھی ایسے وارننگ سائنز لگا دیے جاتے ہیں حالانکہ نفسیاتی امراض بھی دیگر بیماروں ہی کی طرح قابل علاج ہوتے ہیں مگر بدقسمتی سے معاشرے میں نفسیاتی امراض کے بارے میں پایا جانے والا عمومی غلط تاثر شعبہ طب سے وابستہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد میں بھی کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہے حالانکہ نفسیاتی عوارض کا شکار افراد زیادہ توجہ اور ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں۔ فائل بیان کر رہی تھی کہ یہ اس مریض کی جانب سے خودکشی کی دوسری کوشش ہے اس سے پہلے زہر خورانی کی ایک کوشش میں اس کی زندگی بچائی جا چکی تھی۔ اس دفعہ اس نے شارٹ گن سے خود کو نشانہ بنایا تھا خوش قسمتی

www.PakiBooks.Site

سے کارتوس کے چھرے اس کے سینے کو چھلنی نہ کر سکے ایسا شاید فائر کے وقت رائفل کے غلط زاویے کی وجہ سے ممکن ہو پایا تھا۔

"کیا رشتہ ہے آپ کا مریض سے؟" میں نے سامنے بیٹھے شخص سے پوچھا۔

"یہ جی میرا چھوٹا بھائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسے کچھ ہو گا تو نہیں؟" اس کی آنکھوں سے فکرمندی جھلک رہی تھی۔

"میاں اس نے کوئی کسر چھوڑی تو نہیں ہے مگر شاید خدا کو اس کی زندگی ابھی عزیز ہے۔"

"کارتوس کے چھ چھرے ہیں اس کے سینے میں۔ خوش قسمتی سے اس کا سینہ چھلنی ہونے سے بچ گیا ہے۔ آپریشن کے ذریعے یہ چھرے باآسانی نکال دیے جائیں گے اور چند دن میں یہ زخم بھرنا شروع ہو جائیں گے فکرمندی کی کوئی بات نہیں۔" وہ کچھ پرسکون نظر آیا۔

"لیکن ایسا کیا ہوا ہے اس شخص کے ساتھ جو یہ اس نہج کو پہنچا کہ اپنی جان کے ہی درپے ہے؟"

"کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب اس بیچارے نے بڑے درد سہے ہیں۔ کچھ اس کے اپنے کرموں کا صلہ ہے اور کچھ قسمت کی ستم ظریفی۔" اس نے تاسف سے کہا۔

"آپ تفصیل سے بتائیں میں سن رہا ہوں۔" پھر اس نے جو کہانی سنائی میں اپنے الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں۔

منیر حسین بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو بڑی دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں صرف ایک بہن ابھی بھی ان کے ساتھ رہ رہی تھی۔ بڑے بھائی صاحب بھی شادی شدہ اور دو بچوں کے ساتھ اسی گھر میں مقیم تھے۔ والد صاحب ساری زندگی محنت مشقت کرتے رہے اور اب متعدد امراض کا شکار بستر پر پڑے زندگی کے باقی ماندہ دن گزار رہے تھے بڑے بھائی محلے میں ہی ایک چھوٹی سی کریانہ کی دکان پر بیٹھتے تھے۔ مشکل ہی سے گزر بسر ہو رہا تھا۔

منیر نے قریبی سرکاری اسکول میں داخلہ لے لیا، پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا پھر بھی گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے فرار کا واحد رستہ یہی تھا۔ اسکول کا کہہ کر نکلا لڑکا سارا دن اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ شہر کی گلیاں ناپتا پھرتا۔ محلے کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع ہوا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ سگریٹ سے شروع ہوا نشہ مفت کی چرس کے سوٹے تک جا پہنچا۔ یہ باتیں جب گھر تک پہنچیں تو جمیل حسین سخت افسردہ ہوئے۔ ساری زندگی عزت بچاتے گزری تھی اب یہ لڑکا خاندانی شرافت مٹی میں ملانے پر تلا ہوا تھا۔ جمیل حسین نے ان شکایات کا سخت نوٹس لیا۔

"دیکھ منیر! میں نے ساری زندگی محنت مزدوری کرتے گزاری ہے۔ اپنے بچوں کے ساتھ تم لوگوں کو بھی پالا ہے، ابا کی بیماری کا خرچ الگ ہے...۔ تو کوئی کام دھندا کرنے کے بجائے ہماری عزت داؤ پر لگانے کو تلا ہے اور کچھ نہیں تو میرے ساتھ دکان پر ہی بیٹھ جایا کر۔ یہ فضول کی آوارہ گردی سے تو بچ جائے گا۔" جمیل حسین نے متفکر لہجے میں کہا۔

"ہاں تم نے دکان پر بیٹھ کر بڑے محل کھڑے کر لیے ہیں نا۔ جواب میں بھی تیرے ساتھ بیٹھا کروں۔" اس نے کڑوے لہجے میں کہا۔ "دیکھ بھائی میں نے اس طرح سسک سسک کے زندگی نہیں گزارنی، کوئی بڑا کام کروں گا زیادہ پیسے والا جس سے اس بیکار زندگی سے جان چھوٹے۔"

"ہئیں۔ کیا کرے گا تو؟ کر کیا سکتا ہے؟ تعلیم تیرے پاس نہیں۔ پیسا دھیلا جیب میں نہیں۔" بڑے بھائی کے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ "او آیا۔ بڑا کام کروں گا۔ اب بھی ویلا ہے سدھر جا۔ در در کی ٹھوکریں کھائے گا تو لگ پتا جائے گا۔"

"ہاں کھا لوں گا در در کی ٹھوکریں۔ اس بدبودار زندگی سے تو ٹھوکریں بھلی۔" نخوت سے کہتا منیر حسین اٹھ کھڑا ہوا۔

بڑا بھائی افسردگی سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

وقت کا پہیا چلتا رہا، دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے مگر منیر حسین کا پیسا کمانے کا جنون ختم نہ ہوا۔ کئی دفعہ اِدھر اُدھر سے پیسے پکڑ کر کوئی کاروبار شروع کیا مگر تلون مزاجی نے کبھی جم کر کام نہ کرنے دیا۔ پیسا کمانے کی ہوس دن بدن بڑھتی رہی۔ اسی دوران گھر والوں نے ایک اچھے خاندان کی لڑکی دیکھ کر منیر حسین کی شادی کرا دی۔ سب کا خیال تھا کہ شادی کے بعد منیر حسین شاید بدل جائے لیکن اس نے بدلنا تھا نہ بدلا اسی دوران ان کے گھر پہلے بچے کی پیدائش ہوئی، بیوی بڑی سگھڑ اور بھلی مانس تھی جیسے تیسے اس کے ساتھ گزارہ کر رہی تھی۔

جمیل حسین اور اس کی بیگم نے ہر قدم پر ان کا ساتھ دیا اسی وجہ سے شاید منیر حسین کی شادی شدہ زندگی ابھی تک چل رہی تھی۔

ہر طرف سے پیسا کمانے میں ناکامی ہوئی تو منیر حسین اپنی پرانی روش پر اتر آیا۔ نشئی دوستوں کی محفل میں رات گئے تک بیٹھا رہتا، بیوی نے بہت سمجھایا کہ اپنے بڑے بھائی سے ہی کچھ سیکھ اور کوئی ڈھنگ کا کام کر۔

اسی دوران اس کی ملاقات استاد جانی سے ہوئی۔ جانی لاتے کا ایک بدنام شخص تھا۔ اندرون شہر کی ایک تنگ سی گلی

www.PakiBooks.Site

میں جانی استاد کا چائے کا ڈھابا تھا۔ یہ چائے کا کاروبار تو صرف دکھاوے کے لیے تھا۔ اندرون خانہ چائے کا یہ ڈھابا بدنام زمانہ جوئے اور منشیات کا اڈا تھا۔ علاقے بھر کے جواری شام ڈھلتے ہی یہاں جمع ہوتے اور رات گئے تک یہاں جوئے کی محفلیں سجی رہتیں۔ استاد جانی نے جب دیکھا کہ منیر حسین ہر جائز و ناجائز ذریعے سے پیسا حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس نے اسے جوئے کی راہ دکھائی۔

پہلی بازی میں ہی منیر حسین دس ہزار جیت گیا۔ اس کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا نہ تھا، آسانی سے پیسا کمانے کا ایک ذریعہ اسے مل گیا، اس رات وہ خوشی خوشی گھر آیا۔

''راشدہ! دیکھ تیرے لیے کیا لایا ہوں۔'' اس نے بیوی کو پکارا۔

''کیا لے آئے ہو ایسا جو یوں آوازیں دے رہے ہو؟'' وہ جھنجلاتی ہوئی رسوئی سے نکلی۔

''اری ادھر تو آ..... دیکھ تو سہی کیا ہے اس میں۔'' منیر حسین نے لفافہ اسے تھماتے ہوئے کہا۔

راشدہ نے جو لفافہ کھولا تو وہ بھی خوشی سے حیران رہ گئی۔

''ارے یہ تو بڑا پیارا سوٹ ہے منیر۔ میرے لیے ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں ہاں تیرے لیے ہی ہے اور کس کو دوں گا میں۔'' محبت سے اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ منیر جیسا بھی تھا بیوی سے بڑی محبت کرتا تھا۔ راشدہ بھی یہ بات جانتی تھی تبھی تو تنگی ترشی میں اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔

''بریانی بھی لایا ہوں۔ تجھے بہت پسند ہے نا۔ جا گرم کر کے لے آ، دونوں مل کے کھاتے ہیں۔''

''پر منیر تیرے پاس پیسے کہاں سے آئے آجکل تو تیرا کوئی کام دھندا بھی نہیں ہے۔'' بیگم نے فکرمندی سے پوچھا۔

''آج ہی لگا ہے کام۔ یہ ایڈوانس ملا ہے۔ اب ہمارے دن پھرنے والے ہیں۔ تو کن باتوں میں پڑ گئی ہے جا کھانا تو گرم کر کے لا۔''

''اچھا جاتی ہوں۔'' وہ بریانی والا لفافہ اٹھاتے بولی۔ اندر ہی اندر کہیں کوئی چیز اسے پریشان کر رہی تھی۔

☆.....☆

منیر حسین کی قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ جوئے کی زیادہ تر بازیاں اسی کے نام رہی تھیں، چند چھوٹی موٹی رقمیں ہارا بھی تھا مگر پیسوں کے ایسے آسان حصول کی لت ایسی لگی تھی کہ اب چھڑائے نہ چھٹے۔ راشدہ کو شک تو ہوا پر زیادہ پوچھنے پر وہ جھڑک کر خاموش کرا دیتا تھا۔ گھر میں پیسے آ رہے تھے سو وہ خاموش ہو گئی۔ جمیل حسین کو البتہ کئی لوگوں کی زبانی بھائی کی بازی کی خبریں سننے کو ملی تھیں۔ اس نے جب اپنے طور پر کھوجنا چاہا تو منیر نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے وہ دخل نہ دے۔ جمیل حسین نے اسے اولاد کی طرح پالا پوسا کر بڑا کیا تھا ایسے رویے پر اس کا دل تو بہت دکھا لیکن مصلحتاً خاموش ہونا پڑا۔

ادھر استاد جانی سے اس کا یارانہ بڑھتا گیا۔ اب چھوٹی موٹی رقم پر منیر حسین داؤ لگاتا ہی نہ تھا۔

ایک شام جب منیر اڈے پہنچا تو جانی اسی کا منتظر تھا۔

''باؤ منیر آج تو بڑی دیر لگا دی۔ کچھ خاص مہمان آئے ہیں دوسرے شہر سے، بڑی بازی لگے گی آج تو۔'' وہ آواز دبا کر بولا۔

''استاد تجھے تو پتا ہی ہے چھوٹی موٹی بازی تو میں آج کل لگاتا بھی نہیں۔''

''آجا فیر باؤ دیر کس بات کی۔''

بازی ہلکی رقم سے شروع ہوئی پھر دیکھتے دیکھتے ماحول گرم ہونے لگا۔ شروع کی بازیاں تو منیر حسین جیتتا رہا پھر آہستہ آہستہ رقم بڑھنے لگی آخری بازی پانچ پانچ لاکھ کی لگ گئی۔ منیر لاکھ تو اس کے پاس تھے دو لاکھ اس نے استاد جانی سے پکڑے پر شومئی قسمت منیر حسین یہ بازی ہار گیا۔ مخالف پارٹی نے مزید بازی لگانے کا کہا اب تو اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہ بچی تھی۔

''کیا منیر باؤ بس اتنی ہی تھی؟ اگر پیسے نہیں بچے تو کسی اور چیز پر لگا لیتے ہیں بازی۔'' سامنے والا شخص بھی گھاگ تھا۔

''اور کس چیز پر لگاؤں بازی؟'' جھنجلا کر منیر حسین نے پوچھا۔

''موٹر سائیکل پر لگا لیتے ہیں۔ تم جیتے تو موٹر سائیکل کی قیمت ہم سے لے لینا اور ہم جیتے تو موٹر سائیکل ہماری۔''

''مجھے منظور ہے لگاؤ بازی۔''

بازی شروع ہوئی ابتداء میں تو گیم منیر کے حق میں تھی لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے پانسا پلٹ گیا بالآخر منیر یہ بازی بھی ہار گیا اور ساتھ اپنی موٹر سائیکل بھی۔

اس دن پیدل ہی گھر پہنچا تو بیوی نے موٹر سائیکل کے بارے پوچھا کوئی جواب بن نہ پایا تو گالم گلوچ پر اتر آیا۔ راشدہ بھی کہاں چپ رہنے والی تھی اس نے مڑ کر کوئی سخت جواب دیا تو منیر حسین کا پارہ آسمانوں کو چھونے لگا آؤ دیکھا نہ تاؤ بے چاری پر تھپڑوں کی بارش کر دی، وہ زمین پر گر پڑی تو لاتوں مکوں سے دھنک کر رکھ دیا۔ اپنی اس احانت پر راشدہ گنگ رہ گئی۔ جو بھی تھا

www.PakiBooks.Site

منیر نے آج تک اس پر ہاتھ نہ اٹھایا تھا مگر آج تو وہ اپنے حواس میں نہ لگ رہا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔

راشدہ اسی جگہ پڑی ساری رات سسکتی رہی پر اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

اگلے روز وہ یونہی بازار میں گھومتا رہا ارادہ کیا تھا کہ اب جانی کے اڈے کا رخ نہ کرے گا پر اس دلدل سے نکلنا اتنا آسان کب تھا، شام ڈھلتے ہی وہ پھر اڈے جا پہنچا۔ جیب میں بس چائے پینے کے پیسے رہ گئے تھے۔

''منیر باؤ کی گل اے؟ تو ادھر بیٹھا خالی خولی چائے چڑھا رہا ہے اور اندر پارٹیاں تیرا انتظار کر رہی ہیں۔''

''استاد جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ کل اسکوٹر بھی داؤ میں ہار گیا۔ اب تن پر یہ کپڑے بچے ہیں ان کو لگا دوں جوے میں؟''

''لے دس۔ اوے جانی مر گیا ہے جو تو ایسی باتیں کر رہا ہے۔ ادھر ای رک میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر جانی اندر اپنے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر میں واپسی ہوئی تو ہاتھوں میں ہزار ہزار کے نوٹوں کی کئی گڈیاں تھیں۔

''یہ لے منیر باؤ۔ بے فکر ہو کے کھیل جب جیتنے لگا تو واپس کر دینا۔'' جانی نے دو گڈیاں اس کی طرف بڑھائیں۔

منیر نے کچھ کہے بغیر نوٹ تھام لیے۔ داؤ پہ داؤ لگتے رہے۔ ایک بازی میں جو کچھ جیتتا اگلی میں ہار جاتا۔ رات گئے جب یہ میچ ختم ہوئی تو منیر حسین کے پاس تھوڑی رقم ہی بچی تھی۔

پھر تو یہ معمول بن گیا ہر دوسرے دن جانی اسے کچھ رقم تھما دیتا اور وہ بازی لگانے پہنچ جاتا۔ کچھ عرصہ تو یہ معمول چلتا رہا پھر جانی نے اپنی رقم کا مطالبہ کر دیا۔ منیر حسین نے کبھی جانی سے لی گئی رقم کا حساب نہ رکھا تھا نہ جانی نے کبھی بتایا۔ اب اچانک اس نے دس لاکھ روپے مانگ لیے تو منیر حسین کو احساس ہوا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے اور اب کہاں سے اس رقم کا بندوبست ہوگا۔ مطالبات زیادہ بڑھے تو اس نے جانی سے کترانہ شروع کر دیا۔ گھر کے اخراجات الگ سے تھے اوپر سے اتنی بڑی رقم کا بندوبست کہاں سے ہوتا سوچ سوچ کر منیر ذہنی مریض بن گیا ایسے میں ایک دفعہ پھر اس کی فیملی ہی کام آئی۔ راشدہ نے بھائی جمیل سے بات کی کہ کچھ رقم کا بندوبست وہ کر دیں اور کچھ اس کے زیور بیچ کر شاید گزارہ ہو سکے۔ راشدہ کے زیور اور جمیل حسین کی پس انداز کردہ کچھ رقم ملا کر بھی بمشکل نصف رقم کا بندوبست ہو سکا۔ منیر حسین نے آدھی رقم جانی کو لوٹائی اور بقایا پیسوں کے لیے وقت مانگا تو جانی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''دیکھ منیر تجھے میں نے پہلے ہی بہت مہلت دی ہے ابھی تک میں نے تجھے بڑی ڈھیل دی ہے ورنہ جانی تو حلق میں ہاتھ ڈال کر اپنے پیسے نکالا کرتا ہے۔ تیرے پاس ایک مہینے کا وقت ہے دس لاکھ کا مزید بندوبست کر ورنہ پھر جانی کے غضب کو دیکھ۔''

''استاد بڑی مشکل سے یہ پانچ لاکھ اکٹھے ہوئے ہیں۔ اب تو سود بھی لگا رہا ہے ساتھ۔ کہاں سے پورے کروں گا یہ پیسے۔'' پریشانی نے اس کی حالت بگاڑ کے رکھ دی تھی ---- برسوں کا مریض لگتا تھا۔

''اوئے یہ میرا مسئلہ نہیں ہے ایک مہینا۔ دس لاکھ۔ ورنہ پھر تیار رہنا ہر طرح کے حالات کے لیے۔'' قطعیت سے کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

منیر حسین مرے قدموں سے گھر لوٹ آیا۔ گھر والوں کو نئی صورت حال کا پتا چلا تو وہ بھی سخت پریشان ہوئے۔ اب دس لاکھ کا بندوبست کہاں سے ہوتا۔ منیر جتنا سوچتا مزید الجھتا جاتا۔ کھانا پینا کب کا چھوٹ چکا تھا اب ہر وقت بستر پر پڑا سگریٹ پھونکتا رہتا۔ جوں جوں دن قریب آ رہے تھے اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر جب اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا، گندم کے دانوں کو کیڑے سے بچانے والی دوائی کی کئی گولیاں پیس کر حلق سے اتار لیں۔

صبح جب راشدہ ناشتے کے لیے اسے اٹھانے گئی تو اس کی حالت دیکھ کر راشدہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ منہ سے خون کی جھاگ چھوٹی ہوئی تھی اور رنگ سفید پڑ رہا تھا۔ فوری اسپتال پہنچایا گیا۔ معدے کی صفائی ہوئی تو حالت کچھ سنبھلی۔ دو دن بعد اسپتال والوں نے فارغ کر دیا۔

وقتی جان تو بچ گئی تھی لیکن آنے والے وقت کی فکر ابھی بھی اسے کھائے جا رہی تھی۔ اس نے بات چیت کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ راشدہ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی پر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

اسی اثناء میں ایک دن جانی ان کے گھر آ دھمکا۔ پیسوں کے بارے استفسار کیا تو منیر اس کے پاؤں پڑ گیا۔

''استاد کچھ وقت اور دے دے۔ میں تیری پائی پائی لوٹا دوں گا۔'' منیر نے التجا کی۔

جانی پاؤں پٹخ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''بس منیر بہت ہو گیا۔ اب میں خود ہی کچھ کروں گا۔''

وہ رات دونوں میاں بیوی نے آنکھوں میں کاٹ کر گزاری۔ آنے والے وقت کے اندیشے سونے نہ دیتے تھے۔

اگلے روز وہ ہو گیا جو ان کے وہم و گمان میں نہ تھا۔

www.PakiBooks.Site

سویرے سویرے جانی اپنے ساتھ کئی غنڈے لے کر ان کے گھر گھس آیا۔ پہلے تو انھوں نے منیر حسین کو مار مار کا ادھ موا کر دیا، پھر راشدہ کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے لگے۔ یہ منظر منیر کے لیے ناقابل برداشت تھا اپنی رہی سہی ہمت جمع کر کے وہ بیوی کو چھڑانے لپکا پر ان مشٹنڈوں کے آگے اس کی کہاں چلتی تھی۔ وہ اسے گاڑی میں ڈال چلتے بنے۔

منیر حسین کی دنیا لٹ گئی۔ اس کے کیے کی سزا اس کی بیوی کو مل رہی تھی اور وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ جب جمیل حسین گھر لوٹا تو ساری صورت حال جان کر سخت پریشان ہوا۔ پولیس میں جانے کا خیال آیا پر بدنامی کے ڈر سے چپ ہو گئے۔ منیر نے اسے جانی کے اڈے کا بتایا مگر وہاں سے بھی ناکام واپسی ہوئی۔ اس کے بدمعاشوں نے جمیل حسین کو بھی خوب زدوکوب کیا۔ وہ رات سب نے انگاروں پر لوٹ کر گزاری۔ خدا کے اس آسمان تلے ان کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہو گیا تھا اور وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اگلے دن صبح صبح راشدہ بیگم کی واپسی ہوئی۔ اس کی حالت ایک اجڑی ہوئی لاش کی سی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھے گئی۔ نہ روتی تھی نہ ہنستی، کسی بات کا جواب اس نے دینا تھا نہ دیا۔

چپ چاپ اپنا سامان سمیٹ کر وہ گھر سے نکل گئی۔ اس نے ہر تنگی ترشی میں منیر حسین کا ساتھ دیا۔ گالیاں سہیں، ماریں کھائیں اسے بچانے کی خاطر اپنا زیور تک بیچ دیا لیکن وہ مرد اس کی عزت تک کی حفاظت نہ کر سکا۔ بلکہ اس کا کیا اسے اپنی عزت گنوا کے بھگتنا پڑا۔ یہی تو ایک مان ہوتا ہے ایک عورت کا کہ اس کا مرد اس کی عزت کی رکھوالی کرے گا جب یہی مان ٹوٹ گیا تو پیچھے کیا بچا۔ اسے پتا تھا بھائی کے گھر بھی اسے کوئی خوشی سے قبول نہیں کرے گا۔ بھاوج سے اس کی پہلے ہی کوئی خاص بنتی نہیں تھی پر اب کوئی دوسرا راستہ بچا نہ تھا۔ اس جواری کے ساتھ ایک چھت تلے رہنا اب اسے ہرگز گوارا نہ تھا۔

منیر حسین اپنے ضمیر کی عدالت میں کب سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اپنا ایک ایک جرم اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ آج تہی دامن تھا۔ اس کے ہاتھ خالی رہ گئے تھے۔ پیسے کے لالچ میں اس نے کبھی تک کر کام نہ کیا آنکھوں پر لالچ کی ایسی پٹی بندھی کے جوے کی دلدل میں دھنستا گیا کہ جمع پونجی گئی اسکوٹر گیا اور آج؟ آج اس کی وفا شعار بیوی بھی اسے چھوڑ گئی۔ وہ بیوی جو ہر کڑی دھوپ میں اس کے لیے سائبان تھی اس کے اپنے کیے جرم کی سزا اس عفت شعار کو سہنی پڑی اور سزا بھی کیسی کڑی۔ اس پر بیتے ایک ایک لمحے کی ہولناکی کا خیال اسے آتا تو کلیجہ کٹ سا جاتا۔ اسے اپنی زندگی کا کوئی مقصد دکھائی نہ دے رہا تھا۔ پچھتاوا اور دکھ نیزے کی انی کی طرح اسے اندر ہی اندر سے گھائل کیے جا رہے تھے۔ گھر کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ اپنے ہی بھائی بھابی کی نظروں کی تاب بھی نہ رہی تھی اس میں۔ آخر اس مسلسل اذیت کا ایک ہی حل دکھا اسے۔

آزادی
اس دنیا سے
یہاں کے مسائل سے
پچھتاووں سے
اپنے گناہوں کے آسیب سے

☆☆☆

ڈاکٹر صاحب فائر کی آواز سن کے ہم بھاگ کر جب کمرے میں پہنچے تو یہ خون میں لت پت پڑا تھا۔ خدا جانے ان چند دن میں ہم نے کیا کیا دیکھنا تھا۔ بس اس کو اٹھا کر فوراً اسپتال پہنچے وہ تو خدا کا شکر کہ اس کی جان بچ گئی۔ جب سے ہوش میں آیا ہے اٹھ اٹھ کے بھاگتا ہے۔ کہتا ہے کیوں بچایا مجھے، کیوں میری اذیت بڑھا رہے ہو، اپنی بیوی کو آوازیں دیتا رہتا ہے، خود کو کوستا رہتا ہے ہر وقت۔

اسے اپنے گناہوں کی سزا ملی ہے ڈاکٹر صاحب پر مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ باپ بن کر پالا ہے اسے میں نے۔ اب اس کی یہ حالت دیکھتا ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ نجانے ابھی ہم نے اور کیا کیا دیکھنا ہے۔ وہ رکا اور اپنے کاندھے پر پڑے کپڑے سے آنکھیں پونچھیں۔

"صبر کریں بڑے میاں، وہ اللہ بڑا کارساز ہے، غم دیتا ہے تو اسے سہنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔ ہمت سے کام لیں کوئی بہتر حل نکلے گا" میں نے اپنے طور پر تسلی دینے کی کوشش کی پر اپنے الفاظ کا کھوکھلا پن مجھ پر بھی واضح تھا۔

اس ملک میں نجانے کتنے منیر حسین ہوں گے جو دولت کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز رستہ اپنانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ مادہ پرستی کی اس دوڑ نے حلال و حرام کا فرق مٹا دیا ہے۔ کتنی ہی عورتیں ہر روز راشدہ کی طرح کسی اپنے کے گناہوں کی بھینٹ چڑھتی ہوں گی۔ کاش کہ اس ملک کے نوجوان اگر یہ جان لیں کہ پرخلوص رشتوں سے بڑی کوئی دولت نہیں تو شاید پھر کوئی منیر حسین کسی راشدہ کی عزت یوں جوئے میں ہارنے سے بچ جائے۔

www.PakiBooks.Site

خالی ہاتھ

محترم مدیر
السلام علیکم
لکھنا لکھانا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ صحافت کے پیشے میں آئے ہوئے مجھے عرصہ ہو گیا ہے لیکن کہانیاں کبھی لکھی نہیں۔ ہاں پڑھتا ضرور ہوں۔ یہ میری آپ بیتی ہے اس لیے میں اسے اپنے نام سے شائع نہیں کرا سکتا۔ میرے دوست احباب کا ایک حلقہ ہے اسی لیے فرضی نام دیا ہے۔

مجید اکرم
(کراچی)

میں نے غربت کی گود میں آنکھ کھولی۔ والد صاحب ایک سرکاری محکمے میں اسسٹنٹ تھے۔ اس زمانے میں سرکاری ملازمین کی تنخواہ بہت کم ہوا کرتی تھی جس کی وجہ سے گزارہ مشکل ہو رہا تھا۔ ہم چار بہن بھائی تھے۔ مجھ سے چھوٹا اشرف اور دو بہنیں نائلہ اور صائمہ۔ والد اور والدہ قناعت پسند تھے۔ انہوں نے اولاد کو بھی یہی تربیت دی۔ چھوٹے بہن بھائی تو نا سمجھ تھے لیکن میں جوں جوں بڑا ہوتا گیا۔ میرا احساس محرومی بھی بڑھتا گیا۔ میرا دل چاہتا کہ میں بھی دوسرے لڑکوں کی طرح اچھا لباس پہنوں، میری جیب نوٹوں سے بھری ہو۔ میں خوب گھوموں پھروں۔

www.PakiBooks.Site

فلمیں دیکھوں۔ ہوٹلوں میں جاؤں لیکن میں صرف خواب ہی دیکھ سکتا تھا کیونکہ مجھے روزانہ جو جیب خرچ ملتا اس سے ہاف ٹائم میں چھولے کی پلیٹ یا ایک سموسہ ہی خرید سکتا تھا۔

یہی خواب دیکھتے دیکھتے میں کالج میں آگیا۔ انہی دنوں ابا کی بھی ترقی ہوگئی اور وہ گیارہ سے سولہ گریڈ میں آگئے۔ انہیں جس پوسٹ پر تعینات کیا گیا وہاں اوپر کی آمدنی بھی تھی جس کی وجہ سے ہمارے گھر کے حالات بہتر ہونا شروع ہوگئے۔ امی میری فرمائشیں پوری کرنے میں کسی بخل سے کام نہ لیتیں اور مجھے اپنی ضرورت کے مطابق پیسے ملتے رہتے۔

ثمینہ میری کلاس فیلو تھی لیکن اس سے میرا تعلق صرف جان پہچان کی حد تک رہا، وہ شکل وصورت کی اچھی تھی اور کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ اس سے دوستی کی جائے لیکن وہ بہت ہی ریزروڈ ٹائپ لڑکی تھی اور لڑکوں کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ کلاس کی دو چار لڑکیوں سے ہی اس کی دوستی تھی۔ ان میں سے دو تو اسی کے محلے میں رہتی تھیں اور وہ ان ہی کے ساتھ... کالج آتی جاتی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ اس کا تعلق انتہائی غریب گھرانے سے ہے شاید اسی لیے وہ احساس کمتری میں مبتلا تھی اور اس کے دوستوں کا حلقہ بہت محدود تھا۔

اس کے بارے میں اتنی معلومات ہونے کی کمی نہ تھی۔ ہمارا گروپ آٹھ لڑکے لڑکیوں پر مشتمل تھا۔ وہ سب کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ البتہ میں ان سب میں کم حیثیت تھا لیکن میں نے کبھی ان پر اپنی اصلیت ظاہر نہیں ہونے دی۔ کالج میں یونیفارم کی پابندی تھی۔ اس کے باوجود میں ہمیشہ ٹپ ٹاپ میں رہتا۔ میرے جسم سے امپورٹیڈ پرفیوم کی مہک آرہی ہوتی اور میں اپنے سب دوستوں کو کینٹین میں لے جا کر ٹریٹ بھی دے دیا کرتا۔

ان لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہوگیا۔ میرے امیر کلاس فیلوز جب قیمتی کاروں میں آتے اور پورے گروپ کو ساتھ لے کر بڑے بڑے ہوٹلوں اور دیگر تفریحی مقامات پر گھومتے پھرتے تو میرے دل میں بھی یہ خواہش سر اٹھانے لگتی کہ کاش میں بھی ان امیر زادوں کی طرح زندگی بسر کرسکتا۔ میرے والد اپنی آمدنی سے ہماری روز مرہ ضروریات تو پوری کررہے تھے لیکن ان کی کمائی اتنی نہیں تھی کہ وہ ہمیں ہر طرح کا عیش وآرام مہیا کرسکتے۔

اس احساس محرومی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوران تعلیم ہی مجھ پر پیسا کمانے کی دھن سوار ہوگئی اور میں دن رات امیر بننے کا خواب دیکھنے لگا۔ میں اپنے والد کی طرح گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ بہت چھوٹی عمر میں ہی میں نے اس حقیقت کو جان لیا تھا کہ ایک اچھی اور آرام دہ زندگی گزارنے کے لیے بہت سا پیسا ہونا ضروری ہے لیکن اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ یہ پیسا کہاں سے آئے گا۔

میری تعلیم مکمل ہونے میں چار پانچ سال باقی تھے۔ اگر میں یونیورسٹی سے ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرلیتا تب بھی مجھے کوئی معمولی ملازمت ہی ملتی۔ سرکاری نوکری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لیے رشوت یا سفارش کی ضرورت تھی اور یہ دونوں چیزیں میرے پاس نہیں تھیں البتہ یہ ہوسکتا تھا کہ میں باہر سے ڈگری لے کر آتا اور کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر لگ جاتا یا پھر اپنا کاروبار شروع کر کے پیسے کماتا۔ گھر کے حالات دیکھتے ہوئے مجھے یہ دونوں صورتیں ممکن نظر نہیں آرہی تھیں۔

بہت سوچ بچار کے بعد میرے ذہن میں دولت مند بننے کا ایک آئیڈیا آہی گیا۔ اگر میری شادی کسی بے حد امیر گھرانے کی اکلوتی لڑکی سے ہو جائے تو میری قسمت بدل سکتی ہے۔ ظاہر ہے اس کا باپ اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے مجھے کسی اچھی جگہ ملازمت دلوادے یا مجھے کوئی کاروبار شروع کروادے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کوئی امیر لڑکی مجھ سے شادی کیوں کرے گی۔ اتنی عقل تو مجھ میں بھی تھی کہ دولت مند لوگ اپنے ہی ہم پلہ لوگوں میں بچوں کی شادیاں کرتے ہیں بلکہ ان میں سے بیشتر کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے سے اونچے خاندانوں میں رشتے داری قائم کریں تاکہ معاشرے میں ان کا مرتبہ پہلے سے زیادہ بلند ہوسکے۔

میں نے کئی فلموں میں دیکھا تھا کہ امیر لڑکی غریب لڑکے سے محبت کرتی ہے اور گھر والوں کی مخالفت کے باوجود اس سے شادی کرلیتی ہے۔ کیا حقیقی زندگی میں ایسا ممکن ہے اور اس سوال کا جواب مجھے فوراً ہی مل گیا جب میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ خاندان، محلے اور ملنے جلنے والوں میں دیکھا لیکن مجھے ایک بھی ایسا کیس نظر نہیں آیا۔ پچھلے چند سالوں میں میرے خاندان، محلے، دوستوں اور ملنے جلنے والوں میں جتنی بھی شادیاں ہوئی تھیں وہ سب

www.PakiBooks.Site

میری طرح غریب تھے اور ان میں سماجی حیثیت کا کوئی فرق نہیں تھا البتہ صرف ایک مثال قدرے مختلف تھی۔

وہ ہماری امی کے دور پرے کے رشتہ داروں میں سے تھے اور امی انہیں خلیل بھائی کہا کرتی تھیں۔ سدا کے نکمے اور آوارہ۔ انہوں نے انٹر کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ سارا دن دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتے۔ ایک دن وہ دوستوں کے ساتھ براستہ سپر ہائی وے حیدرآباد سے آرہے تھے کہ سہراب گوٹھ کے قریب ایک لڑکی اپنی کار کے پاس کھڑی وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں کو رکنے کا اشارہ کررہی تھی۔ خلیل بھائی نے بروقت اسے دیکھ لیا اور اس کے قریب جا کر اپنی کار روک دی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا ہے اور وہ اسی لیے گاڑیوں کو رکنے کا اشارہ کررہی تھی کہ کوئی اس کی گاڑی کا ٹائر بدل دے لیکن سب گاڑیاں تیزی سے گزرتی چلی جارہی تھیں۔

خلیل بھائی کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ گاڑی کی ڈکی میں فالتو ٹائر موجود ہے۔ خلیل بھائی نے ڈکی کھول کر ٹائر اور دوسرا سامان نکالا اور منٹوں میں ٹائر تبدیل کردیا۔ اس لڑکی نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بولی۔ ''اگر آپ اس وقت میری مدد نہ کرتے تو میں نہ جانے کب تک یہاں کھڑی رہتی۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔''

''شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' خلیل بھائی نے کہا۔ ''انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔''

''بہرحال اس وقت تو میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کرسکتی۔'' اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال آپ میرا کارڈ رکھ لیں جب کبھی میری ضرورت محسوس ہو، آپ بلا تکلف مجھے فون کرسکتے ہیں اور مجھے بھی اپنا نمبر دے دیں۔''

خلیل بھائی نے اسے اپنا نمبر دے دیا اور وہ ان کا شکریہ ادا کر کے اپنی کار میں روانہ ہوگئی۔ خلیل بھائی نے کارڈ پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ دراصل وہ لڑکی رخسانہ ایک بہت بڑے گروپ آف کمپنیز کے چیئرمین کی بیٹی تھی۔ یہ بات خلیل بھائی کو بعد میں معلوم ہوئی۔

دو تین دن بعد ہی رخسانہ نے فون کر کے خلیل بھائی کو ان کے دوستوں سمیت اپنی بہن کی سالگرہ میں شرکت کی دعوت دی۔ خلیل بھائی نے دوستوں کو لے جانا مناسب نہ سمجھا بلکہ وہ تو خود بھی نہیں جانا چاہ رہے تھے لیکن رخسانہ نے اتنے خلوص سے دعوت دی تھی کہ وہ انکار نہ کرسکے اور بن سنور کر اس تقریب میں شرکت کی غرض سے چلے گئے۔

رخسانہ نے اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے ان کا تعارف کروایا۔ وہ غالباً پہلے ہی انہیں خلیل بھائی کے بارے میں بتا چکی تھی اس لیے سب لوگ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ رخسانہ کے والد نے ان کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر اس روز وہ رخسانہ کی مدد نہ کرتے تو نہ جانے اسے مزید کتنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ انہوں نے خلیل بھائی کو اپنا کارڈ دے کر کہا کہ وہ جب بھی ضرورت محسوس کریں ان سے بلاتکلف مل سکتے ہیں۔ کارڈ دیکھ کر خلیل بھائی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ سن شائن گروپ آف کمپنیز کے چیئرمین تھے۔

دوسرے دن رخسانہ نے فون کر کے خلیل بھائی سے کہا کہ ڈیڈی ان سے ملنا چاہ رہے ہیں۔ لہٰذا وہ پہلی فرصت میں ان کے پاس چلے جائیں۔ خلیل بھائی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ شیرازی صاحب اس سے کیوں ملنا چاہ رہے ہیں۔ یہی بات انہوں نے رخسانہ سے پوچھی تو وہ بولی۔ ''مجھے کیا معلوم، بہرحال آپ ان سے ضرور مل لیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے فائدے کی کوئی بات ہو۔''

رخسانہ نے اشارہ دے دیا تھا اس لیے خلیل بھائی نے اس کے ڈیڈی سے ملنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائی اور دوسرے دن ہی ان کے دفتر پہنچ گئے۔ سیکریٹری نے جیسے ہی شیرازی صاحب کو ان کی آمد کی اطلاع دی، انہیں فوراً اندر بلا لیا گیا۔ شیرازی صاحب نے اس روز بھی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور رسمی گفتگو کے بعد مطلب کی بات پر آگئے۔

''برخوردار! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان دنوں آپ کی کیا مصروفیت ہے؟''

خلیل بھائی اس سوال پر سٹپٹا کر رہ گئے۔ وہ انہیں کیا بتاتے کہ پڑھائی چھوڑنے کے بعد دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہیں اس لیے انہوں نے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ ''جی، دراصل بات یہ ہے کہ مجھے ٹائیفائیڈ ہوگیا تھا اس لیے اس سال یونیورسٹی میں داخلہ نہ لے سکا، انشاءاللہ.....''

''اچھا اچھا۔'' وہ ان کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔ ''گویا آپ فارغ ہیں؟''

''جی!''

''آپ کوئی مصروفیت کیوں نہیں ڈھونڈ لیتے، میرا مطلب ہے خالی بیٹھنے سے تو بہتر ہے کہ کوئی کام کیا جائے۔''

www.PakiBooks.Site

''جی ضرور، اگر کوئی مناسب کام مل گیا تو اس بارے میں ضرور سوچوں گا۔''

''آپ میرے پاس کیوں نہیں آجاتے۔ مجھے آپ جیسے لوگوں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔''

خلیل بھائی سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ انہوں نے یہ سوچ کر ہاں کردی کہ اسی بہانے کچھ پیسے ہاتھ آجائیں گے اور گھر والوں کی زبانیں بھی بند ہوجائیں گی۔

''ٹھیک ہے، آپ کل سے کام پر آجائیں۔ میرا منیجر آپ کو اس بارے میں بریف کردے گا۔ تنخواہ انشاء اللہ آپ کی توقع سے زیادہ ہی ہوگی۔''

دوسرے دن سے انہوں نے دفتر جانا شروع کردیا۔ منیجر نے انہیں بتایا کہ فی الحال انہیں کوئی مخصوص ذمے داری نہیں دی جارہی۔ وہ رابطہ افسر کے طور پر کمپنی کی مختلف فیکٹریوں اور دفاتر میں جاکر وہاں کے طریقہ کار سے واقفیت حاصل کریں گے اور جو کچھ وہ دیکھیں یا محسوس کریں اس کی رپورٹ ہر ہفتہ چیئرمین کو دینا ہوگی۔

چند ہی دنوں میں خلیل بھائی نے شیرازی صاحب کا اعتماد حاصل کرلیا۔ بعض اوقات کام کے سلسلے میں وہ ان کے گھر بھی چلے جاتے اور رخسانہ سے ملاقات ہوجاتی پھر یہ ملاقاتیں بڑھنے لگیں اور وہ اکثر گھومنے کے لیے باہر جانے لگے۔ کبھی فلم، کبھی ریستوران تو کبھی لانگ ڈرائیو پھر وہ وقت بھی آگیا جب ان کی قربت، محبت میں بدل گئی اور انہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ شیرازی صاحب نے حسب روایت اس شادی کی مخالفت کی لیکن بیٹی کی ضد کے آگے انہیں ہار ماننا پڑی۔

خلیل بھائی کی تو لاٹری نکل آئی۔ شیرازی صاحب نے جہیز میں دیگر ساز و سامان کے علاوہ انہیں ایک ویل فرنشڈ فلیٹ اور کار بھی دی، اور انہیں اپنی ایک فیکٹری کا مکمل انچارج بنا دیا۔ شیرازی صاحب کے انتقال کے بعد جب جایداد کا بٹوارہ ہوا تو یہ فیکٹری رخسانہ کے حصے میں آئی اور اس طرح خلیل بھائی اس کے مالک بن گئے۔

خلیل بھائی کی کہانی سن کر میرے دل میں امیدوں کے چراغ جل اٹھے اور مجھے یقین ہوگیا کہ ان کی طرح قسمت کی دیوی مجھ پر بھی مہربان ہوسکتی ہے چنانچہ میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ عیش و آرام کی زندگی گزارنے کے لیے میں کسی امیر لڑکی سے ہی شادی کروں گا چاہے اس کے لیے مجھے کتنا ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔

مجھے پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن میں نے یونیورسٹی میں اسی لیے داخلہ لیا کہ وہاں گوہر مقصود ملنے کا امکان زیادہ تھا۔ وہاں کا ماحول کالج سے بالکل مختلف تھا۔ یونیورسٹی میں ہر طرح کے طالب علم تھے۔ امیر، غریب، خوب صورت لڑکیاں، اسمارٹ لڑکے، ذہین اور کند ذہن طالب علم۔ وہاں لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان سے باتیں کرنے اور ان کے ساتھ گھومنے پھرنے کی پوری آزادی تھی لیکن یہاں بھی مجھے طبقاتی فرق نظر آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ لڑکیاں عموماً امیر لڑکوں کو لفٹ کرواتی ہیں اور غریب لڑکوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔

میں نے اس کمی کا یہ حل نکالا کہ پورے زور و شور سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کردیا۔ اسپورٹس، تقریری مقابلے، فنکشنز، جلسے جلوس مظاہرے اور ریلیاں، غرض یہ کہ میں ہر سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا اور اس طرح تھوڑے ہی عرصے میں خاصا مقبول ہوگیا۔ آرٹس لابی اور لائبریری میری سرگرمیوں کا مرکز تھی جہاں میں محفل جمائے بیٹھا رہتا تھا۔ مجھے بہت سارے اشعار یاد تھے جنہیں میں موقع محل کے لحاظ سے پڑھتا اور حاضرین بالخصوص لڑکیوں سے داد وصول کرتا۔ میری کئی لڑکیوں سے دوستی ہوگئی تھی لیکن جس لڑکی کی مجھے تلاش تھی وہ ابھی تک نہیں مل سکی تھی۔

ثمینہ نے بھی میرے ساتھ ہی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا لیکن وہ دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں تھی اس لیے اس سے رہا سہا تعلق بھی ختم ہوگیا۔ البتہ وہ بھی کبھار لائبریری یا کینٹین میں مجھے نظر آجاتی تھی۔ یونیورسٹی کے ماحول کا بھی اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ پہلے کی طرح ریزرو اور الگ تھلگ رہنے والی نظر آئی۔ میں نے اسے کسی لڑکی سے بات کرتے نہیں دیکھا۔ وہ عموماً انہی دو لڑکیوں کے ساتھ رہتی جو کالج میں اس کے دائیں بائیں ہوا کرتی تھیں۔ اب اس نے عبایا پہننا شروع کردیا تھا۔

کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ وہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح مجھ سے بات کرے۔ میرے ساتھ کینٹین جائے یا اپنے کسی کام کے لیے کہے حالانکہ میں نے لڑکیوں سے دوستی کرنے کے لیے جو معیار بنایا تھا۔ وہ اس پر پوری نہیں اترتی تھی۔ کسی غریب لڑکی کے لیے میری دل میں کیا کشش ہوسکتی تھی۔ شاید یہ اس کی بے نیازی اور الگ تھلگ رہنے والا رویہ تھا جس کی وجہ سے میں اس کی طرف مائل ہونے پر

www.PakiBooks.Site

مجبور ہوگیا تھا۔

ابھی پہلا سیمسٹر بھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اس نے اچانک ہی یونیورسٹی آنا چھوڑ دیا۔ ان دنوں یونیورسٹی میں ایک فنکشن ہونے والا تھا اور میں اس کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ منتظمین نے میرے ذمہ کئی کام لگا دیئے جس کی وجہ سے مجھے سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی اسی لیے میرا دھیان کسی اور جانب نہیں گیا۔ فنکشن ختم ہونے کے بعد میں نے اس کی غیر حاضری کو محسوس کیا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید بیماری یا کسی اور وجہ سے وہ یونیورسٹی نہیں آرہی لیکن جب اس کی غیر حاضری طول پکڑ گئی تو مجھے تشویش ہونے لگی میں نے سوچا کہ اس کے ساتھ جو لڑکیاں رہتی ہیں ان سے پوچھوں لیکن میں نے مناسب نہ سمجھا کہ نجانے وہ کیا خیال کریں۔

ایک دن وہ مجھے لائبریری کی سیڑھیوں کے پاس نظر آگئی۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''خیریت تو ہے، بہت دنوں بعد نظر آئیں۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ میں اس سے یوں بے تکلفی سے بات کروں گا پھر آہستہ سے بولی۔ ''میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی ہے۔''

''کیوں!'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''میری شادی ہورہی ہے۔''

''شادی! اتنی جلدی ابھی تو تمہاری پڑھائی بھی نہیں ہوئی۔''

اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ہمارے جیسے گھرانوں میں تعلیم سے زیادہ شادی کی اہمیت ہے اس لیے میرے ماں باپ نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ بھی جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہوجائیں۔''

اس کے بعد میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ بس یونہی شادی کی رسمی سی مبارک باد دی اور اپنے کام سے آگے نکل گیا لیکن نہ جانے کیوں دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی تھی۔ رات کو سونے کے لیے بستر پر لیٹا تب بھی بار بار اس کا خیال آتا رہا۔ مجھے جھنجلاہٹ سی ہونے لگی۔ میں کیوں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں جب کہ میں نے اسے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ سرسری جان پہچان کے علاوہ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا، شاید یہ میرے دل میں چھپا ہوا کوئی چور جذبہ تھا جو مجھے اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کررہا تھا۔

> محبت ایک اقلیم الفت ہے جس کے کئی رنگ ہیں اور ہر رنگ قوس قزح کے رنگوں کی طرح حسین اور دلکش ہے۔ محبت مختلف کیفیات و واردات سے مملو ہوتی ہے جنہیں اس کے موسموں سے عبارت کیا جاتا ہے، ان موسموں میں ہجر و وصال، مسرت و عسرت، حیرت، استعجاب اور سوز و گداز وغیرہ شامل ہیں۔ محبت کے موضوع میں اتنی وسعت ہے کہ دنیا و مافیا کے تمام تر موضوعات اس میں سما سکتے ہیں اور یہ تمام تر موضوعات کا سرنامہ ہے، باقی جذبات و احساسات ذیلی اور معاون نوعیت کے ہیں۔ ان افکار سے مرصع شاعری ہر عہد میں اعتبار و ذوق رہی ہے اور رہے گی۔ یہ تخیلات ہر عہد میں افتخار زریں قرار پاتے ہیں اور ان کی اہمیت مسلمہ و مصدقہ سمجھی جاتی ہے۔ ایسی شاعری ہر رت میں سدا بہار اور تر و تازہ رہتی ہے اگرچہ جدید شعری رویوں میں محبت سے انحراف اور اختلاف کا رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے لیکن اس کی اہمیت کم ہونے کی بجائے مزید نکھر کر سامنے آئی ہے جس سے یہ استخراجی نتیجہ سامنے آیا ہے کہ جواں جذبوں کی اہمیت سے انکار اور فرار ممکن نہیں ہے۔ اکثر و بیشتر شاعرات کا کلام محبت کے حسین احساسات سے مزین ہوتا ہے جس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ نسائی شاعری میں داخلی اظہار بھرپور انداز میں پایا جاتا ہے محبت چونکہ داخلی کیفیت کا نام ہے، کیونکہ محبت کی نمو انسان کے دروں سے ہوئی ہے اس لیے شاعرات کے ہاں رومان نگاری کے وسیع تر امکانات پائے جاتے ہیں۔
>
> اقتباس: شاعرات ارض پاک، از شبیر ناقد

یونیورسٹی کے دو سال بھی گزر گئے۔ اس دوران میں کسی لڑکی کو اپنے جال میں نہیں پھنسا سکا۔ غریب اور متوسط طبقہ کی لڑکیوں کو تو میں نے ویسے ہی اپنی فہرست میں شامل نہیں کیا تھا۔ ان سے دوستی کرکے مجھے کیا ملتا۔ میرے ریڈار پر صرف امیر بلکہ امیر ترین لڑکیاں تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہ تھی جب بھی میں نے ان سے دوستی بڑھانے کی کوشش کی تو۔ مجھے تھوڑی سی کامیابی بھی ہوئی۔ وہ میرے ساتھ گھومتی پھرتیں، مجھ سے اپنے کام کرواتیں اور مجھ سے خوب ہنسی مذاق کرتیں لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے

www.PakiBooks.Site

اتنے قریب نہ آسکی کہ میں اس سے حال دل بیان کرسکتا۔

کبھی کبھی کسی لڑکی کے بارے میں مجھے گمان ہونے لگتا کہ شاید اس کے ساتھ میری دوستی محبت کا روپ دھارتی جارہی ہے لیکن اس وقت مجھے بہت مایوسی ہوتی جب چند روز بعد وہ ہاتھوں میں مہندی رچائے اور انگلی میں انگوٹھی پہنے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ یہ انکشاف کرتی کہ اس کی منگنی ہوگئی ہے اور جب وہ اپنے منگیتر کی خوبیاں بیان کرتی تو میرا دل اندر سے کٹ کر رہ جاتا۔ وہ عموماً کسی وڈیرے، جاگیردار، سرمایہ دار یا کسی اعلیٰ سرکاری افسر کا بیٹا ہوتا۔ جب اس طرح کی دو چار مثالیں سامنے آئیں تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہاں میری دال گلنا مشکل ہے۔ ہر لڑکی خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہے۔ وہ بھلا مجھ جیسے نٹ پونجیے کو کیوں گھاس ڈالے گی۔

میں جان چکا تھا کہ فلموں میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے۔ وہ سب جھوٹ ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ خلیل بھائی قسمت کے دھنی تھے کہ انہیں ایک امیر لڑکی مل گئی ورنہ اس کے علاوہ میں نے کہیں اس طرح کی بے جوڑ شادی ہوتے نہیں دیکھی۔ اس کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اور امیر لڑکی سے شادی کے خواب دیکھتا رہا۔ میرے دماغ میں ایک ہی بات بیٹھ گئی تھی کہ جب خلیل بھائی کو امیر لڑکی مل سکتی ہے تو مجھے کیوں نہیں۔ مجھے اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایک بے وقوف تو ایسی ہوگی جو میری چکنی چپڑی باتوں میں آجائے۔

یونیورسٹی کی تعلیم ختم ہوئی تو لڑکیوں سے ملنے کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ میں سارا دن گھر میں پڑا رہتا یا بائیک لے کر دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے نکل جاتا۔ گھر والوں نے کچھ دن تو برداشت کیا پھر ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ وہ توقع کررہے تھے کہ میں جلد از جلد کوئی ملازمت تلاش کر کے انہیں مالی طور پر سپورٹ کروں لیکن میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر کے کنویں کا مینڈک نہیں بننا چاہتا تھا۔ میرے خیالات بہت اونچے تھے۔ مجھے بہت ساری دولت اور ایک خوش حال زندگی کی آرزو تھی اور اس کی تکمیل کے لیے میں اپنے راستے پر گامزن تھا۔

امی چاہتی تھیں کہ نوکری لگ جائے تو وہ میری شادی کردیں۔ ہر ماں کی طرح انہیں بھی بہو لانے کا بڑا ارمان تھا اور انہوں نے لڑکی بھی ڈھونڈی تھی۔ وہ میری خالہ زاد بہن سیما کو اپنی بہو بنانا چاہ رہی تھیں۔ جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت خوب صورت، سلیقہ مند، سگھڑ اور نیک پروین ٹائپ لڑکی تھی لیکن میں اس سے شادی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ وہ میرے مطلوبہ معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ خالو کی ایک معمولی سی دکان تھی اور ان کے معاشی حالات بھی کم وبیش ہمارے جیسے ہی تھے۔ اس سے شادی کر کے مجھے کیا ملتا۔

میں نے امی سے صاف کہہ دیا کہ فی الحال میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ جب تک میں معاشی طور پر مستحکم نہ ہوجاؤں، شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس پر انہیں بھی غصہ آگیا اور وہ تیز لہجے میں بولیں۔ ”اس طرح گھر میں پڑے پڑے کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی کام دھندا شروع کرو، کبھی کچھ ہوسکتا ہے۔“

میں نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے وعدہ کرلیا اور سنجیدگی سے ملازمت کی تلاش کرنے لگا۔ باقاعدگی سے اخبار میں ضرورت ہے کے اشتہارات دیکھتا اور جو میرے مطلب کی جاب ہوتی۔ وہاں درخواست دے دیتا۔ چند جگہوں پر انٹرویوز بھی ہوئے لیکن بات نہیں بنی۔ دراصل میں ایسی ملازمت کرنا چاہ رہا تھا جس میں بڑے لوگوں تک رسائی ملے اور میں بھی خلیل بھائی کی طرح کسی امیر لڑکی سے تعلق قائم کرنے میں کامیاب ہوجاؤں۔

خدا نے میری سن لی۔ ایک دن میں معمول کے مطابق اخبار میں ضرورت ہے، کے اشتہارات دیکھ رہا تھا کہ میری نظر ایک اشتہار پر گئی۔ کسی اخبار میں رپورٹر کی جگہ خالی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں رپورٹنگ کی طرف نکل جاؤں تو مجھے اعلیٰ سوسائٹی میں تعلقات بنانے کا موقع مل سکتا ہے لیکن صحافت میرا مضمون نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں نے درخواست بھیج دی اور تیسرے دن مجھے انٹرویو کے لیے بلالیا گیا۔

اخبار کے ایڈیٹر نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا جیسے کوئی قصائی بکرے کو دیکھ رہا ہو۔ اس نے فائل میں سے میری درخواست نکالی اور اس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد بولا۔ ”دیکھو میاں! تمہارے پاس صحافت کی ڈگری ہے اور نہ ہی کوئی تجربہ۔ اس کے باوجود میں تمہیں یہ ملازمت دینے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہیں رپورٹنگ کے ساتھ اشتہارات کا بھی کام

www.PakiBooks.Site

کرنا ہوگا۔“

”جی میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”ارے بھئی میں فارسی نہیں بول رہا۔ میں نے کہا کہ تمہیں اخبار کے لیے اشتہار بھی لانا ہوں گے۔“

”لیکن مجھے تو اس کا بھی کوئی تجربہ نہیں۔ یہ تو مارکیٹنگ والوں کا کام ہے۔“

”بس رہنے دو۔ انہیں بھی آزما چکا ہوں۔ صرف ٹائی لگا کر بریف کیس پکڑے اور منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولنے سے اشتہار نہیں ملتے۔ اس کے لیے اپنی انا اور خودداری کو بالائے طاق رکھنا ہوتا ہے۔ کوئی ایک مرتبہ دھتکارے تو دس بار اس کے دروازہ پر جاؤ۔ لوگوں سے تعلقات بنانا ہوتے ہیں۔ ان کے آگے پیچھے پھرنا ہوتا ہے۔ تب کہیں تھوڑی بہت کامیابی ملتی ہے۔“

”یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ شاید میں نہ کرسکوں۔“

”کوئی کام مشکل نہیں ہوتا اگر اسے مشکل نہ سمجھا جائے، تمہیں رپورٹر ہونے کی وجہ سے اعلیٰ سوسائٹی اور سماجی حلقوں میں تعلقات بنانے کا موقع مل سکتا ہے۔ سرکار دربار تک تمہاری رسائی ہوسکتی ہے اور تم ان تعلقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اخبار کے لیے اشتہارات حاصل کرسکتے ہو۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولے۔ ”تم تو جانتے ہی ہو کہ لوگوں میں پڑھنے کا رجحان کم ہوتا جارہا ہے جس کی وجہ سے سرکولیشن کم ہورہی ہے اور ہمیں اخبار کو زندہ رکھنے کے لیے اشتہارات پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے۔ اسی لیے ہم اپنی ٹیم کو وسعت دے رہے ہیں اور تمہیں ملازمت دینے کا مقصد یہی ہے کہ شعبہ اشتہارات کو مضبوط بنایا جائے۔“

رپورٹر کی جانب میں اتنی کشش تھی کہ مجھے ان کی شرط ماننا پڑ گئی لیکن انہوں نے جو تنخواہ بتائی۔ وہ اتنی کم تھی کہ میرا دل اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ مجھے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر وہ بولے۔ ”دیکھو میاں تنخواہ میں اضافہ تمہاری کارکردگی سے مشروط ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں اشتہارات پر کمیشن بھی ملے گا۔ جتنا کام کرو گے۔ اتنی ہی زیادہ آمدنی بھی ہوگی۔“

مجھے کم تنخواہ پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بس میں تو یہ سوچ کر خوش ہورہا تھا کہ رپورٹر بننے کے بعد میں ہر اس جگہ آسانی سے جاسکوں گا جہاں جانے کا میں ابھی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ مثلاً شہر میں ہونے والی بڑی بڑی تقریبات، فنکشنز، فیشن شوز اور پریس کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملے گا۔ بڑے لوگوں سے راہ ورسم بڑھے گی اور اس طرح تعلقات کے بل بوتے پر میں نہ صرف یہ کہ اخبار کے لیے اشتہار حاصل کرسکوں گا بلکہ اپنے بھی بہت سے کام کروا سکوں گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شاید اس طرح مجھے اپنے خواب کی تعبیر مل جائے اور میں کسی امیر لڑکی کو اپنے دام الفت میں اسیر کرسکوں۔

میں نے دوسرے دن سے ہی کام پر جانا شروع کردیا۔ میرے ایڈیٹر فاروقی صاحب بہت اچھے استاد ثابت ہوئے۔ انہوں نے پہلے ہی دن مجھے اپنے پاس بٹھا کر لیکچر دیا اور تفصیل سے سمجھایا کہ مجھے کس طرح اس فیلڈ میں اپنی جگہ بنانی ہے۔ کن لوگوں سے ملنا ہے کن سے تعلقات بڑھانے ہیں اور کن لوگوں سے فائدہ حاصل کرنا ہے۔ انہوں نے مجھے سختی سے تاکید کی کہ بلیک میلنگ سے دور رہو کیونکہ بلیک میلر بہت جلدی ایکسپوز ہوجاتا ہے اور لوگ اس سے کترانے لگتے ہیں۔

میں نے ان کی ہدایات کے مطابق کام شروع کردیا۔ بہت جلد مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ سب اتنا آسان نہیں جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ فیلڈ میں پہلے سے دوسرے اخباروں کے سینئر رپورٹر چھائے ہوئے تھے اس لیے ان کی موجودگی میں میری دال کہاں گلنے والی تھی لیکن میں نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ میرا بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا اس لیے میں قدم بہ قدم آگے بڑھتا گیا پہلے میں دولت کے پیچھے بھاگ رہا تھا لیکن اب پتا چلا کہ دولت سے زیادہ شہرت انسان کے کام آتی ہے۔ ایک دفعہ بندے کو شہرت مل جائے تو دولت خود بخود کھنچی چلی آتی ہے۔ میں عموماً انہی جگہوں پر جاتا جہاں بڑے لوگوں سے ملاقات کا امکان ہوتا۔ میں نے ان لوگوں کے انٹرویوز چھاپنا شروع کردیے جن سے کسی فائدے کی اُمید ہوسکتی تھی۔ اس طرح مجھے اشتہارات ملنے تھے اور بہت جلد میرا کمیشن، تنخواہ سے دگنا ہوگیا۔ اس کے باوجود میں اپنے اصل مقصد سے غافل نہیں تھا۔ مجھے شدت سے اس امیر لڑکی کی تلاش تھی جسے میں اپنی بیوی بنا سکتا۔

ایک دن میں چائے پینے کے ارادہ سے کلفٹن کے ایک پوش ریسٹوران میں داخل ہوا تو بالکل اچانک ہی میری ملاقات ثمینہ سے ہوگئی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اس کا حلیہ ضرور بدل گیا تھا لیکن شکل تو وہی تھی۔ پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ وہی دبلی پتلی مرگھلی ثمینہ ہے جس کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا لیکن اب وہ بالکل

www.PakiBooks.Site

بدل گئی تھی۔ گوری رنگت، نکھرا نکھرا چہرہ، جھیل جیسی گہری آنکھیں، تراشیدہ یا قوتی ہونٹ۔ اس نے جدید طرز کا برانڈڈ سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ کونے کی ایک میز پر بیٹھی اورنج جوس سے دل بہلا رہی تھی۔

ہم دونوں کی نگاہیں ایک ساتھ ملیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دیکھی تو سیدھا اس کے پاس چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تو میرا حوصلہ بھی بڑھ گیا۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم ثمینہ ہی ہو۔''

''تم جیسے لوگ کبھی غلطی نہیں کر سکتے۔'' اس بار اس کی مسکراہٹ پہلے سے زیادہ جاندار تھی۔ ''میں ثمینہ ہی ہوں۔ بیٹھ جاؤ، میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔''

''لگتا ہے کہ تم کسی کا انتظار کر رہی ہو۔'' میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، شاپنگ کے لیے آئی تھی۔ تھک گئی تو سوچا کچھ دیر کے لیے ستا لوں۔'' اس نے جوس کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا لو گے؟''

''چائے۔'' میں نے ساتھ والی کرسی پر رکھے ہوئے کئی شاپنگ بیگز دیکھے تو بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ ''لگتا ہے کہ بڑے ٹھاٹ ہیں تمہارے، جبھی تو اتنی ڈھیر ساری شاپنگ کر ڈالی۔''

اس نے بیرے کو بلا کر چائے کا آرڈر دیا اور آہستہ سے بولی۔ ''شاپنگ تو ایک بہانہ ہے جب گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہوتی ہوں تو شاپنگ کے لیے نکل پڑتی ہوں۔''

''معلوم ہوتا ہے کہ بہت لمبا ہاتھ مارا ہے تم نے۔'' میں نے اس کے لباس رنگ و روپ اور اسٹائل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہت بدل گئی ہو۔ لگتا ہی نہیں کہ وہی کالج کے زمانہ کی ثمینہ ہو۔ کیا کرتے ہیں تمہارے میاں؟''

''بزنس۔'' وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''اور تم تو جانتے ہی ہو کہ ایسے لوگوں کی زندگی کتنی مصروف ہوتی ہے پھر بات بدلتے ہوئے بولی۔ ''لیکن تم بالکل نہیں بدلے۔ بالکل ویسے ہی ہو۔''

بیرا چائے لے کر آیا تو اس نے میرے لیے ایک کپ بنایا اور گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اوہو بہت دیر ہو گئی۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔ تم ایسا کرو کل صبح میرے گھر آ جاؤ۔ تم اپنی کہنا میں اپنی سناؤں گی اور لنچ میرے ساتھ ہی کرنا۔'' اس نے اپنے پرس سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دیا اور بولی۔

''اس پر میرا موبائل نمبر اور گھر کا ایڈریس لکھا ہوا ہے۔''

میں نے دیکھے بغیر وہ کارڈ جیب میں رکھ لیا اور ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں ضرور آؤں گا۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم جیسی خوب صورت عورت کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع مل جائے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گی۔'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

اس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ واقعی وہ بہت بدل گئی تھی۔ کالج میں تو اس نے سیدھے منہ مجھ سے بات نہیں کی تھی اور آج اس نے ایک اتفاقیہ ملاقات کے بعد مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ لگتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے خوش نہیں ہے اور کسی قسم کی نا آسودگی کا شکار ہے۔

دوسرے دن میں وقت مقررہ پر اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ ایک عالیشان کوٹھی تھی۔ گیٹ کے باہر باوردی سیکیورٹی گارڈ متعین تھا۔ اس نے انٹر کام کے ذریعے میری آمد کی اطلاع دی۔ ایک ملازمہ گیٹ پر آئی اور مجھے اپنے ہمراہ کوٹھی کے اندر لے گئی۔ اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور میرے لیے جوس لے کر آ گئی۔

اس ڈرائنگ روم کو دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رپورٹر بننے کے بعد مجھے کئی بڑے لوگوں کے گھروں میں جانے کا اتفاق ہوا لیکن اتنا خوب صورت اور قیمتی ساز و سامان سے مزین ڈرائنگ روم میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ثمینہ بھی آ گئی۔ وہ بڑی نکھری نکھری اور فریش لگ رہی تھی۔

وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی اور بڑی ادا سے سر کے بالوں کو ایک طرف جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''گھر ڈھونڈنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی۔''

''بالکل نہیں۔''

میں نے ڈرائنگ روم پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کہا۔ ''گویا میرا خیال درست نکلا۔ اس کوٹھی اور ڈرائنگ روم کی سجاوٹ دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ واقعی تم نے بہت اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے۔''

''کیونکہ تم میری پچھلی زندگی سے واقف ہو اس لیے اس انداز میں سوچو گے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''لیکن میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گی۔''

میں یقین کر لینا چاہتا تھا کہ ہماری تنہائی میں کوئی مخل

www.PakiBooks.Site

نہ ہو۔ اس لیے پوچھ بیٹھا۔ ''تمہارے علاوہ گھر میں اور کون ہے؟''

''صرف نوکر۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''اور گھر کے دیگر افراد۔''

''میری کوئی فیملی نہیں ہے۔ میں یہاں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہوں۔ وہ ان دنوں کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ویسے بھی ان کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' پھر سانس لے کر بولی۔ ''ٹھہرو! میں تمہیں بتاتی ہوں پھر سب کچھ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میرا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا۔ ہمارے یہاں لڑکیوں کو ایک بوجھ سمجھا جاتا ہے اور ماں باپ ان سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ میں نے جونہی میٹرک پاس کیا۔ امی اور ابا نے بھی میری شادی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ مجھے آگے پڑھنے کا شوق تھا اس لیے میں نے ضد کر کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ ابا نے اس شرط پر مجھے اجازت دی کہ اگر اس دوران میرا کوئی رشتہ آ گیا تو وہ فوراً ہی میری شادی کر دیں گے۔

دو سال خیریت سے گزر گئے اور میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ابا جس فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ اس کے مالک کی پہلی بیوی مر چکی تھی اور وہ دوسری شادی کرنا چاہ رہا تھا لیکن عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے کوئی جوان لڑکی نہیں مل رہی تھی۔ ایک دن اتفاق سے فیکٹری کا منیجر کسی کام سے ہمارے گھر آیا تو اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے واپس جا کر سیٹھ کو نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ وہ فوراً ہی مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو گیا اور اس نے منیجر کے ذریعے ہی مجھے پرپوز کر دیا۔

ابا میں انکار کی جرأت نہیں تھی۔ انہوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ سیٹھ مجھ سے عمر میں تین گنا زیادہ تھا۔ جب میں نے اس رشتہ سے انکار کیا تو ابا میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے مجھے یہاں تک ڈرا دیا کہ اگر میں نے سیٹھ سے شادی نہ کی تو وہ انہیں نوکری سے نکال دے گا بلکہ ان کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے غنڈوں کے ذریعے مجھے اٹھا کر زبردستی نکاح پڑھوا لے۔ اس طرح وہ اس رقم سے بھی محروم ہو جائیں گے جو وہ شادی کی تیاری کے لیے ابا کو دے رہا تھا۔

اپنے گھر والوں کی سلامتی اور عزت و آبرو کی خاطر میں یہ کڑوا گھونٹ پینے پر تیار ہو گئی۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ابا نے شادی کی تیاری کے نام پر سیٹھ سے ایک بڑی رقم وصول کی تھی جب کہ شادی انتہائی سادگی سے ہوئی اور اس میں ان کا کوئی پیسا خرچ نہیں ہوا۔ سیٹھ نے اپنے منیجر کے ہاتھ عروسی جوڑا اور زیورات بھجوا دیئے تھے۔ سیٹھ نے میرے گھر والوں کو اپنی کوٹھی پر بلا لیا تھا۔ اسی ڈرائنگ روم میں میرا نکاح ہوا اور میں رخصت ہو کر اس کے بیڈ روم میں آ گئی۔

اس طرح میری جوانی ایک بوڑھے کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئی۔ میں صبر کے علاوہ کیا کر سکتی تھی۔ یہی سوچ کر میں خاموش ہو گئی کہ یہ بڈھا کتنے دن زندہ رہے گا ایک نہ ایک دن تو اسے مرنا ہی ہے پھر میں آزاد ہو جاؤں گی لیکن یہ مرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس عمر میں لوگوں کو کتنی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں لیکن یہ بالکل صحت مند ہے بس بڑھاپے کی وجہ سے میرے حقوق ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ اسے کوئی بیماری نہیں۔''

''تمہارے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہے؟''

''بہت اچھا، وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ روپے پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں۔ میں اپنے معاملات میں مکمل خود مختار ہوں۔ جہاں دل چاہے جاؤں۔ جتنا خرچ کروں، مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اسے خود بھی اپنی کمزوری کا احساس ہے۔ کہتا ہے کہ وہ اپنا علاج کروا رہا ہے لیکن یہ محض طفل تسلیاں ہیں۔ اس عمر میں وہ کیا خاک ٹھیک ہو گا۔''

''اب تم کیا چاہتی ہو؟''

''تم خود سمجھ سکتے ہو کہ ان حالات میں ایک عورت کیا کر سکتی ہے۔ میں تو پہلے دن سے ہی اس سے طلاق لینے کے بارے میں سوچ رہی ہوں لیکن جانتی ہوں کہ وہ مجھے کبھی بھی طلاق نہیں دے گا۔ میں عدالت کا دروازہ بھی نہیں کھٹکھٹا سکتی کیونکہ میرے اتنے وسائل نہیں اور نہ ہی میں اس کا مقابلہ کر سکتی ہوں لیکن اب مجھ سے یہ تنہائی اور محرومی برداشت نہیں ہوتی۔ آخر میں کب تک اس آگ میں جلتی رہوں گی۔ میں نے کبھی اس سے بے وفائی کے بارے میں نہیں سوچا لیکن اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ اسی لیے جب میں نے کل تمہیں ریستوران میں دیکھا تو ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور میں نے تمہیں اپنے گھر بلانے کی ہمت کر ڈالی۔ تم پہلے شخص ہو جس کے سامنے میں نے اپنا دکھڑا رویا ہے۔ کوئی تو

www.PakiBooks.Site

ہو جس کے کندھے پر سر رکھ کر میں رو سکوں۔''

میں نے فوراً اپنا کندھا پیش کر دیا اور جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔ ''کاش تم مجھے پہلے مل جاتیں تو یہ نوبت نہیں آتی۔ خیر ہم دونوں مل کر اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔''

''ارے ہاں، تم نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں، کیا کر رہے ہو۔ شادی ہو گئی۔ کتنے بچے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔''

''میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ایک اخبار میں رپورٹر ہوں۔ شادی ابھی نہیں ہوئی اس لیے بچے بھی نہیں ہیں۔''

''شادی نہ ہونے کی کوئی خاص وجہ؟'' وہ اشتیاق سے بولی۔

''اس لیے کہ تمہارے بعد تم جیسی کوئی ملی ہی نہیں۔ دراصل تم مجھے شروع سے ہی اچھی لگتی تھیں۔ کئی بار سوچا کہ تم سے دل کی بات کہہ دوں لیکن تم اتنی ریزروڈ ہوا کرتی تھیں کہ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی پھر جب تم نے اپنی شادی کے بارے میں بتایا تو میرا دل بری طرح ٹوٹ گیا۔ مجھے اپنی کم ہمتی پر غصہ آ رہا تھا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس کے بعد میرا کئی لڑکیوں سے واسطہ پڑا لیکن ان میں تم جیسی ایک بھی نہیں تھی۔ گھر والے بھی شادی پر زور دے رہے ہیں لیکن مجھے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی کیونکہ نگاہوں میں تو تمہاری صورت ہی بسی ہوئی ہے۔''

''میں جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ مجھے کبھی اس کا خیال نہیں آیا اور نہ ہی میں نے اس کے بارے میں سوچا۔ دراصل اس سے ملنے اور اس کے حالات جاننے کے بعد میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا تھا اور میں نے اسی پلان کے تحت اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش کامیاب رہی اور وہ شرماتے ہوئے بولی۔ اگر ایسی بات تھی تو اشارتاً ہی تذکرہ کر دیتے۔''

''میں نے کہا نا کہ ہمت نہیں پڑی۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ شاید قدرت نے ہمیں دوبارہ اسی لیے ملایا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں۔''

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ وہ بڈھا مجھے کبھی طلاق نہیں دے گا اور اس کے بغیر ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔''

''اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ ہمیں جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے اگر تم واقعی اپنے شوہر سے چھٹکارا چاہتی ہو تو جیسا میں کہوں وہ کرتی جاؤ۔''

''میں اس قید سے نکلنے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ میرے شانے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے اپنے منصوبے کی ابتدائی کڑیاں جوڑتے ہوئے کہا۔

''گھر میں کتنے نوکر ہیں؟''

''چار، ڈرائیور، خانساماں، مالی اور میڈ۔''

''ان میں سے کون تمہارے شوہر کے زیادہ قریب ہے؟''

''ویسے تو وہ کسی کو منہ نہیں لگاتے لیکن جب وہ یہاں ہوتے ہیں تو ڈرائیور ہی ان کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے میری نظر میں وہی ان کے قریب ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ عام طور پر ڈرائیور ہی اپنے مالک کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔ تمہیں بھی اپنے ڈرائیور سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟''

''ہاں میں شاپنگ وغیرہ کے لیے خود ہی گاڑی لے کر جاتی ہوں۔''

''گڈ! میری بات غور سے سنو، اب میں دوبارہ یہاں نہیں آؤں گا کیونکہ اس طرح تمہارے ملازمین کو شک ہو سکتا ہے۔ ہم کہیں باہر ملا کریں گے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

''نہیں اب میں نے اپنی گاڑی کا اسٹیئرنگ تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے تم جہاں چاہے اسے موڑ دو۔''

میرا تیر نشانے پر تھا۔ میں ثمینہ کو ورغلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب وہ پوری طرح میرے زیر اثر تھی۔ میں اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ تقدیر یکا یک ہی مجھ پر مہربان ہو گئی تھی۔ ثمینہ کی صورت میں ایک سونے کی چڑیا میرے ہاتھ لگ رہی تھی۔ میں اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہ رہا تھا۔ اگر کسی طرح ثمینہ کی اس کے شوہر سے گلوخلاصی ہو جائے تو پھر میں اس سے شادی کر کے عیش و آرام کی زندگی گزار سکتا تھا۔

وہ میری زندگی کا سنہری دور تھا۔ ثمینہ پوری طرح میرے قابو میں آ چکی تھی۔ ہم ہر دوسرے تیسرے روز ملتے، کبھی کسی ریستوران، کبھی پارک تو کبھی ساحل سمندر۔ وہاں

www.PakiBooks.Site

میں دو تین گھنٹے کے لیے کوئی ہٹ کرائے پر لیتا اور اس طرح ہمیں خلوت کے لمحات میسر آ جاتے۔ ایک کروڑ پتی شخص کی بیوی اپنا تن من اور دھن مجھ پر لٹا رہی تھی۔ خیر مجھے تن من کی تو پروا نہیں تھی میرا اصل مقصد تو اس کی دولت پر قبضہ کرنا تھا اس لیے مجھے جلد از جلد کوئی ایسا پلان تیار کرنا تھا جس پر عمل کر کے میں اس سے شادی کر سکوں۔

ثمینہ مجھے بتا چکی تھی کہ اس کا شوہر کبھی بھی طلاق نہیں دے گا اور اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے خلع لے سکے حالانکہ اس کے پاس خلع لینے کی ٹھوس وجہ موجود تھی۔ اسے عدالت میں صرف یہ بیان دینا تھا کہ اس کا شوہر حقوق زوجیت ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر اس کے حق میں فیصلہ ہو جاتا۔ میرے جاننے والوں میں کئی اچھے وکیل تھے۔ میں ان میں سے کسی کو بھی رعایتی فیس پر ثمینہ کا مقدمہ لڑنے کے لیے آمادہ کر سکتا تھا لیکن میں خود ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اگر ثمینہ نے اپنے شوہر سے خلع مانگی تو اسے اس کے شوہر کی دولت اور جایداد میں سے پھوٹی کوڑی بھی نہ ملتی۔ ایسی صورت میں ثمینہ سے شادی کرنا میرے لیے سراسر گھاٹے کا سودا ہوتا۔

ثمینہ کے شوہر کی عمر پینسٹھ سے تجاوز کر چکی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے گا۔ مجھے ثمینہ سے ملتے ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے اور اب مجھ میں مزید انتظار کا حوصلہ نہیں تھا۔ ثمینہ خود بھی اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے بے چین تھی۔ ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''کچھ کرو فرید میں اس کھیل سے تنگ آ چکی ہوں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں اس کے چنگل سے کیسے چھڑاؤں۔'' میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''تمہاری آزادی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ تمہیں طلاق دے دے یا اس کی موت واقع ہو جائے۔ تم کہہ چکی ہو کہ وہ تمہیں طلاق نہیں دے گا۔ اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ اسے دوسرے جہان پہنچا دیا جائے۔''

''یعنی تم یہ کہہ رہے ہو کہ اسے قتل کر دیا جائے۔''

''ہاں۔''

''لیکن یہ کام کون کرے گا؟'' وہ خوفزدہ ہوتے ہوئے بولی۔

''تم!''

''میں؟'' وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں بھلا اسے کیسے قتل کر سکتی ہوں۔''

''بہت آسانی سے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک ایسا زہر دوں گا جس سے انسان فوراً نہیں مرتا بلکہ آہستہ آہستہ اس کی موت واقع ہوتی ہے۔ تم اس کی تھوڑی سی مقدار اس کے کھانے یا چائے میں ملاتی رہنا۔ پندرہ بیس دن میں وہ اللہ کو پیارا ہو جائے گا۔''

''نہیں بھئی، میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ''اوّل تو یہ کہ وہ گھر میں بہت کم رہتا ہے اس لیے باقاعدگی سے زہر دینا ممکن نہیں۔ دوسری بات یہ کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اس کے جسم میں زہر کی موجودگی ظاہر ہو جائے گی اور پولیس سب سے پہلے مجھ پر ہی شک کرے گی۔ نہ بابا پھانسی چڑھنے یا ساری عمر جیل کاٹنے سے بہتر ہے کہ میں اس کی طبعی موت کا انتظار کروں۔''

''اور اگر وہ دس بیس سال مزید زندہ رہا تو۔''

''پھر میری قسمت، میں یونہی گھٹ گھٹ کر زندگی گزار دوں گی۔''

''اچھا۔'' میں نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم اسے قتل نہیں کر سکتیں تو پھر مجھے ہی یہ کام کرنا ہوگا۔''

''میں تمہیں بھی اس کا مشورہ نہیں دوں گی۔ پکڑے گئے تو پھانسی چڑھ جاؤ گے۔''

''تمہاری خاطر میں ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔ ویسے اطمینان رکھو، میرا منصوبہ ہر لحاظ سے فول پروف ہوگا۔''

بظاہر وہ مجھے منع کر رہی تھی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی جلد از جلد اپنے شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے۔ میں نے کئی دن کی سوچ بچار کے بعد ایک محفوظ اور قابل عمل منصوبہ تیار کیا اور اس کی تفصیلات سے ثمینہ کو بھی آگاہ کر دیا کیونکہ اس کے تعاون کے بغیر اس منصوبے پر عمل کرنا ممکن نہ تھا۔

سب سے پہلے مجھے اس کی کوٹھی میں داخل ہونے اور اس کے شوہر کو قتل کرنے کے بعد باہر نکلنے کی پلاننگ کرنا تھی۔ اس کی کوٹھی کے حفاظتی اقدامات خاصے ناقص تھے۔ رات میں گیٹ پر صرف دو سیکیورٹی گارڈ ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک اپنے کیبن میں بیٹھا ہوتا اور دوسرا وقفہ وقفہ

www.PakiBooks.Site

سے باؤنڈری وال کے ساتھ گشت کیا کرتا۔ عقبی دیوار پر خاردار تاروں کی۔ باڑ لگی ہوئی تھی، مجھے اسی راستے سے کود کر کوٹھی میں داخل ہونا تھا۔ کچن کے ساتھ ملازموں کی آمدورفت کے لیے ایک عقبی دروازہ تھا۔ ثمینہ نے اس کی ڈپلیکیٹ چابی مجھے دے دی تھی مجھے اسی دروازہ سے گزر کر اس کے بیڈروم میں جانا تھا۔ واقعے کو ڈکیتی کا رنگ دینے کے لیے میں اس کے شوہر سے تجوری کی چابی مانگتا اور مزاحمت کرنے پر اسے بے آواز ریوالور سے شوٹ کردیتا۔ اس کے بعد مجھے اتنی دیر کچن سے ملحقہ اسٹور روم میں چھپنا تھا۔ جب تک ثمینہ انٹرکام کے ذریعے سیکورٹی گارڈ کو اپنے کمرے میں نہ بلاتی۔ میدان صاف ہونے پر میں گیٹ کے ذریعے باہر نکلتا۔ مین روڈ سے مجھے کوئی ٹیکسی مل جاتی اور میں بخیر وعافیت گھر واپس آجاتا۔

میں نے اس منصوبے کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کیا اور وہ مجھے ہر لحاظ سے محفوظ اور قابل عمل نظر آیا۔ اب مجھے صرف ثمینہ کے فون کا انتظار تھا۔ اس کا شوہر دبئی گیا ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی واپس آتا ثمینہ مجھے اطلاع کردیتی۔ اس دوران میں نے اپنی تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔ چور بازار سے ایک سائیکلسٹ لگا ہوا ریوالور خریدا، سیاہ لباس، سیاہ ہڈ، سیاہ دستانے اور بے آواز جوتے، مجھے سرتاپا سیاہ پوش بن کر جانا تھا تاکہ اندھیرے میں کسی کو نظر نہ آؤں۔

ثمینہ کا فون آیا تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے ہیلو کہا تو وہ خوشی سے چہکتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”نوید! میں آزاد ہوگئی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

”بڈھا مرگیا۔“

”کب کیسے؟“

”وہ کل ہی دبئی سے واپس آیا تھا کچھ پریشان اور الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔ کھانے کے بعد وہ کافی دیر دوسرے کمرے میں کسی سے فون پر بات کرتا رہا۔ اپنے کمرے میں آیا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی کوئی بات نہیں کی اور منہ دوسری طرف کرکے لیٹ گیا۔ رات میں کسی وقت اسے دل کا دورہ پڑا اور اس کی موت واقع ہوگئی۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر پر مردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے فون کرکے ڈاکٹر کو بلایا تو اس نے بھی موت کی تصدیق کردی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے ہائی بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق تھا اور ذرا سی کوئی بات مزاج کے خلاف ہوتو اس کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھ جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ رات میں یہی ہوا ہوگا۔ اس کا فون پر کسی سے جھگڑا ہوا۔ اس کے بعد ہی اس کی طبیعت خراب ہوئی ہوگی۔“

”چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ اللہ نے مجھے جرم کرنے سے بچالیا۔“

”ہاں اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے لیکن تم ابھی محتاط رہنا فی الحال مجھ سے ملنے یا فون کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ لوگ آنا شروع ہوگئے ہیں۔ میں تو کسی کو جانتی بھی نہیں۔ جب مجمع چھٹ جائے گا تو میں خود تمہیں فون کروں گی۔“

مجھے بھی کوئی ایسی جلدی نہیں تھی۔ میرے راستے کا کانٹا ہٹ گیا۔ میرے لیے اس سے زیادہ اطمینان کی بات کیا ہوسکتی تھی۔ اب ثمینہ اس کی دولت اور جایداد کی بلاشرکت غیرے مالک تھی۔ میں نے سوچا کہ عدت ختم ہوتے ہی ثمینہ سے شادی کرلوں گا تاکہ ساری زندگی اس کے پیسے پر عیش کرسکوں۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چوتھے روز ہی ثمینہ کا فون آگیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہ رہی تھی۔ ”میں عدت کی وجہ سے باہر نہیں نکل سکتی اس لیے تم آجاؤ۔ میں اپنے میکے میں ہوں۔“

”کیا مطلب! تمہیں تو اپنے گھر میں ہونا چاہیے تھا۔“

”اب وہ گھر میرا نہیں رہا۔ اس کا بیٹا امریکا سے آگیا ہے۔ اس نے بڑے مہذب انداز میں مجھے گھر سے چلے جانے کے لیے کہا کیونکہ میں عدت ختم ہونے تک وہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ وہ کوٹھی، فیکٹری اور تمام جایداد کا سودا کرکے واپس امریکا چلا جائے گا۔“

”یہ بیٹا کہاں سے آگیا۔“ میرا حلق خشک ہونے لگا۔

”تم نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔“

”مجھے خود یہ بات ابھی معلوم ہوئی ہے۔ تم جانتے ہو مرحوم نے کبھی مجھے اپنے معاملات میں شریک نہیں کیا، تم گھر آجاؤ پھر تفصیل سے بات کریں گے۔“

اب بات کرنے کے لیے کیا رہ گیا تھا۔ میرے سارے خواب جل گئے اگر مجھے معلوم ہوتا کہ شوہر کے مرنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا تو میں کبھی اتنا آگے نہ بڑھتا لیکن اب میرے لیے پیچھے ہٹنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں اس سے شادی کا وعدہ کرچکا تھا اور میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ وہ میری پہلی محبت بھی تو تھی۔

www.PakiBooks.Site

بے وفا

محترم مدیر
السلام علیکم
یہ سرگزشت میرے دوست نثار علی کی ہے لیکن اتنی المناک ہے کہ اسے رقم کرتے ہوئے بھی میں بار بار رویا ہوں۔ یہ بدلتے ہوئے معاشرے کے بہکتے ہوئے قدموں کی چاپ ہے، نئے نئے جوان ہونے والوں کی لغزشوں کی داستان، ان بچوں کی ان کہی داستان جو جذبات کی رو میں بہکنے سے خود کو سنبھالتے نہیں ہیں۔ خود کو تباہ تو کرتے ہی ہیں، ماں باپ کی زندگی بھی تباہ کردیتے ہیں۔

جاوید الحسن
(کراچی)

میں اسے برسوں کے بعد دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

وہ نثار علی تھا۔ ایک مخلص انسان، اپنی بیوی اور بیٹی سے بے انتہا پیار کرنے والا۔ اس کی صرف ایک ہی بیٹی تھی شاداب، جس کو وہ بڑے پیار اور فخر سے گڑیا کہا کرتا تھا اور وہ تھی بھی گڑیا جیسی۔ نرم ونازک خوب صورت۔

نثار علی ہمارے ہی محلے میں رہتا تھا۔ اس کی ایک چھوٹی سی کریانے کی دکان تھی۔ مجھ سے اچھی خاصی سلام دعا تھی۔ میں کبھی کبھی اس کی دکان پر جاکر اس سے گپ شپ بھی لڑایا کرتا تھا۔

وہ ایک حساس اور دردمند دل رکھنے والا انسان تھا۔ اسے ملک کی سیاست اور حالات پریشان کردیا کرتے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”بھائی نثار! تم کن چکروں میں پڑے ہو۔ تمہارے پریشان ہونے سے اس ملک کے حالات نہیں سدھریں گے۔“

”جاوید بھائی کیا کروں دل ہی نہیں مانتا۔“ وہ کہا کرتا۔ ”پتا نہیں کب حالات بدلیں گے۔“

اس کے یہاں جب بچی کی پیدائش ہوئی تو وہ بہت خوش ہوا تھا اور افسردہ بھی ہورہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔ ”جاوید بھائی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے گھر ایک خوب صورت سی بیٹی بھیج دی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دکھ کی بات یہ ہے کہ جمیدہ دوسرے بچے کی ماں نہیں بن سکے گی۔“

”اوہ۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”کیا کوئی مسئلہ ہوگیا ہے؟“

”ہاں مسئلہ ہوگیا ہے۔ اب یہ تو ڈاکٹر ہی جانیں کہ کیا پیچیدگی ہے لیکن انہوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اب ایسا نہیں ہوسکے گا۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ایک بچی آگئی ہے اس کی بہتر پرورش کرو۔ خدا اس کو پورے گھر کے لیے باعث برکت بنادے گا۔“

”ہاں جاوید بھائی اب تو وہی سب کچھ ہے۔“ اس

www.PakiBooks.Site

نے کہا۔ ''بس ہمارے لیے دعا کرتے رہیں۔''

''ایک صبح گلی میں اچھا خاصا شور ہونے لگا۔ میں پریشان ہوکر باہر آگیا۔ بہت سے لوگ جمع تھے نثار ان کے درمیان کھڑا ہوا رو رہا تھا۔ پتا چلا رات اس کی دکان میں چوری ہوگئی ہے۔''

چوروں نے پوری دکان کا صفایا کردیا تھا۔

نثار بے چارہ تباہ ہوگیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے میرے پاس آگیا۔ ''سن لیا جاوید بھائی! میرے ساتھ کیسا ظلم ہوا ہے۔''

''ہاں نثار سن لیا۔'' میں نے اس کے شانے پر تھپک دی۔ ''خدا غارت کرے ایسے لوگوں کو۔''

''میں تو بالکل برباد ہوگیا جاوید بھائی، میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں رہا۔''

''انشاء اللہ خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے، جو شخص پریشان ہوتا ہے حالات اس کو مزید پریشان کیوں کردیتے ہیں۔''

اس کے اس سوال کا جواب میں تو کیا کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا۔

''آپ دکان کی حالت دیکھ رہے ہیں۔'' اس نے دکان کی طرف اشارہ کیا۔ ''کس طرح اس کے تالے توڑے گئے ہیں۔''

واقعی اب اس کی دکان میں کچھ نہیں رہا تھا۔ میرا خیال ہے چور اپنے ساتھ گاڑی لے کر آئے ہوں گے تب ہی وہ سارا سامان اٹھا کر لے گئے تھے۔

''نثار تم نے پولیس کو اطلاع دی۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں جاوید بھائی! اطلاع تو کردی ہے لیکن آپ بھی بتائیں کیا اس کا کوئی فائدہ ہوگا؟''

اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ واقعی کچھ بھی نہیں ہوا۔ بے چارے کی دکان بند ہی ہوگئی۔ اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ اپنی دکان دوبارہ شروع کرسکتا۔

''جاوید بھائی۔'' کچھ دنوں کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ''ہم اس محلے سے جارہے ہیں۔''

''جارہے ہیں، کہاں؟''

''میں نے ایک جگہ نوکری کرلی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ جگہ یہاں سے بہت دور ہے۔ لانڈھی میں ہے۔ نوکری بھی ایک فیکٹری میں ملی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اس علاقے میں کارخانے اور فیکٹریاں وغیرہ ہیں۔ تو میں نے آنے جانے کی پریشانی سے بچنے کے لیے وہیں ایک کوارٹر کرائے پر لے لیا ہے۔''

''نثار بھائی! تمہاری بچی بہت ذہین ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی تربیت اور تعلیم میں کوئی کمی آجائے۔''

''نہیں جاوید بھائی، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' اس نے کہا۔ ''ہم دونوں میاں بیوی زندہ کس کے لیے ہیں، اس گڑیا کے لیے۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے کسی اچھے اسکول میں تعلیم دلواؤں۔''

اس کے بعد نثار ہمارے محلے سے چلا گیا۔ بہت دنوں کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ زندگی ایک ڈھرے پر آگئی ہے۔ وہ اپنی نوکری پر جاتا ہے، حمیدہ گھر سنبھالتی ہے اور گڑیا کا داخلہ شہر کے ایک مہنگے اسکول میں ہوگیا ہے۔ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر اسکول کی فیس اور ویگن کا کرایہ ادا کررہا ہے۔''

''مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ نثار اپنی بچی پر پوری توجہ دے رہا ہے۔

''جاوید بھائی! ہم دونوں میاں بیوی کا اس کے علاوہ اور ہے کون؟'' اس نے کہا۔ ''اس کو دیکھ کر جیتے ہیں، اس کی خوشیاں ہماری خوشیاں ہیں۔ اس کو ذرا سی بھی چوٹ لگے تو گویا ہمیں چوٹ لگتی ہے۔''

''ظاہر ہے وہ تمہاری اولاد ہے۔''

ہم نے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں پھر ایک دوسرے سے رخصت ہوگئے اور اب میں برسوں کے بعد اس کو دیکھ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق کم از کم اٹھارہ بیس سال بعد۔ یہ عرصہ کم نہیں ہوتا۔

وہ بہت بدل گیا تھا لیکن میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس کے ماتھے پر چوٹ کا ایک نشان تھا۔ چاند کی طرح۔ یہ چوٹ اسے بچپن میں لگی تھی۔ میں نے اسی نشان سے اسے پہچانا تھا ورنہ وہ اتنا بدل گیا تھا کہ تعین مشکل تھا۔ آخری ملاقات جو ہوئی تھی اس میں وہ اچھا خاصا صحت مند انسان تھا۔

لیکن اب تو وہ بالکل بوڑھا ہوگیا تھا اگر اس کے ماتھے پر وہ نشان نہیں ہوتا تو میں اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ وہ پھولوں کی ایک دکان سے ایک بکے خرید رہا تھا۔ جب میری نظر اس پر پڑی تو میں نے پہچان لیا کہ یہ وہی تھا نثار علی۔

www.PakiBooks.Site

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نثار! یہ تم ہی ہو نا؟''

وہ چندھیائی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر مجھے پہچان کر گلے سے لگا لیا۔ ''ارے جاوید بھائی۔'' وہ رونے لگا تھا۔

اس کے رونے پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔

''آؤ کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں ذرا یہ بکے لے لوں۔'' اس نے کہا۔

اس نے پھول والے سے بکے لے کر پیسے دیئے اور میرے پاس آگیا۔ ''چلو جاوید بھائی۔''

ہم سامنے ہی ایک ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔ ''خدا کی پناہ ہم کتنے برسوں کے بعد مل رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اٹھارہ بیس برس کے بعد۔''

''ہاں یار! لیکن تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ تم تو اسّی سال کے بوڑھے معلوم ہونے لگے ہو۔''

''ہاں یار۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''وقت نے تو نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔''

''یہ بتاؤ یہ بکے کس کے لیے لے جارہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنی بیٹی کے لیے۔'' اس نے کہا۔

''اوہ کوئی تقریب ہوگی کیسی ہے وہ۔ خیریت سے تو ہے نا؟''

''ہاں شاید خیریت سے ہو۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب!''

''جاوید بھائی میں یہ پھول اس کی قبر کے لیے لے جارہا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں شاک میں آگیا تھا۔ ''اس کی قبر کے لیے؟''

''ہاں جاوید بھائی، میری گڑیا مرچکی ہے۔'' اس نے بتایا۔ اتنا کہہ کر وہ رونے لگا تھا۔

اس کو تو رونا ہی تھا گڑیا جیسی بچی، اس کی اکلوتی اولاد، وہ مرچکی تھی، کس طرح کیا ہوگا اس کے ساتھ۔

بے شمار سوالات میرے ذہن میں تھے۔

میں نے اسے پانی کا گلاس دیا۔ پانی پی لینے کے بعد اس کی حالت کچھ سنبھلی تھی۔

''نثار بھائی تم نے تو یہ خبر سنا کر مجھے صدمہ دے دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کیا کہوں۔''

''ہاں جاوید بھائی ہم دونوں میاں بیوی زندہ کہاں ہیں، ہم تو مر چکے ہیں۔'' نثار نے کہا۔

''لیکن یہ ہوا کیسے۔'' میں نے پوچھا۔ ''گڑیا جیسی لڑکی جس کا مستقبل اتنا شاندار تھا۔ وہ موت کی آغوش میں چلی گئی، کیا بیمار تھی وہ۔''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے جاوید بھائی۔ کسی دن اطمینان سے ملو تو تمہیں سناؤں گا تم میرا موبائل نمبر لے لو۔''

''ہاں نثار بھائی تم موبائل نمبر بھی دو اور اپنا ایڈریس بھی۔ میں تمہارے گھر آؤں گا۔''

''ضرور۔'' نثار نے اپنا موبائل نمبر اور ایڈریس دونوں دے دیئے تھے۔ پھر اس نے کہا۔ ''جاوید بھائی! اب اجازت دو مجھے دیر ہورہی ہے۔ مجھے گڑیا کے پاس پاپوش نگر کے قبرستان میں پہنچنا ہے۔ وہ میرا انتظار کررہی ہوگی۔''

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میں ایسے باپ کو کیا تسلی دے سکتا تھا۔ اس بے چارے کے پاس تو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

☆.....☆

کئی دنوں کے بعد میں اس کے گھر پہنچ گیا۔

لانڈھی میں ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اس کوارٹر کے در و دیوار رو رہے ہوں۔ سب کچھ اداس تھا میں فون کرکے گیا تھا وہ گھر پر ہی تھا۔

وہ مجھے اپنی بیٹھک میں لے آیا۔ چھوٹا سا کمرا، معمولی سا فرنیچر، خالی خالی پن کا احساس ہورہا تھا۔

''اس کمرے کی دیواروں پر گڑیا کی بہت سی تصویریں تھیں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے سب ہٹا دی ہیں۔ میری بیوی جب بھی اس کمرے میں آتی اس کی حالت

رشتے اور راستے زندگی کے دو پہلو ہیں۔ کبھی، کبھی رشتے نبھاتے، نبھاتے راستے کھو جاتے ہیں اور کبھی راستوں میں چلتے، چلتے رشتے بن جاتے ہیں۔ کسی کو رشتے راس آجاتے ہیں اور کسی کو راستے..... فرق بس اتنا ہے راستوں کے دکھ برداشت ہوجاتے ہیں رشتوں کے نہیں..... اپنے رشتوں کا بہت خیال رکھیں، وہ رشتے خون کے ہوں، احساس کے ہوں، مان کے ہوں، اعتبار کے ہوں یا عزت کے۔

مرسلہ: فرحان شیخ، ملتان

www.PakiBooks.Site

غیر ہونے لگتی تھی۔‘‘

’’یہ تم نے اچھا ہی کیا نثار بھائی۔ زخموں کو جتنا کریدیے وہ اتنا ہی ہرا رہتا ہے۔‘‘

اتنی دیر میں اس کی بیوی بھی کمرے میں آگئی۔ نثار نے شاید اسے میری آمد کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ وہ اب ایک بوڑھی عورت ہو چکی تھی جس کے چہرے پر دکھوں کے بہت گہرے سائے تھے۔

وہ میرے سامنے کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

مجھے اس سے تعزیت کرنی تھی لیکن ایسی ٹوٹی ہوئی عورت سے کیا تعزیت کرتا جس کا سب کچھ لٹ چکا ہو۔ اس سے تعزیت کہاں ہو سکتی ہے؟

پھر بھی میں نے دو چار جملے بہ مشکل ادا کیے۔ وہ روتی رہی ... پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔ نثار بھائی بھی مجھ سے اجازت لے کر اندر چلا گیا تھا۔ وہ اسے چپ کرانے گیا تھا۔

کچھ دیر بعد واپس آیا تو ایسا لگا جیسے اندر جا کر خود بھی روتا رہا ہو اور اب منہ دھو کر میرے پاس آگیا تھا۔

’’جاوید بھائی میری گڑیا بہت اچھی تھی۔‘‘ نثار نے کہا۔ ’’بہت پیاری اور بہت ذہین۔ ہم دونوں اس کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے کیونکہ اس کے علاوہ ہمارا کوئی نہیں تھا۔‘‘

’’ہاں نثار بھائی یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔‘‘

’’بچپن ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے آگے چل کر کچھ نہ کچھ ضرور بننا ہے۔ وہ جس اسکول میں پڑھتی تھی اس اسکول میں بھی اس کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ساری ٹیچرز اس سے خوش رہا کرتیں۔ میں نے شاید یہ بتایا تھا کہ میں نے اسے ایک مہنگے اسکول میں داخلہ دلوا دیا تھا۔‘‘

’’ہاں یہ تم نے بتایا تھا۔‘‘

’’اس اسکول میں امیروں کے بچے آیا کرتے۔ بڑی بڑی گاڑیوں میں اور جو ویگن میں آتے تھے وہ بھی اچھے علاقوں سے آتے تھے اور ان کی حالت حقیقتاً مجھ سے بہت بہتر ہوگی لیکن میں نے گڑیا کو سمجھایا تھا۔ ’’دیکھو بیٹا تم کسی بھی حال میں احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہونا۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے باپ کے پاس پیسا نہیں ہے لیکن وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے تم اپنی ذہانت سے اسکول والوں پر چھا جانا پھر سب تمہاری قدر کریں گے۔ چاہے تمہارے پاس کچھ ہو یا نہ ہو۔‘‘

میں اس لٹے ہوئے انسان کی باتیں سنتا رہا۔ کتنا گہرا کرب تھا اس کی باتوں میں۔ اس نے جس کو یہ سب کہا تھا وہ اب منوں مٹی کے نیچے سو رہی تھی۔ کیا زندگی ہے اور کیا زندگی کے کھیل ہیں۔

’’میں جب کبھی بھی اس کے اسکول جاتا، اسکول والے اس کی تعریفیں کیا کرتے تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔ عمر بھر کا احساسِ محرومی ذرا سی دیر میں ختم ہو جاتا تھا۔‘‘

اس دوران اس کی بیوی ہمارے لیے چائے لے آئی تھی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔ وہ ٹرے رکھ کر چلی گئی۔ چائے کے ساتھ کچھ بسکٹ وغیرہ بھی تھے۔

’’نثار بھائی! ان چیزوں کی کیا ضرورت تھی۔‘‘ میں نے پوچھا۔

’’جاوید بھائی! آپ اتنے برسوں بعد آئے ہیں۔‘‘ اس نے کہا۔

’’لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ کن حالات میں آیا ہوں۔‘‘

’’بھائی! سب چلتا ہے، آخر ہم دونوں بھی تو زندہ ہیں ناں، ہمیں تو موت نہیں آئی ہے۔ ہم بھی چائے پیتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں، سب کچھ کرتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے تھے۔

کچھ دیر بعد اس نے خود کو سنبھال کر بتانا شروع کیا۔

’’جو کچھ ہم سے ہو سکتا تھا ہم اس کے لیے کر رہے تھے ہم نے اسے کبھی مایوس نہیں ہونے دیا۔ میں یہ چاہتا ہی نہیں تھا کہ میری بچی میں کبھی بھی احساسِ کمتری پیدا ہو۔ ایک بار اس کے اسکول کے ایک دوست کی برتھ ڈے تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ’’بابا میری دوست کی برتھ ڈے ہے اس نے مجھے بلایا ہے۔‘‘

’’تو ضرور جاؤ بیٹا۔‘‘

’’بابا کسی پارٹی میں جانے کے لیے تو میرے پاس ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔‘‘

’’کوئی بات نہیں بیٹا چلو میرے ساتھ پسند کر لینا پھر میں دلا دوں گا۔‘‘

میں اسے لے کر مارکیٹ آگیا تھا۔ اس نے ایک ڈریس پسند کر لیا۔ جس کی قیمت دو ہزار تھی۔ اب میرے پاس پیسے کہاں تھے جو میں اس کو وہ ڈریس دلوا سکتا۔

’’بابا مجھے تو یہی پسند آیا ہے۔‘‘ اس نے کہا۔

’’کوئی بات نہیں کل خرید لوں گا۔‘‘

وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بابا اس سے

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

جو وعدہ کرتا ہے وہ ضرور پورا کرتا ہے۔

میں دوسری شام کو اس کے لیے وہ ڈریس لے آیا تھا۔ میری بیوی کو معلوم تھا کہ میرے پاس پیسے بالکل بھی نہیں ہیں اور میں کسی سے قرض بھی نہیں لے سکتا اس لیے وہ میرے پیچھے پڑ گئی۔

''بتائیں نا آپ کے پاس کہاں سے پیسے آئے؟''

''ارے بھائی میں نے اپنے کسی دوست سے لے لیے تھے۔'' میں نے بہانہ بنایا۔

''میں مان ہی نہیں سکتی۔''

''وہ کیوں۔''

''اس لیے کہ آپ کو قرض لینے کی عادت ہی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

بہر حال میں نے اسے بتا دیا کہ میں نے اپنا خون بیچا تھا۔ وہ یہ سن کر سکتے میں آ گئی تھی۔ ''کیا کہہ رہے ہیں، آپ نے گڑیا کے سوٹ کے لیے اپنا خون بیچ دیا۔''

''ارے بابا! اس میں ایسی کون سی بات ہو گئی اور ویسے بھی ڈاکٹر حضرات کہتے ہیں کہ چھ مہینے میں ایک بار خون ضرور نکلوانا چاہیے۔''

''نثار بھائی۔ تم نے تو کمال کر دیا۔'' میں نے کہا۔ اس کی داستان سن کر دل پر اثر ہونے لگا تھا۔

''ارے جاوید بھائی، اولاد کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے اور وہ تو ہماری امیدوں کا دیا تھی۔ اس کے لیے نہیں کرتا تو پھر کس کے لیے کرتا۔''

''تم نے اسے بتایا تھا میرا مطلب ہے اپنی بیٹی کو۔'' میں نے پوچھا۔

''ارے نہیں اگر اس کو بتاتا تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتی اور شاید پارٹی میں نہیں جاتی اور میں یہ نہیں برداشت کر سکتا۔ اس چھوٹے سے گھر میں اس بے چاری کے لیے خوشیاں ہی کتنی تھیں۔ بس دکھ ہی دکھ تھے۔ مفلسی تھی ایک لمحے کی خوشی مل رہی تھی تو میں کیسے گزارا کرتا کہ وہ اس خوشی سے محروم رہے۔''

''نثار بھائی تم نے اپنے آپ کو ایک عظیم باپ ثابت کر دیا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ دنیا کا ہر باپ ایسا ہی ہوتا ہے۔'' نثار نے کہا۔

''ہاں شاید ایسا ہی ہے۔''

''اس کے بعد یہ ہوا کہ وہ بہت کامیابی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ بچپن ہی سے اس کا ایک شوق تھا ڈاکٹر بننے کا۔ وہ مجھ سے کہا کرتی۔ بابا جب میں ڈاکٹر بنوں گی نا تو پھر آپ کا علاج کروں گی۔''

''لیکن بیٹا میں بیمار تو نہیں ہوں کہ میرا علاج کرو گی۔''

''اوہو! آپ سمجھ نہیں رہے، میرا مطلب ہے کہ جب آپ بیمار ہوں گے تو آپ کا علاج کروں گی۔''

''اچھا بیٹا پھر تو تمہارے لیے بیمار ہونا پڑے گا۔''

ہم اس قسم کی باتیں کیا کرتے۔ زندگی مفلسی کے باوجود بہت خوب صورت تھی۔ پھر یہ ہوا کہ گڑیا نے بہت ہی شاندار کامیابی حاصل کی۔ میٹرک میں فرسٹ آئی تھی۔ صوبے بھر میں اس کی تیسری پوزیشن تھی۔ جاوید بھائی کیا آپ ہماری خوشیوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر بننے کی منزل کی طرف۔''

''یعنی گڑیا نے پری میڈیکل گروپ لیا ہوا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، یہ اس کی خواہش تھی اور اس کو پورا کرنے کے لیے رات دن محنت کیا کرتی۔ اس طرح اس نے انٹر میں کامیابی حاصل کر لی۔ اچھے سے اچھے میڈیکل کالج میں اس کا داخلہ ہو سکتا تھا اور ہوا بھی یہیں اس کو کراچی کے سب سے اچھے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔''

اس وقت نثار کا چہرہ دمک اٹھا۔ جیسے وہ گڑیا ابھی اس کے سامنے ہی ہو اور میڈیکل کالج میں داخلے کی خوش خبری لے کر باپ کے پاس آئی ہو۔

''اس نے یہ خوش خبری دینے کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ ایک لاکھ بیس ہزار کا خرچا ہے، ایڈمیشن کے لیے درکار ہے۔ جاوید بھائی وہ ایک طرف بے انتہا خوش تھی تو دوسری طرف مجھے انتہائی پریشانی بھی تھی۔''

''ظاہر ہے پریشان تو ہونا ہی تھا۔''

''جاوید بھائی وہ رو رہی تھی اور اس کے آنسو میرے دل پر گر رہے تھے۔ منزل کے اتنے قریب آ کر واپسی تو نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم نے اسی دن کے تو خواب دیکھے تھے۔ اب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہمت ہار کر واپس چلی جاتی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم فکر مت کرو خدا نے چاہا تو کہیں نہ کہیں سے بندوبست ہو ہی جائے گا۔''

''بابا! میں دوسرے کالج میں داخلہ لے لیتی ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''وہاں پیسے نہیں لیں گے۔''

''نہیں بیٹا! یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ تم اس طرح محروم رہ جاؤ، تمہارا بابا ابھی زندہ ہے وہ ہر حال میں تمہیں داخلہ دلوائے گا۔ میری بیٹی ڈاکٹر بنے گی پھر میرا علاج کرے گی۔''

''لیکن جاوید بھائی! ایک لاکھ بیس ہزار کی رقم بہت زیادہ تھی۔ مجھ جیسا آدمی کہاں سے اتنے پیسے لے کر آتا۔ پھر بھی میں نے اپنے طور پر کوششیں شروع کر دیں، فیکٹری میں بات کی، دوستوں سے ملا، جاننے والوں سے ملا لیکن اتنی رقم کا بندوبست نہیں ہو سکا۔''

''نثار بھائی تم کو میرا گھر معلوم تھا، میرے پاس آ سکتے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''پھر ہم دونوں مل کر کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے۔''

''ہاں جاوید بھائی، ایسا ہو سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ بہر حال میں اپنی کوششیں کرتا رہا اور ایڈمیشن ختم ہونے کی آخری تاریخ بھی قریب آ گئی پھر میں نے گڑیا کو مایوس نہیں ہونے دیا۔ ایک لاکھ بیس ہزار کا بندوبست کر ہی دیا تھا۔''

''یہ بندوبست کہاں سے کر دیا تھا نثار بھائی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے اپنا ایک گردہ بیچ دیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''کیا!'' یہ سن کر مجھے ایک جھٹکا لگا تھا۔ ''اپنا گردہ بیچ دیا تھا۔''

''ہاں جاوید بھائی، گڑیا کے خوابوں کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اگر یہ نہیں ہوتا تو خود سوچو۔ اس کا کیا حال ہوتا اور ویسے بھی ایک گردہ جانے سے انسان مرتا تو نہیں ہے۔ دیکھ لو میں تمہارے سامنے زندہ بیٹھا ہوں۔''

میں حیرت اور دکھ سے اس باپ کو دیکھ رہا تھا جو ایک عظیم آدمی تھا۔ جس نے اپنی اولاد کے لیے بے مثال قربانیاں دی تھیں۔ وہ سیدھا سادا نثار بھائی اس وقت بہت بڑا ہو گیا تھا۔

''جاوید بھائی، تم سوچ نہیں سکتے کہ پیسوں کا بندوبست ہو جانے کی خبر سن کر گڑیا کتنی خوش ہوئی تھی وہ بار بار مجھے پیار کیے جا رہی تھی۔'' ایک ہفتے تک گھر سے باہر رہنے کی میری غفلت بھی اس نے بھلا دی تھی۔ صرف بیوی نے ایک بار کہا تھا کہ حیدر آباد میں ایسا کون سا عزیز ہے جس کے پاس گئے تھے۔

www.PakiBooks.Site

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: مرزا شہر عباس فون نمبر: 0301-2454188

سرکولیشن مینجر ..... سید منیر حسین 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

www.PakiBooks.Site

''کیا تم نے گھر والوں کو بتایا تھا کہ تم نے اپنا گردہ بیچ کر پیسوں کا بندوبست کیا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں میں نے یہ بات چھپا لی تھی۔ صرف میری بیوی کو معلوم ہو گیا تھا اور وہ بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ میں نے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ کسی بھی حال میں گڑیا کو معلوم نہ ہو پائے، ورنہ وہ ڈسٹرب ہو جائے گی اور پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگے گا۔''

''نثار بھائی! تم نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ارے یہ سب عام باتیں ہیں۔ اولاد کے لیے تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ خدا نے اولاد کا بھی کیا رشتہ بنایا ہے۔ محبتوں کے سارے راستے اس کی طرف جاتے ہیں۔ خیر تو پھر یہ ہوا کہ کالج میں پڑھائی کا اس کا ایک سال بھی کامیابی سے گزر گیا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی شاندار کامیابی حاصل کی تھی۔''

''ہاں مجھے اندازہ تھا کہ وہ ایسی ہی ثابت ہو گی۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے اس کے بچپن ہی میں اسے دیکھ کر یہ اندازہ کر لیا تھا۔''

''جاوید بھائی تم سوچ نہیں سکتے کہ میں اس دن کتنا خوش تھا۔ جب وہ اپنے کچھ ساتھیوں کو ہمارے گھر لے کر آئی تھی۔ وہ سب اس کے ساتھ کے میڈیکل کے اسٹوڈنٹ تھے۔ سب ڈاکٹر بننے جا رہے تھے۔ سب کا مستقبل بہت روشن تھا۔ وہ سب امیر گھرانوں کے بچے بچیاں تھیں لیکن ہمارے گھر آئی تھیں۔ ہم دونوں میاں بیوی نے ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں رکھی تھی۔''

''ہاں نثار بھائی۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم نے ان مہمانوں کے لیے کیا کچھ نہ کیا ہو گا۔'' میں نے کہا۔

''اس کے بعد یہ ہوا کہ میں فیکٹری میں اوور ٹائم کرنے لگا تاکہ زیادہ سے زیادہ پیسے کما کر لا سکوں اور گڑیا کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ تم تو جانتے ہو کہ میڈیکل میں ہر بڑھتا ہوا سال پچھلے سال سے زیادہ خرچ لے کر آیا کرتا ہے۔ دنیا بھر کی چیزیں لانی پڑتی ہیں۔''

''ہاں بھائی یہ میں جانتا ہوں۔''

''پھر یہ ہوا کہ وہ آخری سال میں آ گئی۔ اس دن اس کے تیسرے سال کا رزلٹ تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اس سال بھی ہمیشہ کی طرح کامیابی حاصل کر لے گی۔ اس کے بعد پھر چوتھا سال۔ پھر پریشانیاں ختم لیکن جاوید بھائی پر پریشانیاں تو ختم نہیں ہوئیں وہ خود ختم ہو گئی۔''

''لیکن کیسے!'' میں چیخ اٹھا۔ ''وہ کیسے مر گئی۔''

''اس نے خودکشی کر لی تھی جاوید بھائی۔'' نثار نے بتایا۔

''کیا! خودکشی کر لی تھی؟''

''ہاں جاوید بھائی خودکشی، جان دے دی تھی اس نے۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ تیسرے سال ناکام ہو گئی ہو گی۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوا، اس نے تو بہت شاندار کامیابی حاصل کی تھی۔''

''تو پھر کیا ہوا تھا؟''

''اس نے کسی لڑکے کی بے وفائی سے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کی تھی۔'' نثار نے بتایا۔ ''ہم لوگوں کو تو اس بات کا علم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ بے وقوف کسی ایسے لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے جو اس کو دھوکا دے گا بس وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکی اور اس نے جان دے دی۔''

نثار کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ کمرے میں ایک گہری سوگواری کی سی کیفیت تھی۔ میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اس بے چارے پر کیا قیامت گزر گئی تھی۔

کچھ دیر بعد نثار نے کہا۔ ''دو سال ہو گئے ہیں، میں ہر منگل کو اس کی قبر پر جاتا ہوں، کیونکہ وہ منگل ہی کے دن ہم سے جدا ہوئی تھی۔ آج بھی منگل ہے۔ میں ابھی وہیں جا رہا ہوں کیا تم بھی میرے ساتھ چلو گے؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''میں اس کی قبر پر نہیں جاؤں گا۔ برا مت ماننا نثار بھائی، تمہاری بیٹی اس قابل ہی نہیں تھی کہ اسے یاد بھی کرنا چاہیے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو جاوید بھائی۔''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اس لڑکی نے اس کے لیے جان دے دی جس نے اسے دھوکا دیا اور جنہوں نے زندگی بھر اس کا ساتھ نبھایا اس کو ایک اعلیٰ مقام تک لے کر گئے ان کے لیے وہ زندہ بھی نہیں رہ سکی۔''

نثار نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ میں اسے اس حال میں چھوڑ کر اس کے کوارٹر سے باہر آ گیا۔ اب خدا جانے وہ کہاں ہو گا۔ کس حال میں ہو گا۔

www.PakiBooks.Site

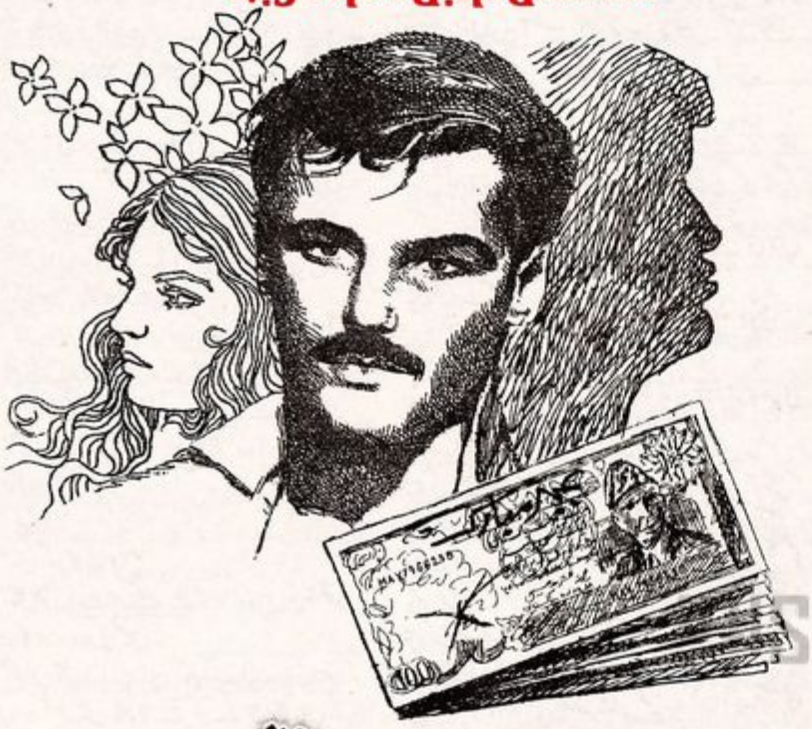

حق

مکرمی مدیر
السلام علیکم!
ایک سچ بیانی ارسال خدمت ہے۔ شہزاد تو ایک سیدھا سادہ بندہ تھا اسے اس کے اپنوں نے ہی ستا رکھا تھا۔ موجودہ حالات میں، بگڑے معاشرے میں اپنوں کا خون کس طرح سفید ہو چکا ہے اس کی ایک چھوٹی سی جھلک صرف آئینہ دکھانے کو کہ اگر کوئی حق غصب کر لے اور حق دار خاموش رہ جائے تو کیا ہو سکتا ہے۔ شہزاد کی بیوی اگر یہ ڈراما سیٹ نہ کراتی تو شہزاد اسی طرح گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتا رہتا۔ اُمید ہے قارئین کو یہ کاوش پسند آئے گی۔

اعتزا زسلیم وصلی
(تاندلیا نوالہ۔ فیصل آباد)

گھر میں داخل ہوتے ہی اسے اپنے چھوٹے بیٹے کی چیخ سنائی دی۔

''یا اللہ خیر، اسے کیا ہوا؟'' وہ بڑبڑاتا ہوا اندر کی جانب لپکا۔ کمرے سے باہر نکلتا ہوا منا دکھائی دیا۔

''کیا ہوا منے؟'' اس نے جھک کر منے کو گود میں اٹھا لیا۔

''مما نے مارا ہے۔'' منے نے روتے ہوئے شکایت لگائی۔

''تو آپ انہیں تنگ کیوں کرتے ہیں۔'' اس نے منے کے گال کو چوما۔

''میں نے تنگ نہیں کیا، مما غصہ زیادہ کرتی

www.PakiBooks.Site

ہیں۔'' منے نے شکایت جڑ دی۔

''تو بیٹا ان کی طبیعت خراب رہتی ہے اس لیے، اب آپ جاؤ باہر بہن کے ساتھ کھیلو۔'' اس نے منے کو نیچے اتارا اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی سکینہ پر نظر پڑی جو چارپائی پر لیٹی تھی۔

''آ گئے آپ۔'' اس کی آواز میں کمزوری نمایاں تھی۔

''ہاں، طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے ہاتھ تھام لیا۔

''بہتر ہوں۔'' سکینہ نے ہاتھ چھڑا لیا۔

''کیا ہوا؟ کچھ ہوا ہے کیا؟''

''نہیں، یوں ہاتھ مت تھاما کرو، پتا بھی ہے ٹی بی ہے مجھے، تم بچ کے رہو۔'' اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''ایسے کچھ نہیں ہوتا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''شہزاد ایسا کب تک چلے گا؟'' وہ آج کچھ زیادہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔

''کیسا؟''

''یہی، گھر کا نظام؟''

''چل تو رہا ہے اور کیسے چلے گا؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا جو زرد ہو گئی تھیں۔

''کہاں چل رہا ہے؟ پورا ماہ ایک ایک روپیا بچا کر رکھتے ہیں اور آخر میں پھر فاقے کرنے پڑتے ہیں، آج سب ختم ہوا پڑا ہے۔ پھر ساتھ میری بیماری اور بچوں کے اسکول کا خرچ؟ رانی کا اسکول چھڑوا لیا ہے مگر منا اور حماد تو جاتے ہیں۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''مجھے بتاؤ سکینہ میں کیا کروں؟'' وہ جھنجلا گیا۔

''آپ کچھ کرنے کے قابل ہوتے تو ہم یوں غربت کی چکی میں نہ پس رہے ہوتے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس نے ہاتھ چھوڑ کر غصے سے اسے دیکھا۔

''وہی جو آپ سمجھ رہے ہیں، بھائیوں نے آپ کو جایداد میں حصہ نہ دیا، آپ چپ رہے، حویلی کا کمرا چھین لیا، آپ چپ رہے، آپ بزدل ہیں پہلے دن سے، ڈرپوک ہیں آپ، کچھ کر نہیں سکتے، میں بیمار نہ ہوتی تو آج گھر میں یہ فاقوں کی نوبت نہ آتی، گھروں میں کام کرتی، برتن دھوتی مگر اپنے بچوں کو بھوک سے مرنے نہ دیتی۔'' سکینہ کی کہی ہر بات سچ تھی۔ وہ بس غصہ کر سکتا تھا مگر کہہ کچھ نہیں سکتا تھا۔ خلاف معمول اس نے غصہ بھی نہیں کیا۔ خاموش رہا۔ بالکل خاموش۔ سکینہ نے کروٹ بدلی اور منہ چھپا کر رونے لگی۔ قسمت میں رونا لکھا تھا اسے رونا ہی تھا، ساری زندگی۔ شہزاد کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔ ایک جھٹکے سے اٹھا اور بیرونی دورازے کی جانب چل دیا۔

☆.....☆

شہزاد نصیر کے حالات ہمیشہ سے ایسے نہ تھے۔ وہ شوخ اور زندہ دل نوجوان تھا جس کو پریشانی کبھی چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے پرائیویٹ اسکول جوائین کر لیا حالانکہ نصیر نے چھوٹے بیٹے کو بہت سمجھایا۔

''یہ چند پیسوں کی نوکری ہے، میں دکان بنا دیتا ہوں اپنا کام کر، اسے چھوڑ۔'' مگر وہ کہاں ماننے والا تھا۔ جوان خون تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد باپ نے لاڈ سے پالا تھا اور سب سے چھوٹا ہونے کا اضافی فائدہ بھی حاصل تھا۔ زندگی نے پلٹا کھایا۔ کینسر نصیر کی بوڑھی ہڈیوں کو نگل گیا۔ قبرستان میں ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا اور زندگی واپس اپنی سڑک پر رواں دواں ہو گئی۔ شہزاد کے دو بڑے بھائی تھے، عباد اور فواد۔ دونوں میں خوب بنتی تھی۔ شادی بھی ایک ہی گھر میں ہوئی تھی۔ شازیہ اور نازیہ سے۔ نصیر کے مرنے کے دو سال بعد انہوں نے شہزاد کی شادی کا فیصلہ کیا۔ سکینہ ان کی پھپھو کی بیٹی تھی۔ معصوم صورت، زبان کی تیز مگر دل کی بہت اچھی۔ شہزاد اسے پسند کرتا تھا۔ دونوں خاندانوں میں کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ یوں سکینہ دلہن بن کر اس کی زندگی میں آ گئی اور ہر طرف بہار کا موسم آ گیا۔ شہزاد میں بھی رفتہ رفتہ تبدیلی آ رہی تھی۔ اب وہ مجبور ہوتا جا رہا تھا۔ حماد کی پیدائش ہوئی اور ان کا گھر مکمل لگنے لگا۔ عباد کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی جبکہ فواد کی دو بیٹیاں تھیں۔ گھر میں بچوں کا خوب شور رہتا تھا۔ حماد کے بعد رانی پیدا ہوئی تب شہزاد کو احساس ہوا کہ اس کے جیسے میں آنے والا گھر کا یہ ایک کمرا ضرورتوں کے حساب سے قطعی ناکافی ہے۔ سکینہ نے دبے لفظوں میں یہ بات کی مگر شہزاد چپ رہا۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا مگر اس رات جیسے شہزاد پر حقیقت کھلی۔ فواد اور عباد ان کے کمرے میں آئے تھے۔ اس نے نازیہ کو چائے لانے کا کہا۔

''چائے کی ضرورت نہیں شہزاد، ہم تم سے ضروری بات کرنے آئے ہیں۔'' فواد نے سر ہلایا۔

''جی بھائی حکم کریں۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

www.PakiBooks.Site

''بات یہ ہے شہزاد۔'' عباد نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''تم دیکھ رہے ہو یہ حویلی اب ہمارے خاندان کے حساب سے چھوٹی پڑتی جا رہی ہے۔''

''جی یہ بات تو میں بھی کرنے والا تھا۔'' وہ خوش ہوا۔ اس کو گمان تھا کہ شاید بھائیوں کو اس کے حالات پر رحم آ گیا ہے مگر ان کی اگلی بات سن کر اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

''ہم چاہتے ہیں تم اب اپنا کوئی انتظام کر لو۔'' عباد نے بات مکمل کی۔ وہ حیران رہ گیا۔

''کک کیا مطلب بھائی؟'' وہ ہکلایا۔ سکینہ خود شاک میں تھی۔

''ہاں شہزاد، میں نہیں چاہتا کل کو ہمارے بچے بڑے ہو کر ایک دوسرے سے لڑیں، یہ حویلی ابو نے میرے اور عباد کے نام کی ہے، اس لیے تم اپنا الگ گھر لے لو۔'' فواد نے حتمی لہجے میں کہا اور وہاں سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہ لو، جائیداد میں تمہارا حصہ۔'' اس نے جیب سے ہزار کے چند نوٹ نکالے اور اسے پکڑا دیے۔

کیا مذاق تھا۔ لاکھوں روپے کی حویلی، ابو کا اپنا کاروبار اور اس کا حصہ؟ صرف چند ہزار۔ نازیہ اور شازیہ کو سکینہ پسند نہیں تھی۔ اسی وجہ سے شہزاد پر یہ دن آیا تھا۔ دوسرے دن وہ اپنا سامان سمیٹ کر کرایے کے اس مکان میں آ گئے جو دو چھوٹے چھوٹے کمروں، واش روم اور باورچی خانے پر مشتمل تھا۔ اس کا کرایہ تقریباً شہزاد کی تنخواہ کے برابر تھا مگر مالک مکان اس کا دوست تھا اور اس نے آدھے کرایے پر اسے مکان دے دیا۔ یوں زندگی کی گاڑی چل نکلی۔ راستے طے ہوتے گئے مگر منزل ابھی بہت دور تھی۔ حماد اور رانی کے بعد منے کی پیدائش ہوئی جس کا اصلی نام جنید تھا مگر پیار سے سب منا کہتے تھے۔ منا ابھی ایک سال کا ہوا تھا کہ سکینہ کو ٹی بی کا مرض لاحق ہو گیا۔ گورنمنٹ اسپتالوں میں اس کا علاج مفت ہے مگر مریض کے لیے پھل اور خوراک ضروری ہوتے ہیں جو کہ یقیناً شہزاد نہیں لا سکتا تھا۔ سکینہ بستر کو لگ گئی اور گھر میں بچوں کی آواز کے علاوہ اگر کوئی آواز آتی تھی تو سکینہ اور شہزاد کے لڑنے کی۔ فواد اور عباد آخری بار منے کی پیدائش پر آئے تھے۔ سکینہ کے ماں باپ نہیں تھے البتہ ایک بھائی تھا جو دوسرے شہر میں جاب کرتا تھا۔ وہ دونوں زندگی سے جنگ کرنے میں مصروف تھے اور زندگی فتح ہونے کا نام بھی نہیں لے رہی تھی۔ اس دن بھی شہزاد لڑ کر مسجد میں آ گیا۔ وضو کیا اور خدا کے سامنے جھک کر مشکلوں سے نجات کی دعا مانگنے لگا۔ خدا تو سب کا ہے۔ اس کی بات بھی ضرور سنے گا۔

☆.....☆

اسکول سے واپس آ کر اس نے سکینہ کو آواز دی۔

''سکینہ، کھانے کو کچھ ہے؟''

''ہاں، چکن روسٹ کیا ہے اور بریانی بنا رہی ہوں، میٹھے میں کیا کھائیں گے؟'' سکینہ کی آواز میں کاٹ تھی۔

''سیدھی طرح بولو بکواس نہ کرو، نہیں ہے، تو طنز لازمی ہے کیا؟'' اس کی آواز اونچی ہوئی۔

''منے اور رانی کو یہی جواب دیا ہے، مگر دونوں نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔'' وہ باہر آ گئی۔

''کہاں ہیں دونوں؟'' اس نے پوچھا۔

''اندر سو گئے ہیں، پانی میں چینی ملا کر دی تھی انہیں، وہی جو دکان سے ادھار لی تھی۔'' سکینہ نے جواب دیا۔

''قرض مانگتا ہوں کسی سے۔'' وہ اٹھا۔

''ہونہہ، اپنا حق مانگ نہیں سکتے اور قرض مانگیں گے۔'' اس نے منہ بنایا۔

''سکینہ، بھائی ہیں وہ میرے، کیسے ان کے خلاف لڑوں؟''

''میرا بھی بھائی شہباز آیا تھا آج، کہہ رہا تھا بچوں کو لے کر میرے ساتھ چلو، میں نے انکار کر دیا۔'' سکینہ نے بتایا۔

''تو چلی جاتیں۔''

''آپ جیسے بزدل اور ڈرپوک کو چھوڑ کر؟''

''سکینہ۔'' وہ چلایا۔

''چیخیں مت، سچ برداشت کریں۔'' سکینہ کا جواب سخت تھا۔

''گھر آنا ہی فضول ہے۔'' وہ اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر کی جانب چل دیا۔ آج اس کا رخ مسجد کی طرف نہیں تھا۔ وہ قریبی پارک میں آ بیٹھا جہاں لوگ فیملیز کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ اپنی سوچ میں گم بیٹھے بیٹھے اسے احساس ہوا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے ہیں۔ پارک میں رونق کم ہوتی جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد مکمل اندھیرا چھا گیا۔ اس کا دل گھر واپس جانے کو چاہ رہا تھا مگر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ اس کی نظر سامنے پڑی جہاں ایک فقیر میلی سی چادر لپیٹے بیٹھا تھا۔ یہ فقیر شاید اندھا تھا، بار بار صدا

www.PakiBooks.Site

بلند کر رہا تھا ”اللہ کے نام پر کچھ دے دو، اندھا فقیر دعائیں دے گا۔“ اسے خبر نہیں تھی ارد گرد اب شہزاد کے علاوہ کوئی نہیں تھا جو خود بھیک مانگنے کے قابل تھا اسے کیا دیتا۔ اندھیرے میں شہزاد کو ایک شخص کا ہیولا دکھائی دیا جو چلتا ہوا فقیر کے پاس آیا تھا۔ سامنے سے گاڑی کی ہیڈ لائٹ پڑی۔ شہزاد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ شخص شاید کوئی بہت امیر آدمی تھا۔ اس نے ہزار کے کئی نوٹ فقیر کی گود میں ڈال دیے تھے۔ شہزاد اس شخص کی شکل نہیں دیکھ سکا کیونکہ اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ لالچ کی پٹی اس کی آنکھوں پر بندھ گئی۔ اس نے دوبارہ صدا لگاتے ہوئے فقیر کی جانب دیکھا۔

”تم بزدل ہو، ڈرپوک ہو۔“ سکینہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ایک لمحے کے لیے ضمیر کی آواز بلند ہوئی۔

”یہ غلط ہے شہزاد۔“ مگر لالچ اس کی رگ رگ میں دوڑنے لگا تھا۔ وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ فقیر کی جانب بڑھنے لگا۔ فقیر بے خبر تھا اور صدا لگائے جا رہا تھا۔ قریب ہی ایک ٹوٹے ہوئے بنچ کا ٹکڑا شہزاد کے ہاتھ لگ گیا۔

”کیا پتا اندھا ہونے کی اداکاری کر رہا ہو۔“ سوچ نے سر ابھارا۔ وہ آواز پیدا کیے بغیر فقیر کے سر پر پہنچا اور پوری طاقت سے بنچ کا ٹکڑا اس کے سر پر دے مارا۔ فقیر آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شہزاد نے تیزی سے پیسے مٹھی میں بھرے اور بھاگتا ہوا پارک سے باہر آ گیا۔ رات کا اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ اس کی سانسیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ پارک سے کچھ ہی دور ایک دکان کے دروازے پر لگے بلب کی روشنی میں وہ رک گیا۔ اس نے غور سے اپنے ہاتھ میں دبے پیسوں کو دیکھا۔ یہ نیلے نوٹ تھے مگر ان پر سرخ رنگ میں لکھا ہوا ”عید مبارک۔“ چمک رہا تھا۔ اس کا دل ڈوب گیا۔ اس نے جھنجلا کر پیسے دور پھینک دیے۔

”ایک جرم کیا وہ بھی کسی کام کا نہیں۔“ اسے اپنے آپ پر ہنسی آ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا وہ گھر کی جانب چل دیا جہاں غربت اس کی منتظر تھی۔

☆......☆

اسکول میں بچوں کو پڑھانے کے بعد وہ بس میں سوار ہوا۔ بس اسٹاپ پر اترتے ہی اس کی نظر ایک کالج بوائے پر پڑی جو اسے پکارتا ہوا اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ رک گیا۔

”انکل یہ لفافہ دیا ہے ایک بھائی نے آپ کے لیے۔“ اس کی بات سن کر وہ حیران ہوا۔

”ارے نہیں بھئی غلط فہمی ہوئی ہو گی آپ کو، میرے لیے کس نے دینا ہے؟“

”نہیں انکل، آپ کے لیے ہی دیا ہے۔“ وہ لفافہ پکڑا کر آگے چل دیا اور لفافہ پکڑے پکڑے گھر آ گیا۔ آج سکینہ کی کھانسی معمول سے زیادہ تھی۔

”شہزاد۔“ اس نے اسے دیکھتے ہی پکارا۔

”جی۔“

”مجھے اسپتال لے چلو، میڈیسن کل ختم ہو جانی ہے۔“ کمزور آواز میں کہتی ہوئی وہ اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”چلتے ہیں، بس دو منٹ۔“ وہ دوسرے کمرے میں آیا اور لفافہ کھول کر دیکھنے لگا۔ لفافے میں ایک کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا جس پر صاف ستھری ہینڈ رائٹنگ سے لکھا ہوا تھا۔ ”فقیر بے چارہ دو منٹ بعد ہی مر گیا تھا۔ جعلی نوٹوں کے لیے قتل کرنے والے تم پہلے انسان ہو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ صرف میں نے دیکھا ہے اور میں کسی کو بتاؤں گا نہیں مگر ایک شرط پر......“ شرط کیا تھی۔ یہ نہیں لکھا ہوا تھا۔ شہزاد کو دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کل تک وہ ایک شریف انسان تھا مگر آج ایک قاتل بن چکا تھا۔ شہزاد کے سامنے اس شخص کا سایہ لہرایا جو فقیر کے سامنے نوٹ پھینک رہا تھا۔

”تو یہ سارا کھیل اس کا ہے، اب کیا کرے گا یہ۔“ اس نے سوچا۔ پسینے کی چمک اس کے ماتھے پر دکھائی دی۔ حماد اسے بلانے آیا

”آپ کو مما بلا رہی ہیں۔“

”آ رہا ہوں۔“ اس نے خط پھاڑ دیا ”جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ کہہ کر باہر نکل آیا۔ سکینہ کو اسپتال میں چیک کروانے کے بعد اس نے ایک دوست سے قرض لیا اور رات کے لیے دال روٹی لے آیا۔ دوسرے دن اسکول سے واپسی پر جب وہ بس سے اترا تو اس نے غیر ارادی طور پر جیب میں ہاتھ مارا۔ یہاں ایک کاغذ موجود تھا جو بس میں ہی اس کی جیب میں کسی نے ڈالا تھا۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ ہوئی۔ ”یہ کون میرے گلے پڑ گیا؟“ وہ بڑبڑایا۔ گھر آ کر کاغذ نکال کر دیکھا۔ اسی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔ ”میں کسی کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ پرائیویٹ اسکول ٹیچر شہزاد نے ایک فقیر کو جعلی نوٹوں کے لیے قتل کیا ہے مگر اس شرط پر کہ تم مجھے

www.PakiBooks.Site

ایک ہفتے کے اندر اندر دس لاکھ روپے دو گے، مجھے پتا ہے تمہارے کے لیے یہ ناممکن حد تک مشکل کام ہے مگر تمہیں یہ کرنا ہو گا ورنہ پھانسی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ دو دن بعد تمہیں بتا دوں گا پیسے کب اور کہاں پہنچانے ہیں۔“

اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ یہ سیدھی سیدھی بلیک میلنگ تھی اور وہ کسی صورت بھی دس لاکھ کا بندوبست نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پہلے کیا کم مصیبتیں تھیں جو ایک اور اس کے سر پر آن پڑی۔ ”یا اللہ زندگی میں صرف ایک بار لالچ کیا اس سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا اور اس کی اتنی بڑی سزا؟“ اس نے خدا کو پکارا۔ آنکھوں میں نمی لیے وہ کمرے کی چھت کو گھور رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ کبھی اس قسم کے حالات سے نہیں گزرا تھا۔ کمرے میں کسی کی آمد ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے سکینہ کھڑی تھی۔

”تم پریشان ہو شہزاد؟“

”نن......نہیں تو۔“ ہکلاتے لہجے میں بولتے ہوئے اس نے نظر چرائی۔

”نہیں، مجھے محسوس ہوا ہے تم کسی بات کو لے کر پریشان ہو؟“ وہ اب اس کے پاس بیٹھ چکی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں سکینہ، تمہارا وہم ہے۔ بس یہی گھر کی پریشانیاں ہیں۔“ اس نے سکینہ کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”میری طرف دیکھیں شہزاد۔ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں مگر میں کئی سالوں سے آپ کے ساتھ ہوں۔ ہر پریشانی اور دکھ میں آپ کا ساتھ دیا ہے، اب کیا مسئلہ ہے مجھے بتا دیں۔“ اس نے شہزاد کی جھولی میں سر رکھا اور رونے لگی۔

”سکینہ، میں ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں۔“ اس نے سکینہ کے چہرے پر ہاتھ رکھا۔

”کک کیسی مشکل؟“ وہ اٹھ بیٹھی۔

”بتاتا ہوں۔“ اس نے کہا اور مدھم لہجے میں بولتے ہوئے سب بتا دیا۔ فقیر کی موت اور بلیک میلر کے مطالبے تک۔ سکینہ ساری بات سننے کے بعد کچھ دیر خاموش رہی اور پھر پریشان لہجے میں بولی۔ ”شہزاد اگر اسے پیسے نہ دیے تو؟“

”تو وہ پولیس کو سب بتا دے گا اور میں پھنس جاؤں گا۔“ وہ سخت پریشان تھا۔

”آپ اس سے بات کر کے دیکھیں، حالات

صہبا اختر (1996-1932)

نظم ”سمندر“ کے نغمہ نگار کورنگی لانڈھی سے نکل کر قومی شہرت حاصل کرنے والے اختر علی رحمت ”صہبا اختر“ کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ واحد پاکستانی شاعر ہیں جنہوں نے اہم عالمی واقعات و حادثات اور اہم یادگار شخصیات پر بکثرت نظمیں لکھیں۔ اس سے آپ کے منفرد اندازِ فکر کی غمازی ہوتی ہے۔ حریت میں ہر ہفتہ نظم اور مشرق میں برسوں قطعات لکھتے رہے۔ صہبا اختر محکمہ خوراک سے وابستہ رہے۔ کئی کتابیں آپ کے قلم سے تحریر میں آئیں۔ ”سرکشیدہ“ آپ کا پہلا مجموعہ کلام ہے طویل نظم مثنوی، داستان اور تمثیل کا مجموعہ ”سمندر“ ہے جسے ادبی حلقوں میں سراہا گیا اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ صہبا اختر کا نعتیہ مجموعہ ”اقرا“ منفرد اندازِ بیان کا حامل ہے جس میں روایتی نعت گوئی کی ڈگر سے ہٹ کر حقیقی اسلوب بیان کو اپنایا گیا ہے۔ ایسے مجموعے نعتیہ شاعری میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ 19 فروری 1996 کو آپ کا انتقال ہوا اور خاکِ کراچی میں پنہاں ہو گئے۔ گلشن اقبال 13 ڈی میں ایک شارع اور ناظم آباد تھانے کے عقب میں بلدیہ کراچی کی صہبا اختر لائبریری کراچی کے شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کرتی رہتی ہے۔ ”اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر“ میں ڈاکٹر عاصی کرنالی مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ ”عہدِ حاضر کی ایک توانا آواز صہبا اختر ہیں۔ رفعتِ خیال، شکوہِ لفظی اور لہجے کی بلند آہنگی کے سبب ان کی اپنی پہچان ہے۔ دوسری اصناف شعری میں بھی قدرت کلام کا لوہا منوایا۔ ان کی قومی اور ملی منظومات جس میں ملتِ اسلامیہ کے جلال و جمال، فتح و ظفر مندی کی آرزو جھلکتی ہے۔“ ”ہمارے اہلِ قلم“ میں صہبا اختر کی تاریخ ولادت 30 ستمبر 1932 دبستانوں کا دبستان کراچی جلد اول میں 30 ستمبر 1932، حریم نعت، رئیس احمد میں 30 دسمبر 1932 جب کہ وفیات نعت گویانِ پاکستان ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ میں 30 ستمبر 1931 تحریر ہے۔ جائے پیدائش ”جموں“ پر سب متفق ہیں۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

www.PakiBooks.Site

بتائیں اسے اپنے۔"

"یار کیا احمقانہ بات کی ہے، میں اسے جانتا تک نہیں، دونوں بار خط کسی اور ذریعے سے مجھ تک پہنچا ہے ہاں مگر اس کی دھمکی سے لگ رہا ہے وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھا تھا۔

"آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے۔" سکینہ نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔

"کیا؟"

"اپنے بھائیوں سے بات کیوں نہیں کرتے؟"

وہ چونک گیا اور ناگواری سے بولا۔ "تم گھوم پھر کر اسی بات پہ آجاتی ہو۔"

"تو کیا کروں؟ بتاؤ...... کیا کوئی اور طریقہ ہے اس کمینے بلیک میلر سے جان چھڑانے کا؟ بھائیوں سے اپنا حق وصول کرو شہزاد، اگر جان بچانی ہے تو یہ کرو، دس لاکھ کیا، حویلی اور کاروبار میں آپ کا حصہ کسی طرح بھی پچیس تیس لاکھ سے کم نہیں، اپنے حق کے لیے لڑیں شہزاد ورنہ پھنس جائیں گے، اپنا نہیں تو میرا اور بچوں کا خیال کریں۔" سکینہ کی بات تلخ تھی مگر سچ تھی۔ شہزاد خاموش رہا۔ لوہا گرم دیکھ کر اس نے پھر چوٹ لگائی۔ "کب تک بزدلی کے طعنے سنیں گے؟ کیا ساری زندگی اسی طرح غربت کی چکی میں پستے رہیں گے؟ اس زندگی سے موت اچھی ہے روز روز دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے اپنا حق حاصل کرو۔"

"مگر کیسے سکینہ؟ ابو نے میرے نام کچھ نہیں کیا۔" وہ دکھ سے بولا۔

"کیا ثبوت ہے اس بات کا؟ کوئی وصیت؟ وکیل گواہ یا کچھ اور؟" وہ تلخ ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ "انہوں نے تمہیں کہا اور تم نے مان لیا کیونکہ تم ڈرتے ہو ان سے، چھوٹے تھے تب سے، اب جاؤ ان کے سامنے کھڑے ہو جاؤ کچھ اور کہیں تو عدالت اور پولیس کی دھمکی دینا، دیکھنا سیدھے ہو جائیں گے، رشتے جب لالچ اور ہوس میں پڑ جائیں تب رشتے نہیں رہتے۔ بھوک تہذیب کے آداب بھلا دیتی ہے اور پھر یہاں تو ہمارا حق ہے۔" اس کی باتیں شہزاد کے دل پر اثر کر رہی تھیں۔ ابھی سورج ڈوبنے میں کچھ وقت باقی تھا۔ وہ اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ سکینہ نے پکارا۔ "کہاں چلے؟"

"اپنا حق لینے۔" اس کی بات سن کر سکینہ مسکرا دی۔ شہزاد نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆......☆

عباد اور فواد ابھی دکان سے گھر واپس آئے تھے۔ ان کی شہر میں کافی بڑی جنرل اسٹور تھی جو نصیر نے وراثت میں چھوڑی تھی۔ وہاں اک دن کی سیل ہزاروں میں تھی اور وہ مالی لحاظ سے کافی مضبوط تھے۔ ان کے بچے مہنگے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ بیویاں نت نئے فیشن کے کپڑے بنوانے میں مصروف رہتی تھیں۔ گھر میں ہر طرح کی سہولت موجود تھی۔ ہاتھ منہ دھو کر دونوں دسترخوان پہ بیٹھے ہی تھے کہ حویلی کے گیٹ سے کوئی اندر داخل ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ شہزاد تھا۔ نازیہ اور شازیہ بچوں کے ساتھ اندر چلی گئیں۔ وہ شہزاد کو پسند نہیں کرتی تھیں۔

"آؤ شہزاد کیسے آنا ہوا۔" فواد نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا البتہ عباد بیٹھا رہا۔

"مجھے آپ سے کام ہے بھائی۔" وہ قریب ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"کیسا کام؟" دونوں حیران ہوئے۔

"مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔" وہ نارمل انداز میں بات کر رہا تھا۔

"کتنے پیسے؟" ان کے خیال میں شاید دو تین ہزار مانگے گا۔ حالات کا رونا رو کر وہ اس سے جان چھڑوا لیں گے مگر اگلی بات سن کر دونوں کی آنکھیں کھل گئیں۔

"بیس لاکھ۔"

"بب بیس لاکھ۔" دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور ہنس پڑے۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے اتنے پیسے ہمارے پاس کہاں سے آئے؟" عباد نے جواب دیا۔

"چلو آپ کے پاس نہیں ہیں تو ایسا کریں حویلی میں میرا حصہ الگ کر دیں اور دکان میں بھی تیسرا حصہ مجھے دے دیں میں چلا جاؤں گا۔" شہزاد آج ٹھان کر آیا تھا۔

"او بھائی کیسا حصہ؟ دکان اور حویلی ابو نے ہمارے نام کی ہے۔" فواد نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا، کیا ثبوت ہے؟ ابو کی وصیت مجھے دکھا دیں ذرا اور خاندانی وکیل صاحب بلوائیں میں بھی پوچھوں اس سے کہ ابو نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ میں بھی ان کا سگا بیٹا تھا پھر یہ سوتیلے جیسا سلوک کیوں۔" اس کی بات سن کر دونوں کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔

"یہ تجھے کس نے ہمارے خلاف بھڑکایا ہے؟ سچ کہتے ہیں دولت رشتوں کا احترام بھلا دیتی ہے۔" یہ جذباتی بلیک میلنگ تھی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔

"کسی نے نہیں بھڑکایا، بس میں بزدل تھا جو پہلے اپنے حق کے لیے لڑ نہیں سکا، اب لڑوں گا چاہے کچھ بھی ہو اور رشتوں کے احترام کی آپ لوگ بات ہی نہ کریں، ہمارے گھر میں کتنے وقت کا کھانا بنتا ہے یہ آپ دونوں نہیں جانتے۔" اس نے جذباتی انداز میں جواب دیا۔

"دیکھ شہزاد، ہم بھائی ہیں اور میں نہیں چاہتا عدالتوں میں ایک دوسرے کو گھسیٹیں۔" عباد پٹری پر آچکا تھا۔

"میں بھی نہیں چاہتا بھائی، اس لیے پہلے یہاں آیا ہوں ورنہ عدالت کا دروازہ کھلا ہے۔" اس نے صاف جواب دیا۔

"پر شہزاد جتنے پیسے تو مانگ رہا ہے اتنے ہمارے پاس ابھی نہیں ہیں۔" فواد نے کہا۔

"ہم تمہیں پیسے دیں گے مگر بیس لاکھ نہیں اور وہ بھی ایک شرط پر۔" عباد نے فواد کی بات کاٹی۔

"کیسی شرط؟"

"تمہیں اپنے حق سے دستبردار ہونا ہوگا۔" عباد کی بات سن کر وہ مسکرایا۔

"ٹھیک ہے مجھے منظور ہے پر پیسے کب ملیں گے؟"

"کل بینک کھلتے ہی مل جائیں گے مگر بیس لاکھ نہیں، کم کرو۔" فواد کی بات سن کر اس نے چند لمحے سوچنے میں لگائے۔

"میں جانتا ہوں میرا حصہ پچیس تیس لاکھ سے کم نہیں لیکن مجھ میں اب بھی کچھ شرم باقی ہے، کل دس بجے میں آکر پندرہ لاکھ لے جاؤں گا۔" وہ یہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا اور گھر واپس جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

☆......☆

دوسرے دن دس بجے بینک سے پندرہ لاکھ لے کر انہوں نے شہزاد کے حوالے کر دیے۔ اس سے پہلے وہ ضروری کاغذات پر دستخط لینا نہیں بھولے تھے۔ شہزاد خدا کا شکر ادا کر رہا تھا جس نے اسے اتنی ہمت دی۔ گھر واپس آتے ہوئے وہ اسی پارک کے قریب سے گزرا جہاں کچھ دن پہلے فقیر اس کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا اور آج اسی قتل کی وجہ سے اس میں اتنی ہمت پیدا ہوئی تھی کہ وہ اپنے حق کے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

مرزا ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

www.PakiBooks.Site

لیے کھڑا ہوا۔ گھر آ کر اس نے رقم سکینہ کو پکڑائی۔ اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔

''دس لاکھ تو وہ بلیک میلر لے جائے گا۔''

''ہاں پر اللہ کا شکر ادا کرو پانچ لاکھ ہمیں بچ گئے تو حالات بدل جائیں گے۔'' اس نے تسلی دی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے اس رات مستقبل کی پلاننگ کرتے رہے۔ غریب کے ساتھ یہ بہت بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ پیسا نہیں تو اس کے حصول کی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے اور پیسے ہو... تو اس لیے پریشان کہ اب اسے خرچ کس جگہ اور کیسے کریں۔ دونوں صورتوں میں پریشانی اس کا مقدر ہوتی ہے۔ اگلے دن انہی سوچوں میں گم شہزاد جب اسکول پہنچا تو چپڑاسی نے ایک خط اسے پکڑایا۔ وہ بلیک میلر کی چالاکی پر اش اش کر اٹھا۔ ایک بار بھی سامنے آئے بغیر اس نے اپنے پیغامات شہزاد تک پہنچا دیے تھے۔ مختصر سے خط میں چند ہدایات درج تھیں۔

''میں نے سوچا دس لاکھ سے میری ضروریات پوری نہیں ہو سکتی۔ ایسا کرو پندرہ لاکھ جو کل بینک سے حاصل کیے ہیں وہ بچوں کے اسکول بیگ میں ڈالو اور شام کے وقت پارک کے بینچ پر رکھ دینا جہاں چند دن پہلے موجود تھے۔ پارک سے نکل جانا۔ اگلے پندرہ منٹ تک آس پاس دکھائی دیے تو پولیس لے آؤں گا۔''

شہزاد کی آنکھ میں نمی اتر آئی۔ بلیک میلر اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے آخری وار بہت خطرناک کیا تھا۔ وہ اس کی بے بسی سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ سارا دن اسکول میں پریشان رہا۔ گھر واپس آ کر اس نے خط سکینہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اس نے خط پڑھا اور غصیلے لہجے میں بولی۔ ''یہ ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا ہے، کیا پتا بعد میں بھی پیسے مانگتا رہے ہم نے نہیں دینا ایک روپیا بھی۔''

''وہ ثبوت دے دے گا پولیس کو۔ فقیر کے قتل میں مجھے سزا ہو گئی تو یہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟'' اس کا جواب سن کر وہ خاموش ہو گئی۔ اسی شام شہزاد نے سارے پیسے بیگ میں ڈالے اور پارک میں رکھ کر واپس آ گیا۔ پندرہ منٹ یونہی ارد گرد گھومتا رہا۔ گھر واپس آتے ہوئے اس کی نظر ایک دکان کے سامنے ہاتھ پھیلائے بیٹھے فقیر پر پڑی۔ شہزاد کو لگا وقت رک گیا ہے۔ زمین اس کے ارد گرد گھومنے لگی تھی۔ یہ وہی فقیر تھا جو کچھ دن پہلے اس کے ہاتھوں ''قتل'' ہو چکا تھا۔ شہزاد الٹے قدموں پارک کی طرف دوڑا۔ پارک سنسان پڑا تھا۔ نہ بیگ تھا اور نہ بلیک میلر۔ اسے قسمت کی ستم ظریفی پر ہنسی آ رہی تھی اور اپنی بزدلی پر غصہ۔ وہ مرے مرے قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆.....☆

سکینہ ساری بات سن کر خاموش رہی۔ کچھ دیر بعد جب بولی اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''خدا کو یہی منظور تھا شہزاد!'' اپنا حق غریب یہی کہہ کر بھول جاتے ہیں۔ خدا کو یہی منظور تھا۔

اگلی صبح جب وہ اٹھے تو دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون آ گیا صبح صبح؟'' شہزاد نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا۔ سامنے سکینہ کا بھائی شہباز کھڑا تھا۔

''شہباز تم اور اتنی صبح؟ سب خیریت ہے ناں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ شہباز کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ وہی بیگ جس میں پیسے ڈال کر وہ پارک میں رکھ آیا تھا۔

''یہ آپ کی امانت واپس کرنے آیا تھا۔'' اس نے ہاتھ میں موجود بیگ شہزاد کو پکڑایا۔ ''معذرت چاہتا ہوں شہزاد بھائی پر سگے بھائیوں کا خون جب سفید ہوا تب آپ کے اندر کی بزدلی نے آپ کو ان حالات میں پہنچا دیا۔ مجھے سکینہ نے سارے حالات بتائے۔ ایسے میں مجھے یہی بہتر لگا۔ آپ کو آپ کا حق دلوانے کے لیے میرا طریقہ مختلف تھا مگر کامیاب رہا۔ اگر یہ طریقہ کامیاب نہ ہوتا تو میں کوئی اور طریقہ اپناتا پر آپ کے ڈر نے مجھے ناکام نہیں ہونے دیا۔ پریشان کرنے کے لیے معذرت۔ سکینہ بھی میرے ساتھ اس پلان میں شامل تھی۔'' شہزاد کے پیچھے کھڑی سکینہ مسکرائی۔ شہزاد حیرانگی سے ان کو دیکھ رہا تھا۔

''تم دونوں نے اچھا نہیں کیا۔'' اس کا جملہ سن کر شہباز کے چہرے کا رنگ بدلا۔

''واقعی پر آپ کا حق آپ کو مل گیا۔ یہ گناہ ہمیں معاف کر دیجیے گا۔'' اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ شہزاد نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے اور ناشتے کی ٹیبل پر لے آیا جہاں کئی قسم کے فوڈ آئٹم تھے۔ اس نے ٹیبل پر رکھے ناشتے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''چلو تمہاری اس حرکت نے مجھے حق پر خاموش رہنے کی غلطی کے بھنور سے نکال لیا ہے۔''

www.PakiBooks.Site

جوابی تھپڑ

محترم مدیر
السلام علیکم!

انسان یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ قرآن نے صاف لفظوں میں کہا ہے، انسان خسارے میں ہے، ہم اسے بھوک پیاس اور اولاد کے ذریعے آزمائیں گے! اللہ تعالیٰ آزماتا ہے لیکن انسان کے اندر چھپا شیطان اسے ہمیشہ اس آزمائش میں بھٹکا دیتا ہے، اُفتاب اور ہدایت بھی بہک رہے تھے کہ اسے بروقت حقیقت کا ادراک ہو گیا۔

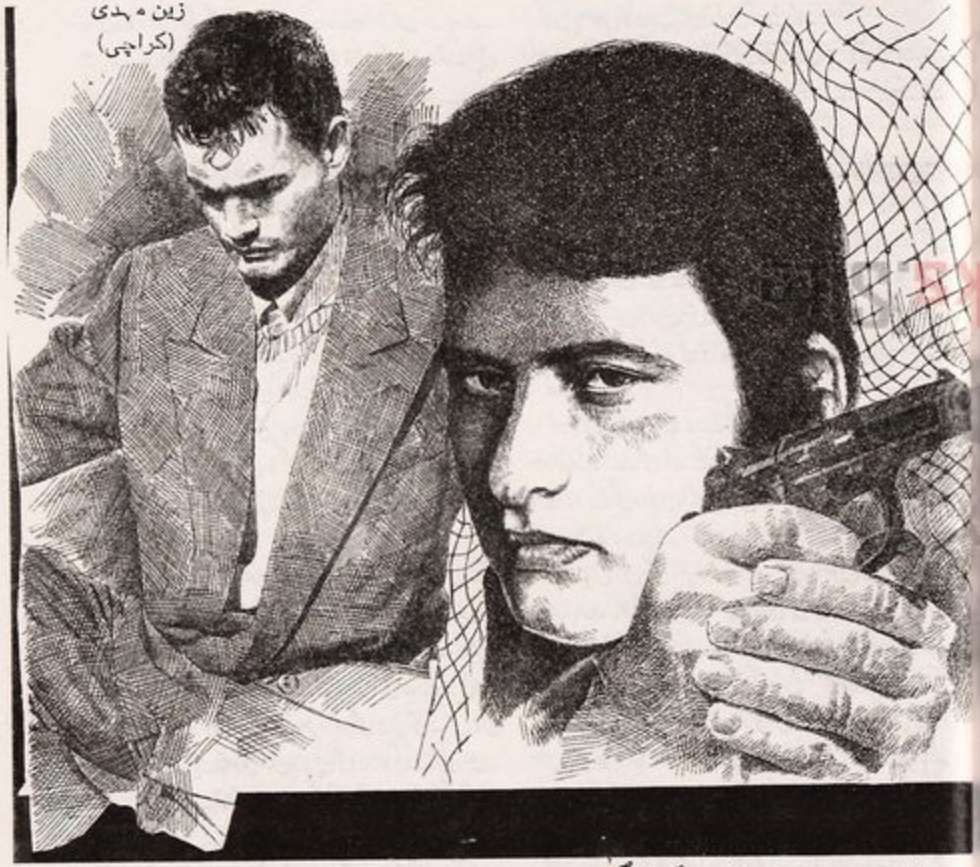

زین مہدی
(کراچی)

ابا نے میرا نام ہدایت اللہ رکھا تھا مگر مجھے صحیح ہدایت نہیں مل سکی تھی اور میں شتر بے مہار بن گیا تھا۔ آج اس کو دولتی ماری کل کسی اور کو، بس یہی کام تھا میرا مگر یقین کریں کہ یہ سب کچھ میں محلے سے باہر کرتا۔ محلے میں تو مجھے شرفا کی جمع سمجھا جاتا تھا۔ ہر ایک کا میں ادب کرتا تھا اس لیے سب مجھ سے شفقت بھرا برتاؤ کرتے تھے، میری اسی منکسر المزاجی کے سبب سب اپنا آدھا ادھورا کام مجھ سے کراتے تھے۔ جیسے ٹکٹر والے شمیم صاحب کے کہنے پر ان کے سامان کی لسٹ لیتا اور بازار سے ان کا سودا لا دیتا۔ مائی فروتے کا دیا ہوا چیک بینک میں ان کے نام سے جمع کرا آتا۔ جس نے جو کہا وہ میں بغیر

www.PakiBooks.Site

انکار کے کر دیتا تھا سوائے شبیر صاحب کے۔ ان سے مجھے ازلی بیر تھا۔ اسی وجہ سے جب بھی ان کی نظر مجھ پر پڑتی تو وہ منہ بنا کر برابر سے گزر جاتے تھے۔ میں سلام کرتا تو بھی وہ جواب نہیں دیتے تھے۔ اگر وہ کسی محفل میں بیٹھے ہوں اور میں پہنچ جاتا تو فوراً اٹھ جاتے تھے اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ میں ان کی عزت میں اضافہ کروں گا اور ایسی ذومعنی بات کہوں گا کہ سب ہنس پڑیں گے۔ کوئی بھی معنی نہیں سمجھے گا مگر وہ سلگ کر رہ جائیں گے کیونکہ وہ ان کی کسی دکھتی رگ پر انگلی ہوگی بلکہ الفاظ نہیں دو دھاری خنجر ہوگا جو ان کے دل میں کھب جائے گا اس لیے بھی کہ وہ عزت دار تھے اور میں منہ پھٹ۔ میں ہدایت اللہ کسی کی ہدایت ماننے کا قائل بھی نہیں تھا۔ اپنی کرتا۔ یوں بھی مجھے ہدایت دیتا بھی تو کون؟ ہدایت دینے والا تو اس وقت منوں مٹی تلے جاسویا تھا جب میں صرف بارہ سال کا تھا۔ بارہ سال کا بچہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا اس لیے کہ اس کے پاس وسائل نہیں ہوتے۔ میرے پاس تو وسائل کے ساتھ رقم نامی کوئی شہ بھی نہیں تھی۔ جمع پونجی کے نام پر بس ایک یہی گھر تھا۔ اس گھر کی لاج میں کئی رشتے دار آگے بڑھے مگر ماں نے ہمت دکھائی۔ عدت میں ہوتے ہوئے بھی انہوں نے پردے کی آڑ سے وہ تیر چلائے کہ ان سب کو بھاگتے ہی بنی۔

ان سب کے دفعان ہونے کے بعد انہوں نے مجھے گلے سے لگا کر کہا۔ ”بیٹا، تیرا باپ کہتا تھا کہ انسان اگر بزدل ہے تو وہ سونے کو بھی پیتل کا ٹکڑا بنا دے گا۔ ہمت کر ہمت۔ میں محنت کروں گی اور تُو باپ کے خواب کی تعبیر کرنا۔ پڑھ لکھ کر بابو بن جانا۔“

انہوں نے گھر سنبھالنے کے لیے دوسروں کے گھروں میں جھاڑو پوچھا کرنے کا کام سنبھال لیا پھر ان کی ترقی ہوگئی یعنی ماسی کا کام چھوڑ کر انہوں نے گارمنٹ فیکٹری میں جاب کرلی۔ رشتے دار تو کب کے وال گلتی نہ دیکھ کر اپنی اپنی راہ لے چکے تھے اور پھر کسی نے مڑ کر خبر بھی نہ لی تھی۔ بس ماں تھی میں تھا اور ایک چھوٹی بہن زرین تھی۔ زندگی گزرتی رہی۔

ابا کا خواب تھا کہ میں پڑھ لکھ کر افسر بنوں' ان کی طرح چھابڑی نہ لگاؤں۔ ابا کے مرنے کے بعد یہی خواب ماں کی آنکھوں میں اتر آئے۔ اپنی ہڈیوں پر ظلم کر کے بھی وہ کتابوں کاپیوں کا خرچ اٹھانے لگیں۔ مہینے کے مہینے اسکول کی فیس بھی جمع کرا دیتی تھیں۔ ماں کے دکھ کو میں نے بھی محسوس کرلیا تھا اس لیے دل لگا کر پڑھ رہا تھا مگر یہ سلسلہ دراز ثابت نہ ہوا اور میں دوستوں کے بہکاوے میں آکر نصاب سے زیادہ غیر نصابی کاموں میں دلچسپی لینے لگا۔ کرکٹ' فٹ بال اور ڈبو میں وقت گزارنے لگا۔ اماں صحیح راہ سمجھاتیں' غلطیاں جتاتیں مگر مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ جب تک ٹھوکر نہ لگے انسان سنبھلتا بھی تو نہیں ہے۔ مجھے بھی ٹھوکر کی ضرورت تھی۔ میری بداعمالیوں' بداطواریوں کا نتیجہ سامنے آگیا۔ میٹرک میں انتہائی کم نمبر آئے۔

ماں نے بہت سمجھایا' ہاتھ تک جوڑ لیے کہ میں کالج میں داخلہ لے لوں مگر میں کسی طور راضی نہ ہوا۔ میرا کہنا تھا کہ میرا باپ کون سا ایم اے، بی اے پاس تھا۔ جاہل کے بچے بھی جاہل رہتے ہیں۔ میں نے بہت پڑھ لیا اب اس سے زیادہ نہیں پڑھوں گا۔ اب میں نوکری کروں گا۔

نوکری کوئی پیڑ پر لگا پھل تو تھا نہیں کہ ہاتھ بڑھایا اور توڑ لیا۔ اس آفس سے اس آفس چکر لگاتا رہا اور ہر جگہ سے انکار ملتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال گزر گیا۔

اب گھر کے حالات یوں تھے کہ آمدنی اٹھنی خرچا روپیا۔ جہاں سے ایک دو وقت کا کھانا مل جاتا تھا اب وہ بھی ملنا بند ہو گیا تھا۔ جہاں جہاں ماں کام کرتی تھیں وہاں وہاں سے انہیں بھی رقم نکڑوں میں ملنے لگی تھی۔ مہنگائی آسمان کو چھو رہی تھی۔ مجبوراً اب بہن زرین بھی ماں کے ساتھ کام پر جانے لگی تھی۔ دونوں کی تنخواہ آنے لگی تو کچھ راحت آئی کہ اب دو وقت کا کھانا پکنے لگا۔

زرین دو پیسے لانے لگی تو اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ اب اسے بھی مجھ نکمے کی حرکتیں بری لگنے لگیں۔ گھر میں تو تکار ہونے لگی دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔

اس دن بھی ہم دونوں میں کٹیلے جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ صرف اتنی تھی کہ رات کی رکھی یعنی باسی روٹی' پھیکی چائے سے کھانا دشوار تھا اس لیے انکار کر دیا تھا۔ اس پر اس نے طعنہ دیا کہ اگر مرغ مسلم کھانا ہے تو کما کر لاؤ۔ میں نے تو اپنی سی کوشش کرلی تھی۔ اب نوکری نہیں ملے تو اس میں میرا کیا قصور؟ اسی لیے مجھے غصہ آگیا تھا اور میرا ہاتھ بہن پر اٹھ گیا تھا اس بات پر بہن کی طرفداری میں اماں نے مجھ پر طمانچوں کی بارش کر دی تھی اور جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی تھیں۔ اماں کے طمانچوں نے مجھ پر وہ قہر نہیں ڈھائے تھے جتنا ان کے طعنوں نے مجھے اندر سے زخمی کر دیا تھا۔ میری انا بری طرح مجروح ہوگئی تھی۔ دل کر رہا تھا کہ میں بہن کو زندہ گاڑھ دوں لیکن کیا کرتا کہ اماں درمیان میں تھیں۔ میں غصے میں تنتناتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ باہر آکر بھی اندر کی تپش کم نہ ہوئی

www.PakiBooks.Site

ایسا لگ رہا تھا کہ اندر ایک جوالہ مکھی نے سر اٹھا لیا ہو۔ سامنے ایک چھوٹا سا روڑا پڑا تھا میں نے اسے ٹھوکر ماری۔ شاید اس طرح میں اپنے اندر کے ابال کو کم کرنا چاہتا تھا لیکن اثر الٹا ہوا۔ پیروں میں چپل تھی جس کی وجہ سے انگوٹھے پر چوٹ محسوس ہوئی اگر اور کوئی وقت ہوتا تو میں پیر پکڑ کر بیٹھ جاتا مگر چوٹ محسوس ہونے پر بھی رکا نہیں آگے بڑھتا گیا۔ گلی کے اختتام پر منور پان والے کی دکان تھی۔ وہاں سے سگریٹ ادھار مل جایا کرتا تھا۔ وہ سگریٹ دینے میں آنا کانی تو کرتا تھا مگر دے دیتا تھا۔ اس وقت سگریٹ کی طلب شدید ہو رہی تھی، پیٹ خالی تھا لیکن کیا کرتا اسی پر گزارا کرنا تھا۔ دکان کی پرلی طرف آفتاب کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر ڈھارس بندھی اور میں دکان کی بجائے اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی میری طرح بیکاری کا عذاب سہہ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی مگر میں نے محسوس کرلیا کہ اس کی مسکراہٹ میں ہلکا پن ہے۔ وہ بات ہی نہیں تھی جو بے ساختگی کی علامت کہلاتی ہے۔ مسکراہٹ میں لمعہ نہیں ہوتا اگر دل خوش ہو تو مسکراہٹ کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے دل کی گہرائی سے ابھری ہو اور اگر دل میں رنج چھپا ہو تو مسکراہٹ ایسی ہوتی ہے جو فوراً چغلی کھا لیتی ہے کہ یہ نقلی ہے۔ آفتاب کی مسکراہٹ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ بھی تو میری طرح حالات کا شکار تھا۔ اس کے حالات میں جانتا تھا اس لیے سمجھ گیا کہ وہ بھی کوئی نئی چوٹ کھا کر آرہا ہے۔ دو جلے دل ملتے ہیں تو پھپولے پھوڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔ میں نے نزدیک پہنچ کر کہا۔ ”کیا حال ہے یارا۔“

”وہی جو عین کا حال ہے وہی غین کا۔ دونوں دُہرے ہیں' پیٹ سے پیٹھ مل رہی ہے۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔

میں سمجھ گیا کہ میری طرح وہ بھی بھوکا ہے۔ شاید اسے بھی گھر والوں نے کھانا نہیں دیا ہے۔ پہلے بھی اس کے ساتھ ایک دو بار ایسا ہو چکا تھا۔ اسی نے بتایا تھا۔ اس کے گھر والے بھی اسے نوکری نہ ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”گویا میرے جیسا ہی حال تیرا بھی ہے۔“

”ایک ہی سوال بار بار پوچھ کر رلاتا کیوں ہے، خود ہی سمجھ لیا کرنا۔“ اس نے رو دینے کے انداز میں میرے سوال کا جواب دیا۔ اس کے انداز پر مجھے ہنسی آگئی۔

میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”ہر رات کے بعد صبح ہوتی ہے۔ ایک دن ہماری قسمت کا بھی سورج طلوع ہوگا۔“

”اور وہ دن نہ جانے کب آئے گا۔“ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا تھا کہ میں نے کہا۔ ”یار! اگر تیری جیب میں کچھ پیسے ہیں تو چل کسی ہوٹل میں بیٹھ کر عیاشی کر لیتے ہیں۔“

”اس وقت تو ہیں، دراصل جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو پھر انگلی ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے۔ باجی کے پرس سے پانچ سو کا ایک نوٹ اڑا لیا تھا۔ ایک دو دن پہلے انہیں تنخواہ ملی ہے اس لیے انہیں شاید ہی احساس ہوا ہو کہ پیسے کم ہیں۔“

”تب تو چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو بھی مل جائے گا۔“

”لگتا ہے میری طرح تو بھی کھانا چھوڑ کر آیا ہے۔ چل کسی دال چاول والے ہوٹل میں بیٹھ کر عیاشی کر لیتے ہیں۔ ایک اچھا اور سستا ہوٹل مین روڈ پر ہے۔ وہیں چلتے ہیں۔“

ہم دونوں ہوٹل پر پہنچے تو کہ وہ خاصا گندا ہوٹل تھا جہاں زیادہ تر مزدور ٹائپ کے لوگ ہی آتے تھے لیکن اس وقت وہی ہمیں کسی فائیو اسٹار سے کم نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم نے پیٹ کی آگ بجھائی اور باہر نکل آئے۔ نزدیک ہی ایک کوئٹہ ہوٹل تھا جہاں کی چائے لاجواب ہوتی تھی۔ ایسی میٹھی کہ لب سے لب سل جائیں۔ روڈ سائیڈ میں بچھی کرسیوں پر ہم بھی بیٹھ گئے اور چائے کا انتظار کرنے لگے۔ اسی دوران اس نے کہا۔ ”یار! تجھے انور یاد ہے؟“

”کون انور؟“ میں نے پوچھا۔

”یار وہی انور جسے پانچ چھ سال قبل محلے سے نکالا گیا تھا جس نے ارشد صاحب کو تھپڑ مارا تھا۔“

”ہاں ہاں وہی نا جس نے ارشد صاحب کے ہاں چوری کی تھی۔“

”ہاں وہی۔“

”اس چور کی یاد کیوں آگئی؟“

”اب وہ بہت بڑا آدمی بن گیا ہے۔ بہت نام ہے اس کا۔ کل اس سے ملاقات ہوگئی تھی۔“

”تو اس میں ایسی کون سی نئی بات ہوگئی۔“

”یار وہ بہت بڑا آدمی بن گیا ہے۔“

”اگر وہ بڑا آدمی بن گیا ہے تو ہمیں کیا؟ اب تو وہ اس محلے میں بھی نہیں رہتا۔“

”پہلے پوری بات تو سن۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پہچان لیا تھا۔ مجھ سے پوچھا کہ کام کیا کر رہے ہو تو میں نے کہہ دیا تھا کہ بیکار ہوں۔ اس پر اس نے قہقہہ لگا کر کہا تھا کہ جب

www.PakiBooks.Site

کہیں نوکری نہ ملے تو میرے پاس آجانا۔ میں تمہیں نوکری دوں گا۔ اس نے اپنا ایڈریس بھی بتایا تھا۔"

"تو کیا اس نے کوئی فیکٹری لگا لی ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھول لیا ہے؟"

"وہ کرتا کیا ہے اس کا تو علم نہیں لیکن اس کی حیثیت دیکھ کر لگا تھا کہ وہ بڑا آدمی بن گیا ہے۔ اس کے پاس چمچماتی گاڑی تھی۔ قیمتی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ جو سگریٹ وہ پی رہا تھا وہ بھی پاکستانی نہیں تھی' کیا خوشبو تھی۔ میں کل سے سوچ رہا ہوں کہ اس سے ملاقات کروں۔"

"تو جا کر مل لے۔"

"نوکری کی تلاش تمہیں بھی ہے۔ ہم ساتھ چلتے ہیں۔"

"یار جو چوری چکاری کرتا تھا وہ ایسی کون سی نوکری دے گا؟"

"جہاں اتنے دنوں تک ٹھوکریں کھائی ہیں وہیں ایک اور ٹھوکر، ہمارا کیا جاتا ہے۔ دفتر دفتر کھلتے ایسی باتوں کے تو ہم عادی ہو گئے ہیں۔ یوں بھی نہ تم نے کوئی ڈگری حاصل کی ہے اور نہ میں نے۔ ہم دونوں ہی تو میٹرک وہ بھی سی گریڈ سے پاس کر کے اعلیٰ نوکری کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ چلو اس ٹھکانے کو بھی آزما لیتے ہیں۔"

اس کے سمجھانے پر میں راضی ہو گیا کیونکہ میرے پاس اور کوئی آپشن بھی نہیں تھا۔

ہم بس کے ذریعہ اس علاقے میں پہنچے جہاں کا انور نے آفتاب کو ایڈریس دیا تھا۔ انور کے دیے ہوئے مکان نمبر کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ کارنر کے بنگلے پر نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی جس پر محمد انور لکھا تھا۔ نام کی تختی حوصلہ دے رہی تھی مگر بنگلے کا رقبہ حوصلے کو پست کر رہا تھا۔ وہ پانچ سو گز پر بنا ایک عالی شان بنگلا تھا۔ گیٹ پر ایک گارڈ بھی کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں اور شانے پر لٹکی جدید رائفل دیکھ کر ہمارے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں انور نے غلط نمبر دیا ہو، یہ سوچ میرے ذہن میں آئی تھی پھر بھی ہم نے آگے بڑھ کر چوکیدار سے تصدیق کرنا ضروری جانا۔ اس نے نام سنتے ہی سر ہلا کر کہا۔ "یہی بنگلا ہے؟"

میں نے آفتاب کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلا کر اشارہ کیا تو میں نے گارڈ سے پوچھا۔ "ہمیں انور صاحب سے ملنا ہے۔ کیا ہم اندر جا سکتے ہیں۔"

"کیوں نہیں۔ صبح سے شام تک لوگ ان سے ملنے آتے رہتے ہیں۔"

اجازت ملتے ہی ہم نے گیٹ کے اندر قدم رکھ دیا۔ اندر کورٹ یارڈ میں ایک میز اور چار کرسیاں رکھی تھیں۔ ان پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ہمیں اندر آتے دیکھ کر وہ سب ہماری طرف دیکھنے لگے۔ ہم ان کی طرف بڑھتے کہ ایک آدمی تیر کی طرح برآمدے میں آیا اور اس نے پوچھا۔ "کہاں سے آئے ہو، کیا کام ہے؟"

"ہمیں انور صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے بدقت تمام یہ کہا۔ کیونکہ انور کے ساتھ صاحب لگانے پر میرے اندر ایک کالی اندھی سی چل رہی تھی کہ جس شخص کو ہم نے جوتے مار کر محلہ بدر کیا تھا اس کو صاحب کہہ کر مخاطب کرنا پڑ رہا تھا۔

"ادھر سے آئیں۔" اس نے اشارے سے ہمیں برآمدے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا اور ہم اسی جانب بڑھنے لگے۔ مجبوری انسان سے کیا کچھ نہیں کراتی اگر میں صاحب روزگار ہوتا تو اس در پر تھوکنے بھی نہ آتا۔ ویسے مجھے اب بھی کوئی خوش فہمی نہیں تھی' حیرت ضرور تھی کہ ایک اچکا اتنے بڑے بنگلے کا مالک کیسے بن گیا، میں یہی دیکھنے آیا تھا۔ اس شخص کے پیچھے پیچھے ہم برآمدے سے ہوتے ہوئے اندر داخل ہوئے، وہ ایک بڑا سا ہال نما کمرا تھا۔ اس کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر میں مغالطے میں آ گیا کہ کہیں یہ کوئی اور انور تو نہیں ہے۔ اس ہال میں دیوار کے ساتھ کئی صوفے بچھے ہوئے تھے لیکن کسی بندہ بشر کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ ہمیں یہاں کیوں لے کر آیا ہے، میں سوچ میں پڑ گیا کیونکہ انور بھی نظر نہیں آیا تھا۔ ہمیں ساتھ لانے والے نے کہا۔ "آپ بیٹھ جائیں۔ اندر والوں کے باہر آتے ہی آپ کو بلا لیا جائے گا۔"

ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے مگر اسے بیٹھنا نہیں کہیں گے، یوں سمجھیں ہم ٹک گئے۔ یعنی پیٹھ ہلکی سی ٹکائی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اس کمرے میں تھا ہی کیا جسے دیکھ کر کچھ اخذ کیا جاتا۔ وال ٹو وال کارپیٹ اور کارپٹ بھی مہنگا والا۔ ایسا دبیز کہ پاؤں دھنسنے لگیں۔ کمرے کی داہنی دیوار سے لگا کر کھڑا کیا گیا ایک مجسمہ جو شاید وینس کا تھا۔ اور وہ' ہمیں ساتھ لانے والا وہ تو مشینی آدمی کی طرح ایک جانب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اندر سے دو آدمی باہر نکلے۔ ابھی ہم ان دونوں کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ گھنٹی بجی اور اس مشینی آدمی کے اندر ہل چل پیدا ہوئی۔ اس نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا۔ "جاؤ بھائی نے طلب کیا ہے۔"

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تبھی آفتاب نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "بس اب اٹھ لو۔"

www.PakiBooks.Site

ہم اٹھ کر اندر کی طرف بڑھے۔ اس کمرے کے بعد ایک اور کمرا تھا۔ اس کمرے کے اندر ہم داخل ہوئے تو وہ کمرا بھی کسی عاشق کے دل کی طرح خالی تھا۔ اسے پار کر کے ہم ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے میں ایک نیبل تھی۔ جہازی سائز کی نیبل، اس نیبل کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر انور بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے خاصا تبدیل ہو گیا تھا۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی۔ فرنچ کٹ داڑھی۔ اس نے واس کوٹ پہن رکھی تھی۔ بقیہ جسم نیبل کے پیچھے تھا۔ اس کے سامنے کیا۔ پورے کمرے میں دوسری کوئی کرسی نہیں تھی اس لیے ہم اس کے سامنے پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہمیں دیکھا پھر کہا۔ "تمہیں حیرت ہو رہی ہے نا کہ اس کمرے میں کوئی اور کرسی کیوں نہیں ہے تو سن لو۔" وہ چند لمحوں کے لیے رکا پھر اس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور پھر بولا۔ "اس لیے کوئی کرسی نہیں رکھی ہے کہ یہاں آنے والوں کو بیٹھنے کی اجازت نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ رکا۔ اس کے باتیں کرنے کا انداز بھی بالکل بدل گیا تھا۔ اب وہ کسی بھی رخ سے پانچ سال پہلے والا انور لگ نہیں رہا تھا۔ باتوں کا سلسلہ اس نے روکا تو میں نے چاہا کہ اس سے پوچھوں، اتنا دھانسو بنگلا کیسے لیا۔ باہر جو گارڈ کھڑا ہے اس کی تنخواہ کون دیتا ہے۔ تم تو ایک معمولی اچکے ہو۔ اس سے موبائل چھین لیا اس کے گھر میں کود کر کوئی قیمتی چیز اڑا لی۔ اب تو وہ انور رہے نہیں' ایسی کون سی گیدڑ سنگھی مل گئی جس نے تمہیں اوپر سے نیچے تک بدل دیا۔ شاید وہ میرے چہرے کو پڑھ رہا تھا اس نے کہا۔ "یہ بھی سن لو' یہاں کسی کو بولنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اس کمرے میں صرف میں بولتا ہوں۔ آنے والے صرف سنتے ہیں لیکن تم لوگ میرے غربت کے ساتھی ہو۔ مجھے یاد ہے تم نے کئی بار اپنے پیسوں سے مجھے کھانا بھی کھلایا تھا۔ میں اسی احسان کا بدلہ چکا رہا ہوں۔ آج سے تم لوگ بے روزگار نہیں رہے۔ ایک بڑے شخص کے خاص آدمی بن چکے ہو۔ اب تم پر کوئی بھی آدمی' خواہ وہ پولیس والا ہی کیوں نہ ہو ایک جملہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ تمہاری نوکری کا بندوبست ہو جائے گا۔ میرا کام ذرا الجھا ہوا ہے۔ اس میں نئے لوگ فٹ نہیں ہو سکتے اس لیے ایک دوسرے آدمی کے پاس بھیج رہا ہوں۔"

میں نے پھر بھی پوچھنے کی جرأت کر لی۔ "مگر ہم کریں گے کیا؟"

"اس بار بول لیا۔ آئندہ احتیاط کرنا۔ اس کمرے میں آ کر کبھی بھی کوئی جملہ اپنی زبان سے نہ نکالنا۔ اب تمہیں کرنا کیا ہے یہ شکیل بتا دے گا، وہی شخص جو تمہیں اندر لایا تھا۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔"

آفتاب تو گویا اس کے ٹرانس میں آ چکا تھا۔ ابھی انور کا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ملٹری والوں کی طرح حکم سنتے ہی اباؤٹ ٹرن ہو گیا۔ مڑتے ہی اس نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے تھے۔

ہم دوسرے کمرے میں پہنچے تو وہ اب بھی اسی جگہ کھڑا تھا۔ اس میں صرف اتنی سی تبدیلی آئی تھی کہ وہ جہاں کھڑا تھا وہاں دیوار پر ایک انٹرکام کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور حکمیہ انداز میں بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

وہ روبوٹ کی طرح چلتا ہوا داہنی جانب کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کی تقلید میں ہم بھی ادھر ہی بڑھنے لگے۔ اندر کے کمرے میں کچھ لوگ بیٹھے تھے ان میں سے ایک کی طرف وہ بڑھا۔ اس نے کہا۔ "ماجے کو فون کر کے کہہ دو، دو بندے جو انور صاحب کے خاص بندے ہیں انہیں کام پر لگا دو۔"

اس بندے نے کسی سے فون پر بات کی پھر ایک پرچی لکھ کر دی۔ "اس پتے پر چلے جاؤ کام ہو جائے گا۔" ہم وہاں سے نکلے اور اس پتے پر جا پہنچے۔

وہ ایک کچی آبادی تھی مگر جس گھر کا پتا دیا گیا تھا وہ دو منزلہ تھا اس گھر کے دروازے پر جس شخص سے ملاقات ہوئی اسے ہمارے بارے میں فون پر بریف کر دیا گیا تھا۔ وہ ہمیں لے کر اندر بڑھا۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر وہاں بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر..... شخص پر پڑی جو اپنے سامنے ایک رجسٹر کھولے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے پہنچ کر ہمیں لانے والے نے کہا۔ "آج سے یہ بھی ہماری ٹیم کا حصہ ہے۔ اسے تمام باتیں سمجھا دو۔"

اس شخص نے سر تا پا ہمارا جائزہ لیا پھر بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

ہم اس کے سامنے بچھی تین کرسیوں میں سے دو پر برابر برابر میں بیٹھ گئے۔ اس نے دوبارہ سے ہمارا جائزہ لیا پھر بولا۔ "اس وقت بیروزگاری بہت بڑھ گئی ہے۔ پڑھے لکھے لڑکے سڑکوں پر چپل گھسیٹتے پھر رہے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر رونا آتا ہے اس لیے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد اس مسئلہ کا ایک حل ڈھونڈا گیا۔ بیکار نوجوانوں کو روزگار دینے کی ایک اسکیم شروع کی گئی ہے۔ اس طرح آپ جیسے پڑھے لکھے نوجوان ہر روز ایک معقول رقم گھر لے جا سکیں گے۔" اس نے

www.PakiBooks.Site

اپنی تقریر روک کر ہمارا جائزہ لیا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔
''کتنی بار چوری کی اور کتنی بار پولیس کے ہتھے چڑھے؟''

اس کے اس سوال نے مجھے چونکا دیا۔ حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یہی حال آفتاب کا تھا۔ ہمیں حیرت میں دیکھ کر اس نے کہا۔ ''یہ سوال اس لیے کیا ہے کہ آنے والے ایام ایسی نوید لے کر آئیں گے۔ زندگی چور پولیس کھیلنے میں گزرے گی۔'' پھر اس نے دراز سے دو ٹی ٹی نکال کر ہمارے سامنے رکھی۔ ''اس کو چلانا آتا ہو یا نہ آتا ہو مگر رکھنا ضروری ہے۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ یہ کامیابی کی کنجی ہے۔'' اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ کچھ چہرے ہوتے ہی ایسے ہیں کہ ان پر مسکراہٹ بھی کھیلنے سے ڈرتی ہے۔ وہ بھی کچھ ایسا ہی چہرہ لیے میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے وہاں رکھی میز کی دراز سے دس ہزار کی رقم نکالی اور میری طرف بڑھا کر بولا۔ ''یہ اس ماہ کی آدھی تنخواہ۔ آدھی بعد میں ملے گی۔ تمہاری تازہ تصویر جو اندر آتے ہوئے آٹومیٹک کیمرے نے کھینچی تھی وہ ہمارے بہی خواہوں کو بھیج دی ہے' تاکید کردی ہے کہ پولیس والوں سے تم کو بچائے رکھیں' تم پر سے آنکھیں ہٹائے رکھیں۔''

''مگر ہمیں کرنا کیا ہے؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ اس لیے کہ نوازشات کے ساتھ ٹی ٹی بھی تو دی گئی تھی۔ میں جواب طلب انداز میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا کہ وہ بولا۔

''تم نوکری کے لیے آئے ہو نا؟ نوکری مل گئی۔ اب مالک جو کام لینا چاہتا ہے کرتے چلے جاؤ۔''

''مگر کرنا کیا ہوگا اس بارے میں بھی تو پتا چلے۔''

''وہی بتانے جا رہا ہوں۔'' اس نے سسپنس بھرے انداز میں کہا۔ ''بس تھوڑا انتظار کریں۔ میں چاہ رہا ہوں کہ باریک بینی کے ساتھ بتاؤں کیونکہ آپ لوگ اس دنیا میں پہلی بار داخل ہوں گے۔ اس سے پہلے شاید آپ نے ایک چیونٹی تک نہ ماری ہوگی لیکن اب آپ کو مرد بن کر جینا ہوگا۔ ابتدا میں یہ کام آپ کو پسند نہ آئے مگر یاد رکھیں کہ اس دنیا میں جینے کے لیے چھیننا ضروری ہے۔ یہ دنیا کسی کو کچھ نہیں دیتی اگر جینا ہے تو چھیننا سیکھیں۔''

اس نے رک کر ہمارے چہروں پر نظر ڈالی پھر کچھ بولتا کہ میں نے نیا سوال داغا۔ ''یوں تو میں سمجھ چکا ہوں کہ ہمیں اب جرائم کی دنیا میں جدوجہد کرنی ہے لیکن یہ بتادیں کہ کس طرح اپنا مقام حاصل کرنا ہے۔''

''وہی بتا رہا ہوں۔'' اس نے ناگواری سے کہا پھر سانس لے کر بولا۔ ''آپ کے پاس اتنی رقم بھی نہیں ہے کہ آپ ایک پیالی چائے پی سکیں.... مگر آپ کا پڑوسی معمولی معمولی بات پر ہزار ہزار لٹا رہا ہے۔ آپ کے پاس سستا سا بٹنوں والا موبائل ہے اور آپ کے پڑوسی کے پاس آئی فون کی اعلیٰ قسم ہے۔ آپ سارا دن محنت کے بعد دس روپیا کماتے ہیں اور وہ دس منٹ میں اس سے زیادہ لٹا دیتا ہے۔ ایسا کیوں، اس لیے کہ وہ رقم آپ کی محنت کی ہوتی ہے۔ آپ سے محنت کرا کر وہ عیش کرتا ہے اگر آپ میں ہمت ہے تو وہ رقم آپ چھین سکتے ہیں لیکن ہمت نہ ہونے کی وجہ سے وہ عیش کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے ہم ہمت پیدا کرا رہے ہیں۔''

''میں اب تک سمجھ نہیں پایا ہوں کہ آپ کیسے ہمت پیدا کرائیں گے۔''

''آپ کسی کو ایک تھپڑ نہیں مار سکتے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ مضبوط آدمی ہے۔ اگر آپ کا طمانچہ اٹھا تو جواب میں وہ آپ کی ہڈیاں توڑ دے گا۔ ہم آپ کو ہمت کے ساتھ قوت بھی دیں گے۔ آپ جو مرضی ہو کریں۔ آپ کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکے گا۔''

''لیکن اس کا آپ کو فائدہ کیا ہوگا؟''

''اب ہم اپنے خاص پوائنٹ کی طرف آتے ہیں۔ آپ بازار کے پرلی طرف کھڑے ہو جائیں گے۔ وہ بھی رات کے وقت پھر جیسے ہی کوئی آئے گا آپ اس پر ٹی ٹی تان لیں۔ اس کی جیب میں جو کچھ ہوگا وہ نکال لیں کیونکہ وہ آپ کا ہوگا۔ موبائل ہر جیب میں ہوتا ہے۔ وہ موبائل اس دکان میں پہنچا دیں گے وہ ہاتھ کے ہاتھ آپ کو پیسا دے دے گا۔'' کہہ کر اس نے دکان کا کارڈ بڑھا دیا۔

''لیکن جناب یہ تو رہزنی ہوئی؟'' میں نے دبا دبا سا احتجاج کیا۔

''تو پھر مسجد کے سامنے کھڑے ہو جائیں اور اللہ کے نام پر طلب کریں۔ ارے میاں' میں نے تو پہلے ہی بتایا اس دنیا میں جینا ہے تو چھیننا پڑے گا۔ باس نے پیسا کمانے کا طریقہ آپ کو بتا دیا۔ آپ کی سیکیورٹی کا بھی انتظام کر دیا۔ یاد رکھیں آپ کے پاس جو پیسا آتا ہے وہ آپ کا ہی ہوتا ہے۔ اب اپنا پیسا واپس لیں یا آرام سے بھوکے مریں۔ یہ آپ پر منحصر ہے۔''

''نہیں جناب آپ گائیڈ کریں ہم آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے۔'' آفتاب نے جلدی سے کہا۔ وہ تو

www.PakiBooks.Site

پہلے ہی حالات سے تنگ تھا۔ جلد گھبرا جانے والا اسی لیے اس نے ہتھیار ڈال دیا۔ اس کی وجہ سے میں بھی خاموش رہ گیا۔

''تم دونوں کے لیے ایک بائیک دی جائے گی۔ جب مرضی ہو کام کے لیے نکل جانا۔ جتنے موبائل ملیں انہیں اس دکان پر جس کا کارڈ دیا ہے، پہنچا دینا۔ وہ بغیر کچھ پوچھے قیمت دے دیا کرے گا۔ دن بھر جو کچھ کماؤ گے اس کا صرف ٹین پرسنٹ اسی دکان پر رکھوا دو گے۔ اب دوبارہ یہاں آنا نہیں ہے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت پڑے تو اسی دکان پر کہہ دینا۔ وہ چیز پہنچا دی جائے گی یا اس بارے میں نئی ہدایت مل جائے گی۔ زندہ رہنے کا طریقہ کار ہم نے سمجھا دیا اب آگے بڑھنا تمہارا کام ہے۔'' اس نے رک کر سانس لیا پھر بولا۔ ''ویسے اطمینان رکھنا۔ جہاں تم کھڑے رہو گے وہاں کیا آس پاس بھی کوئی پولیس والا موجود نہیں ہوگا۔ بس پبلک سے بچتے رہنا۔'' کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

ہم دونوں وہاں سے نکلے۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے آگے بڑھتے رہے۔ کچھ دور آنے کے بعد میری نظر ایک ریسٹورنٹ پر پڑی۔ بھوکے تو ہم تھے ہی سوچا اب جب ہمارے پاس پیسے ہیں تو کیوں نا کچھ کھا پی لیا جائے۔ یہ سوچ کر میں نے آفتاب سے پوچھا۔ ''اب تو جیب میں پیسے بھی ہیں تو کیوں نا کچھ کھا پی لیا جائے؟''

''ارادہ نیک ہے۔ خود مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔'' کہہ کر اس نے قدموں کا رخ ریسٹورنٹ کی جانب موڑ لیا۔

ہم دونوں ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے اور ایک خالی میز کی جانب بڑھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد میں نے آرڈر دیا اور پھر اس کی جانب متوجہ ہوا۔ ''اس کام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم نے کبھی رہزنی کی نہیں کیا اس کام میں کامیابی ملے گی؟''

''ہر شخص کے لیے ہر کام نیا ہوتا ہے۔ ابتدا میں کچھ پریشانیاں آئیں گی پھر ہم عادی ہو جائیں گے۔ یوں بھی جب ہماری سیکیورٹی کی ذمے داری اس نے لی ہے تو پھر فکر کیسی؟''

''سیکیورٹی کے بارے میں فکر نہیں ہے۔ جب وہ اتنا بڑا ریکیٹ چلا رہا ہے۔ یقیناً اس کے کم سے کم ہزار بندے تو پورے شہر میں دندناتے پھر رہے ہوں گے۔ اس کے انداز و اطوار سے ہی پتا چل رہا ہے کہ وہ یہ کام منظم طریقہ پر کر رہا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ ہر روز اسے دو ڈھائی لاکھ سے کم بھتا یعنی لوٹنے والوں سے کمیشن نہیں مل رہا ہوگا۔ اتنا کمیشن وہ اکیلے کھاتا نہیں ہوگا۔ اس نے آگے بھی ایسے لوگوں کو ساتھ ملا رکھا ہوگا جو اس کے مددگار ہوں گے۔ مجھے ڈر ایک اور بات کا ہے۔'' میں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا لیکن ذرا مختلف انداز میں۔

''کون سا ڈر؟'' آفتاب نے پوچھا۔

''یہ ابھی نہیں بعد میں بتاؤں گا۔'' کہہ کر میں کھانوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

ہم نے خاموشی سے کھانا ختم کیا اور پھر باہر نکل آئے۔ میری جیب میں ایک بڑی رقم تھی جسے میں اپنے گھر والوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے کہ ان کا رویہ میرے ساتھ کیسا تھا یہ میں بتا ہی چکا ہوں۔ گھر والوں کے رویہ کی وجہ سے ہی میں نے انوار کی چاکری منظور کر لی تھی۔ اس نے خود فون کر کے بتا دیا تھا کہ رات گیارہ بجے گھر سے نکل آنا ہے۔

ہدایت کے مطابق ہم رات گیارہ بجے بتائے گئے مقام پر پہنچ گئے تھے لیکن جیسے ہی سوچا کہ ہمیں کسی سے موبائل چھیننا ہے تو چھکے چھوٹ گئے تھے۔ دل کی دھڑکن بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس بات کا اندازہ تو سب کو ہے کہ حجاب ٹوٹنا اصل ہے۔ جب تک حجاب رہتا ہے انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ جیسے ہی اس کی جھجک ٹوٹتی ہے وہ سب کچھ کر لیتا ہے۔ اس موقع پر مجھے پڑوسی ملک کا ایک ٹی وی ڈراما یاد آ رہا ہے۔ بھشم سہانی کے ناول ''تمس'' پر وہ ڈراما تھا۔ اس میں آر ایس ایس والے ایک لڑکے کو تیار کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو چاقو مارے، لیکن وہ لڑکا جھجک رہا تھا۔ اسے خون دیکھ کر خوف آجاتا تھا۔ اس کی جھجک توڑنے کے لیے وہ لوگ اس کے ہاتھ میں چھری دے کر کہتے ہیں کہ مرغ ذبح کرو۔ اس سے زبردستی ایک مرغ کے گلے پر چھری پھروا تے ہیں۔ بس اس کی جھجک ٹوٹتی ہے اور وہ وہی خون آلود چھری لے کر چیختا ہوا باہر جاتا ہے اور سڑک کنارے کھڑے ایک مسلمان خوانچہ فروش کے پیٹ میں چھری مار دیتا ہے۔

انور اینڈ کمپنی نے بھی میری اور آفتاب کی جھجک ختم کرنے کے لیے ایک سنسان راستے پر مجھے کھڑا کر دیا تھا۔ تبھی دور سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ ارباز نامی شخص جس کے ساتھ ہم یہاں آئے تھے اس نے اس بندے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے پاس موبائل ضرور ہوگا۔ اسے آفتاب روکے گا اور تم اس کی تلاشی لے کر وہ کچھ جو جیب میں ہوگا نکال لینا۔''

یہ ہماری پہلی واردات تھی۔ ہمارے دل دھڑک رہے

www.PakiBooks.Site

تھے۔ جسم میں رعشہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہاتھ پیروں کی جان نکل رہی ہے۔

ارباز نے میری حالت دیکھ کر کہا۔ ''خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس پیڑ کے پیچھے کھڑے ہیں۔ اگر کوئی خطرہ محسوس ہوا تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔''

ارباز تو ہدایت دے کر چلا گیا لیکن ہم اسی طرح کھڑے رہے۔ کیفیت میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی۔ میں نے پہلے اس پیڑ کی طرف دیکھا جدھر ارباز گیا تھا۔ پھر اس بندے پر نظر مرکوز کر دی جو سیٹی میں کسی فلم کی دھن بجاتا ہوا وہ نزدیک آتا جا رہا تھا۔

جیسے جیسے وہ قریب آ رہا تھا میرے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے ٹی ٹی جن ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا وہ خود شاخ بید مجنوں بنا ہوا تھا مگر میرے سامنے جو بندہ تھا۔ جس پر میں نے ٹی ٹی تان رکھی تھی وہ مجھ سے زیادہ کانپ رہا تھا اس لیے مجھے کامیابی مل گئی یعنی آفتاب نے اس کی جیب سے موبائل اور پرس نکال لیے۔ اس کے بعد بھی ایک دو واردا تو ں میں مجھے دشواری ہوئی لیکن بعد میں دل ایسا پتھر ہو گیا کہ کسی پر رحم ہی نہ آتا۔ اکیلے بندے کو دیکھتے ہی گھیر لیتا اور پھر ٹی ٹی دکھا کر سب کچھ لوٹ لیتا۔ ایک دو بار پبلک کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بھی بچا تھا۔

پبلک کے ہتھے چڑھنے کا مطلب تھا کہ موت۔ اسی وجہ سے ہمیں بچائے رکھنے والے آس پاس ہی ہوتے تھے جو تماش بینوں کو پیچھے ہٹا کر آگے آتے اور پھر ہمیں گھیرے میں لے کر ''چلو تھانے چلو'' کہتے ہوئے اپنی گاڑی میں بٹھاتے اور دور لے جا کر اتار دیتے۔ اگر کوئی زیادہ ہیرو بننے کی کوشش کرتا تو اسے تھانے میں گواہی دینے چلیں کہہ کر ڈراتے۔ اس خوف سے وہ خود ہی پیچھے ہٹ جاتا۔ گویا ہماری زندگی میں راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ گھر میں اماں کو بتا دیا تھا کہ مجھے ایک بڑی فرم میں نوکری مل گئی۔ ان کے ہاتھ میں بڑی بڑی رقم رکھنے لگا۔ ان کا رویہ ہی بدل گیا۔ بہن بھی اب محبت جتانے لگی تھی۔ اس درمیان ایک دو واردا تیں ذرا ہٹ کر بھی کیں۔

کبھی کبھی ہم پولیس کی وردی پہن کر بھی واردات کرتے تھے تاکہ لوگ یہی سمجھیں کہ یہ واردات پولیس والوں کی ہے۔ اس دن بھی ہم دونوں ایک سنسان مقام پر کھڑے تھے کہ دور سے آتی ہوئی پولیس موبائل نظر آئی۔ موبائل دیکھتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ اگر جسم پر خاکی وردی نہ ہوتی تو بات دیگر تھی۔ راہ گیر سمجھ کر پولیس والے دو ایک دھمکی دیتے اور اپنی راہ پر چلے جاتے لیکن اس وقت تو وردی کی وجہ سے ہم کسی نہ کسی پریشانی میں گھر سکتے تھے اس لیے ہم نے الٹی طرف چلنا شروع کر دیا۔ پولیس کی موبائل نزدیک آتی جا رہی تھی لیکن ان کے نزدیک آنے سے پہلے ہی ہم نے ایک فیصلہ کیا اور سامنے والے گیٹ پر جا کر رک گئے جیسے ہمیں وہیں آنا تھا۔ موبائل نزدیک آتی جا رہی تھی کہ ہم نے بیل بجا دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا جیسے کوئی دروازے کے پاس کھڑا ہمارا منتظر تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ہم اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ کھولنے والا حیران نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا کہ ہم نے جلدی سے کہا۔ ''ہمیں تھانے سے ڈیوٹی دینے کے لیے بھیجا گیا ہے۔''

''مگر آپ اندر کیوں آ گئے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہمیں اندر بیٹھ کر آپ لوگوں کی حفاظت کرنی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ آفتاب بالکل خاموش تھا۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کون سی چال چلنے والا ہوں۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ پہرا باہر بیٹھ کر دیا جاتا ہے اور آپ اندر بیٹھ کر دیں گے؟''

اتنی دیر میں ایک عورت بھی آ کر اس شخص کے برابر کھڑی ہو گئی تھی۔ یقیناً وہ اس کی بیوی ہو گی۔

''سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمیں خبر ملی ہے کہ آپ کے گھر میں ڈاکا پڑنے والا ہے۔ اسی وجہ سے مجھے بھیجا گیا ہے۔''

''او ہو..... میں پہلے ہی کہنے والی تھی۔ ایک ساتھ اتنی بڑی رقم گھر لے کر نہ آؤ لیکن تم میری سنتے کب ہو۔ بینک والوں سے ڈاکوؤں کو خبر مل گئی ہو گی اور وہ.....'' بیوی نے کہا تھا کہ مرد نے ڈانٹا۔

''اللہ کی بندی کبھی تو چپ رہا کرو۔''

لیکن وہ عورت بھی بولنے کی گویا مشین تھی۔ شوہر کے روکنے پر بھی نہ رکی اور بولتی چلی گئی۔ ''کیا ضرورت تھی کہ ایک ساتھ دس لاکھ روپے گھر لے کر آؤ۔''

اتنی بڑی رقم کا سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔ یہی بات ہوئی ہو گی۔ کسی نے خبر دے دی ہو گی کہ آپ کے شوہر رقم نکال کر لے گئے ہیں اور انہوں نے ڈاکوؤں کو خبر دے دی۔''

''آپ لوگ دروازے پر کیوں کھڑے ہیں اندر آ جائیں۔'' اس نے ہمیں دعوت دی اور ہم اندر کی جانب بڑھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر پر حاوی ہے۔ بیوی کے آ جانے پر وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ ہم اس کے کہنے پر

www.PakiBooks.Site

اندر کی جانب چل پڑے۔ پہلا ہی کمرا ڈرائنگ روم تھا۔ اس نے اندر پہنچتے ہی کہا۔ ''آپ لوگ یہاں بیٹھیں۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' اس کا شوہر بھی جانے لگا تو اس نے کہا۔ ''ارے آپ کہاں چلے' مہمانوں کے پاس بیٹھیں۔''

اس کے شوہر نے اپنی زبان پر اس طرح تالا لگا لیا تھا جیسے اسے بولنا ہی نہیں آتا ہو۔ اس کی خاموشی کو توڑنے کے لیے میں نے کہا۔ ''بھائی صاحب ایسی کیا ضرورت پڑ گئی تھی کہ آپ اتنی بڑی رقم بینک سے گھر لے آئے؟''

''دراصل ہم اس بار قربانی میں حصہ نہیں لیں گے، خود جانور لائیں گے، وہ بھی اچھی قسم کا۔'' چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس عورت نے کہا۔ ''ویسے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے رقم کی حفاظت کے لیے اسے الماری کے لاکر میں نہیں رکھا ہے۔ اپنے بیڈ کے گدے کے نیچے رکھا ہے جہاں کسی کا دھیان ہی نہیں جائے گا۔''

میں نے چائے اٹھا کر سپ لیا اور پھر عورت سے بولا۔ ''گھر میں آپ دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے؟''

''پہلے ان کی اماں ساتھ رہتی تھیں لیکن ان کا مزاج ذرا تیز ہے۔ اب وہ بیٹی کے ساتھ رہنے لگی ہیں۔ ہمارا صرف ایک بیٹا ہے جو مری میں پڑھ رہا ہے وہیں بورڈنگ میں رہتا ہے۔ سال کا سال آتا ہے۔'' عورت خاصی باتونی لگ رہی تھی۔ چائے پینے کے بعد میں نے آفتاب کو اشارہ کیا اور اس نے ٹی ٹی نکال کر عورت کے سر سے لگا دیا پھر اس کے شوہر سے بولا۔ ''بالکل خاموش رہنا ہے۔ آواز نکالی تو اسے گولی مار دوں گا۔''

میں نے پھرتی سے وہیں رکھے دوپٹے سے شوہر کے ہاتھ پاؤں باندھے اور پھر الماری کھولی۔ سامنے ہی کئی چٹھے لٹکے ہوئے تھے اس سے عورت کو باندھا پھر گدے کے نیچے سے رقم نکالی اور انہیں منہ بندھی حالت میں چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ ایک ہی جھٹکے میں قسمت نے اتنی بڑی رقم دے دی تھی۔

خوشی سے سرشار ہم بڑھتے جا رہے تھے۔ ہماری قسمت کہ ایک بھی رکشا ٹیکسی نظر نہیں آئی۔ ابھی ہم مین روڈ پر پہنچے بھی نہیں تھے کہ یکا یک سامنے والی گلی سے ایک بائیک والا نکلا۔ اسے دیکھتے ہی ہوش ٹھکانے آ گئے۔ پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا تھا۔ وہ انسپکٹر عثمان تھا۔ ہمارے علاقے کا ایس ایچ او۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی پوچھا۔ ''کس تھانے کے ہو؟''

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے پہچانا نہیں پھر بھی اس سے کچھ بولنا گلے میں پھندا ڈالنے والی بات تھی اس لیے کہا۔ ''ہم کسی بھی تھانے کے نہیں ہیں۔ ڈرامے کی شوٹنگ سے واپس آ رہے ہیں۔''

''کپڑے بدلے کیوں نہیں؟'' اس نے جائزہ لے کر پوچھا۔

''بس سروقت بہت ہو گیا تھا اسی لیے وردی میں ہی نکل آئے۔''

''قمیص اتارو۔'' اس نے حکم دیا۔ مرتے کیا نہ کرتے۔ اس کی جانب پیٹھ کر کے قمیص اتاری اور پوٹلی بنا کر بغل میں داب لی۔

''آئندہ وردی پہن کر کبھی بھی اِدھر اُدھر آنے جانے کی ضرورت نہیں۔'' کہہ کر وہ اپنی بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔

جتنی دیر وہ ہمارے ساتھ رہا مجھے تو ڈر سے اپنا گلا خشک ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اگر بنیائن کے نیچے رکھی گڈیاں اسے نظر آ جاتیں تو خیر نہیں تھی۔

وہاں سے ہم تقریباً دوڑتے ہوئے سڑک تک آئے۔ قسمت اچھی تھی کہ سڑک پر آتے ہی رکشا مل گیا اور ہم اپنے گھر تک پہنچ گئے۔

پھر رقم کا بٹوارا کیا اور سونے کے لیے چل دیئے۔

اگلی صبح جب اٹھا تو اپنے اندر ایک عجیب سی طاقت محسوس ہو رہی تھی اس لیے کہ جیب میں اتنی بڑی رقم تھی۔ بہن نے آ کر میٹھے انداز میں کہا۔ ''چائے بنا دی ہے۔ روٹی ہاٹ پاٹ میں رکھی ہے۔ جب دل کرے کھا لینا۔ ہم کام پر جا رہے ہیں۔ پرسوں عید ہے، بہت کام پڑا ہے۔'' پھر رک کر بولی۔ ''بھائی ایک بات کہوں؟''

''ہاں بولو۔''

''اب تو آپ کی اتنی اچھی نوکری لگ گئی ہے۔ ایک کام کیوں نہیں کرتے؟''

''کون سا کام؟''

''ہر سال بڑی عید پر ہم دوسروں کے ہاں سے آئے گوشت کے انتظار میں رہتے ہیں، کیوں نا اس بار آپ بھی جانور لے آئیں۔''

''سوچتا ہوں'' کہہ کر میں نے کروٹ بدل لی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچنا شروع کر دیا' جب سے پیدا ہوا ہوں اس گھر میں قربانی ہوئی نہیں ہے۔ اتنا پیسا جیب میں ہے، کیوں نا اس بار ہم بھی قربانی کریں۔ اس طرح اماں پر تو رعب پڑے گا ہی۔ محلے والے بھی رعب میں آ جائیں

www.PakiBooks.Site

گے اس لیے بھی کہ ہمارے محلے میں بھی کوئی قربانی کرتا نہیں ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں تقریباً اچھل کر بستر سے اترا اور بھاگتا ہوا باتھ روم تک گیا۔ کئی سال پہلے مجید بھائی نے ایک بکرا کیا تھا۔ اس کے علاوہ کسی نے کبھی قربانی کی ہو مجھے تو یاد نہیں۔ مجید کا ریکارڈ توڑنا ضروری ہے۔ یہ سوچ کر میں نے ٹھان لیا کہ اس بار ضرور قربانی کروں گا۔

کچھ دیر سونے کے بعد گھر سے نکل آیا۔ چائے اور روٹی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ جیب میں رقم تھی اور بشیر بھائی کا ڈھابا سامنے تھا جہاں پراٹھے بن رہے تھے۔ میں کھانے بیٹھ گیا۔ ابھی ناشتا ختم بھی نہیں کیا تھا کہ آفتاب آ گیا۔ اس کا چہرہ بھی کھلا پڑ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”پراٹھے کھا رہے ہو۔ چلو میرے لیے بھی منگواؤ۔“

میں نے اس کے لیے بھی آرڈر دیا۔ چائے کا سپ لیتے لیتے میں نے اس سے کہا۔ ”یار اپنے محلے میں بھی کسی نے قربانی کی نہیں، کیوں نہ اس بار ہم بھی قربانی کریں؟“

”لیکن یار لوگ پوچھیں گے کہ اتنی بڑی رقم آئی کہاں سے؟“ آفتاب نے کہا۔

”لوگوں کا تو کام ہی ہے کچھ نہ کچھ کہنا۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ قربانی ضرور کریں گے۔ اب تو انور بھائی کا بھی ساتھ ہے اس لیے فکر کیسی؟ رات والی رقم سے یہی کر لیتا ہوں آگے اللہ مالک۔“

وہ بھی میری باتوں سے متفق ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے۔“

اسے ہم خیال پا کر میں نے کہا۔ ”یار بکرے لانے سے بہتر ہے کہ گائے لے آئیں۔“

”تیرے پاس جتنی رقم ہے اس سے اچھا جانور ملنے سے رہا۔“ آفتاب بولا۔

”دیکھ اب رقم کی ہمارے پاس کمی ہے نہیں۔ انور بھائی کا سر پر ہاتھ ہے اس لیے ایسا کر تو بھی میرے ساتھ حصہ ڈال لے۔ دونوں کی رقم ملا کر ایک اچھا جانور آ جائے گا۔“

آفتاب نے آج تک میری کسی بات کی مخالفت نہیں کی تھی۔ میں جو کہتا وہ کرنے پر فوراً تیار ہو جاتا۔ اس نے اپنی رقم جو ساتھ لیے ہوئے تھا۔ میرے ہاتھوں پر رکھ دی۔ میں نے رقم جیب میں رکھی اور کہا۔ ”آج کام پر نہیں جائیں گے۔ انور بھائی کو فون کر کے کہہ دے۔ کہنا کہ ہدایت کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر ہم منڈی چلیں گے۔“

اس وقت میرے پیر زمین پر پڑ ہی نہیں رہے تھے۔ کسی نہ کسی طرح دن گزرا اور رات میں ہم منڈی کے لیے نکل پڑے۔ وہاں تک جانے کی پریشانی نہیں تھی۔ جانور لانے لے جانے والی سوزوکیاں لوگوں کو بھی لے جاتی تھیں۔ ایسی ہی ایک سوزوکی میں ہم بیٹھ گئے۔

سوزوکی ابھی شہر سے باہر نکلی ہی تھی کہ یکا یک ہمارے آگے چلتی ہوئی ایک ڈبل کیبن گاڑی بیچ سڑک پر رک گئی۔ سڑک پر ٹریفک نام کو تھی۔ اگر یہی حرکت ہائی وے یا کسی دوسری چلتی ہوئی سڑک پر ہوتی تو گاڑیاں ٹکرا جاتیں۔ ہمارا ڈرائیور گالیاں بکتا ہوا نیچے اترا لیکن ڈبل کیبن سے اترنے والوں کو دیکھ کر اس کا غصہ ہوا ہو گیا۔ وہ سب مسلح تھے۔ انہوں نے ہماری طرف اسلحہ تان لیا اور سب کو اترنے کو کہا۔ ایسا میں نے بھی سن رکھا تھا کہ منڈی کے راستے پر ڈاکو ناکا لگا کر لوٹ لیتے ہیں۔ منڈی جانے والوں کے پاس اچھی خاصی رقم ہوتی ہے اس لیے ایک ہی جھٹکے میں وہ بڑی رقم کما لیتے ہیں لیکن ان لوگوں کی گاڑی اور حلیہ دیکھ کر نہیں لگ رہا تھا کہ یہ لوگ ڈاکو ہوں گے اس لیے ہم سب سوزوکی سے نیچے اتر آئے لیکن کسی نے سچ کہا ہے۔ جو جیسا ہوتا ہے وہ ویسا نظر نہیں آتا۔ ہمارے اندازے غلط نکلے تھے۔ واقعی وہ سب ڈاکو تھے اور انہوں نے نہایت تیزی سے سب کی تلاشی لی تھی اور جیب خالی کرا لی۔ گویا ایک ہی جھٹکے میں ہمیں خالی کر دیا تھا۔ جس راستے سے رقم ہم تک پہنچی تھی اسی راستے سے ہم خالی بھی ہو گئے۔ اب آگے جانا فضول تھا اس لیے واپس آ گئے۔ وہ تو ایک بڑی رقم کا دکھ تھا لیکن بعد میں بھی ہم نے یہی دیکھا کہ جب تک ہم انور بھائی کے ساتھ تھے، دن بھر میں دس سے پچاس ہزار کما لیتے تھے لیکن وہ پیسا کبھی بھی رہا نہیں اس لیے کہ ایک دن کمائی ہوتی اور چار دن کوئی مرغا نہیں ملتا اس لیے وہی رقم کھا پی جاتے۔ کافی سوچنے کے بعد دماغ نے مشورہ دیا کہ اس راستے کو کچھ دن کے لیے چھوڑ دو، دوسرے ذرائع جس میں ایمانداری سے پیسے ملیں اسے اختیار کر لو۔ اگر یہی حالت رہی تو انور بھائی سے دوبارہ رشتہ استوار کر لیں گے۔

بس میں نے اس خیال کو عملی جامع پہنا دیا۔ ہم نے کراچی چھوڑ کر فیصل آباد آ جانا بہتر سمجھا اس لیے کہ کراچی میں رہتے تو انور بھائی کا ڈنڈا چین لینے نہیں دیتا۔ اب تین سال سے یہاں ہوں اور معمولی سی تنخواہ میں بڑے آرام سے گزر رہی ہے۔ اسی چھوٹی سی تنخواہ سے بہن کی شادی بھی کرا دی۔ اب اپنی بھی ہونے والی ہے۔

www.PakiBooks.Site

خواب عذاب

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
یہ سچ بیتی اس نوجوان قاتل کی ہے جس پر قتل کا الزام تھا۔ قتل، اس نے نہیں کیا تھا، صرف محرک تھا پھر بھی مقتولہ کے گھر والوں نے ایسی شہادتیں بنا دیں کہ وہ پھانسی کا سزاوار ٹھہرا لیکن جب رہائی کا حکم آیا تو وہ مر چکا تھا کیونکہ اسے ہر روز مقتولہ کی روح آکر خوفزدہ کرتی تھی۔ انسانی ذہن کی کجروی کا یہ بیان قارئین کو پسند آئے گی۔

نسرین اختر نینا
(اسلام آباد)

”پلیز مجھے مت مارو، مم..... مجھے معاف کر دو، میں..... میں بہت برا انسان ہوں۔ مجھے..... مم..... میرے بھیانک جرم کی سزا مل چکی ہے۔ میں..... میں پھانسی پر چڑھ جاؤں گا، تمہارے ساتھ کی گئی زیادتی اور ظلم کی سزا پالوں گا۔“ وہ نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ التجائیں کر رہا تھا۔

جیل کی اس کال کوٹھڑی میں ہم چار افراد پھانسی کے منتظر تھے۔ ہم تینوں تو کافی دنوں سے تھے مگر یہ نوجوان ابھی کچھ دنوں قبل ہی لایا گیا تھا۔ سارا دن وہ چپ چاپ ایک کونے میں سر نیہوڑائے بیٹھا رہتا۔ کوئی اس سے بات کرتا یا کچھ پوچھتا تو ہوں ہاں میں جواب دے کر خاموش ہو جاتا

www.PakiBooks.Site

اور خالی خالی نگاہوں سے کوٹھڑی کی بے رنگ و روغن دیواروں کو گھورتا رہتا، جیل کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں اس کا سراپا چھپ سا گیا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں پیلاہٹ نمایاں تھی۔ سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ چہرے کے خدوخال سے ظاہر ہوتا تھا کہ کبھی وہ خوب صورت جوان رعنا ہوگا مگر اب تو جوانی اور خوب صورتی قصۂ پارینہ بن چکی تھی کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا۔ یوں پھانسی گھاٹ کی کوٹھڑیوں میں آنے والے قیدی کافی عرصہ عام بیرک میں گزار چکے ہوتے ہیں۔

اس کوٹھڑی کے مکین ہم تینوں قیدی یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ رات کو نیند میں وہ کیوں بڑبڑاتا اور معافی مانگتا ہے کیونکہ اس کی کیس ہسٹری کا ہمیں علم نہیں تھا۔ نہ ہی وہ خود کسی سے کچھ کہتا تھا۔ ورنہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ پھانسی کی کوٹھڑی کے قیدی جانتے ہیں کہ ان کی زندگی کے گنے چنے دن باقی ہیں اس لیے وہ ایک دوسرے سے کھل مل کر رہتے، اپنی زندگی کے واقعات ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہیں۔ اپنے کیے گئے ظلم پر پچھتاؤں کا اظہار بھی کرتے نماز روزے کی پابندی کرتے ہیں۔ تلاوت کلام پاک کے بعد رو رو کر اللہ تعالیٰ سے اپنے کردہ اور نہ کردہ گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ جب ملاقاتی آتے ہیں تو ان سے بھی معافی کے طلب گار رہتے ہیں۔ بے حد خوش اخلاق اور مہذب ہو جاتے ہیں لگتا ہی نہیں کہ انہوں نے قتل جیسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

مگر کچھ قیدی ہمارے اس ساتھی جیسے بھی ہوتے جو اپنی ذات کے خول ہی میں مقید رہتے اور بغیر کچھ کہے سنے ایک روز پھانسی کے پھندے پر جھول جاتے ہیں عموماً ہوتا یہ ہے کہ انسان فطرتاً متجسس واقع ہوا ہے اور اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول اور اپنے آس پاس موجود لوگوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکے۔ خاص کر ایک قیدی کی زندگی تو یوں بھی محدود سے دائرے میں مقید ہوتی ہے اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ اپنے ساتھی قیدیوں کے بارے ہی میں جاننے کی کوشش کرسکتا ہے اور یہی ہماری بھی کوشش اور خواہش تھی کہ کسی طرح یہ گم صم سا رہنے والا نوجوان اپنے بارے میں کچھ بتائے۔ اپنے جرم کی نوعیت سے ہمیں آگاہ کرے تاکہ ہم اسے تسلی دلاسہ دے سکیں۔ اس کی ہمت بندھائیں اور اسے سمجھائیں کہ زندگی کے جتنے بھی بقایا لمحات اسے میسر ہیں ان میں اپنے گناہوں اور غلطیوں کا اعتراف کر کے اللہ کے حضور معافی کا خواستگار ہو مگر وہ تو کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتا اور مخاطب کرنے والا خود ہی چپ ہو جاتا۔

سارا دن بت بنا رہنے والا رات کو نیند میں اس طرح گڑگڑاتا کہ ہماری نیند اچٹ جاتی۔ یوں بھی سزائے موت کے منتظر قیدیوں کو نیند آتی ہی کہاں ہے۔ وہ تو اپنے اس ہولناک انجام کے بارے ہی میں سوچتے سوچتے وقت گزار دیتے ہیں مگر وہ ایک انوکھا شخص تھا کہ اللہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگنے کی بجائے نیند میں کسی اور سے معافی مانگتا تھا۔ اسی وجہ سے ہم لوگوں کو اس کے بارے میں بے حد تجسس تھا مگر وہ سیدھے منہ بات کرنے کا بھی روادار نہیں تھا۔

ایک رات وہ اس بری طرح بڑبڑانے لگا کہ میں خوفزدہ ہوگیا۔ اس روز کوٹھڑی میں، میں اکیلا ہی تھا۔ باقی دو ساتھی ایک دن پہلے اپنے جرائم کی سزا پا چکے تھے۔ پہلے تو ہم تین تھے اور اس کی بڑبڑاہٹ سے بیدار ہو کر بھی اتنا زیادہ گھبراتے یا خوف زدہ نہیں ہوتے تھے مگر اس رات چونکہ میں اکیلا تھا۔ جیل کی پُراسرار خاموشی میں اس کی آواز خوف زدہ کرنے لگی تھی۔ چنانچہ میں اٹھ کر اس کے قریب گیا اور اسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا اور خالی خالی نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ پھر سسکیاں لیتے ہوئے بھ سے لپٹ کر بولا۔ ''خدا کے لیے بھائی میری مدد کرو۔ وہ..... وہ..... مجھے بہت تنگ کرتی ہے۔ کاش، کاش مجھے جلد پھانسی دے دی جائے، زندگی کا طوق گلے سے اتر جائے اور اس اذیت سے مجھے نجات مل جائے، وہ ہر رات میرے خوابوں میں آکر مجھے اذیت پہنچاتی ہے، میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ راتوں کو نہ سوؤں مگر باوجود کوشش کے بیدار رہنے میں ناکام رہتا ہوں اور نیند خود بخود مجھ پر حاوی ہو جاتی ہے اور وہ آجاتی ہے پھر ساری رات مجھے ذلیل کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلوں، تبھی اس کے انتقام کی آگ بجھے گی مگر..... مگر جب میں جانتا ہوں کہ جلد ہی مجھے پھانسی ہو جائے گی تو پھر میں کیوں خودکشی کر کے ایک اور گناہ کا ارتکاب کروں۔ وہ چاہتی ہے کہ میں بھی ایسے ہی مروں جیسے اسے مرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا کروں۔'' یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگا تھا۔ میں نے بھی اسے رونے دیا تاکہ اس کے اندر کا غبار دھل سکے۔

www.PakiBooks.Site

کافی دیر رونے کے بعد جب اس کے آنسو تھمے تو میں نے اسے پیار سے گلے لگایا۔ تسلی دلاسہ دیا اور کہا۔ ''دیکھو میرے بھائی انسان خطا کا پتلا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی زندگی میں وہ کوئی نہ کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے اور اس کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہم اپنے جرائم کا اعتراف کر کے سچے دل سے اللہ سے معافی کے خواست گار ہوں اور جس شخص کو ہماری وجہ سے دکھ اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہو اس سے بھی معافی مانگیں۔ اگر وہ حیات نہ ہو تو اس کے لواحقین سے معافی مانگیں۔ اس کی مغفرت کے لیے دعائیں کریں کیونکہ ہمارے بس میں یہی رہ جاتا ہے۔''

کاش یہ سب اتنا آسان ہوتا تو مسئلہ ہی کیا تھا میں اپنے جرم کی سزا بھگتنے سے نہیں ڈرتا۔ میں تو ہر لمحہ انتظار کرتا ہوں کہ کب میرے بلیک وارنٹ آئے اور مجھے پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر اس اذیت ناک زندگی سے نجات دلا دے مگر میرے گھر والے اپیلوں پر اپیلیں کیے جا رہے ہیں۔ اب صدر کے پاس آخری مرتبہ اپیل کی جا رہی ہے۔

''اگر تم مختصراً اپنے جرم کی نوعیت بتا دو تو شاید مجھے ادراک ہو سکے کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے اور ممکن ہے کہ میں تمہیں اس کا کوئی قابل عمل حل بھی بتا سکوں۔'' میں نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''نن..... نہیں..... میرے مسئلے کا ایک ہی حل ہے موت۔ وہ بھی یہی کہتی ہے۔'' اس نے مایوس لہجے میں کہا۔

''نہیں..... نہیں میرے دوست، میرے بھائی، اس دنیا میں بہت دکھ ہے۔ تم سے بھی زیادہ پریشان لوگ یہاں جی رہے ہیں۔ تم ذرا اس جیل ہی میں دیکھ لو۔ تمہیں ایسی ایسی دردناک کہانیاں سننے کو ملیں گی تو تم اپنا دکھ بھول جاؤ گے۔ میں گزشتہ کئی سال سے اس پھانسی کی کوٹھڑی میں اپنی موت کے پروانے کا منتظر ہوں مگر ابھی تک میری خواہش پوری نہیں ہوئی۔ پہلے مقدمہ چلتا رہا اور میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے روز مرتا رہا، روز جیتا رہا۔ حالانکہ میں نے قتل جیسا جرم کیا تھا مگر وہ محض خود حفاظتی کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر میں اسے قتل نہ کرتا تو وہ مجھے قتل کر دیتا۔ ہمارے مخالفین طاقت ور تھے اس لیے آج میں پھانسی کی سزا پانے والا مجرم ہوں اور وہ میرے آدھے خاندان کو قتل کرنے کے باوجود عیش کر رہے ہیں۔ یہ دنیا ایسی ہی ہے۔ یہاں کمزور سزا پاتے اور اثر و رسوخ والے دندناتے پھرتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ناکردہ گناہوں کی پاداش میں اپنی زندگیاں جیل کی چار دیواری میں گزار دیتے ہیں اور دن دہاڑے جرم کرتے ہوئے پکڑے جانے والے چند سالوں ہی میں رہا ہو کر وکٹری کا نشان بناتے ہوئے جیل سے باہر چلے جاتے ہیں ایسے بے ضمیر لوگوں کو اپنے جرائم پر کوئی خلش ہوتی ہے، نہ کوئی ندامت۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہو میرے بھائی مگر میرا معاملہ تو بالکل ہی مختلف ہے۔ میں مظلوم نہیں بلکہ ظالم ہوں۔ اپنی مردانگی پر گھمنڈ کرتے ہوئے ایک پاک دامن لڑکی کی عزت سے کھیل کر اسے حرام موت پر مجبور کیا۔''

''بھائی کچھ بتاؤ گے بھی یا محض پہیلیاں ہی بجھواتے رہو گے۔'' میں نے اس کی لمبی چوڑی تمہید سے اکتا کر کہا۔

اس نے اپنی قمیص کی آستین سے اپنے اشک صاف کیے اور کوٹھڑی کی چھت پر نظریں جما کر کھوئے کھوئے لہجے میں بولنے لگا۔

ہیت کے اعتبار سے شاعری کی دو اصناف ہیں، غزل اور نظم۔ نظم کی کئی ہیتیں ہیں، جن میں مثنوی، مثلث، قطعہ بند، خمس، مسدس، مثمن، مستزاد، نظم معریٰ، آزاد نظم اور نثری نظم شامل ہیں۔ آزاد نظم کی کامیابی کے بعد نثری نظم کے امکانات روشن ہونے لگے۔ نثری نظم میں وزن، قافیہ، ردیف اور مصرعوں کے چھوٹا یا بڑا ہونے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ آزاد نظم میں ارکان کی کمی بیشی روا ہوتی ہے لیکن نثری نظم میں ارکان سرے سے معدوم ہوتے ہیں بلکہ سطور چھوٹی اور بڑی ہوتی ہیں۔ جس طرح غزل اور نظم میں ہیت کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے، اسی طرح ان اصناف کے فکری مزاج میں بھی مغائرت پائی جاتی ہے۔ نظم میں فکری اعتبار سے وسعت ہے اس لیے اس میں زیادہ تصریح و توضیح کی گنجائش ہوتی ہے جس کے باعث منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور محاکات نگاری بخوبی کی جاسکتی ہے۔ تسلسل نظم کا تلازمہ ہے۔ خیالات زنجیر کی کڑیوں کی صورت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ نثری نظم بطور خاص سلاست کا مظہر ہوتی ہے۔ نثری نظم میں فنی حوالے سے بہت گنجائش پائی جاتی ہے۔ تاہم فکری اعتبار سے کسی قسم کا سمجھوتا روا نہیں ہے۔

اقتباس: شاعرات ارض پاک
از شبیر ناقد

www.PakiBooks.Site

''وہ.....وہ..... بے حد خوب صورت تھی جیسے گلاب کی نوخیز کلی ہو۔ ہنستی مسکراتی بے فکری، جیسے کہ وہ اس دنیا میں صرف خوش ہونے ہی کے لیے آئی ہو۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی، دو بھائیوں کی پیاری، راج دلاری بہنا سونے کا نوالہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والی۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اس کی ہر خواہش پوری کرنا اس کے گھر کے تمام افراد کی زندگیوں کا گویا نصب العین تھا۔ اس قدر لاڈ پیار اور شاہانہ زندگی کے باوجود اس میں غرور اور تکبر نام کو نہیں تھا۔ اس نے بی اے کا امتحان پاس کیا تو گھر میں اس کی شادی کے چرچے ہونے لگے۔ اس کے رشتے تو اسی وقت سے آرہے تھے جب سے اس نے میٹرک پاس کیا تھا مگر وہ اپنی پڑھائی کا بہانہ کر کے ٹال دیتی پھر جب وہ بی اے میں پہنچی تو پھر اس کی کینیڈا میں مقیم خالہ اپنے ڈاکٹر بیٹے کا رشتہ لے کر آگئی۔ نائمہ ہاں اس کا یہی نام تھا، اس کے رشتے آنے کی خبر مجھ پر بجلی کی طرح گری، میں جو کہ اس کا پڑوسی تھا۔ بے حد دولت مند نہیں تو غریب بھی نہ تھا۔ میرے والد کا اپنا اسٹور تھا۔ ہم چار بھائیوں اور دو بہنوں پر مشتمل ایک خوش حال گھرانا تھا۔ برسوں سے پڑوس میں رہنے کی وجہ سے دونوں گھرانوں میں بے حد اچھے تعلقات تھے۔ ہم سارے بچے اکٹھے ہی کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ میری نائمہ کے بڑے بھائی حامد سے دوستی تھی تو میری چھوٹی بہن بشریٰ اور نائمہ ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھیں۔ ہم ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے تھے۔ میں بی اے کر رہا تھا اور حامد بھی میرے ساتھ ہی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ بشریٰ اور نائمہ نے بھی ایک ہی کالج میں چار سال تک تعلیم حاصل کی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی اس وقت ہوتی تھی جب میں حامد سے ملنے اس کے گھر جاتا یا پھر نائمہ ہمارے گھر آتی تھی۔ اس طرح مجھے اسے دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ مختصری بات چیت بھی ہو جاتی تھی۔ میں نائمہ کے بارے میں اس قدر سنجیدہ ہو چکا تھا کہ ہر وقت اسی کے متعلق سوچتا رہتا۔

پھر جب بی اے کے بعد نائمہ نے بشریٰ کو بتایا کہ شاید وہ ایم اے میں داخلہ نہ لے سکے کیونکہ اس کے گھر والے سنجیدگی سے جلد از جلد اس کی شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

میں نے بشریٰ سے یہ بات سنی تو بری طرح گھبرا گیا۔ گو کہ میری محبت یک طرفہ تھی۔ نہ ہمارے درمیان کوئی عہد و پیمان ہوئے تھے اور نہ ہی نائمہ نے کبھی میری حوصلہ افزائی کی تھی اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دونوں خاندان میں رشتے داروں سے بڑھ کر ملنا جلنا تھا۔ ایک دوسرے کے گھروں میں ہم آتے جاتے تھے، کوئی غیریت اور تکلف نہیں تھا اس لیے مجھے یقین تھا کہ اگر میرے گھر والوں نے نائمہ کا رشتہ مانگا تو وہ کبھی انکار نہیں کریں گے کہ میں ان کی نظروں کے سامنے پلا بڑھا تھا۔ مجھ میں ایسی کوئی برائی یا عیب نہیں تھا کہ جس کی وجہ سے مجھے مسترد کیا جاتا۔ شکل و صورت اور قد و قامت بھی مناسب تھا۔ نہ میں اسموکنگ کرتا تھا نہ لڑکیوں سے دوستیاں کرتا پھرتا تھا۔ میں ایم بی اے کے فائنل سمسٹر میں تھا۔ چند ماہ بعد تعلیم سے فارغ ہو جاتا تو کسی بھی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل جاتی۔ کیونکہ میں ایک مہنگی ترین یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا جہاں کے اسٹوڈنٹس کو یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں ہائر کر لیتی تھیں۔ اس لحاظ سے میرا مستقبل شاندار تھا اور میں بے فکری سے اپنی تعلیم کے مکمل ہونے اور جاب ملنے کا منتظر تھا تا کہ نائمہ کا رشتہ طلب کر سکوں مگر جب مجھے بشریٰ سے پتا چلا کہ نائمہ کے بہت زیادہ رشتے آرہے ہیں تو میں نے اپنے والدین کی منتیں کرنی شروع کر دیں کہ وہ فوراً نائمہ کے رشتے کے سلسلے میں بات کریں۔

امی اور ابو نے مجھے بہت سمجھایا کہ نائمہ کہیں بھاگی نہیں جا رہی تم اطمینان سے اپنی تعلیم مکمل کرو۔ جاب حاصل کر کے اپنے قدموں پر کھڑے ہو جاؤ تو پھر ہم رشتے کا مطالبہ کر سکیں گے مگر میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی اور بے قراری تھی مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں نے فوری طور پر کچھ نہ کیا تو نائمہ کو ہمیشہ کے لیے کھو دوں گا۔ چنانچہ میرے بے حد اصرار پر ایک شام امی، ابو اور بشریٰ، نائمہ کے گھر گئے اور پھر کچھ ہی دیر بعد لوٹ آئے۔

ادھر میں اضطراب کے عالم میں ان کی واپسی کا منتظر تھا کہ وہ واپس آکر خوش خبری سنائیں گے مگر ان کے مایوس اور اترے ہوئے چہرے دیکھ کر میرا دل ڈوب سا گیا اور میں بوجھل قدموں سے اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا اور بیڈ پر لیٹ کر کھڑکی سے نظر آنے والے آم کے پیڑ پر نظریں جما کر سوچوں کے تانے بانے بننے لگا۔

کچھ دیر بعد میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور میری سماعتوں سے بشریٰ کی آواز ٹکرائی۔ ''بھائی سو گئے کیا؟''

''نن.....نہیں تو.....'' میں نے اپنے دھڑکتے دل کو قابو کرنے کی سعی کرتے ہوئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر کہا۔

www.PakiBooks.Site

''وہ.....وہ..... بھائی جس مقصد کے لیے آپ نے ہمیں نائمہ کی طرف بھیجا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا۔'' بشریٰ نے ٹھہر ٹھہر کر بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پلیز بھائی! آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ خوب صورت ہیں، پڑھے لکھے ہیں، آپ کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ میری تو کئی ہی فرینڈز آپ کو پسند کرتی ہیں۔ ہم جلد بہت اچھی سی لڑکی تلاش کر لیں گے۔'' بشریٰ نے مجھے کھویا کھویا سا دیکھ کر تسلی دینے کی کوشش کی۔

''اٹس او کے بشریٰ! اب تم جاؤ اور میرے لیے چائے کی ایک پیالی لے آؤ۔'' میں نے بشریٰ سے کہا۔

''ٹھیک ہے بھائی میں ابھی آپ کے لیے خود چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر بشریٰ کمرے سے چلی گئی اور میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔

میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سوچ سوچ کے میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نائمہ کسی اور کی ہو جائے گی۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا تھا نائمہ کو اپنی سمجھتا تھا اور وہ بھی مجھ سے بے تکلف تھی۔ ہر دم میں وہ ہمیشہ میری پارٹنر بنتی اور پھر جب ہم بڑے ہو گئے تب بھی ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

جب بھی میں اس کے گھر جاتا تو وہ اصرار کر کے مجھے خود چائے بنا کر دیتی۔ ساتھ میں سینڈوچز، بسکٹ ضرور ہوتے۔ اس نے یا اس کے گھر والوں نے کبھی بھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا تھا کہ میں ان کے گھر کے چکر کیوں لگاتا ہوں اسی لیے میرے والدین نہایت اعتماد سے رشتہ مانگنے گئے تھے مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ نائمہ کا رشتہ اس کی خالہ کے بیٹے سے طے ہے اور چند ماہ بعد شادی ہے۔

یہ خبر میرے لیے بے حد اذیت ناک تھی اور میں یہ سوچ سوچ کر تڑپ رہا تھا کہ وہ لڑکی جسے میں نے بچپن ہی سے چاہا تھا وہ کسی اور کی ہونے جا رہی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ میں ہی اس کے لیے پاگل ہوا پھرتا تھا جب کہ اس کے دل میں میرے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ سنا تھا کہ محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی اور اگر کوئی کسی کو چاہنے لگے تو دل کو دل سے راہ ہو جاتی ہے اور محبوب کے دل میں بھی خود بخود وہی محبت کا پودا پنپنے لگتا ہے مگر اب مجھے احساس ہوا تھا کہ یہ سب کتابی باتیں تھیں۔ جب تک اظہار محبت نہ کیا جائے کوئی کسی کی چاہت سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے نائمہ کو پہلے ہی اپنے دل کی

اکتوبر 2018ء کے شمارے کی ایک جھلک

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن اور ملک صفدر حیات کی تھانے داری

بجنگ آمد

چاہت کے گنگناتے جذبوں اور رقابت کی تپش میں جلنے والوں کا انجام..... آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کا دلربا انداز

مکافات

ماضی کے پوشیدہ گوشوں کی فسوں گری اور بند دریچوں میں پنہاں راز و نیاز..... تاریخی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کا منفرد انداز

رنگ آسماں

زہریلے سانپوں اور گہری چالوں پر مشتمل خوفناک اور عبرت ناک واقعات کا سنگم..... اے آر راجپوت کے خیالات کی پرواز

وقت

خوشگوار مستقبل کی آس اور کربناک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے وقت کی مکاریاں۔ حسام بٹ کے قلم کا جادو

اس کے علاوہ

منظر امام، تنویر ریاض، شاہ زین رضوان، سلیم انور، محمد طاہر عمیر اور ثمر عباس کی خوبصورت کہانیاں

www.PakiBooks.Site

کیفیت سے آگاہ کیوں نہ کیا۔ میں اپنی اس کوتاہی پر پچھتاووں کی آگ میں جل رہا تھا اور نائمہ کے ہونے والے شوہر سے حسد محسوس کر رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس شخص کو شوٹ کر کے نائمہ کو لے کر ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں اس کے اور میرے علاوہ کوئی اور نہ ہو۔ میں دن رات ایک ہی دعا کر رہا تھا کہ اچانک خبر آئے کہ نائمہ کے منگیتر کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ مر گیا ہے۔ نائمہ کے گھر والے مجھ سے اس کی شادی کرنے پر تیار ہوگئے ہیں مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا اور شادی کے دن قریب آنے لگے۔

رشتے سے انکار کے باوجود دونوں گھرانوں کی دوستی اور میل جول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بشریٰ اکثر نائمہ کے گھر چلی جاتی اور اس کی شادی کی تیاریوں میں ہاتھ بٹاتی۔ دونوں خریداری کے لیے بازاروں کے چکر بھی لگاتی رہتیں، کیونکہ نائمہ کی کوئی بہن نہیں تھی۔ کزنز اور دوسری فرینڈز دور رہتی تھیں وہ روز روز آ بھی نہیں سکتی تھیں جب کہ بشریٰ ایک تو قریب رہتی تھی پھر آج کل فارغ بھی تھی۔ اس کو ایم اے میں داخلہ نہیں ملا تھا اور امی ابو اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہے تھے تاکہ جلد ہاتھ پیلے کردیں۔ البتہ میں نے رشتے سے انکار کے بعد سے حامد سے اپنی دوستی تقریباً ختم کردی تھی اور اس کے گھر بھی آنا جانا ترک کردیا تھا۔ وہ یوں بھی اپنے فائنل ایگزام کی تیاری میں مصروف تھا اس لیے اس نے میری بیگانگی کو زیادہ محسوس نہیں کیا۔ کبھی کبھار فون پر ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرلیتے تھے یا پھر کسی مشترکہ دوست کے گھر کسی فنکشن پر ملاقات ہوجاتی تھی۔

ایک دن نائمہ نے بشریٰ کو فون کیا کہ اس کے امی ابو ایک قریبی عزیز کی فوتگی پر فیصل آباد جا رہے ہیں حامد اپنے دوستوں کے ساتھ سیاحت کے لیے سوات گیا ہوا ہے۔ گھر میں رات کو ایک بوڑھی ملازمہ کے علاوہ نائمہ کے پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ موقع میرے لیے نعمت سے کم نہ تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک خطرناک پلان بنا لیا اور ایک دوست سے جو میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا اور پارٹ ٹائم ایک پرائیویٹ اسپتال کے او ٹی میں ڈیوٹی دیتا تھا اس سے تجربہ کرنے کے بہانے سے کلوروفام منگوالیا تھا۔ اس دوا کو شاپر میں رکھی روئی پر لگا کر ربر بینڈ چڑھا دیا تھا۔ رات کے دس بجے میں نے اس کے موبائل پر کال کیا کہ حامد کی ایک بک لینی ہے اگر کہو تو آجاؤں۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اس میں اجازت کی ضرورت کیا ہے۔ آجائیں۔“

میں اسی بات کا تو منتظر تھا، فوراً ہی گھر سے نکل پڑا۔ مجھے پتا تھا کہ ملازمہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے جا چکی ہوگی۔ کال بیل بجائی تو نائمہ نے ہی دروازہ کھولا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر حامد کے کمرے میں آئی۔ میں کتابوں کے شیلف کی طرف بڑھا تو اس نے کہا۔ ”میں اتنی دیر میں آپ کے لیے چائے بنا لیتی ہوں۔“

اس کے جاتے ہی میں نے جیب سے شاپر نکالا اور ربر بینڈ کھول کر احتیاط سے پکڑ لیا۔ پھر کچن کی طرف بڑھا۔

وہ پیالی میں چائے انڈیل رہی تھی کہ میں نے اپنی سانس روک کر شاپر سے روئی کا پھایا نکالا اور پھرتی سے اس کی ناک پر رکھ دیا۔ اس نے ہلکی سی مزاحمت کی اور میرے ہاتھوں پر ڈھے سی گئی۔

وہ پھول جیسی ہلکی تھی۔ میں اسے ہاتھوں پر اٹھا کر بیڈ روم میں لے آیا اور پھر میں انسان سے حیوان بن گیا۔ اس کی بے بسی کا خوب فائدہ اٹھایا پھر باہر آ کر گیٹ کو بھی بند کردیا اور بڑے اطمینان سے چلتا ہوا اپنے گھر آ کر سکون سے گہری نیند سو گیا۔ بڑے عرصے بعد اس قدر چین کی نیند نصیب ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ شادی کی پہلی رات ہی اس کے شوہر کو حقیقت کا پتا چل جائے گا اور وہ اسے چھوڑ دے گا تب میں دوبارہ رشتہ بھیجوں گا اور وہ ہمیشہ کے لیے میری ہوجائے گی۔

مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ دوسری صبح ہی اس کے گھر میں لوگوں کا اژدھام ہوگیا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں بھی کھڑی نظر آئی تھیں۔ اس کے امی ابو بھی فیصل آباد سے بھاگم بھاگ آگئے تھے۔ مجھے تشویش ہوئی تھی اور میں بشریٰ کا انتظار کرنے لگا کیونکہ وہ اور امی ابو نائمہ کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ میں برش کرنے اٹھا تو موبائل پر نظر پڑی۔ مس کال اور میسج کا نشان نظر آرہا تھا۔ میں نے موبائل آن کیا تو نائمہ کا میسج نظر آیا۔ میں نے میسج کھولا اس نے لکھا تھا۔ ”تم بے حد گھٹیا انسان ہو، تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں تمہاری بچپن کی دوست تھی۔ تمہارے دوست کی بہن اور بہن کی سہیلی تھی۔ میں تمہیں اپنا بھائی سمجھتی تھی اسی لیے تم پر اعتماد کرتی تھی اور تم نے میرے اعتماد کا یہ صلہ دیا۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میں نے لکھ دیا ہے ایک رقعے پر کہ رات کو تم میرے گھر آئے تھے اور مجھے بے ہوش کر کے میری زندگی برباد کر گئے تھے۔ یعنی کہ میری موت کے ذمے دار تم ہو۔

www.PakiBooks.Site

اگرچہ میں خود یہ نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کرنے جا رہی ہوں مگر میں نے تمہیں اپنا قاتل ٹھہرایا ہے۔ جب تم یہ میسج پڑھ رہے ہوگے تب تک میں اس دنیا سے جا چکی ہوں گی کیونکہ اپنی عصمت سے محروم ہو کر میرے لیے جینا اور کسی اور سے شادی کرنا ناقابل برداشت ہے۔ تمہیں میری بربادی کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔“

میں نائمہ کا میسج پڑھ کر کانپ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ محض یوں ہی مجھے ڈرا رہی ہے۔ وہ ایسی بولڈ لڑکی نہیں ہے کہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرلے۔ میرا یہ خیال تھا کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں اپنے ساتھ ہونے والی واردات کو جان نہ سکے گی لیکن یہ میری غلط فہمی تھی اور پھر نائمہ نے جو کچھ کہا تھا وہ ثابت ہوگیا۔ نائمہ کے والدین نے میرے گھر والوں کو یہ کہہ کر گھر سے نکال دیا کہ وہ اپنی بیٹی کے قاتل کے گھر والوں کو ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ پولیس میرے گھر آئی اور مجھے نائمہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئی۔

پولیس نے مجھے حوالات میں بند کردیا اور پھر مجھ پر شدید تشدد کیا جس کی وجہ سے میں نے اعترافِ جرم کرلیا۔ یوں بھی نائمہ کے مرنے کے بعد مجھے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی میرے اقرارِ جرم کے بعد مجھے قاتل قرار دے کر جیل میں بھیج دیا گیا اور پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔

میں نے عدالت میں صاف صاف کہا کہ چونکہ نائمہ کے گھر والوں نے میرے رشتے سے انکار کر کے کہیں اور اس کا رشتہ طے کردیا تھا جس کا مجھے بے حد افسوس تھا کیونکہ میں نائمہ کو بے حد چاہتا تھا۔ میں نے اسی لیے اسے زیادتی کا نشانہ بنایا کہ میں اسے کسی اور کا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے اس اعترافی بیان کی وجہ ہی سے مجھے پھانسی کی سزا ہوئی مگر میرے گھر والے مجھے کسی صورت بھی پھانسی کے پھندے پر لٹکتا نہیں دیکھنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے میری سزا کے خلاف اپیل کردی کہ چونکہ مجھے نائمہ کی اچانک موت کا صدمہ ہے اس لیے میں نے اس کے قتل کا جھوٹا اعتراف کیا ہے ورنہ میں تو اس قدر ٹھنڈے مزاج کا شخص ہوں کہ کبھی کسی سے معمولی سا لڑائی جھگڑا بھی نہیں کیا، قتل کرنا تو دور کی بات ہے۔ نائمہ کے جس خط کو ثبوت بنایا جا رہا ہے وہ اس کی کسی کہانی سے کاٹا گیا ہے کیونکہ اسے کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ اسی دلیلوں کی بنیاد پر میرے گھر والے پُرامید ہیں مگر میں اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہوں میرے

سفاکیت اور درندگی کا انوکھا کھیل

عالم اسلام پر تاتاریوں کی جانب سے کی جانے والی لشکر کشی تقریباً دو دہائیوں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ اس لشکر کشی کے دوران تاتاریوں نے سفاکیت اور درندگی کی وہ مثالیں قائم کیں کہ جن کی نظیر نہ ان سے پہلے کہیں ملتی ہے اور نہ ہی ان کے بعد دنیا میں کسی نے اپنی مفتوح اقوام سے ایسا سلوک کیا۔ تاتاریوں نے عام اور نہتے مسلمانوں سے انتہائی بہیمانہ سلوک کیا۔ قتل و غارت گری کی وہ داستانیں رقم کیں کہ انہیں لکھتے ہوئے آج کا مؤرخ بھی کانپ اٹھتا ہے۔ شہر فتح کرنے کے بعد پوری پوری آبادیوں کو تہہ تیغ کردیا گیا۔ خصوصاً وہ شہر جہاں مسلمانوں نے زیادہ مزاحمت دکھائی ان علاقوں میں تو انسانوں کے ساتھ ساتھ کتے اور بلیوں کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ پوشیدہ خزانوں کی برآمدگی کے لیے مشتبہ مالدار افراد پر تشدد کے نت نئے طریقے ایجاد کیے گئے۔ مقتولین کی کھوپڑیوں کے مینار بنانا ان کا مشغلہ بن گیا تھا۔ شہر کے باسیوں سے تمام مال و دولت چھینتے، ان کا قتل عام کرتے، اس کے بعد ان کے مکانات کو آگ لگا دیتے اور اس طرح تہہ خانوں میں چھپے ہوئے لوگ بھی زندہ جل کر ہلاک ہوجاتے۔ سمرقند بخارا، قوقند، اترار اور دیگر شہروں میں عام مسلمانوں اور جنگی قیدیوں سے یہی سلوک کیا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ جن شہروں کو امان دی گئی اور باقاعدہ معاہدہ کر کے قبضہ کیا گیا ان شہروں میں بھی کسی نہ کسی بہانے سے یہی سلوک کیا گیا۔ ایسے مواقع پر وہ مسلمان عمائدین جو غداری کر کے تاتاریوں سے ساز باز کر لیتے انہیں بھی بعد میں قتل کردیا جاتا۔

اقتباس: اورنج کا المیہ

مرسلہ: صادق محمد۔ ملتان

www.PakiBooks.Site

والدین نے صدر مملکت سے رحم کی اپیل کر رکھی ہے اور انہیں یقین ہے کہ اپیل منظور ہو جائے گی اور یوں میں رہا ہو جاؤں گا۔

”ایک طرف تو میرے گھر والے شد و مد سے میری زندگی بچانے کی تگ و دو کر رہے ہیں اور دوسری طرف میں ایک پل کے لیے بھی زندہ رہنا نہیں چاہتا کیونکہ احساس جرم مجھے ہر وقت ذہنی خلفشار میں مبتلا رکھتا ہے پھر نائمہ کی روح ہر رات خواب میں آکر مجھے اکساتی ہے کہ میں اپنے ہاتھوں زندگی کا خاتمہ کرلوں کیونکہ میں نے اس کی عصمت کو پامال کر کے اسے خودکشی جیسی حرام موت پر مجبور کیا تھا۔ وہ چاہتی ہے کہ میں بھی حرام موت کا ارتکاب کر کے ہمیشہ کے لیے دوزخ کی آگ میں جلتا رہوں۔ اگرچہ میں نے قتل جیسا بھیانک گناہ نہیں کیا ہے مگر ایک شریف لڑکی کے دامن عصمت کو تار تار کر کے اسے مرنے پر مجبور تو کیا ہے۔ اس گھناؤنے جرم کی سزا بھی تو بھیانک ہی ہونی چاہیے اور وہ پھانسی نہیں ہے جس کے لیے میں ذہنی طور پر تیار ہوں۔“

اپنی طویل کہانی سنا کر وہ خاموش ہو گیا اور پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگا۔ میں نے اسے گلے سے لگا کر تسلی دلاسہ دیا، مجھے اس خوب صورت نوجوان پر ترس آرہا تھا جو ایک لڑکی کے عشق میں پاگل ہو کر ایسی غلطی کر بیٹھا جو اس جیسا تعلیم یافتہ نوجوان شاید کرنے سے پہلے ہزار بار سوچتا مگر کہتے ہیں کہ جب انسان غصے اور انتقام کی آگ میں جلنے لگتا ہے تو اس کے ہوش و حواس سلب ہو جاتے ہیں اور شیطان کے بہکاوے میں آکر بڑے سے بڑے فعل کا ارتکاب بھی کرنے سے نہیں چوکتا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنا پڑھا لکھا ہے پھر بھی سمجھ نہیں پا رہا ہے کہ اپنی محبت کے مرجانے سے اپنی چال کے ناکام ہو جانے سے وہ شیزوفرینا کا مریض بن گیا ہے۔ اسے جاگتی آنکھوں سے بھی نائمہ کی روح نظر آنے لگی ہے۔ اس کی روح اس کو ساری رات تنگ کرتی ہے اور وہ نیم پاگل سا ہو گیا ہے۔ میں اسے سمجھاتا کہ وہ نماز کی پابندی کرے۔ قرآن پاک کی تلاوت کثرت سے کیا کرے اور سجدے میں جھک کر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگے، رو رو کر اللہ تعالیٰ سے التجا کرے کہ نائمہ کی بھٹکتی ہوئی روح کو سکون اور قرار عطا ہو جائے۔

مگر وہ میری بات سن کر مایوسی سے کہتا۔ ”بہت کوشش کرتا ہوں کہ نماز میں دل لگاؤں۔ درود پاک پڑھوں اور دیگر دعائیں وغیرہ پڑھ پڑھ کر نائمہ کے ایصال ثواب کی التجا کروں مگر کسی چیز میں دل نہیں لگتا۔ عجیب سی بے چینی اور اضطراب دل و دماغ کو جکڑے ہوئے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نائمہ صحیح کہتی ہے خودکشی کر کے ہی میں زندگی کے اس طوق کو گلے سے اتار کر سکون پا سکتا ہوں۔ پھانسی کی سزا تو ٹلتی جا رہی ہے۔ پتا نہیں کب وہ مجھے میرے جرم کی پاداش میں تختہ دار پر چڑھائیں گے تب تک تو میں روز جیوں گا اور روز مروں گا۔ یہ روز روز کا جینا زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ رات کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں جان بوجھ کر سونے کی کوشش نہیں کرتا کہ جیسے ہی نیند کی آغوش میں جاتا ہوں نائمہ کی روح آجاتی ہے اور پھر میں اس کی بے رحمانہ اذیتوں کو سہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ باوجود نہ سونے کی خواہش اور کوشش کے جانے کس وقت خود بخود ہی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہو جاتی ہیں اور میرے لیے اذیتوں کے در وا ہو جاتا ہے۔“

پھر ایک رات جب گارڈ نے آکر اسے یہ خوش خبری سنائی کہ صدر مملکت نے اس کی رحم کی اپیل کو منظور کر لیا ہے اور صبح اسے رہا کر دیا جائے گا تو بجائے خوش ہونے کے وہ بجھ سا گیا اور اس کے چہرے پر ایک عجیب سی اذیت اور سراسیمگی کے تاثرات پھیل گئے اور وہ کوٹھڑی کی چھت کو گھورنے لگا۔

لوگ جینے کی آرزو کرتے ہیں پھانسی سے بچ نکلنے کے لیے دعائیں کرتے ہیں لیکن وہ اپنی رہائی کی خبر پر خوش ہونے کی بجائے افسردہ ہو رہا تھا۔ شاید نائمہ کی روح کے خوف سے ایسا محسوس کر رہا تھا کہ پھانسی پا کر وہ اپنے گناہ کی سزا بھگت جائے گا تو پھر اس کی آخرت بھی سنور جائے گی اور نائمہ کی روح کے کچوکوں سے بھی جان چھوٹ جائے گی حالانکہ اسے اس بات کا اچھی طرح علم ہونا چاہیے تھا کہ نائمہ کا وہ گناہ گار تھا اور جب تک وہ اسے معاف نہ کرتی اللہ تعالیٰ بھی اسے معاف نہ کرتے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ معاف فرما دیتے ہیں مگر مخلوق کو اذیت دینے یا نقصان پہنچانے کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس شخص سے اسے معافی نہ مل جائے جسے اس نے دکھ دیا ہو۔

جب پھانسی کی سزا کی بجائے اس کی رہائی کا پروانہ آگیا تو اسی رات اس نے ازار بند کو پنکھے سے باندھ کر خودکشی کر لی کیونکہ وہ صدمے سے شیزوفرنیا کا مریض بن چکا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ نائمہ کی روح انتقام لینا چاہ رہی ہے۔

www.PakiBooks.Site

میں شادی سے پہلے [illegible] داخلہ مل سکتا۔ ویسے بھی مجھے ڈاکٹر بننے سے دلچسپی نہیں تھی اور میرا رجحان کامرس کی طرف تھا۔ اس لیے میں نے بی کام میں داخلہ لے لیا۔ اس کے بعد میرا ارادہ ایم بی اے کرنے کا تھا۔

نہیں کہ مجھے پیسوں کی ضرورت تھی یا ہمارے گھر کے مالی حالات بہت زیادہ خراب تھے بلکہ ملازمت کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں اپنی سولہ سال کی محنت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں شروع سے ہی پڑھائی میں بہت اچھی تھی اور ہمیشہ سالانہ امتحان میں میرے اچھے نمبر آتے تھے۔ میٹرک اور انٹر میں بھی میرا اے گریڈ آیا لیکن اتنے نمبر نہیں تھے کہ

ہم چار بہن بھائی ہیں۔ دو بھائی اور دو بہنیں۔ ابو کا ایک چھوٹا سا بزنس ہے جس سے ہمارا گزارہ اچھی طرح ہو رہا تھا۔ ہم بہت زیادہ امیر تو نہیں البتہ ہمارا شمار خوش حال

سراب

جناب معراج رسول

السلام وعلیکم!

اب تک میں دوسروں کی آپ بیتیاں پڑھتی رہی ہوں۔ پہلی بار خود لکھنے کی کوشش کی، یہ مجھ بیتی ہے۔ میں جن حالات سے گزری ہوں اس کی لفظی تصویر کشی کی ہے۔ اس تحریر کے ذریعے میں ان خواتین کو پیغام دینا چاہتی ہوں جو معاشی خود مختاری کی حامی ہیں جب کہ یہ خود مختاری ایک سراب ہے۔ دھوکا ہے۔ میں نے اس راز کو کیسے جانا، یہ آپ کو میری اس آپ بیتی میں مل جائے گا۔

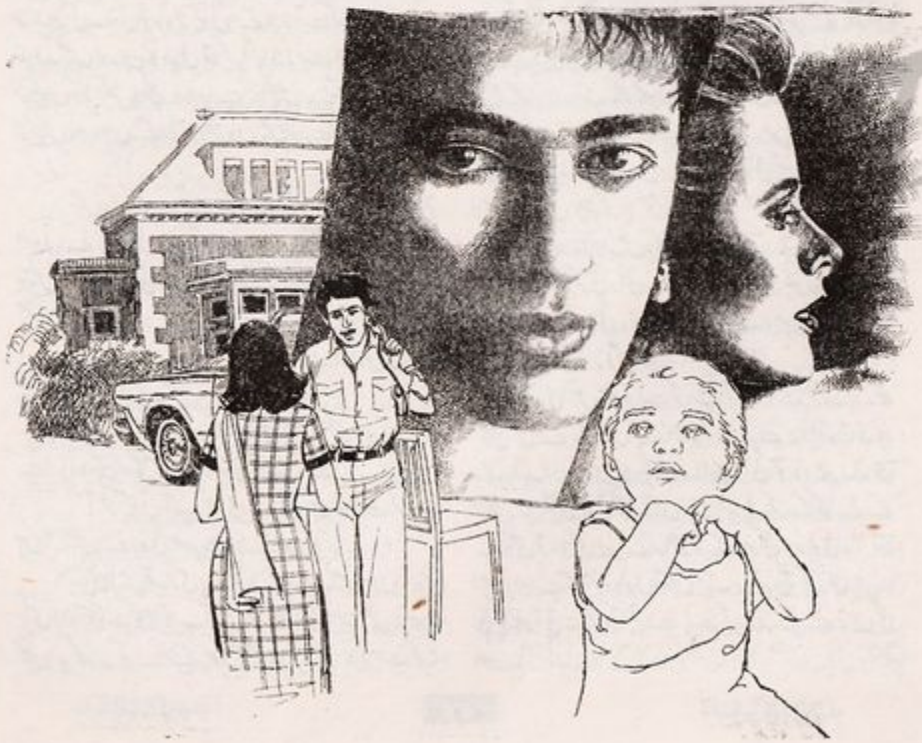

ریحانہ قمر

(کراچی)

www.PakiBooks.Site

لوگوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ابو نے بہت پہلے ہی گلشن اقبال میں چار سو گز کا مکان بنا لیا تھا اور اوپر کی منزل کرائے پر دے دی تھی۔ وہ اپنی بچت بینک میں نہیں رکھتے تھے بلکہ جب ان کے پاس کچھ پیسے ہوتے تو وہ اس سے کوئی پلاٹ، فلیٹ یا دکان خرید لیتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کی جایداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ابو بہت لبرل اور روشن خیال تھے۔ انہوں نے کبھی ہم پر بے جا پابندیاں نہیں لگائیں اور نہ ہی اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش کی۔ مجھ سے بڑے دو بھائی جمال اور کمال تھے۔ دونوں نے اپنے رجحان کے مطابق میڈیکل اور انجینئرنگ کے شعبوں کا انتخاب کیا۔ البتہ امی کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں لیکن جب میں نے کامرس کا انتخاب کیا تو انہوں نے ساری امیدیں مجھ سے چھوٹی فرزانہ سے وابستہ کرلیں، وہ پڑھائی میں مجھ سے دو سال پیچھے تھی۔ اس نے امی کو مایوس نہیں کیا اور انٹر میں محنت کر کے اتنے نمبر لے آئی کہ اس کا داخلہ بآسانی میڈیکل کالج میں ہوگیا۔

بی کام کے بعد میں نے بی بی اے میں داخلہ لے لیا۔ یہ کورس مکمل کرنے کے بعد ہی میں ایم بی اے کرسکتی تھی۔ جب امی کو میرے عزائم کا علم ہوا تو انہوں نے پہلی بار مخالفت کی۔ اوّل تو وہ لڑکیوں کے ملازمت کرنے کے ہی خلاف تھیں اور ان کا خیال تھا کہ اگر ملازمت ہی کرنی ہے تو لڑکیوں کو ڈاکٹر یا ٹیچر بننا چاہیے۔ انہیں یہ پسند نہیں تھا کہ لڑکیاں، مردوں کے ساتھ دفتروں میں نو سے پانچ کی جاب کریں۔

جس دن میں بزنس اسکول میں فیس جمع کروا کر آئی تو انہوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔ ''کیا کرو گی یہ ڈگری لے کر۔ بہت پڑھ لیا۔ اب گھر بیٹھو۔''

''یہ بات آپ کو پہلے کہنی چاہیے تھی۔ اب تو میں نے فیس بھی جمع کرادی۔''

''فیس کا کیا ہے۔ واپس بھی لی جاسکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ کچھ کٹوتی کرلیں گے۔''

''آخر کیوں آپ میری پڑھائی کی مخالفت کر رہی ہیں؟'' میں نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔

''بیٹی! میں تمہاری پڑھائی کے خلاف نہیں ہوں اگر تم کسی اور سبجیکٹ کا انتخاب کرتیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن یہ کورس کرنے کے بعد تمہیں دفتر میں ملازمت کرنا پڑے گی جو میں سمجھتی ہوں کہ لڑکیوں کے لیے مناسب نہیں۔''

''اوہو امی آپ بھی کن اندیشوں میں پڑ گئیں۔ ایم بی اے کی ڈگری ملنے میں چار پانچ سال لگ جائیں گے۔ اس وقت نہ جانے کیا حالات ہوں۔ کیا پتا مجھے ملازمت کرنے کا موقع ملتا بھی ہے یا نہیں۔ کم از کم میری تعلیم تو مکمل ہونے دیں۔''

''اگر پڑھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو ماسٹرز کرلو۔'' امی نے کہا۔

''نہیں میں ایم بی اے ہی کروں گی۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اور اگر آپ نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو فرزانہ کو بھی گھر بٹھالیں۔ آخر وہ بھی تو ڈاکٹری کر رہی ہے۔ کیا اسے رات دن مردوں کے ساتھ کام نہیں کرنا پڑے گا۔''

میری اس دلیل کے بعد امی وقتی طور پر خاموش ہو گئیں اور میں دل و جان سے پڑھائی میں مشغول ہوگئی۔ میری فطرت میں ہمیشہ سے ہی ضد شامل ہے۔ مجھے جس کام سے منع کیا جائے میں وہی کرتی ہوں۔ پہلے میں ایم بی اے کے بارے میں اتنی زیادہ سنجیدہ نہیں تھی ویسے بھی وہاں کی پڑھائی اتنی سخت تھی کہ شاید میں ایک دو سیمسٹر کے بعد ہی ہمت ہار دیتی لیکن امی کی مخالفت کے بعد میں نے اسے ایک چیلنج سمجھ لیا اور سب کچھ چھوڑ کر پڑھائی میں لگ گئی۔

میں باقاعدگی سے کالج جاتی اور میری کوشش ہوتی کہ کوئی پیریڈ نہ چھوڑوں۔ اگر کوئی خالی پیریڈ مل جاتا تو لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتی رہتی۔ گھر آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا اور میں رات دیر تک لیپ ٹاپ پر نوٹس اور اسائنمنٹ تیار کرتی رہتی۔ میں نے ہر قسم کی تفریح میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ ٹی وی، فلمیں، شاپنگ، سیر و تفریح سب ایک خواب بن کر رہ گیا تھا۔

میری اس مصروفیت کو سب لوگ نوٹ کر رہے تھے لیکن کسی نے کچھ نہیں کہا۔ البتہ فرزانہ سے برداشت نہ ہو سکا۔ ایک دن میں کالج سے واپس آئی تو وہ میرے ہی انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں لباس تبدیل کر کے کھانے کے لیے بیٹھی تو وہ بھی میرے ساتھ شریک ہوگئی اور بولی۔ ''کتنا اچھا دن ہے کہ ہم دونوں بہنیں ایک ساتھ لنچ کر رہی ہیں۔ سچ پوچھو آپی۔ میں تو تم سے بات کرنے کے لیے ترس گئی ہوں۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ تم کچھ زیادہ ہی محسوس کر رہی ہو ورنہ رات کو تو ہم اکٹھے ڈنر کرتے ہیں۔''

''بہت سی باتیں ایسی ہیں جو سب کے سامنے نہیں کی جاسکتیں۔ خاص کر جمال اور کمال بھائی کی موجودگی میں تو بالکل نہیں۔''

میں چونک گئی۔ ایسی کیا بات ہے جو یہ سب کے سامنے نہیں کرنا چاہتی، کہیں یہ نادان لڑکی کسی سے دل تو نہیں لگا بیٹھی اور اب مجھے اپنا راز دار بنانا چاہ رہی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''مثلاً کیسی باتیں؟''

''اب تو دیکھو نا آپی! کتنے دن ہو گئے ہم دونوں شاپنگ کے لیے نہیں گئے۔ اب اگر میں یہی بات جمال یا کمال بھائی کے سامنے کروں تو وہ میرا اتنا ریکارڈ لگائیں گے کہ میں شاپنگ کا نام لینا بھول جاؤں گی۔''

''اوہ!'' میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے سوچا کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ تم جب کہو، ہم شاپنگ کے لیے چلے جائیں گے۔''

''کس وقت کہوں۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''تم تو گھر آتے ہی اپنا کام لے کر بیٹھ جاتی ہو پھر تمہیں رات تک فرصت نہیں ہوتی۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہاری خاطر ایک دن کام کی چھٹی ہوسکتی ہے۔ دراصل کام کرنا میری مجبوری ہے۔ ہماری کلاس میں مقابلہ بہت سخت ہے۔ ایک سے ایک ذہین اسٹوڈنٹ موجود ہے اگر میں نے ذرا سی بھی سستی کی تو بہت پیچھے رہ جاؤں گی۔''

''میں تمہاری مجبوری سمجھ گئی۔ یہ بتاؤ کس دن چلو گی؟''

''میرا خیال ہے کہ ہفتہ ٹھیک رہے گا۔ اگر میرا کچھ کام رہ گیا تو میں وہ اتوار کو پورا کرلوں گی۔''

ہفتہ کے روز میں کالج سے جلدی گھر آگئی۔ فرزانہ اس روز کالج نہیں گئی۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے کھانا کھایا اور فرزانہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے چل دی۔ گھر سے نکلتے وقت میں نے فرزانہ کو تاکید کردی تھی کہ وہ بلاوجہ دکانوں پر جا کر وقت ضائع نہ کرے بلکہ صرف اسی دکان پر جائے جہاں سے اسے کچھ خریدنا ہو کیونکہ یہ اس کی پرانی عادت تھی کہ وہ ہر دکان پر رک کر چیزوں کے دام پوچھتی۔ ایک دو آئٹم نکلوا کر دیکھتی اور آگے بڑھ جاتی۔ اسے کپڑے لینے ہوتے لیکن وہ جوتوں کی دکان میں چلی جاتی۔ ایک دو چپلیں پاؤں میں ڈال کر دیکھتی۔ ان کے دام پوچھتی اور منہ بناتی ہوئی باہر آجاتی۔

شاپنگ مال میں ہمیشہ کی طرح رش تھا۔ خدا جانے ان عورتوں کے پاس اتنا وقت اور پیسا کہاں سے آجاتا ہے جو وہ اس فراخ دلی سے شاپنگ کرتی ہیں۔ فرزانہ کو کپڑے خریدنا تھے۔ اسے کپڑوں کا کریز تھا جب تک مہینے میں کم از کم دو جوڑے نہ بنالے۔ اسے چین نہیں آتا تھا۔ میں نے بھی سوچا کہ گرمیاں آرہی ہیں۔ میں بھی اپنے لیے ایک دو لون کے سوٹ لے لوں گی۔

میرا خیال تھا کہ فرزانہ اسی دکان پر جائے گی جہاں سے وہ ہمیشہ شاپنگ کیا کرتی تھی لیکن وہ اپنی عادت کے مطابق ایک اور دکان میں گھس گئی جس کے باہر سمر سیل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ مجھے ایسے ہتھکنڈوں سے چڑ ہے اور میں کبھی سیل سے خریداری نہیں کرتی لیکن فرزانہ کو تو وقت ضائع کرنے کا شوق ہے۔ اس نے حسب عادت سیل کے لیے رکھے ہوئے کپڑوں کے ڈھیر چھانٹنا شروع کردیا۔

میں بے زاری کے عالم میں کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی کہ اچانک میری نظر کاؤنٹر پر بیٹھے ایک شناسا چہرہ پر پڑی۔ وہ میرا کلاس فیلو شاداب تھا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ وہاں کیا کر رہا تھا۔ وہ گاہک نہیں تھا ورنہ کاؤنٹر پر نہ بیٹھا ہوتا وہ یقیناً اس دکان کا مالک یا ملازم ہوگا۔ میں فرزانہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلنے والی تھی کہ اس نے مجھے دیکھ لیا اور لپک کر کاؤنٹر کے اس حصہ پر آیا جہاں میں کھڑی ہوئی تھی۔

''ریحانہ آپ؟'' اس نے خیر مقدمی انداز میں کہا۔ ''آئیں اس طرف آجائیں میں دکھاتا ہوں۔''

فرزانہ نے بھی اسے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ شاید سوچ رہی ہوگی کہ یہ شخص اس کی آپی کو کیسے جانتا ہے۔ وہ بھی میرے پاس آگئی۔ میں نے شاداب سے کہا۔ ''یہ میری چھوٹی بہن فرزانہ ہے۔ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہے۔ دراصل شاپنگ تو اسے کرنی ہے میں تو بس یونہی ساتھ چلی آئی اور فرزانہ، یہ شاداب ہیں۔ میرے کلاس فیلو، سچ پوچھو تو انہی سے میرا مقابلہ ہے۔''

شاداب نے ہم دونوں کے لیے کولڈ ڈرنک منگوائی اور فرزانہ سے پوچھ پوچھ کر کپڑوں کے تھان نکلواتا گیا۔ فرزانہ کی تو جیسے لاٹری نکل آئی۔ اس نے مختلف قسم کی کوالٹی اور ڈیزائن کے کم و بیش بیس پچیس تھان نکلوائے اور ان میں

www.PakiBooks.Site

سے چار جوڑے منتخب کیے۔

اس نے وہ جوڑے پیک کروانے کے بعد مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کچھ نہیں لیں گی؟''

''نہیں میرے پاس کافی کپڑے ہیں اور مجھے کچھ زیادہ شوق بھی نہیں ہے۔''

''اچھا نہیں لگتا کہ آپ میری دکان سے خالی ہاتھ جائیں۔ یہ فریش اسٹاک ہے۔ دو سوٹ لے لیں۔ میں رعایت کردوں گا۔''

اس کے کہنے پر میں نے بھی دو سوٹ پسند کرلیے۔ اس نے بل بنوایا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس نے بازار کے مقابلے میں اچھی خاصی رعایت کردی تھی۔ چلتے وقت اس نے مجھے اپنی دکان کا کارڈ دیا اور بولا۔ ''ویسے تو آپ کو یہ دکان یاد رہے گی پھر بھی احتیاطاً یہ کارڈ رکھ لیں۔ آیندہ جب بھی شاپنگ کا ارادہ ہو تو پہلے ہمارے یہاں ضرور دیکھ لیں۔''

''جی ضرور۔'' میں نے کہا اور ہم دکان سے باہر آگئے۔

گھر آنے کے بعد بھی میں شاداب کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ میری اس سے برائے نام واقفیت تھی۔ صرف اس حد تک کہ وہ میرا کلاس فیلو اور کلاس کا سب سے ذہین طالب علم تھا۔ اب تک جتنے ٹیسٹ اور اسائنمنٹ ہوئے تھے ان میں سب سے زیادہ نمبر اسی کے تھے۔ وہ کلاس میں پوری تیاری کے ساتھ آتا اور اس کے پاس سر کے پوچھے گئے ہر سوال کا جواب ہوتا تھا۔ اس سے زیادہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی اور نہ ہی کبھی اس سے کوئی بات ہوئی تھی۔

میری سر توڑ کوشش تھی کہ اسے نیچا دکھاؤں۔ اس کے لیے میں دن رات محنت کررہی تھی پھر بھی میری پوزیشن کبھی دوسری اور کبھی تیسری آتی۔ اس طرح میرے ذہن میں اس کے بارے میں ایک منفی تاثر ابھرنے لگا۔ میں اکثر سوچتی کہ اگر شاداب اس کلاس میں نہ ہوتا تو میری پہلی پوزیشن آسکتی تھی۔ ایک طرح سے میں اس سے حسد کرنے لگی تھی جیسے وہ میرا رقیب ہو۔

اس روز اسے کپڑوں کی دکان پر دیکھ کر میں اس کے بارے میں مختلف انداز سے سوچنے لگی۔ پہلا سوال تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ وہاں کیا کررہا تھا۔ اس کے دو ہی جواب ہوسکتے تھے۔ وہ دکان کا مالک تھا یا پھر سیلز مین لیکن اگر مالک ہوتا تو کیش کاؤنٹر پر بیٹھتا لیکن وہاں ایک بڑے میاں براجمان تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اس دکان پر سیلز مین تھا۔ اس کا تصور کرتے ہی مجھے جھرجھری آگئی۔

دوسرے دن میں کالج پہنچی تو وہ مجھے گیٹ پر ہی مل گیا۔ یوں لگا جیسے وہ میرا ہی انتظار کررہا تھا۔ وہ تیزی سے میرے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''کیا آپ فارغ پیریڈ میں میرے ساتھ چائے پینا پسند کریں گی۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

اس سے پہلے میں کبھی کسی لڑکے کے ساتھ چائے پینے نہیں گئی تھی۔ ہمارا تین چار لڑکیوں کا گروپ تھا۔ ان کے ہمراہ ہی کینٹین جایا کرتی تھی۔ پہلے سوچا کہ معذرت کرلوں لیکن اس نے گزشتہ روز ہمارے ساتھ جو رعایت کی تھی۔ اس کا خیال آگیا۔ اس کے علاوہ مجھے خود بھی اس کے بارے میں جاننے کی جستجو ہورہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ ہمارا تیسرا پیریڈ فری ہے۔ اس میں ہم چائے پینے جاسکتے ہیں لیکن ایک شرط پر۔''

''وہ کیا؟''

''بل میں دوں گی۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' وہ چہکتے ہوئے بولا۔ ''میں نے انوائیٹ کیا ہے، اس لیے بل بھی میں ہی دوں گا۔''

''اگر یہ شرط منظور نہیں تو میری طرف سے انکار سمجھیں۔''

''چلیں جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو کینٹین میں ہی ملوں گا۔''

میں نے بل دینے کی شرط اس لیے لگائی کہ مجھے اس کی حیثیت معلوم ہوچکی تھی۔ ایک معمولی سیلز مین کی تنخواہ کتنی ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ آٹھ دس ہزار اور وہ وہاں پارٹ ٹائم کام کرتا تھا اس لیے اس سے بھی کم ملتے ہوں گے۔ اسی لیے میں اس کی جیب پر بوجھ ڈالنا نہیں چاہ رہی تھی۔

میں دو پیریڈ لینے کے بعد کینٹین پہنچی تو وہ پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس وقت کینٹین میں بہت کم لوگ تھے۔ میں سیدھی اس کی میز پر چلی گئی اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''جلدی سے چائے منگوالیں پھر مجھے لائبریری بھی جانا ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''آپ نے تو لائبریری کو اپنا دوسرا گھر بنالیا ہے۔ جب دیکھو وہیں بیٹھی رہتی ہیں۔''

''کیا کروں تیاری بھی تو کرنی ہوتی ہے۔'' میں نے

www.PakiBooks.Site

جھینپتے ہوئے کہا۔ ''ہر کوئی آپ کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتا۔''

''میں بیچ میں کیسے آگیا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا پھر اس نے ویٹر کو بلا کر چائے اور سموسوں کا آرڈر دیا اور بولا۔ ''خیر اس وقت تو میں نے آپ کو ایک اور وجہ سے زحمت دی ہے۔''

''جی فرمایئے۔ میں سن رہی ہوں۔''

''کل آپ جس دکان پر آئی تھیں۔ میں وہاں سیلز مین ہوں اور یہ بات آپ کے علاوہ اس کلاس میں کسی اور کو معلوم نہیں۔ سب مجھے کسی کھاتے پیتے گھر کا فرد سمجھتے ہیں۔''

''پہلے میں بھی یہی سمجھی تھی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''بہرحال آپ بے فکر رہیں۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔''

بیرا چائے لے کر آگیا۔ اس کے ساتھ سموسے بھی تھے۔ میں نے اس کے لیے چائے بنائی تو وہ بولا۔ ''سیلز مین ہونا کوئی جرم نہیں اور نہ ہی مجھے اس پر کوئی شرمندگی ہے لیکن آپ جانتی ہیں کہ اس معاشرے میں جھوٹ اور منافقت کا سکہ چلتا ہے اور ایسے ہی لوگوں کی یہاں عزت ہے۔ اس وقت میری ذاتی زندگی پر ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ کبھی کسی نے نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ نہ ہی مجھے کچھ بتانے کی ضرورت پیش آئی اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرا جو بھرم بنا ہوا ہے وہ قائم رہے۔ جس دن انہیں معلوم ہوگیا کہ میں ایک معمولی سیلز مین ہوں تو میری عزت دو کوڑی کی رہ جائے گی۔ اس کے بعد یہ لوگ شاید مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہ کریں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو شاداب۔'' میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''واقعی یہاں کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہونی چاہیے میں بھی نہیں بتاؤں گی ورنہ تمہارا بھرم ٹوٹ جائے گا۔''

میں غیر ارادی طور پر آپ سے تم پر آگئی تھی چنانچہ اس نے بھی یہی صیغہ استعمال کیا اور بولا۔ ''یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا۔''

''اس میں احسان والی کوئی بات نہیں۔ مجھے صرف اپنی زبان ہی تو بند رکھنی ہے۔ میں ویسے بھی لوگوں سے زیادہ بات نہیں کرتی لیکن ایک مسئلہ ہے۔''

''وہ کیا؟'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔

''میرے علاوہ کوئی اور کلاس فیلو بھی تمہیں وہاں دیکھ سکتا ہے۔''

''اس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ ہمارے زیادہ تر کلاس فیلوز ڈیفنس اور کلفٹن میں رہتے ہیں اور یہاں اتنے بڑے بڑے شاپنگ مال ہیں کہ انہیں کسی دوسری جگہ جانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے باوجود اگر کسی نے دیکھ لیا تو میری قسمت۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' میں ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولی۔ ''ایک بات پوچھوں؟''

''ضرور؟''

''یہ تو میں سمجھ گئی کہ تم کسی معاشی مجبوری کے تحت سیلز مین کی جاب کررہے ہو لیکن اس بارے میں تفصیل سے جاننا چاہتی ہوں۔''

''وہ دکان میرے چچا کی ہے اور میں انہی کے ساتھ رہتا ہوں۔ بہت چھوٹا تھا جب میرے والدین ایک حادثہ میں اللہ کو پیارے ہوگئے تھے، چچا نے ہی میری پرورش کی۔ ان کا اپنا کنبہ بہت بڑا ہے۔ ماشاء اللہ چھ بچے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے میری ہر ضرورت پوری کی۔ البتہ چچی کا رویہ ہمیشہ بہت خراب رہا۔ وہ شروع سے ہی مجھے ایک بوجھ سمجھتی تھیں۔ میں نے میٹرک کیا تو انہوں نے مجھے آگے پڑھانے سے صاف انکار کردیا اور بولیں کہ وہ میرے تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کرسکتے اس لیے اب مجھے کوئی کام دھندا تلاش کرنا چاہیے۔ میں کسی بھی قیمت پر پڑھائی سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے صرف کالج میں داخلہ دلوادیں۔ اس کے بعد کے اخراجات میں خود برداشت کروں گا۔ انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ ایک میٹرک پاس لڑکا مزدوری کے علاوہ کیا کام کرسکتا ہے۔ بہرحال انہوں نے مجھے ایک ہزار روپے دیئے اور کہا۔ ''اس کے بعد ہم سے کوئی اُمید نہ رکھنا۔''

''میں نے کالج میں داخلہ لے لیا اور ساتھ ہی پارٹ ٹائم کام کی تلاش شروع کردی۔ ایک ہفتے کی دوڑ دھوپ کے بعد مجھے ایک بڑے جنرل اسٹور پر سیلز مین کا کام مل گیا۔ تنخواہ تین ہزار روپے مقرر ہوئی۔ میری ڈیوٹی دوپہر دو بجے سے آٹھ بجے تک تھی۔ میں نے اسے غنیمت جانا۔ کم از کم کالج کی فیس اور کتابوں کاپیوں کا خرچ تو نکل ہی آتا۔ میں کالج سے سیدھا اسٹور چلا جاتا اور میری واپسی رات کو ہوتی تھی۔ چچا کو معلوم ہوا تو وہ بہت ناراض ہوئے اور مجھ سے ملازمت چھوڑنے کے لیے کہا لیکن چچی بولیں کہ اس

www.PakiBooks.Site

میں حرج ہی کیا ہے۔ اچھا ہے۔ چار پیسے ہاتھ آئیں گے۔ کم از کم اپنی پڑھائی کا خرچ ہی نکال لے گا۔ اس کے بعد چچا کچھ نہیں بولے۔"

"یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن ایک سال بعد ہی اس دکان میں آگ لگ گئی اور میری ملازمت بھی جاتی رہی۔ چچا نے کہا کہ اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بہتر ہے کہ تم میری دکان پر آجاؤ۔ تمہاری وجہ سے مجھے بھی اطمینان رہے گا۔ انہوں نے میری تنخواہ بھی بڑھا دی اور میں وہاں بیٹھنے لگا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مالک کا بھتیجا ہونے کی وجہ سے دوسرے سیلز مین اور مارکیٹ کے لوگ میری عزت کرتے ہیں اور مجھے مالک کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ ہے میری پوری کہانی۔"

اس کی داستان سن کر میں بہت متاثر ہوئی۔ وہ صحیح معنوں میں سیلف میڈ انسان تھا جس نے چچی کی جھڑکیاں اور طعنے سننے کی بجائے عزت کا راستہ اختیار کیا اور کسی پر بوجھ بننے کی بجائے اپنا مسئلہ خود حل کیا۔ اب میرے ذہن میں ایک سوال باقی رہ گیا تھا۔ میں نے وہ بھی پوچھ لیا۔

"تم صبح سے شام تک مصروف رہتے ہو۔ اس کے باوجود کلاس میں تمہاری پوزیشن سب سے اچھی ہے۔ تم پڑھتے کس وقت ہو؟"

"میں رات کے کھانے کے بعد بارہ ساڑھے بارہ بجے تک پڑھتا رہتا ہوں اس کے بعد فجر کے وقت اٹھ کر دوبارہ پڑھتا ہوں اگر یہاں کوئی خالی پیریڈ مل جائے تو لائبریری چلا جاتا ہوں۔ چچا نے مجھے اتنی رعایت دے رکھی ہے کہ جس دن کوئی اسائنمنٹ یا ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہو تو میں وقت سے پہلے گھر جا سکتا ہوں۔"

"پھر تو تم سیلز مین نہیں بلکہ دکان کے مالک ہوئے۔" میں اٹھتے ہوئے بولی۔

"تم جو چاہو سمجھو لیکن حقیقت یہی ہے۔" وہ بھی میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔

اس کی کہانی سننے کے بعد میں دل سے اس کی عزت کرنے لگی۔ میں جانتی تھی کہ ایسے لوگ آگے چل کر بہت ترقی کرتے ہیں۔ مجھے اس کا مستقبل روشن نظر آرہا تھا۔ اس کے بعد میں اس کے ساتھ چائے پینے تو نہیں گئی لیکن آہستہ آہستہ ہمارے درمیان بے تکلفی بڑھنے لگی۔ اب میں اور وہ لائبریری میں ایک ساتھ ہی پڑھائی کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے مجھے بہت سہولت ہو گئی تھی اور وہ اسائنمنٹ وغیرہ بنانے میں میری کافی مدد کرتا تھا۔

اس دن کے بعد اس نے مجھے کبھی کینٹین چلنے کے لیے نہیں کہا اور نہ ہی کسی اور حوالے سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی جب کہ دوسرے لڑکے تو لڑکیوں سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے تھے۔ ہماری ملاقاتیں صرف لائبریری تک محدود تھیں اور ہمارے درمیان پڑھائی کے علاوہ کسی اور موضوع پر بات نہیں ہوتی تھی۔ اس نے کبھی میرے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کون ہوں؟ کہاں رہتی ہوں؟ کتنے بہن بھائی ہیں؟ باپ کیا کرتے ہیں؟ لگتا تھا کہ اسے میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ بھی اس کی شخصیت کا ایک انوکھا پہلو تھا۔

دن گزرنے کا پتا بھی نہ چلا اور ہمارا کورس مکمل ہو گیا۔ اس دوران میرے اور شاداب کے تعلقات ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھے۔ میں منتظر ہی رہی کہ وہ کچھ کہے لیکن وہ تو نجانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا یا پھر وہ مجھے اس نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ جس کی میں توقع کر رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اسے دل ہی دل میں پسند کرنے لگی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ دل کی بات زبان پر لائے تو میں یکسو ہو کر اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر سکوں۔

میری پریشانی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گھر والوں نے میری شادی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ابو کو کچھ زیادہ جلدی ہو رہی تھی لیکن امی چاہتی تھیں کہ پہلے جمال اور کمال بھائی کی شادی ہو جائے تاکہ بھاوؤں کے آنے کے بعد وہ مجھے رخصت کریں۔ میں بھی اس خیال کی حامی تھی تاکہ مجھے اتنی مہلت مل جائے کہ اپنا ایم بی اے مکمل کر سکوں اور میں نے امی سے کہہ دیا تھا کہ وہ بھائیوں کے لیے لڑکیاں دیکھنا شروع کر دیں۔ میرا فی الحال شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ پہلے میں اپنا ایم بی اے مکمل کر لوں۔"

یہ سنتے ہی امی بھنچے سے اکھڑ گئیں اور بولیں۔ "میرا خیال ہے کہ تمہارے ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ واقعی تمہاری شادی ہو جانی چاہیے ورنہ تم کبھی بھی اس پڑھائی کے چکر سے باہر نہیں آسکو گی۔"

مجھے بھی غصہ آگیا اور میں با آواز بلند بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کو میری شادی کی جلدی کیوں ہے۔ آج کل تو اٹھائیس تیس سال کی عمر میں شادیاں ہو رہی ہیں۔"

"بیٹی، لڑکی کی شادی جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ عمر زیادہ ہو جائے تو اچھے رشتے آنا بند ہو جاتے

www.PakiBooks.Site

ہیں۔"

"ایسی باتیں تو منہ سے نہ نکالیں۔" میں منہ بسورتے ہوئے بولی۔ "صرف دو سال کی تو بات ہے پھر مجھے شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

امی کو ایک بار پھر میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے اور انہوں نے بھائیوں کے لیے لڑکیاں ڈھونڈنا شروع کر دیں۔ میرا ارادہ ایگزیکٹو ایم بی اے میں داخلہ لینے کا تھا۔ اس کی کلاس ہفتے میں دو دن ہوتی تھیں لیکن یہ کورس صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو ملازمت کے ساتھ ساتھ پڑھائی جاری رکھنا چاہتے ہیں چنانچہ میں نے ملازمت تلاش کرنا شروع کر دی۔

ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں ایک پلیسمنٹ بیورو بھی تھا۔ ان کے پاس مختلف اداروں سے ڈیمانڈز آتی تھیں اور وہ ہمیں وہاں بھیج دیتے تھے۔ ایک دن میں اسی سلسلے میں انسٹی ٹیوٹ گئی تو وہاں شاداب بھی آیا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکا اور کہنے لگا۔ "تم تو ایسے غائب ہوئیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ میں تو تلاش گم شدہ کا اشتہار دینے والا تھا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس سے بھی آسان طریقہ میں بتا دیتی ہوں۔ اگر کوئی ضروری بات تھی تو تم مجھے فون کر لیتے۔ میرا نمبر تو ہے نا تمہاری پاس۔"

"ہاں نمبر تو ہے لیکن وہ بات فون پر کرنے والی نہیں۔"

"اچھا۔" میں چونکتے ہوئے بولی۔ "ایسی کیا خاص بات ہے جو فون پر نہیں ہو سکتی۔"

"وہ بات یہاں بھی نہیں ہو سکتی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "چلو کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھتے ہیں۔"

"اچھا! ایک منٹ رکو۔ میں جس کام سے آئی ہوں وہ کر لوں پھر کینٹین میں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

میں نے دفتر میں جا کر اپنا رجسٹریشن فارم بھرا اور اس کے ساتھ کینٹین چلی آئی۔ وہاں تقریباً سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ابھی نیا سمسٹر نہیں شروع ہوا تھا اس لیے اِکا دُکا لوگ ہی نظر آرہے تھے۔ اس نے چائے اور سموسوں کا آرڈر دیا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمہارے لیے ایک نیوز ہے۔"

"اچھا! میں بھی تو سنوں وہ کیا نیوز ہے؟"

"مجھے ایک برطانوی یونیورسٹی سے اسکالرشپ مل گیا ہے اور میں ایم بی اے کرنے لندن جا رہا ہوں۔"

"اوہ مبارک ہو۔ اتنی بڑی خبر اور تم مجھے صرف چائے اور سموسوں پر ٹرخا رہے ہو۔ اس کے لیے تو کسی اچھے سے ریستوران میں زبردست قسم کا ٹریٹ ہونا چاہیے۔"

"وہ بھی ہو جائے گا۔ آگے بھی تو سنو تم تو جانتی ہی ہو کہ پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کانٹا یہاں بھی نکل آیا ہے۔"

"کیسا کانٹا؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"چچا چاہتے ہیں کہ جانے سے پہلے میری شادی یا کم از کم نکاح ہو جائے تاکہ وہاں جا کر میں کسی گوری میم کی زلف کا اسیر نہ ہو جاؤں۔ یہ بپتا انہیں چچی نے پڑھائی ہے۔ وہ میری شادی اپنی بھانجی سے کرنا چاہ رہی ہیں۔"

"تو کر لو اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ لڑکی کسی طرح بھی میرے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"دیکھو ریحانہ۔ میں شکل و صورت کی بات نہیں کرتا۔ سب انسان اللہ کے بنائے ہوئے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ مثلاً تعلیم وہ صرف میٹرک پاس ہے۔ جاہل ماں باپ کی گنوار بیٹی۔ اسے نہ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ ہے، نہ بات کرنے کی تمیز۔ سارا دن ٹی وی دیکھتی ہے یا ڈیک پر گانے سنتی رہتی ہے۔ ایسی لڑکی سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں ساری عمر کنوارا ہی رہوں۔"

"اس میں اتنی ٹینشن لینے والی کیا بات ہے اگر تم اس لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو انکار کر دو۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ "چچا اور چچی کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں، انہوں نے میری پرورش کی اور کبھی بھی والدین کی کمی کا احساس نہیں ہونا دیا۔ اس لیے میں انہیں انکار نہیں کر سکتا۔"

"پھر تم نے اس کا کیا حل سوچا ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے اور وہ یہ کہ میں چچا چچی کو بتا دوں کہ ایک لڑکی کو میں پسند کرتا ہوں اور اس سے شادی کا وعدہ کر چکا ہوں لیکن وہ ابھی پڑھ رہی ہے اس لیے شادی میرے واپس آنے پر ہوگی۔ اس طرح وہ مطمئن ہو جائیں گے اور ان کے ذہن سے یہ اندیشہ نکل جائے گا کہ میں وہاں کسی گوری میم سے شادی کر لوں گا۔"

"اور اگر انہوں نے منگنی میں نکاح پر اصرار کیا تو؟"

www.PakiBooks.Site

"ہاں! یہ مسئلہ ہوسکتا ہے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اس کے لیے مجھے تمہارا تعاون درکار ہوگا۔"

"میں..... میں بھلا کیا تعاون کرسکتی ہوں۔" میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے اب کھل کر بات کرلینی چاہیے۔" وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "اگر تمہیں یہ بات پسند نہ آئے تو سمجھ لینا کہ میں نے کچھ کہا ہی نہیں تھا۔ سنو ریحانہ تم ہی وہ لڑکی ہو جسے میں پسند کرتا ہوں۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اپنے دل کی بات کہہ دوں لیکن پڑھائی کی وجہ سے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میرا یہی خیال تھا کہ برسرروزگار ہونے کے بعد تمہیں پرپوز کروں گا لیکن اب صورتِ حال ایسی ہوگئی کہ تمہیں اعتماد میں لینا ضروری ہوگیا اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو چچا چچی کو تمہارے گھر بھیج دیتا ہوں۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ اس نے تو بم کا گولہ داغ دیا تھا اور میں اوپر سے نیچے تک ہل کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ میں خود عرصہ دراز سے اس کی زبان سے یہ الفاظ سننے کی منتظر تھی لیکن مجھے اس ڈرامائی صورتِ حال کی توقع نہیں تھی میں نے خود پڑھائی کا بہانہ بنا کر امی سے دو سال کی مہلت مانگی تھی۔ اب کس منہ سے کہتی کہ میری شادی کردو چنانچہ میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "تمہارا پرپوزل بالکل اچانک اور غیر متوقع ہے اس لیے میں فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ زندگی کا اتنا بڑا اور اہم فیصلہ کرنے کے لیے مجھے کچھ وقت چاہیے۔"

"ٹھیک ہے سوچ لو۔" اس نے کہا۔ "لیکن میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں تمہیں زیادہ سے زیادہ تین دن دے سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں تم سے تین دن بعد اسی وقت اور اسی جگہ ملوں گی۔"

میں نے گھر آنے کے بعد ساری صورتِ حال کا جائزہ لیا تو مجھے اس پرپوزل میں کئی جھول نظر آئے۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ اس کی سماجی اور معاشی پوزیشن بہت کمزور... تھی اس کے پاس روزگار تھا، نہ ذاتی گھر اور نہ گاڑی جب کہ آج کل والدین یہی چیزیں دیکھتے ہیں۔ وہ چچا کے ٹکڑوں پر پل کر بڑا ہوا اور اب اسکالرشپ پر پڑھنے کے لیے باہر جارہا تھا۔ یہ تھا اس کا اسٹیٹس۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا مستقبل بہت روشن ہو لیکن فی الحال اس کے پاس ایک ڈگری کے سوا کچھ نہیں تھا اور میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اس صورتِ حال میں اس کے چچا کو ہمارے یہاں سے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ پڑھ لکھ کر واپس آجائے اور اسے یہاں ایک اچھی ملازمت مل جائے تو میرے گھر والے ایک فارن کوالیفائیڈ شخص کو اپنا داماد بنانے پر تیار ہوجائیں لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ فی الحال اس رشتے کے قبول ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

میں تین دن بعد اس سے ملنے گئی تو وہ پہلے سے میرا انتظار کررہا تھا۔ ہم معمول کے مطابق کینٹین میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس نے چائے منگوائی اور اُمید بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "پھر کیا سوچا تم نے؟"

میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہارا پرپوزل منظور ہے لیکن....."

"لیکن کیا؟"

"میں بہت سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس وقت تمہارے چچا کا آنا مناسب نہ ہوگا۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے تمام خدشات اس کے سامنے بیان کردیئے اور کہا کہ جب وہ لندن سے ڈگری لے کر آئے گا تو اس کی پوزیشن بہت بہتر ہوگی اور اس وقت اس کا رشتہ قبول ہونے کے زیادہ امکانات ہوں گے۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے مگر....."

"مگر کیا؟ پوری بات کرو۔"

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اس وقت تک تم میرے انتظار میں بیٹھی رہو گی۔ اگر اس دوران کوئی اچھا رشتہ آگیا تو اسے کیسے انکار کرو گی۔"

میں نے اسے امی سے ہونے والی گفتگو سنا دی اور کہا کہ میں نے پڑھائی کا بہانہ بنا کر دو سال کی مہلت لے لی ہے اور امی کو بھائیوں کی شادی کے مشن پر لگا دیا ہے اس لیے فی الوقت ایسا کوئی خطرہ نہیں اگر اس دوران کوئی رشتہ آیا تو میں کوئی نہ کوئی عیب نکال کر اسے مسترد کردوں گی۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم میرا انتظار کرو گی لیکن چچا سے کیا کہوں؟"

"وہی جو تم پہلے کہہ چکے ہو کہ لڑکی ابھی پڑھ رہی ہے اس لیے فی الحال شادی نہیں ہوسکتی۔ چاہو تو اس میں یہ اضافہ کردینا کہ لڑکی کے گھر والے منگنی یا نکاح کے قائل نہیں ہیں۔ چچا کی تسلی کے لیے تم مجھے ان سے ملوا سکتے ہو تاکہ انہیں یقین آجائے کہ واقعی کسی ایسی لڑکی کا وجود ہے

www.PakiBooks.Site

جسے تم پسند کرتے ہو۔"

وہ زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "واقعی تمہارا ابھی جواب نہیں، پوری اسکیم سوچ رکھی ہے۔"

"ظاہر ہے کہ جب کوئی مسئلہ سامنے ہو تو اس کا حل سوچنا ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح دنیا کے کام چلتے ہیں۔"

پھر سب کچھ اسی طرح ہوا جو ہم نے سوچا تھا۔ وہ ایک دن مجھے اپنے گھر والوں سے ملوانے لے گیا۔ میں نے ان کے لیے کچھ تحائف اور مٹھائی بھی لے لی تھی جنہیں دیکھ کر وہ دونوں میاں بیوی نہال ہوگئے اور جب میں نے ان کے سامنے شاداب سے دو چار باتیں انگریزی میں کیں تو اس کی چچی کو یہ یاد نہ رہا کہ ان کی کوئی بھانجی بھی ہے جس کا نکاح وہ اپنے بھتیجے سے کرنا چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! ہماری تو بڑی خواہش تھی کہ شاداب سے تمہارا نکاح ہوجائے۔ اس طرح ہمیں اطمینان ہوجاتا۔"

"آنٹی! آپ کو تو معلوم ہے کہ میری پڑھائی چل رہی ہے۔ اس کے بعد ہی کچھ ہوسکتا ہے۔"

وہ میرا جواب سن کر خاموش ہوگئیں۔ میں کچھ دیر بیٹھ کر چلی آئی۔ میری اسکیم کامیاب رہی۔ شاداب کے چچا اور چچی دونوں ہی مجھ سے متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے شاداب کی پسند یعنی مجھ پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ شاداب نے مطمئن ہوکر جانے کی تیاری شروع کردی اور ایک دن اپنے پروگرام کے مطابق لندن کے لیے روانہ ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد مجھے ایک کمپنی سے جاب کی آفر آئی۔ اس بار امی کے ساتھ ساتھ پورے گھر نے میری مخالفت کی۔ صرف فرزانہ میری حمایت لے رہی تھی۔ ابو نے تو صاف کہہ دیا۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے جاب کرنے کی۔ ابھی میں زندہ ہوں تمہاری ضرورتیں پوری کرنے کے لیے۔"

دونوں بھائی یک زبان ہوکر بولے۔ "ہاں گڑیا! تمہیں جتنے پیسوں کی ضرورت ہو ہمیں بتا دیا کرو۔"

"اللہ آپ لوگوں کو سلامت رکھے لیکن میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ ایسی تعلیم کا کیا فائدہ جو کسی کام نہ آئے۔ ابو آپ کو ابھی چار بچوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ میں آپ کا سہارا بننا چاہتی ہوں اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنی کمائی سے اپنے اخراجات ہی پورے کرلوں۔"

ایک شام خود اپنے لیے گزاریے

مہینے میں کم از کم ایک شام خود اپنے لیے مخصوص کیجیے..... یہاں اپنے سے مراد آپ خود نہیں بلکہ اس میں آپ کی شریک حیات بھی شامل ہے۔ اپنے وسائل کے مطابق کوئی تفریحی جگہ منتخب کیجیے..... یہ سارا وقت کہنے سے زیادہ سننے میں گزاریں۔ گھر کے ماحول سے ہٹ کر کسی پارک، تفریح گاہ میں جا کر بیٹھیں۔ پاپ کارن، ایک آئس کریم یا برگر ہی سہی آنے جانے میں ٹرانسپورٹ کی زحمت بھی برداشت کریں۔ کسی رکاوٹ، کسی کمی کو خاطر میں نہ لائیں۔ ایک دوسرے سے الجھے بغیر وقت گزاریں، ایک دوسرے کے مسائل سمجھنے کی کوشش کریں، براہ راست مکالمہ بھی زندگی کی ضرورت ہے۔ جس کا گھر میں موقع کم ہی ملتا ہے۔ تفریح کو ممکنہ حد تک تفریح بنائیں اس سے ذہنی سکون بھی ملے گا اور آپ کو زندگی کے معمولات سے نمٹنے کے لیے توانائی بھی فراہم ہوگی۔

مرسلہ: ریحان ہاشمی، کراچی

اس کے بعد کوئی کچھ نہیں بولا۔ البتہ ابو نے اتنا ضرور کہا۔ "ٹھیک ہے تم اپنا شوق پورا کرلو لیکن اگر کسی وقت بھی کوئی مشکل پیش آئے تو ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر ملازمت چھوڑ دینا۔"

وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر بول رہے تھے۔ جانتے تھے کہ دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیوں کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن میں نے ابھی اپنے گرد حفاظتی حصار بنالیا تھا۔ میں ڈیوٹی جوائن کرنے سے پہلے بازار گئی اور ایک بہت ہی خوب صورت جڑاؤ ایمیٹیشن کی انگوٹھی خریدی تاکہ سب یہی سمجھیں کہ میں انگیج ہوچکی ہوں۔

زندگی بہت مصروف ہوگئی تھی۔ میں ملازمت کے علاوہ ہفتہ میں دو دن ایم بی اے کی کلاسیں اٹینڈ کرتی اور گھر آکر رات کو دیر تک پڑھتی رہتی۔ شاداب سے فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ وہ چچا اور چچی کے لیے بہت فکرمند تھا۔ اس نے مجھ سے ریکوئسٹ کی کہ میں کبھی کبھار وقت نکال کر ان کی خیریت معلوم کرنے چلی جایا کروں۔ میرے پاس تو ویسے ہی وقت کی بہت کمی تھی۔ اس کے باوجود میں شاداب کی خاطر ان لوگوں کو دیکھنے چلی جاتی۔

امی بڑے زور و شور سے بھائیوں کے لیے لڑکیاں

www.PakiBooks.Site

جان جائیں

آنسو اپنی بخشش کے لیے اللہ کے سامنے بہائیں اور مسکراہٹ اللہ کی مخلوق میں بانٹ دیں۔ یہی بندگی کا تقاضا اور انسانیت کی معراج ہے۔

فرید احمد، فیصل آباد

ڈھونڈ رہی تھیں لیکن ابھی تک انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ دراصل وہ دونوں بھائیوں کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہ رہی تھیں جس پر وہ دونوں راضی نہیں تھے۔ کمال بھائی نے تو صاف کہہ دیا کہ امی ان کی فکر چھوڑیں اور پہلے جمال بھائی کی شادی کردیں۔ انہیں ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔

میں نے بھی امی کو یہی سمجھایا کہ وہ بیک وقت دو بہوؤں لانے کا خیال دل سے نکال دیں کیونکہ اس میں بڑے مسئلے ہیں۔ پہلے دو لڑکیاں ڈھونڈو۔ ان کی الگ الگ بری بناؤ۔ دو دن مہندی، دو دن برأت، ولیمے میں دو سمدھیانے، اتنے سارے لوگوں کو کون دیکھے گا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ دونوں شادیوں میں ایک سال کا وقفہ رکھیں تاکہ سارے کام اطمینان وسکون سے ہوجائیں۔

دراصل اس میں بھی میرا مفاد تھا۔ اس طرح امی دو سال تک بھائیوں کی شادیوں میں الجھی رہتیں اور میری طرف ان کا دھیان نہ جاتا۔ اس دوران اگر میرا کوئی رشتہ آجاتا تو وہ یہ کہہ کر انہیں ٹال سکتی تھیں کہ ابھی وہ بیٹوں کی شادیوں میں مصروف ہیں۔ ان سے فارغ ہوکر وہ اس بارے میں سوچیں گی۔

میں اپنی ملازمت سے پوری طرح انجوائے کررہی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ معاشی خودمختاری کیا ہوتی ہے۔ ہر مہینے جب ایک معقول رقم میرے اکاؤنٹ میں آتی تو پورے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی۔ اب مجھے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے سارے اخراجات بآسانی پورے ہورہے تھے۔ کالج کی فیس، گاڑی کا کرایہ، شاپنگ اور بہت کچھ۔ اس کے بعد بھی اچھے خاصے پیسے بچ جاتے تھے۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ شادی کے بعد بھی ملازمت جاری رکھوں گی تاکہ مجھے اپنی ضرورتوں کے لیے شوہر کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ آگے چل کر یہ فیصلہ میرے لیے بہت سی پریشانی کا سبب بنے گا۔

دو سال پلک جھپکتے گزر گئے۔ اس دوران دونوں بھائیوں کی شادیاں ہوگئیں۔ میرے لیے بھی دو تین رشتے آئے لیکن ان میں کوئی بھی میرے معیار کا نہیں تھا لہٰذا گھر والوں نے خود ہی انہیں مسترد کردیا۔ میرے انکار کی نوبت ہی نہیں آئی۔ میرا ایم بی اے مکمل ہوا تو اس کے ساتھ ہی میری ترقی ہوگئی۔ ادھر شاداب نے بھی واپس آنے کی نوید سنادی۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند ہفتوں بعد ہی اسے ایک مٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی ملازمت مل گئی۔ اس کی تنخواہ مجھ سے دگنی تھی اور دیگر مراعات اس کے علاوہ، کمپنی نے اسے زیرو میٹر گاڑی بھی دی تھی۔ اسی خوشی میں وہ مجھے ڈنر کرانے شہر کے مہنگے ترین ریستوران میں لے گیا۔ کھانے کے دوران اس نے کہا۔ ''میں نے تمہاری ساری شرطیں پوری کردی ہیں۔ اب تو میں اپنے بزرگوں کو تمہارے گھر بھیج سکتا ہوں۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بزرگوں کے ساتھ تمہیں بھی آنا پڑے گا۔ بردکھوے کے لیے۔'' پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''کچھ روز انتظار کرو۔ میں امی کو تمہارے بارے میں بتادوں۔ وہ ابو اور بھائیوں سے مشورہ کرکے کوئی دن اور تاریخ بتادیں گی۔''

میں نے جب امی کو شاداب کے بارے میں بتایا تو وہ حیران رہ گئیں پھر مجھے چھیڑتے ہوئے بولیں۔ ''اب تجھے یہ دو سال کی مہلت کیوں مانگنی جارہی تھی۔''

میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تو آپ کو بہت پہلے سمجھ لینی چاہیے تھی کہ کچھ تو ہے اس پردہ داری میں، خیر دیر آید درست آید۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ابو سے مشورہ کرکے جواب دوں گی۔''

ابو نے بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بظاہر شاداب میں کوئی خامی نہیں تھی بلکہ خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔ فارن کوالیفائیڈ اچھے عہدے پر فائز، ساس نندوں کا بھی کوئی جھگڑا نہیں۔ میں نے امی کو بتادیا تھا کہ فی الوقت وہ اپنے چچا کے پاس رہ رہا ہے کیونکہ وہی اس کے سرپرست ہیں۔ شادی کے بعد اسے کمپنی سے مکان مل جائے گا تو وہ وہاں شفٹ ہوجائے گا۔

ابو اور بھائیوں سے گرین سگنل ملنے کے بعد امی نے

www.PakiBooks.Site

مجھ سے کہا کہ میں اتوار کی شام پانچ بجے ان لوگوں کو بلا لوں۔ امی نے خاص طور پر تاکید کی کہ شاداب بھی ان کے ساتھ آئے تاکہ ایک ہی دفعہ میں گھر کے سب لوگ اس سے مل لیں۔

شاداب نے اپنی وجاہت، ذہانت اور قابلیت سے گھر کے ہر فرد کو متاثر کیا تھا۔ پہلے وہ دبلا پتلا اور سانولا تھا لیکن انگلینڈ کی آب وہوا اسے خوب راس آئی تھی۔ اب وہ نسبتاً گورا اور قدرے فربہ ہوگیا تھا۔ دھاری دھار قمیص، سیاہ پینٹ اور سیاہ چمک دار بوٹوں نے اس کی شخصیت کو اور بھی زیادہ دلآویز بنادیا تھا۔ میں نے گھر والوں کے چہرے دیکھ کر اندازہ لگالیا کہ انہیں شاداب پسند آگیا ہے۔ خصوصاً میری بھابیاں تو پہلی نظر میں ہی اس کی گرویدہ ہوگئی تھیں۔

میں کچن میں چائے بنارہی تھی کہ بڑی بھابی وہاں آئیں اور ایک آنکھ میچ کر شرارت آمیز لہجے میں بولیں۔ ''زبردست دانہ چنا ہے تم نے۔''

میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''دعا کریں کہ باقی لوگوں کی بھی یہی رائے ہو۔''

''انشاء اللہ!'' وہ بڑے خلوص سے بولیں۔ ''مجھے یقین ہے کہ سب اسے ہی ووٹ دیں گے۔ اتنا ہینڈسم اور پڑھا لکھا لڑکا قسمت والوں کو ہی ملتا ہے۔''

امی نے ان لوگوں کی بہترین خاطر تواضع کی اور رخصت ہوتے وقت شاداب کے چچا نے سب لوگوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی چنانچہ اگلے اتوار کو امی، جمال بھائی اور بڑی بھابی شاداب کے گھر گئیں اور ان کی واپسی مطمئن انداز میں ہوئی۔ اس کے بعد ایک دو رسمی ملاقاتیں ہوئیں اور یہ رشتہ طے ہوگیا۔ شادی چھ ماہ بعد ہونا قرار پائی۔

امی نے جہیز کی تیاری شروع کردی۔ شاداب نے کہہ دیا تھا کہ بیڈروم سیٹ کے علاوہ کوئی فرنیچر اور الیکٹرونکس کا سامان نہ دیا جائے کیونکہ چچا کے گھر میں اتنی گنجائش نہیں ہے جب وہ اپنے گھر میں شفٹ ہوگا تو یہ چیزیں بھی آجائیں گی۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ برأت میں تو زیادہ لوگ نہیں تھے۔ البتہ امی نے پورے خاندان کو مدعو کیا تھا۔ ولیمہ کے تین دن بعد ہم شمالی علاقوں کی سیر کے لیے چلے گئے۔ پندرہ دن گزارنے کے بعد واپس آئے تو خاندان میں دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں اس گھر میں مہمانوں کی طرح رہ رہی تھی اور مجھے احساس تھا کہ ہماری وجہ سے چچی کے گھر والے ڈسٹرب ہورہے ہیں۔ پہلے شاداب کے کمرے میں ان کے دونوں لڑکے بھی سوتے تھے۔ میرے آنے کے بعد وہ چھت پر بنے ہوئے کمرے میں چلے گئے جو پہلے اسٹور کے طور پر استعمال ہورہا تھا۔ مجھے شدت سے انتظار تھا کہ شاداب کو کمپنی کی طرف سے مکان ملے اور ہم اپنے نئے گھر میں شفٹ ہوجائیں۔

ہم دونوں نے دفتر سے ایک مہینے کی چھٹی لی تھی۔ یہ دن بڑی تیزی سے گزر گئے۔ اس روز میں صبح سویرے اٹھ گئی۔ شاداب کے لیے ناشتا بنایا اور خود دفتر جانے کی تیاری

ارسطو

ارسطو (384-322ق م) یونان تھریس کے ایک شہر استاجرہ میں پیدا ہوا اور کلکس میں فوت ہوا۔ اس کا باپ نکومیکس، اسکندر اعظم کے دادا امنطاس کا جو مقدونیہ کی ریاست کا ایک طاقت ور حکمران تھا، دوست اور درباری طبیب تھا، ارسطو کی پرورش جب ادویات اور امراض کے تذکروں میں ہوئی تو اس کا رجحان طبع کا علوم طبیعی کی طرف ہوجانا ایک فطری امر تھا۔ 367ق م میں اثنیا میں اس کی تعلیم شروع ہوئی۔ اس کے عہد شباب کی کئی ایک کہانیاں مشہور ہیں۔ ایک کہانی کے مطابق اس نے اپنی تمام آبائی جایداد جوانی کی سرمستیوں میں برباد کر ڈالی اور جب قلاش ہوکر بھوکوں مرنے لگا تو فوج میں بھرتی ہو گیا لیکن کچھ عرصہ بعد ملازمت چھوڑ کر اپنے آبائی شہر استاجرہ میں لوٹ آیا اور طبابت کرنے لگا۔ تیس برس کی عمر میں اسے علم وحکمت سیکھنے کا شوق ہوا اور وہ افلاطون کے حلقہ تلمذ میں شریک ہونے کے لیے ایتھنز چلا گیا۔ اس سے زیادہ مستند روایت کی رو سے اس نے اٹھارہ برس کی عمر میں افلاطون کی شاگردی اختیار کی تھی، اس کے شباب کی سرمستیوں کا اس روایت میں بھی ذکر ملتا ہے، اس نے افلاطون سے ایک روایت کے مطابق آٹھ اور دوسری روایت کی رو سے بیس برس تعلیم حاصل کی۔

مرسلہ: اختر عثمانی۔ حیدرآباد

www.PakiBooks.Site

کرنے لگی۔ شاداب اپنا بریف کیس لینے کمرے میں آیا اور بولا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم نے ملازمت چھوڑ دی ہوگی۔''

''کیوں؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''اس لیے کہ اب تمہیں جاب کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ضرورت تو مجھے پہلے بھی نہیں تھی۔'' میں نے مختصر جواب دیا کیونکہ میں صبح سویرے بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ ہم شام کو بات کریں گے۔'' اس نے کہا اور بریف کیس اٹھا کر چل دیا۔

اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی کہ اسے میری جانب سے کیا تکلیف ہو رہی ہے۔ کیا یہ بھی عام مردوں جیسا ہی ہے۔ حاکمیت پسند، عورت کو جوتی کی نوک پر رکھنے والا۔ کیا یہ بھی یہی چاہتا ہے کہ میں گھر میں قید ہو کر رہ جاؤں۔ اس کی لونڈی بن کر رہوں۔ گھر کے سارے کام کروں۔ بچے پالوں اور اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے اس کا منہ دیکھتی رہوں پھر وہ ترساتر سا کر اور احسان جتا کر چار پیسے میرے ہاتھ پر رکھ دے۔ اگر اس کی یہ سوچ ہے تو میں بھی ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ چاہے وہ کچھ بھی کہتا رہے۔

دفتر پہنچی تو میرے کمرے میں مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ سب لوگ کچھ نہ کچھ لے کر آرہے تھے۔ مٹھائی، کیک، پھولوں کے گلدستے وغیرہ وغیرہ۔ گیارہ بجے میرے اعزاز میں پارٹی ہوئی اور ایم ڈی صاحب نے مجھے اسٹاف کی جانب سے ایک قیمتی اور خوب صورت گفٹ پیش کیا۔ یہ وہ یادگار لمحات تھے جنہیں میں کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ میں سوچنے لگی کہ کیا گھر میں بیٹھ کر مجھے یہ عزت اور پذیرائی مل سکتی ہے۔ شام کو میں نے تمام چیزیں گاڑی میں رکھوائیں اور گھر کے لیے روانہ ہوگئی۔ یہ تو میں بتانا بھول ہی گئی کہ پروموشن کے بعد مجھے کمپنی کی طرف سے گاڑی بھی مل گئی تھی۔

رات کو شاداب نے پھر وہی موضوع چھیڑ دیا تو میں تنک کر بولی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم میری ملازمت کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ اتنی اچھی جاب ہے، پیسا، عزت ہر طرح کی سہولتیں۔ اسے چھوڑنا کفرانِ نعمت ہوگا اور پھر اس کی کوئی معقول وجہ بھی تو ہو۔''

''معقول وجہ ہے، جبھی تو کہہ رہا ہوں۔'' وہ رسان سے بولا۔

''وہ کیا؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔''

''میں تمہیں دُہری ذمہ داری کے عذاب سے بچانا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب۔ میں سمجھی نہیں۔''

''دیکھو نا، شادی سے تمہارے اوپر گھر کی کوئی ذمے داری نہیں تھی۔ تم مزے سے جاب کر رہی تھیں اور گھر کا سارا کام تمہاری والدہ اور بھابیوں نے سنبھال رکھا تھا مگر اب صورتِ حال مختلف ہے۔ تمہیں ملازمت کے ساتھ گھر بھی دیکھنا ہوگا۔ ابھی تو ہم چچا کے گھر میں مہمان کی طرح رہ رہے ہیں لیکن کل کو جب ہم اپنے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے تو کیا ہوگا۔ تمہیں دفتر کے ساتھ گھر کو بھی دیکھنا ہوگا تم یہ سب کیسے کر پاؤ گی؟''

''سب ہو جاتا ہے۔'' میں چہکتے ہوئے بولی۔ ''دنیا میں لاکھوں کروڑوں عورتیں جاب کے ساتھ گھر اور بچوں کو بھی سنبھالتی ہیں۔ میں ان سے الگ تو نہیں ہوں۔''

''ان میں سے نوّے فیصد ضرورت مند ہیں اور کسی مجبوری کے تحت کام کر رہی ہیں۔ کوئی بیوہ ہے یا مطلقہ۔ کسی کا باپ یا شوہر بے روزگار ہے یا اس کی آمدنی بہت کم ہے۔ کوئی اپنے جہیز کے لیے پیسے جمع کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ تمہارے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ میری تنخواہ اچھی خاصی ہے۔ اس میں ہم دونوں کا گزارہ بڑی آسانی سے ہوسکتا ہے پھر تمہیں جاب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے اپنا دست نگر بنانا چاہتا ہے تاکہ میں ساری عمر اس کے اشاروں پر چلتی رہوں۔ یہ مجھے کسی صورت بھی قبول نہیں تھا لیکن میں اس سے بحث کرنا نہیں چاہتی تھی... اس لیے میں نے مصالحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری بات سے سو فیصد متفق ہوں۔ واقعی مجھے ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے لیکن میرے پاس بھی ملازمت جاری رکھنے کے حق میں کچھ دلیلیں ہیں۔ پہلی یہ کہ میں نے ایم بی اے اس لیے نہیں کیا کہ گھر میں بیٹھ کر برسوں کی محنت ضائع کردوں اگر گھر داری ہی کرنا تھی تو اس کے لیے میٹرک تک تعلیم کافی تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت تو تمہاری تنخواہ میں ہمارا گزارہ ہو رہا ہے لیکن کل کو جب ہماری فیملی بڑھے گی تو یہ تنخواہ ناکافی ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس وقت ہمارے پاس ذاتی گھر ہے اور نہ اپنی گاڑی۔ تم اپنی تنخواہ سے اتنی بچت نہیں کر سکتے کہ آئندہ چار پانچ سالوں میں ان دونوں چیزوں کے مالک بن جاؤ یہ اسی صورت میں

www.PakiBooks.Site

ممکن ہے کہ میں جاب کرتی رہوں۔ تم گھر کا خرچ چلاؤ اور میری تنخواہ جمع ہوتی رہے۔''

میری دلیلوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''گویا تم نے تہیہ کر رکھا ہے کہ جاب نہیں چھوڑو گی۔''

''ہاں!'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''کم از کم اس وقت تک مجھے کام کرنے دو جب تک ہمارا اپنا مکان نہ ہو جائے پھر اگر تم کہو گے تو میں جاب چھوڑ دوں گی۔''

''ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہا تھا۔''

آہستہ آہستہ اس کی شخصیت کی پرت کھلتے گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ اسے اپنی تعلیم، ذہانت اور ملازمت پر بہت گھمنڈ تھا اور وہ اپنے مقابلے میں دوسروں کو بہت حقیر سمجھتا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں کی قابلیت ایک جیسی تھی لیکن اسے یہ زعم تھا کہ اس نے انگلینڈ سے ایم بی اے کیا ہے جب کہ میں مقامی پروڈکٹ تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے میری ڈگری اور ملازمت کا مذاق اڑاتا۔

تین ماہ بعد اسے کمپنی سے مکان مل گیا اور ہم نئے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ مجھے شادی پر فرنیچر اور الیکٹرونکس کی خریداری کے لیے جو چیک ملا تھا ان سے میں نے اپنی پسند کی چیزیں خریدیں اور گھر کو اچھی طرح سے ڈیکوریٹ کیا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ گھر کی صفائی اور کھانا پکانے کے لیے کسی ملازمہ کا بندوبست کرلوں گی لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ دن میں ہم دونوں کام پر ہوتے تھے اور ہماری غیر موجودگی میں کسی ملازمہ کا گھر میں آنا ٹھیک نہیں تھا چنانچہ میں دفتر سے آنے کے بعد خود ہی گھر کی صفائی کرتی۔ کھانے کا حل میں نے یہ نکالا کہ ہفتہ اور اتوار کی چھٹی میں پورے ہفتے کے لیے چار پانچ ڈشیں بنا لیتی۔ اس طرح مجھے صرف روٹی ڈالنا ہوتی تھی جو کوئی مشکل کام نہ تھا پھر بھی اگر موڈ نہ ہوتا تو بازار سے منگوا لیتی۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد میں نے محسوس کیا کہ شاداب کا رویہ تبدیل ہو رہا ہے ویسے تو وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ اکثر ہم لوگ شام کو چچا یا امی کے گھر چلے جاتے یا رات کا کھانا کسی ریسٹورنٹ میں کھاتے لیکن گھر میں وہ مجھے زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنا چاہتا تھا۔ دفتر سے آتے ہی اسے چائے کی طلب ہوتی۔ اس کے ساتھ اسے پکوڑے، سموسے یا رول چاہیے ہوتے تھے پھر اس نے بازار سے روٹیاں لانا بند کردیں۔ اسے رات کے کھانے میں ہاتھ کی بنی ہوئی گرم روٹیاں پسند تھیں۔ رات کو سونے سے پہلے وہ کافی پینا پسند کرتا تھا۔

اسی طرح صبح کو بھی میں گھن چکر بنی رہتی۔ پہلے اس کے کپڑے استری کرتی، پھر ناشتا بناتی اس کے بعد خود تیار ہوتی۔ درمیان میں بھی آوازیں پڑتی رہتی تھیں۔ کبھی اس کا بٹوہ نہیں ملتا، کبھی قلم تو کبھی چشمہ اور میں دوڑ دوڑ کر اس کی چیزیں تلاش کرتی۔ اتوار کا دن تو اور بھی مشکل ہوتا۔ میں نے کپڑے دھونے کے لیے ماسی لگا رکھی تھی جو اتوار کو آتی تھی لیکن شاداب کو اس کا کام پسند نہیں آیا اور مجھ سے کہا کہ

> انتظار حسین کہتے ہیں کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ترقی اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب اپنی زبان کو بھول جائیں اور انگریزی پڑھ لیں، ایک طبقہ کہتا ہے کہ انگریزی بالکل نہیں۔ میرے نزدیک دونوں غلط ہیں۔ انگریزی زبان بیسویں صدی میں چلنے کے لیے بہت ضروری ہے مگر اس زبان کو سیکھنے کی تربیت میں یہ تقاضا پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اپنی زبان کو فراموش کردیں۔ اپنی زبان کو فراموش کرنے والے کبھی دوسری زبان کو مکمل طور پر نہیں اپنا سکتے۔ تنقید میں ہمارا جو اچھا زمانہ گزرا ہے اس میں نقاد انگریزی اور اردو میں ہم پلہ تھے اس کی مثال حسن عسکری اور فراق ہیں۔ آپ یوں سمجھیں کہ اگر ہم نے مغربی ادب نہ پڑھا ہوا ہوتا تو ہمارے ادب کی یہ شکل ہی نہ ہوتی، ہماری شاعری روایت میں پھنسی رہتی اور نظم والا حالی کی نظم سے آگے نہ نکلتا۔ میں اب اکثر جو اصرار کرتا ہوں کہ مشرقی ادب سے بھی واقفیت ہونی چاہیے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ مغربی ادب سے استفادہ نہ کریں۔ میں نے بھی استفادہ کیا ہے مگر میرا یہ خیال ہے، ہماری مشرقی فکشن کی جو روایت تھی وہ کہاں گئی؟ وہ داستان کی روایت کیا تھی؟ تلاش کرنے پر مجھے پتا چلتا ہے کہ قدیم ہندوستان کی کتھاؤں کی پرانی روایت کیا تھی۔ وہ مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے کہ میں اتنی بڑی روایت سے کیوں بے خبر تھا اور یہ نئے نقادوں، عسکری اور فراق نے کیوں روشناس نہیں کروایا۔
>
> اقتباس: باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے۔ از۔ خرم سہیل

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

میں جان گئی تھی کہ وہ مجھے صرف اس لیے تنگ کررہا ہے کہ میں گھبرا کر جاب چھوڑ دوں لیکن میں بھی ضد کی پکی تھی۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے لیکن جاب نہیں چھوڑوں گی اس لیے اس کی تمام زیادتیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتی رہی لیکن میرا اصل امتحان اس وقت شروع ہوا جب میں ایک بچے کی ماں بن گئی۔ سوا مہینے تو پتا نہیں چلا کیونکہ امی میرے پاس رہنے کے لیے آگئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد شاداب نے ایک بار پھر اپنا مطالبہ دہرایا اور بولا۔ ''تم کام پر چلی جاؤ گی تو بچہ کو کون دیکھے گا؟''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں اسے ڈے کیئر سینٹر میں چھوڑ دوں گی۔''

''کیا مطلب، میرا بچہ ڈے کیئر سینٹر میں پلے گا؟'' وہ برہم ہوتے ہوئے بولا۔

''تو کیا ہوا۔ زیادہ تر ملازمت پیشہ خواتین اپنے بچے ڈے کیئر سینٹر میں ہی چھوڑتی ہیں۔''

وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو میری بات مان جاؤ۔ اپنے آپ کو ہلکان مت کرو۔ کیوں اپنے آپ کو دُہری مشقت میں مبتلا کررکھا ہے۔ آرام سے گھر میں بیٹھو اور گھریلو زندگی کا لطف اٹھاؤ۔''

میں اس کی ہر بات کا غلط مطلب لیتی تھی۔ اس وقت بھی یہی سمجھی کہ وہ مجھے معاشی خودمختاری کی نعمت سے محروم کرنا چاہ رہا ہے۔ میں نے تڑ سے جواب دیا۔ ''تم جانتے ہو کہ میں ایک مقصد کے لیے جاب کررہی ہوں۔ اس کے لیے میں ہر قسم کی مشقت جھیلنے کے لیے تیار ہوں۔''

''بہت ضدی ہو تم۔'' وہ جھلاتے ہوئے بولا۔

''تمہیں سمجھانا بہت مشکل ہے۔''

میں نے ننھے ارسلان کو ڈے کیئر سینٹر میں داخل کردیا۔ اب میری نئی پریڈ شروع ہوگئی تھی۔ صبح اپنے ساتھ بچے کو بھی تیار کرنا ہوتا۔ اس کا سامان ایک باسکٹ میں رکھتی اور دفتر جاتے ہوئے اسے ڈے کیئر میں چھوڑ دیتی۔ وہاں ایک آیا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شام کو واپسی میں بچے کو ساتھ لے کر گھر آتی اور گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ مجھے اس کو بھی دیکھنا ہوتا۔ تھک ہار کر رات کو گیارہ بارہ بجے بستر پر لیٹتی تو بیچ میں اس کی وجہ سے بار بار اٹھنا پڑتا۔ اس کے رونے سے شاداب کی نیند خراب ہوتی تھی اس لیے میں اسے دوسرے کمرے میں لے جا کر سلانے کی کوشش کرتی اور مجھے بمشکل دو تین گھنٹے ہی سونا نصیب ہوتا۔

پھر ایک ایسا واقعہ آیا جس نے میرے ہوش اڑا دیئے۔ ہوا یوں کہ ایک روز ارسلان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ ڈے کیئر والوں نے مجھے فون کیا لیکن میں اس وقت میٹنگ میں تھی اس لیے فون نہ سن سکی۔ دو گھنٹے بعد میٹنگ ختم ہوئی تو میں نے ان کا نمبر دیکھ کر رنگ چیک کیا۔ وہ خاتون کہہ رہی تھیں۔ ''جلدی سے آجائیں۔ آپ کے بچے کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دوڑی ہوئی سینٹر پہنچی تو ارسلان کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اس کا پورا جسم نیلا ہورہا تھا اور منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ میں اسے لے کر قریبی اسپتال پہنچی تو ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے فوڈ پوائزنگ ہوگئی ہے۔ طبی امداد ملنے سے اس کی طبیعت دو گھنٹے میں سنبھل گئی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور بچے کو لے کر گھر آگئی۔

میں نے شاداب کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا، البتہ رات کو سونے سے پہلے اس سے کہا۔ ''میں نے جاب چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ کل میرا دفتر میں آخری دن ہوگا۔''

وہ حیران ہو کر میری شکل دیکھنے لگا لیکن اس نے مجھ سے اس کی وجہ نہیں پوچھی۔ میں اسے کیا بتاتی معاشی خود مختاری ایک سراب ہے جس کا پیچھا کرتے کرتے اپنی زندگی، اپنا سکون، چین و آرام سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہے۔ مجھے ایسی عورتوں سے ہمدردی ہے جنہیں کسی مجبوری کی وجہ سے باہر نکلنا پڑتا ہے ورنہ ان کا اصل مقام گھر ہی ہے اور گھر میں بیٹھنے والی عورت ہمیشہ سکون سے رہتی ہے۔

شمارہ ستمبر 2018ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: پکار..... احمد (فیصل آباد)

☆ دوم: انمول..... اطہر ندیم (لاہور)

☆ سوم: انجام..... ارشد کریم (لاہور)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجئے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے